دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ

# جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

اگست 2011

نگران اعلیٰ

معراج رسول

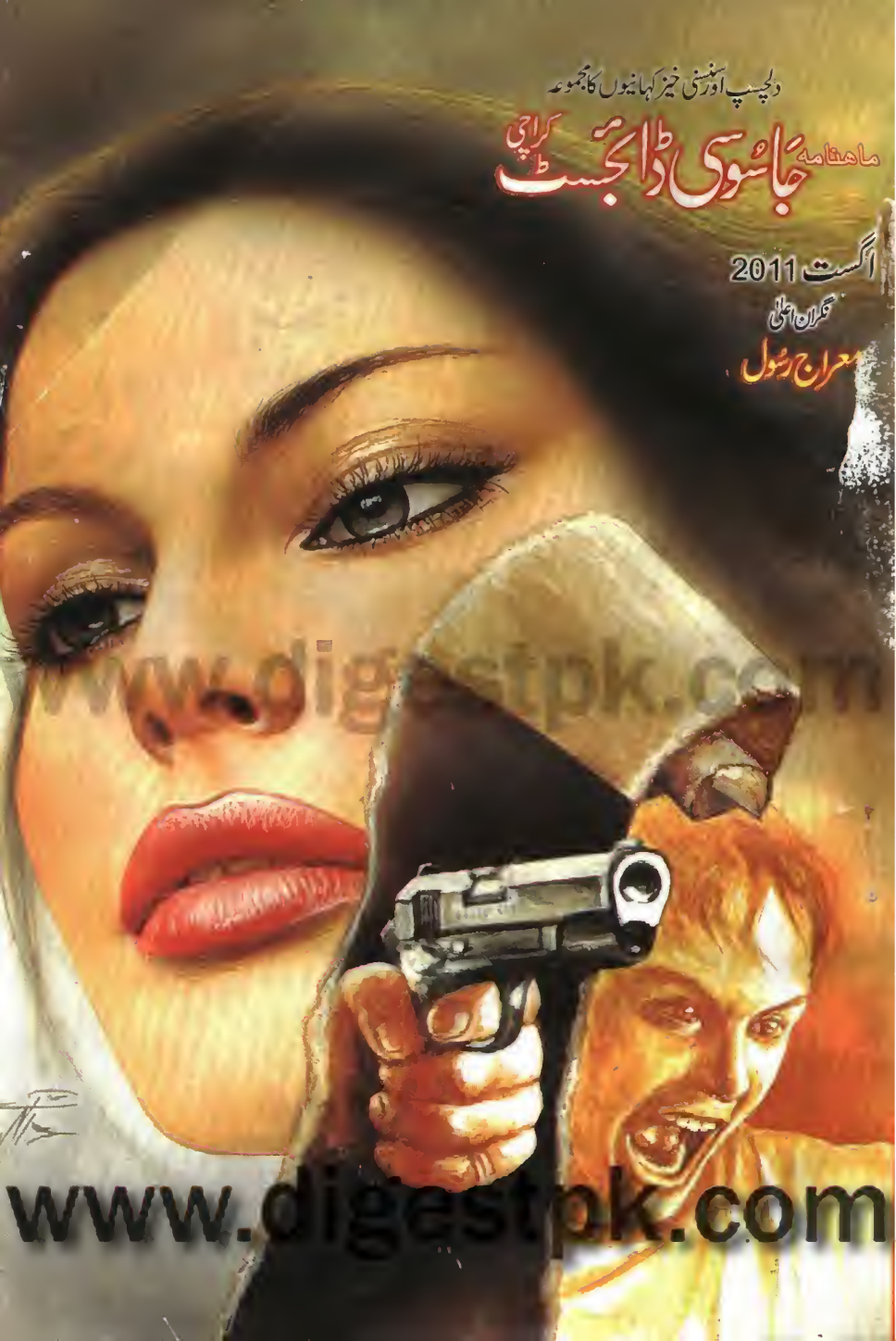

www.digestpk.com

www.digestpk.com

جاسوسی ڈائجسٹ

11 چینی نکتہ چینی — مدیر اعلیٰ
قارئین کی گرگرفرمائیاں کج ادائیاں
تلخ شیریں محبتیں عنایتیں اور شکایتیں





18 خبطی — محی الدین نواب
خاندانی الجھاوؤں اور روایات
کے شکنجے میں جکڑی داستان عشق







47 بدلہ — تنویر ریاض
اس ملزم کی بے چارگی جسے
ناکردہ جرم میں ملوث کر دیا گیا تھا



55 احمق قاتل — جمال دستی
ماضی کو فراموش کر کے مستقبل کو داؤ پر
لگا دینے والے کوتاہ اندیش کا قصہ







73 زندہ درگور — مختار آزاد
اس پولیس افسر کا فسانہ عبرت.....
جس کا سامنا اچانک روز سزا سے ہو گیا



86 للکار — طاہر جاوید مغل
محبت کے محاذ پر ٹکرائے ہوئے شخص کی جدوجہد
اسے اپنے تحفظ کی جنگ کا سامنا تھا







131 مشروب خون — سید ریاض
سراغرساں کو امتحان سے دوچار
کر دینے والا سنسنی خیز معاملۂ جرم



جلد 40 • شمارہ 08 • اگست 2011 • زرسالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 50 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون 35895313 (021) فیکس 3502551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com



مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

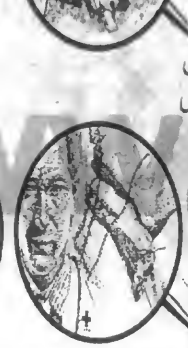

151 میز کی چوری — بابر نعیم
قیمتی اور نادر و نایاب میزوں
کی گمشدگی کا دلچسپ واقعہ





161 خواب پریشاں — سلیم انور
نئے زمانے کے آہنگ سے روشناس
کراتی ایک سائنس فکشن اسٹوری







166 گرداب — اسما قادری
تقدیر کی فسوں گری قسمت کی چالبازی کا مقدر
کا کھیل۔ ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی



195 انوکھے چور — محمد عفان آزاد
ان مجرموں کا احوال جن کی آنکھوں پر
ہوس زر نے پٹیاں باندھ دی تھیں







209 مخمل کے کانٹے — کاشف زبیر
نسل در نسل ایک ہی پیشے سے
وابستہ خاندان کا دلچسپ احوال



220 لمحے کا فیصلہ — احمد اقبال
حسن و ذہانت کی یکجائی کا شاخسانہ جس
نے فرزانگی کو دیوانگی میں بدل ڈالا







254 بے بس اختیار — پروین زبیر
ایک بااختیار شخص کی داستاں جسے وقت
نے ایک دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا



پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

مقبول عام ٹی وی سیریلز اور شاہکار ناولوں کی تخلیق کار

# عمیرہ احمد کا پیغام پاکیزہ بہنوں کے نام

## عکس

پاکیزہ کے لیے میرا پہلا سلسلے وار ناول اور مجموعی طور پر میری تیسری تحریر ہے۔ تقریباً چار سال بعد میں کسی بھی ڈائجسٹ کے لیے کوئی ناول لکھ رہی ہوں۔ قارئین سے زیادہ میں خود ایکسائٹڈ ہوں۔ آپ کی توقعات سے واقف ہوں لیکن اب اس کی عادی ہو چکی ہوں۔

آئندہ آنے والے سالوں میں اگر زندگی رہی تو میں پاکیزہ کے لیے انشاءاللہ تعالیٰ ہر سال باقاعدگی سے کچھ نہ کچھ لکھنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ اس لیے نہیں کہ مجھے ڈائجسٹ کے ذریعے مزید شہرت، شناخت یا پیسے کی ضرورت ہے بلکہ صرف اس لیے کہ پاکستان کے بہت سے علاقوں میں لوگ میری تحریریں کتاب کی شکل میں خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ اس کا ادراک مجھے پہلے نہیں تھا۔ ڈائجسٹ کی دنیا میں واپسی کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ میں اپنے پڑھنے والوں کا وہ قرض لوٹانا چاہتی ہوں جو انہوں نے عزت، پسندیدگی، ستائش اور نام کی صورت میں مجھے دیا۔

میرے تحریری سفر میں یہ پہلا موقع ہے کہ میں ایک وقت میں دو مکمل ناولز پر کام کر رہی ہوں۔ درِنجات اور عکس ورنہ اس سے پہلے میں نے ہمیشہ ایک وقت میں ایک مکمل ناول پر کام کیا ہے۔ درِنجات کو میں پہلے شائع کروانا چاہتی تھی لیکن پھر بالکل آخری لمحات میں، میں نے عکس کو پہلے شائع کروانے کا فیصلہ کیا۔

درِنجات اپنے موضوعات کے اعتبار سے زیادہ complex اور hard hitting ہے۔ کہانی کا کینوس بھی بڑا ہے تو میں نے سوچا درِنجات کی صورت میں seven course meal دینے سے پہلے آپ کو عکس کی صورت میں ایک appetizer دے دیا جائے۔

تو آئیں عکس کے ونڈر لینڈ میں چلیں اور محبت اور تعلق کی کچھ نئی بنیادیں، نئی جہتیں کھوجیں۔

عمیرہ احمد کے قلم سے نکلا ہوا دلوں کی گہرائیوں کو چھو لینے والا ناول

عکس

ماہنامہ پاکیزہ میں اگست 2011ء سے شروع ہو رہا ہے


مدیر اعلیٰ

# چینی نکتہ چینی

عزیزانِ من... السلام علیکم!

اگست 2011ء کا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ اگست 1947ء کی بات ہے جب بابرکت طاق راتوں میں قیامِ پاکستان کا وہ اعلان ہوا... جس کے لیے برِصغیر کے لاکھوں مسلمان مدتوں سے منتظر تھے۔ ایک بار پھر ماہِ اگست ہے اور رمضان المبارک کا مہینا ہم پر سایہ فگن ہے... مبارک ساعتوں کے درمیان یومِ آزادی کا وہ لمحہ... جو ارضِ پاک سے تجدیدِ عہد کا متقاضی ہے۔ پاکستان وہ عام ریاست نہیں جو حوادثِ زمانہ اور تغیر حالات کے باعث دنیا کے نقشے پر اُبھری ہو... یہ دنیا کی وہ ریاست ہے جس کا وجود ایک نظریہ اور فلسفے کا مظہر ہے۔ خالقِ پاکستان حضرت قائدِ اعظم محمد علی جناح کے فرمان اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ پاکستان کو کیسی ریاست دیکھنا چاہتے تھے مگر افسوس کہ وقت نے انہیں مہلت نہ دی اور ہمیں یہ توفیق حاصل نہیں ہوئی کہ پاکستان کو وہ پاکستان بنا سکتے جس کے رہنما اصول فرمانِ قائد میں پوشیدہ ہیں۔ آج پاکستان عمر کی ساتویں دہائی کے تقریباً نصف میں پہنچ چکا ہے۔ یومِ آزادی چند روز کی دُوری پر ہے... لیکن کیا ہوگا؟ ٹیلی وژن اور ریڈیو پر مخصوص پروگرام نشر ہوں گے، اخبارات خصوصی ضمیمے نکالیں گے، عمارتوں پر قومی پرچم اور جھنڈیاں لہرائی جائیں گی اور بس... لیجیے! ہم نے آزادی کا دن منالیا... کیا یومِ پاکستان کا تقاضا یہی ہے...؟ ارضِ پاک اور اس کے وسائل بیان کرنے بیٹھو تو دفتر کے دفتر درکار ہوں گے۔ مختصر سی بات یہ ہے کہ قدرت نے ظاہری اور پوشیدہ، اُن تمام وسائل سے نوازا ہے جو ہمیں خوشحال ریاست بنا سکتے ہیں مگر ہم نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا نہ شکر ادا کیا اور نہ ہی ان سے فائدہ اٹھایا۔ شاید اسی لیے ہم مایوسی، بدعنوانی، دہشت گردی اور انتشار کا شکار ہیں...

سوچیے... آج ہمیں جن حالات کا سامنا ہے، کیا پاکستان اس لیے بنا تھا؟ احساس ہو جائے تو جشنِ آزادی کے ساتھ یومِ توبہ بھی منائیے کہ رمضان المبارک میں عشرۂ مغفرت بھی ہے اور درِ توبہ تو ویسے بھی ہمیشہ کھلا رہتا ہے... تاہم پورے پاکستان اور بالخصوص ’جاسوسی ڈائجسٹ‘ کے تمام قارئین کو رمضان المبارک اور یومِ آزادی مبارک ہو۔

اس کے ساتھ ہی رُخ کرتے ہیں آپ کی بزم کا اور دیکھتے ہیں کہ کیا کہہ رہے ہیں آپ لوگ گزشتہ شمارے کے بارے میں...

مانسہرہ سے ڈاکٹر نعیم اکبر سحر کی امیدیں ’’چند چکروں کے بعد (چکر لگانے کے بعد) جاسوسی ہاتھوں میں آیا۔ اطمینان سے ایک دن اور ایک رات میں ختم فرمایا کیونکہ ٹانگ میں دو جگہ فریکچر ہونے کے بعد فرصت ہی فرصت ہے، دعاؤں کا محتاج ہوں۔ (اللہ تعالیٰ جلد از جلد صحت یاب کرے) سرورق دلچسپ اور جاسوسی کے معیار پر پورا اترا۔ فہرست کا ڈیزائن اچھا تھا۔ چینی، نکتہ چینی میں مدیرِ اعلیٰ کا فکر انگیز تجزیہ دل کو چھونے والا تھا۔ خطوط میں ایک نیا نام راحی غارس سامنے آیا۔ یوں محسوس ہوا کسی قدیم مصری اہرام سے برآمد ہونے والی ممی کا نام ہے۔ (آپ خوف زدہ تو نہیں ہوئے؟) ویلکم! جگر خراش جیمز ہیڈلے کی تحریر کا ترجمہ اثر نعمانی کے قلم کا اعجاز ہے کہ طبع زاد معلوم ہوتا ہے۔ خیر و شر کی ازل سے جاری جنگ کا ایک انداز جگر خراش ہے۔ چال باز سیر بنارار کی تحریر ایک اچھے دوست اللہ کی نعمت ہوتے ہیں کے مصداق تھی۔ ڈینی ایک اچھا دوست تھا۔ اس نے اپنے دوست کو جرائم کی دلدل سے نکالنے کے لیے ایک بہترین حکمتِ عملی سے کام لیا اور کامیاب ہوا۔ اس کامیابی میں بہترین کردار لیو کی بیٹی کیٹی نے ادا کیا۔ بہرحال اہلِ مغرب کا ایک اچھا پہلو ہے جو مجھے بھایا ہے۔ اسما قادری گرداب کو پھیلا رہی ہیں۔ اس پھیلاؤ سے معاشرے کے بہت سے پوشیدہ پہلو عیاں ہوں گے۔ مگر گزارش ہے کہ یہ پھیلاؤ کہیں الجھاؤ نہ بن جائے۔ شرگزیدہ کو شا منظر نے تحریر کیا۔ کہانی کا جان دار پلاٹ تھا۔ اینڈ حیرت انگیز تھا۔ للکار مغل صاحب کا شاہکار، قابلِ تعریف مگر الفاظ نہیں۔ لگتا ہے جارج گورا سے فائٹ تابش نہیں، ہیرو بھائی عمران کریں گے اور ٹیکنیک کی بنیاد پر فائٹ جیت جائیں گے۔ ہیرو عمران کی زندگی کا ابتدائی پہلو سامنے آیا۔ یوں لگتا ہے کہ تابش اور عمران ہم زاد ہیں۔ مغل صاحب! ہم منتظر ہیں کہ اس ہندوانہ مناظر سے للکار کی جان کب چھوٹتی ہے۔ جادوگر اور اشارہ دونوں بہترین انتخاب تھے۔ بحرِ تلاطم کو منظر امام صاحب نے تحریر کر کے بہت سے انکشافات کیے کہ یہ بحری ڈاکو باندر ہیں اور جس ڈگڈگی پر ناچ رہے ہیں، اس ڈگڈگی کو بجانے والے ہاتھ کوئی اور ہیں۔ اللہ پاک ہمیں دوست دشمن کی تمیز نصیب فرما دے اور حکمت و بصیرت کی دولت سے مالا مال کر دے کہ ہماری آنکھیں بھی ظاہر سے ہٹ کر باطن کو جانچ سکیں۔ پہلا رنگ واقعی اس قابل تھا کہ پہلا رنگ کہلا سکے۔ دوسرا رنگ خاصا پھیکا تھا۔ موضوع بھی پرانا نہیں بوسیدہ ہو چکا تھا۔ جدت کی تھک تھکو یاں لگانے کے باوجود سمی بے لذت، لذت پیدا کرنے میں ناکام رہی۔ چونکہ کاشف زبیر صاحب ہمارے پسندیدہ قلم کاروں میں سے ہیں لہٰذا ’’ہتھ‘‘ ہولا رکھتے ہوئے آئندہ کے لیے بہتر سے بہتر کی امید رکھتے ہیں۔‘‘





مالاکنڈ ایجنسی سے صبا گل کی وضاحت ’’جاسوسی سے 5 تاریخ کو ملاقات ہوئی۔ سرورق بہت پیارا تھا۔ خاص کر لڑکی بہت حسین تھی۔ ماہا ایمان کی طرح۔ اس دفعہ انعامی خط محمد اسماعیل اجاگر کا تھا، مبارک ہو۔ ہمیشہ کی طرح ماہا ایمان باجی کا خط ٹاپ آف دی لسٹ تھا۔ بہت پیارا اور شوخ۔ میرے بڑے بھائی بھی کہتے ہیں کہ سب لڑکوں اور لڑکیوں میں ماہا ایمان ایک اچھی تبصرہ نگار ہیں، ویلڈن۔ ذیشان افتخار صاحب! اللہ آپ کو جیل سے آزاد کرے، آمین۔ انفال مرزا اینڈ صبا مرزا کا خط بھی اچھا تھا۔ سب سے پہلے اسما قادری کی گرداب پڑھی۔ ماہ بانو حسبِ معمول جنگل میں پھنسی ہوئی ہے۔ اسما بی بی! خدارا اسے جلدی وہاں سے نکالیں۔ کشور اور آفتاب پر بڑا رنج ہوا۔ آفتاب نے چودھری کو نواسی کی خوشخبری دے کر اپنے لیے مشکل پیدا کر لی۔ اب معلوم نہیں معصوم امید کس

کے ہاتھوں میں گئی ہے۔ للکار کی بھی عمدہ قسط ہے۔ ہمیں تو اسی قسط میں جارج اور تابش کے مقابلے کا انتظار تھا اور مغل صاحب معلوم نہیں کہانی کو کس موڑ پر لے گئے۔ میرے فیورٹ کردار عمران کی کہانی پڑھ کر افسوس ہوا۔ دوسرا رنگ زبردست تھا۔ شامی اور تیمور کے کارنامے نے مزہ دیا۔ جرائم پیشہ عناصر اپنے انجام تک پہنچ گئے۔ شکر ہے روشا کی مراد برآئی اور ایک ناپسند شخص سے شادی کرنے سے بچ گئی۔ میں ڈائجسٹ وقفے وقفے سے پڑھتی ہوں کیونکہ امی گھر میں اکیلی ہیں اور بھائی کی بھی ابھی تک شادی نہیں ہوئی ہے تو گھر کے کام زیادہ ہوتے ہیں اور باقی مہینے کے لیے بھی کچھ کہانیاں چھوڑ دیتی ہوں۔''

نومی اے مسلم ٹاؤن بہاولپور سے حاضر ہیں'' خلافِ توقع دو جولائی کو دیدارِ جاسوسی ہوگیا۔ حسینہ جاسوسی کسی پاکستانی ایکٹریس سے مشابہ تھی لیکن نام نہیں یاد آرہا۔ خیر ڈوبتے شخص پر نظرِ تاسف ڈالتے ڈائریکٹ محفل میں قدم رنجہ فرمایا جہاں محمد اسماعیل اجاگر اپنے تفصیلی تبصرے کے ساتھ ''اجاگر'' تھے، مبارک ہو جناب۔ سرمد مشتاق، گرداب آج کل کے حالات کی عکاسی کرتی دلچسپ تحریر اور بہ یک وقت اپنے اندر کئی سبق لیے ہوئے ہے اگر کوئی سمجھے تو۔ انفال اینڈ صبا! تبصرے وہ بھی پریوں کے، پھر کول اور پھر پیارے... اف کتنی متضاد باتیں کرتی ہو۔ ماہا ایمان نہ جانے صنفِ چوں چراں (فی میلز) کو اپنے بارے میں غلط فہمی کیوں رہتی ہے اور آپ نے خود فرمایا کہ خدا...... بنائے لیکن خوش فہم نہ بنائے۔ حسنین عباس اپنی صنف کو بے چارہ کہہ کر کیوں بے عزتی کروا رہے ہو۔ نادیہ خان، مائیکل ریچل کے چودہ طبق یو پی ایس سے جڑے ہوں گے۔ پامیلا خان! بات بے بات چٹکیں کیوں مارتی ہو۔ دلنشین بلوچ ابھی آپ کی طبیعت ناساز ہے تو تن من بھگونے سے پرہیز کریں۔ اللہ آپ کو اور نادیہ خان کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے۔ ذیشان اللہ آپ کی مدد فرمائے۔ راحی غارس! یعنی آپ کے ان کا نام بھی افتخار ہے؟ گرداب میں چودھرائن جیسے کو تیسا کے مصداق اپنے کیے کی سزا بھگت رہی ہے اور جلد ہی چودھری کی باری آئے گی۔ دوسری طرف لگتا ہے کہ اسلم اور للی مارے جائیں گے اور ماہ بانو بچ نکلنے میں کامیاب رہے گی۔ للکار میں مغل انکل تابی اور جارج کی لڑائی کو طول دے کر ہمارے صبر کا امتحان لے رہے ہیں۔ خیر، اب تو ہمارے ہیرو بھائی کی داستانِ غم شروع ہوگئی اور لگتا ہے للکار دی اینڈ کے قریب ہے۔ رنگوں میں پہلا رنگ بورنگ تھا جبکہ حسبِ توقع شامی اور تیمور کے کارنامے نے ہمیں خوب مستفید کیا۔ نوشی کی کمی محسوس ہوئی۔ چال باز میں بہت سمجھ داری سے چال چلی ڈینی نے، کیٹی کا کردار پسند آیا۔''

ایم اے ہاشمی بونیر سے لکھتے ہیں'' اس ماہ کا سرورق دیکھ کر بے ساختہ کہہ اٹھا۔ تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات، تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے۔ گول مٹول چہرہ، سرخ و گداز شنگرفی لب، سیاہ دراز گیسو، چشم بددور! چینی، نکتہ چینی کا دروازہ کھول دیا تو بے چارے محمد اسماعیل صاحب پاؤں تلے روندتے روندتے بچے ارے... مبارک ہو، پرلطف تبصرے کے ساتھ۔ انفال اینڈ صبا! خدا کی پناہ۔ اب اپنا ہمایوں اتنا بھی خوفناک نہیں البتہ مشکوک ضرور ہیں۔ اگر موصوف پے در پے نام نہ بدلتے تو نہ مشکوک ہوتے اور نہ ہی خوفناک۔ محسن علی صاحب! حور کبھی دیکھی ہے آپ نے؟ ذیشان صاحب! اللہ آپ کو آرام وسکون دے، آمین اور جیل کی زندگی سے آزادی عطا فرمائے۔ دل چھوٹا نہ کریں اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ ایک تھی بہانی، بھوتوں کی تھی وہ نانی۔ تھی وہ ہماری ماہا ایمانی! محترمہ چلو آپ کو گدھا اتنا عزیز ہے تو ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ پسند اپنی اپنی۔ حسنین بلوچ صاحب! اللہ آپ کو بھی ربانی دے، آمین۔ ویسے آپ اور ذیشان ساتھی ہی ہوں گے۔ نادیہ خان باجی! اپنے گوشہ کی کہانی نے آپ پر خاطر خواہ اثر کیا ہے جبھی تو بیمار پڑ گئیں۔ اللہ آپ کو صحت دے، آمین۔ محی الدین اشفاق صاحب! آمنہ کو بلانے کے لیے آپ کو یہاں صدا لگانے کی ضرورت نہیں۔ آپ نے اس کے گھر جا کر اسے لانا ہوگا کیونکہ ہم بھی اس کو مس کرتے ہیں۔ رانی عائشہ! آپ کا انداز دل کو بھایا یا اندازِ گفتگو، یہ ہم تب بتائیں گے جب آپ ہمیں ملتان کی کوئی اچھی سی سوغات کھلائیں۔ شکیل حسین صاحب! یار صنفِ نازک سے اگر خوش گوار تعلق استوار نہیں کر سکتے تو صرف تعلق تو استوار کر سکتے ہو نا۔ ڈرتے کیوں ہو بھلا؟ سب سے پہلے گرداب کی خیر خیریت لیتے ہیں۔ اسامی! احتجاج... ماہ بانو کا اسلم کے ساتھ شادی کے لیے وہاں سے نکلنا ایک آنکھ نہ بھایا۔ جلد از جلد جنگل میں آپریشن شروع کر کے ماہ بانو کو پولیس کی تحویل میں دے دیں اور شہر یار تک پہنچا دیں۔ ہم بھی جنگل سے اکتا گئے ہیں۔ وڈی چودھرائن پر تو کلیجا ٹھنڈا ہوا۔ دال اور مکئی کی روٹی کھا کے اب راہِ راست پر آجائیں گی محترمہ۔ للکار کافی اچھی جارہی ہے۔ مقابلہ دیکھنے کے لیے آنکھیں ابل آئی ہیں۔ پلیز جلدی کریں مغل صاحب! عمران کا بیک گراؤنڈ پڑھ کر افسوس ہوا۔ میرے خیال میں اثر نعمانی کی تحریریں آپ نے خفیہ ہتھیار کے طور پر سنبھال کر رکھی ہیں۔ کافی عمدہ کہانی تھی جگر خراش۔ سرورق کا پہلا رنگ بھی اچھا تھا مگر دوسرے رنگ کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ مختصر کہانیوں میں دریچۂ عشق عمدہ کہانی تھی۔ یہ قسمت ہی تھی کہ فرانسسکو نے اپنی محبت پالی۔ ورنہ دو محبت کرنے والے شادی کرنے میں کم ہی کامیاب ہوتے ہیں۔ معجزہ کچھ خاص نہ تھی۔ سیرینا راز کی چال باز اچھی تحریر تھی۔ میں تو کیٹی کو قاتلہ ہی سمجھتا رہا مگر وہ تو معصوم نکلی۔ منڈی بہاؤالدین سے سردار شاہین طیب کی کاوش کافی زبردست تھی۔ پنجابی تو پوری طرح میری سمجھ میں نہیں آتی مگر پھر بھی اس کا مفہوم سمجھ گیا۔ باقی چند ایک کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔''



اٹک سے عبدالغفور خان کی تجاویز'' ٹائٹل اچھا تھا۔ اشتہارات کی لسٹ سے چھلانگ لگا کے میں نے کہانیوں کی لسٹ میں سب سے پہلے للکار پڑھی۔ کہانی جیسے جیسے پڑھتا گیا، سحر میں مبتلا کرتی رہی۔ خاص کر تابش کا جارج گورا صاحب کو چیلنج دینا اور وہ برابر حملے کروا کر تابش، عمران کو وحشت زدہ کرنا چاہتا ہے اور ابھی جاوید صاحب سے گزارش ہے، اگلی قسط میں جارج اور تابش کی فائٹ کی قسط لکھیں کیونکہ ان دونوں کی فائٹ کا شدید انتظار ہے۔ عمران قدم قدم پر تابش کے استاد یا وکیل کا رول بہ خوبی ادا کرتا رہا۔ اس کہانی کے اختتام پر گرداب شروع کی۔ ماہ بانو نے اسلم کے ساتھ شادی کا فیصلہ صحیح وقت پر کرلیا۔ اے سی صاحب نے تو شادی کرلی، ماہ بانو کا دل ٹوٹ گیا۔ آفتاب بچی کا باپ بن گیا لیکن جن حالات میں وہ چودھری کے آدمیوں سے بچ نکلا یہ بھی غنیمت ہے کہ وہ اس کے ہاتھ نہیں آیا۔ اس کے بعد بحرِ تلاطم پڑھی۔ یہ کہانی ایک کپتان کی جو کہ ہمت اور حوصلے سے بندوں کو سمندر کی بے رحم موجوں سے



نکال کر لایا۔ سمی بے لذت بس اچھی کہانی تھی۔ شر گزیدہ میں ایک انسان کی اچھائی کو برائی کا احوال لکھا گیا تھا کہ کیسے کیسے لوگ جو کہ ان کو زمین سے آسمان بناتے ہیں اور وہ اپنی گندی صفت بچھو والے ڈنگ سے باز نہیں آتے ہیں، باقی زیرِ مطالعہ ہیں۔''

حافظ آباد سے ماہا ایمان کا تبصرہ'' سرورق انتہائی شان دار اور شاہکار قسم کا تھا۔ تمام اسٹروک پرفیکٹ تھے۔ پانی میں ڈوبتے ہوئے مرد کے تاثرات بہت عمدہ تھے۔ حسینہ بھی حسینہ کہلائے جانے کی حق دار تھی۔ سوٹڈ بوٹڈ بابا جی بھی ہیٹ لگائے دورِ غلامی کی یاد تازہ کرتے ہوئے انگریزوں کو بھی پیچھے چھوڑتے نظر آئے۔ محفل کی صدارت اس بار محمد اسماعیل اجاگر کر رہے ہیں، تبصرہ گو کہ ادھورا تھا لیکن اچھا تھا۔ اجاگر صاحب! لکھائی پر توجہ دی ہوتی تو آج آپ کو یہ شکایت نہ ہوتی۔ محسن علی فرام بالاکوٹ! حوصلہ رکھو ہمارا رخِ روشن ہر کس و ناکس کے دیکھنے کے لیے ہے بھی نہیں۔ حسنین عباس بلوچ! خوش ہو جائیے، اس دفعہ میں نے ہاتھ ہولا رکھا ہے۔ دلنشین ڈیئر میں بہت اچھی ہوں کیونکہ میں اپنی فیورٹ ہوں۔ تمہاری جلد صحت یابی کے لیے دعا گو ہوں۔ ذیشان افتخار! آپ کا بہت شکریہ اور آپ جیسے گوہرِ نایاب کو اس طرح حالات کا شکار ہوتے دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے اور ستم ظریفی یہ ہے اربابِ اختیار یہ جانتے ہوئے بھی کہ جیلوں میں 10 فیصد بے گناہ ہیں، کچھ کرنے سے قاصر ہیں۔ محمد شہزاد! دل تو آپ جاسوسی کو دے بیٹھے اب ''ان'' کو کیا دو گے؟ پیاری صبا گل! بڑا درست اندازہ لگایا ہے تم نے، داد دینی پڑے گی۔ کچھ کچھ ایسا ہی ہے۔ راول پنڈی سے راحی غارس! یار تمہارا نام منفرد سا ہے۔ کیا مطلب ہے اس کا؟ تصویر العین! کہاں ہو تم؟ سلسلے وار تحریروں میں گرداب اپنا رنگ روپ و چاشنی کھو بیٹھی ہے۔ نہایت سلو ٹیمپو، بے رنگ، رومانس سے کوسوں دور بہت ہی سپاٹ تحریر ہوگئی ہے۔ مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ ماہ بانو اسلم سے شادی کا فیصلہ کرے گی لیکن یہ شادی ہوگی نہیں اگر ہوگئی تو میں گرداب کا بائیکاٹ شروع کردوں گی کیونکہ اب میں مزید سمجھوتا نہیں کرسکتی۔ للکار زبردست ٹریک پر آگئی ہے۔ عمو یعنی عمران کا ماضی پڑھ کے میں تابی کو رعایتی نمبرز دینے پر مجبور ہوگئی ہوں کیونکہ عمو بھی شروع میں ڈرا سہما اور حالات کا شکار نظر آرہا ہے تابش کی طرح۔ یقیناً انسان حالات کی بھٹی میں پک کے ہی کندن بنتا ہے۔ گزشتہ سے پیوستہ تحریر جگر خراش میں ویلیس نے خوب انتقام لیا سوزی کا۔ سانڈرا اور ویلیس دونوں نے اپنا اپنا انتقام لیا عمدہ طریقے سے۔ انجیلا پاگل خانے جانے کے ہی قابل تھی۔ سرورق کے رنگوں میں پہلا رنگ بحرِ تلاطم از منظر امام، بحری قزاقوں سے رہا کرائے گئے کیپٹن وصی اور ان کی بیٹی لیلیٰ وصی سے انسپائرڈ لگ رہا تھا۔ (یہ کہانی تین ماہ قبل لکھی گئی تھی۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ مصنف نے جیسا لکھا، تقریباً ویسا ہی ہوا) دوسرا رنگ کاشف زبیر کی جانے پہچانے کرداروں پر مشتمل سمی بے لذت تھی۔ شامی اور تیمور ہمیشہ پرائے پھڈے میں ملوث ہو جاتے ہیں۔ روشا بے چاری کو کچھ بھی حاصل وصول نہ ہوا۔ مختصر تحریروں میں سب سے پہلے محمد عفان آزاد کی آدم خور پڑھی۔ ٹریوی کو ہاتھ پیر ہلائے بغیر بہادری کا خطاب مل گیا۔ میں انتظار ہی کرتی رہی کہ اب ٹریوی کے ساتھ کچھ ہوگا، اب ہوگا لیکن موصوف کچھ کیے بغیر ہی مشہور ہوگئے۔ ثنا منظر کی شر گزیدہ میں فیاض بے چارے کے ساتھ الٹی نیکی گلے پڑ گئی والا معاملہ ہوگیا۔ مختار آزاد کی دریچۂ عشق میں کیا خوب انعام ملا احمق فرانسسکو کو۔ جس محبوبہ کو وہ مری ہوئی سمجھ رہا تھا، وہ اچانک زندہ ہو کے اس کے جذبۂ عشق سے متاثر ہو کے انعام میں مل گئی۔ اس کے علاوہ جادوگر تو ہم پرستی اور مافوق الفطرت واقعات کے گرد گھومتی ایک سحر انگیز تحریر تھی۔''

سرگودھا سے طارق سلطان کی دھمکی'' اس ماہ کا شمارہ تین جولائی کی حبس زدہ شام کو ملا۔ ٹائٹل بہت پسند آیا۔ خوب صورت حسینہ کو دیکھ کر ایسا لگا کہ پاکستان پیارے میں ابھی خارش کی وبا ختم نہیں ہوئی۔ پیچھے والے صاحب ماتھے پر سلوٹیں ڈالے ہمیں خشمگیں نظروں سے گھور رہے تھے۔ اس کے بعد کود پڑے چینی، نکتہ چینی میں۔ کرسیِ صدارت پر لفظوں کے چٹخارے کے ساتھ اسماعیل اجاگر صاحب دھنسے ہوئے تھے، سو مبارک باد وصول فرمائیے۔ باقی سب دوستوں، بڑوں اور چھوٹوں کے تبصرے شان دار تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے للکار پڑھی۔ قسط گریٹ فل تھی لیکن مغل صاحب نے سامبر کا اور انتظار کروایا لیکن عمران کے ماضی میں گم کرنا بھی دل کو مسرور کر گیا۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ گرداب وہی پرانے رنگ ڈھنگ میں ڈوبی ہوئی نظر آئی۔ چال باز نہایت عمدہ تحریر تھی۔ آدم خور میں یہ سبق تھا کہ بدتر سے بدتر حالات میں بھی ہمیں اپنی سوچ کو مثبت رکھنا چاہیے اور انسانی زندگیوں سے کھیلنے کے بجائے برائیوں کے خلاف جہاد کرنا ہے۔ سرورق کے رنگ جو اپنے اندر ساتوں رنگ چھپائے ہوئے تھے، بے حد پسند آئے۔ آخر میں اس تاکید کے ساتھ اجازت چاہوں گا کہ اس ماہ ضرور خط شائع کیجیے گا نہیں تو ہم دل پر جبر کر کے جاسوسی سے اپنا ناتا توڑ دیں گے۔'' (خدارا ایسا مت کیجیے گا۔ ہم ڈر گئے)

علی آتش کی نرم خوئی ضلع قصور سے'' اس ماہ کا پیارا ہماری آتش کو کنٹرول میں رکھنے والا جاسوسی 6 جولائی کو بک اسٹال کے دوسرے چکر میں ملا۔ ویسے تو ہم خود پبلک لائبریری اونر ہیں لیکن رسالہ ہم بک اسٹال سے ہی خریدتے ہیں، مزہ آتا ہے نا۔ (یہ تو بڑی اچھی بات کہی آپ نے...) سب سے پہلے خود بخود دیدار سرورق کا ہو جاتا ہے۔ اب جاسوسی کا سرورق دیکھ کر دوبارہ سے لگنے لگا ہے کہ یہ واقعی جاسوسی کا سرورق ہے۔ سرورق میں تو کچھ اور اچھا لگا یا نہیں لیکن حسینہ کی انگلیوں اور انگوٹھے کے ناخن کی لمبائی اچھی نہیں لگی کیونکہ یہ محفل کے منچلے دوست جو تبصرہ کرتے ہیں کہیں انہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ مجموعی طور پر سرورق بہترین تھا۔ اس کے بعد چینی، نکتہ چینی کی محفل رنگ و نور میں پہنچے۔ اس دفعہ وننگ اسٹینڈ پر محمد اسماعیل اجاگر صاحب تشریف فرما تھے، مبارک باد۔ مرزا اسٹرز کا تبصرہ اچھا تھا۔ محسن علی موم صاحب! آپ کو چہرۂ انور کے مطلب کا بھی پتا ہے یا صرف ماہا ایمان کو خوش کرنے کے لیے محاورہ بول دیا ہے۔ ویسے آپ اتنی جلدی ہماری آتش بازی کے قائل ہو گئے اور جاسوسی میں تبصرہ لکھتے ہوئے تو ہم برف کے کارخانے میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ اس دفعہ بھی تبصرے تو سارے ہی شان دار، جان دار تھے۔ ہم نے اپنے پرانے جاسوسی کی محفل کی چیکنگ کے لیے جنوری 1997ء کا ایک شمارہ پکڑا تو اس کے ونر راشد صاحب نے جاسوسی کے دو صفحات تک طویل تبصرہ لکھا تھا۔ ہم حیران رہ گئے۔ آج کل ہاف صفحے سے زیادہ تبصرہ کم ہی پڑھنے کو ملتا ہے۔ (وقت کے ساتھ تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں) اس کے بعد اسٹوریز کی طرف

بڑھے تو سب سے پہلے للکار پڑھنی شروع کی۔ اس دفعہ ہماری شروع سے جو خواہش تھی وہ پوری ہونے لگی ہے کہ عمران بھائی کا ماضی جاننے کا موقع مل رہا ہے۔ ویسے تو تابش کی فائٹ کی بے چینی بڑھتی رہے گی لیکن ہیرو بھائی کی اسٹوری پڑھنے میں بھی مزہ آئے گا۔ مغل صاحب از دی گریٹ رائٹر فار ایکشن اینڈ جاسوسی اسٹوریز۔ اس کے بعد اپنے مرحوم رائٹر کے قلم کے جادو کا دوسرا حصہ پڑھا۔ ویلیس نے دوبارہ اپنی ڈیوٹی جوائن کرلی، یہ اچھا لگا۔ اثر نعمانی صاحب کے تمام تراجم کی طرح یہ ترجمہ شدہ اسٹوری بھی بہترین تھی۔ اس کے بعد سرورق کے رنگ کاشف زبیر کے سنگ شامی اور تیمور کی جنگ پڑھی۔ جس کا ہمیں تو یہی نتیجہ معلوم ہوا کہ پیار اندھا ہوتا ہے۔ بحر تلاطم منظر امام صاحب کی بحری قزاقی پر ایک بہترین اسٹوری رہی۔ ہمیں اسٹوری پڑھ کر خیال آیا کہ واقعی بحری قزاقی اکیلے قزاق نہیں کر سکتے، بعض ممالک کی حکومتیں ان کی سرپرستی ضرور کرتی ہیں تو ایسا ہوتا ہے۔ چھوٹی اسٹوریز میں جمال دستی کی جادوگر تو ہم پرتی پر اچھی تحریر تھی لیکن جیسا کرو گے ویسا بھرو گے کا درس دے رہی تھی۔ ثنا منظر شر گزیدہ لے کر آئیں۔ آدم خور میں انسانی نفسیات کا پتا چلا۔ اس دفعہ مکمل جاسوسی شان دار رہا۔''

چکوال سے ایم عزیر اسد کی باتیں ''بھیگے ہوئے موسم میں بھیگا ہوا ساتھی بالکل ساتھ ہو تو مزہ آجاتا ہے لیکن گھر پہنچنے تک دوست صاحب خوشی سے کچھ زیادہ ہی پھول گئے اور ان کی ورق گردانی کافی مشکل ہوگئی۔ ٹائٹل اچھا تھا۔ دوستوں میں پہنچے تبصرے پسند آئے۔ محسن علی لگتا ہے آپ کوئل سے ہیں۔ راحی غارس جی شکر ہے آپ کو کچھ تو نظر آیا۔ اب بات ہو جائے کہانیوں کی۔ جگر خراش میں مافیا سے پنگا لینے کے باوجود مضبوط حکمتِ عملی کی وجہ سے دونوں دوست محفوظ رہے اور سانڈرا نے بھی باپ کا بدلہ لے لیا۔ سسی بے لذت میں کافی عرصے بعد پرانے کردار نظر آئے، زبردست تحریر تھی۔ بات کی جائے گرداب کے بارے میں تو کہوں گا کہ اسا جی نے اس دفعہ کمال کر دیا، امید ہے کافی دوستوں کو پسند آئی ہوگی۔ بحر تلاطم میں باپ بیٹی کی محبت نے متاثر کیا۔ للکار میں... انکل معراج اور طاہر انکل کی ملی بھگت لگتی ہے کہ ہم جیسے بے چاروں کو ترسانے کے لیے چند سطریں شائع کر کے ایک مہینا انتظار کی سولی پر لٹکا دیتے ہیں۔ (مبالغہ آرائی تو نہ کریں... ہر ماہ 40 صفحات کو آپ چند سطریں کہہ رہے ہیں... یہ زیادتی ہے) بچپن سے قربانیاں دینے والا عمو قدرت نے اگر تابش کی قسمت میں لکھ دیا ہے تو یہ تابی کے لیے بہت بڑا انعام ہے۔ سامبر کی لڑائی کا شدت سے انتظار ہے۔ شمارہ اس دفعہ میرے لیے ہیرو نمبر تھا۔'' (کیوں؟)

سمیر الغاری عرف سومی کی تعریفیں تحفہ سے ''اس ماہ کا جاسوسی 6 جولائی کو ملا۔ سب سے پہلے ٹائٹل پر نظر پڑی تو ایک خوب صورت سی لڑکی کو دیکھتے ہوئے ذہن میں یہ خیال آیا۔ تیرے مست مست دو نین، میرے دل کا لے گئے چین۔ بہت ہی خوب صورت آنکھیں ہیں حسینہ کی۔ صبا گل جی! اب تو آپ خوش ہیں کیونکہ آپ نے دھمکی دی اور آپ کا خط شامل ہو گیا۔ پامیلا خان جی، یہ یا اتنی خوشی کہ آپ نے اپنا خط چینی، نکتہ چینی میں دیکھتے ہی چیخ ماردی۔ آپ کے گھر والوں نے آپ سے پوچھا نہیں کہ کیا ہوا تھا۔ مجھے سب سے اچھا تبصرہ علی آتش کا لگتا ہے اور باقی لوگوں کے بھی تبصرے اچھے لگتے ہیں۔ للکار اچھی جا رہی ہے اس کے بارے میں کچھ بھی کہیں وہ لفظ اس کہانی کے لیے کم پڑ جائیں گے۔ جگر خراش میں مجھے سب سے اچھا رول اینڈرسن کا لگا کیونکہ آج کے زمانے میں بھی اتنے اچھے دوست ہوتے ہیں۔ سرورق کا پہلا رنگ کچھ خاص نہیں تھا۔ مگر سرورق کا دوسرا رنگ تو خوب تھا۔ میری تو ہنسی ہی نکل گئی، تیمور، شامی اور روشنا کی بے وقوفیاں دیکھ کر۔ باقی چھوٹی کہانیاں بھی اچھی تھیں مگر شر گزیدہ پڑھ کر مجھے بہت افسوس ہوا کہ فیاض نے انعم والوں پر اتنا احسان کیا اور وہ اسے ہی دھوکا دے گئے۔ اس ماہ کا جاسوسی مجھے بہت پسند آیا۔''

ڈیرہ اسماعیل خان سے سید عبادت کاظمی کی عجلت ''جاسوسی حسبِ معمول 4 جولائی کو ملا۔ سرورق پر پہلی نظر پڑتے ہی دل سے بلا تامل واہ کی سرگم نکلی۔ (کیسے؟ ہمیں تو سنائی نہیں دی) اشتہاروں کو پھلانگتے ہوئے تبصروں کی محفل میں داخل ہوئے جہاں محمد اسماعیل اجاگر صاحب کرسیٔ صدارت پر براجمان تھے۔ اسماعیل صاحب ہماری طرف سے مبارکاں۔ عائشہ رانی، ماہا ایمان، حسنین بلوچ اور دلنشین بلوچ کے تبصرے جان دار تھے۔ تفسیر عباس اور آمنہ پٹھانی کہاں غائب ہیں؟ کہانیوں میں سب سے پہلے گرداب پڑھی جو کہ خطرناک سچویشن اختیار کر چکی ہے۔ تھینکس ٹو کاشف زبیر کہ آپ نے ہماری فرمائش پوری کی۔ جگر خراش بہترین تھی۔ للکار، طاہر جاوید مغل بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ منظر امام نے بھی اچھا لکھا۔ چھوٹی کہانیوں میں بابر نعیم کی چھلانگ اچھی کہانی تھی، باقی تبصرہ آئندہ ماہ پر...''

اوکاڑہ سے تفسیر عباس کی جادوگری ''جاسوسی 2 جولائی کو دستیاب ہوا۔ انتہائی دلکش اور جاذبِ نظر سرورق نے بہت متاثر کیا۔ دوشیزہ سرورق ترچھی نگاہوں سے نہ جانے کہاں قیامت ڈھا رہی ہیں... ساتھ ہی ایک صاحب کو آہنی زنجیروں میں جکڑ کر سپرد آب کر دیا گیا۔ اوپر کونے میں مونچھوں والی سرکار... یقیناً کوئی پسندیدہ منظر دیکھنے میں مگن ہے۔ پتا نہیں کیوں ذاکر صاحب کو اپنی ہی صنف سے اللہ واسطے کا بیر ہے چلو... خیر ہے... چینی، نکتہ چینی میں ایک دو امریکن سنڈیوں کی آمد نے پرامن ماحول کو کافی سے زیادہ متاثر کر کے رکھ دیا ہے۔ پنڈی گھیب سے محمد اسماعیل اجاگر... ماشاء اللہ کافی اجاگر ہو رہے ہیں تبصرہ اچھا تھا، پرچینی نہیں تھی۔ آپ نے بھیجی ہی نہیں یا پھر شاید سنسر والوں نے کھالی... جوہر آباد سے اعجاز احمد کا اظہارِ یکجہتی... دلائل اثر انگیز ہیں بشرطیکہ ہماری منتشر د متعصب قوم... ایک پرچم کے سائے تلے اپنے ایک ہونے کا عہد بھی کرے پر دیوانے کا خواب کب شرمندۂ تعبیر ہوتا ہے۔ سرگودھا سے ذیشان افتخار! ہماری دعا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر آپ کو صعوبت قید و بند سے جلد از جلد رہائی نصیب کرے۔ (آمین) حافظ آباد سے ماہا ایمان کی شوخیاں... تو گویا یہ درست ہے کہ بڑھاپے میں عادتیں بچوں جیسی ہو جاتی ہیں۔ سرگودھا سے حسنین عباس بلوچ! پاکستان میں صرف نظام محکمۂ ڈاک ہی نہیں... ہر محکمہ قابلِ افسوس ہے۔ مالاکنڈ سے صبا گل، ماہا سے متعلق بلکہ ان کی عمر طویل سے متعلق اگر آپ نے یہ تجزیہ پچیس تیس سال قبل کیا ہوتا تو سو سے کچھ زائد فیصد درست ہوتا۔ اب تو ان محترمہ کا یہ حال ہے کہ بے چاری کچھ کھانے یا مسکرانے کی ناکام کوشش کرتی ہیں تو ان کی مصنوعی بتیسی گر جاتی ہے۔ بتیسی اٹھانے کی کوشش لاحاصل



میں ذرا جھکتی ہیں تو ان کا 6 چھ نمبر کا قدیم چشمہ گر جاتا ہے اور جب جھک کر چشمہ اٹھانے لگتی ہیں تو خود گر جاتی ہیں... اللہ انہیں اللہ کی توفیق عطا فرمائے۔ راولپنڈی سے راحی غارس! آپ نے ہمارے ٹوٹے پھوٹے لفظوں کو عزت دی اس کے لیے از حد نوازش۔ ویسے ہمیں آپ کے منفرد نام نے کافی متوجہ اور متاثر کیا۔ بنوں سے پامیلا خان! آپ آج کل بہت چیخیں نکال رہی ہیں، دماغی امراض کے ماہرین سے رابطہ کیجیے۔ ملتان سے عائشہ رانی! یہی بات ہم مدتوں سے کہہ رہے ہیں، آج آپ نے خود ہی تسلیم کر لیا کہ آپ ناقص العقل ہیں اور ٹیکسلا سے دلنشین بلوچ! آپ سے بھی اپنے نااہل ہونے کا اعتراف کرا لیا۔ اچھا کیا، عقل دکان سے تو نہیں ملتی نا کہ خرید لی جائے۔ سچ بولنا اچھی بات ہے۔ علی آتش فرام چونیاں! آپ کا خوب صورت نام... نہایت عظیم شخصیت حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منسوب ہے اس کے ساتھ آتش؟ وضاحت ضرور کیجیے گا... سید شکیل کاظمی! محبتوں کے اظہار کے لیے شکریہ بہت چھوٹا لفظ ہے اور قوم یاجوج ماجوج سے خوش گوار تعلق ہو بھی کیسے سکتا ہے... کہانیوں میں اندھے انتقام کی اندھی کارروائی... جگر خراش... اثر نعمانی کا بہترین تلخیص و ترجمہ نہایت سنسنی خیز اور عمدہ کہانی ثابت ہوئی۔ کہانیوں کے مغلِ اعظم بہترین مصنف کی لازوال و شاہکار تحریر للکار، دلچسپ موڑ پر ہے۔ عمران کی سرگزشت سے جارج گورا اور تابی کی سامبر کی لڑائی کا سنسنی خیز مقابلہ گویا کچھ ماہ موخر سمجھیں۔ عمران کی کہانی بھی بہت دلچسپ ہے اور ابھی تو آغاز ہے۔ اسما قادری کی گرداب، قدرے بہتر ہو رہی ہے۔ فضول مکالموں سے اجتناب لازم ہے۔ شہر یار ٹھیک جا رہا ہے لیکن ماریا مشکوک کردار ہے۔ ماہ بانو اور اسلم کی مشروط محبت اور فرار کہانی کے لیے دلچسپ موڑ ہے۔ منظر امام کا پہلا رنگ بحرِ تلاطم سمندر کے سینے پر کھیلا گیا سنسنی خیز ڈراما۔ زندگی تقدیر کے ساتھ سازش کر کے کیا کیا ستم ڈھاتی ہے۔ ہمایوں کا کردار جان دار تھا۔ لزی کے انجام نے کافی افسردہ کیا۔ مختار آزاد کی محبت کے حسین و لطیف جذبے میں گندھی تحریر دریچۂ عشق... محبت کی فسوں خیزیوں کا دلچسپ فسانہ تھا۔ بابر نعیم کی چھلانگ بھی خوب رہی گویا یہ سارا کھٹ راگ ناکس کی ناقص کارکردگی کا شاخسانہ تھا۔ معجزہ بھی ٹھیک تھی لیکن معجزے اب کہاں ہوتے ہیں۔ محمد عفان آزاد کی پُراثر تحریر آدم خور۔ منفی سوچ اور منفی راستے کا تعین۔ بیمار ذہن سے یہی توقع کی جاسکتی ہے۔ ثنا منظر کی شر گزیدہ بھی خوب رہی۔ جمال دستی کی تحیر آفریں تحریر جادوگر کے کیا کہنے... اشارہ اور پیش بندی بھی اچھی کہانیاں تھیں۔''

بنوں سے ہمایوں سعید راج کی اٹکھیلیاں ''خوب صورت بالوں اور چاند سے مکھڑے والی حسینہ بہت اپنی اپنی سی لگی۔ کاش وہ محی الدین اشفاق کے بجائے مجھے دیکھ رہی ہوتی۔ (آپ کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی) انکل جی حسبِ سابق فکرمند تھے مگر اس باران کے وسوسوں اور اندیشوں کا مرکز حکومتی بے حسی نہیں بلکہ قدرتی آفات تھے۔ محمد اسماعیل اجاگر اپنی اہمیت اجاگر کرنے میں کامیاب رہے۔ کہانیوں پر بہت دلکش تبصرہ کیا۔ جناب نے انفال اینڈ صبا، ابن آدم کو خوفناک مخلوق کہہ کر آپ نے اشرف المخلوقات کی انسلٹ کی ہے۔ حالانکہ بنتِ آدم کی زندگی ابن آدم سے شروع ہو کر ابنِ آدم پہ ہی ختم ہو جاتی ہے۔ ذیشان صاحب کے حالات جان کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ آپ پر رحم کرے۔ صبا گل! آپ نے کیا شان دار اندازہ لگایا ہے۔ واقعی ماہا جی کی عمر سنچری سے بیس یا پچیس سال ہی کم ہے۔ پامیلا خان! ویلکم اور یہ بات بات پر چیخنا صنفِ نازک کو زیب نہیں دیتا۔ عائشہ جی! ہاشمی صاحب کا منہ مت کھلوایئے ورنہ کہہ دیں گے کہ ہمیں تو آپ بھا گئی ہیں۔ علی بھائی آپ چونکہ آتش ہیں اسی لیے وگ کے بغیر بھی کام چلا لیتے ہیں۔ کاظمی صاحب! پھر تو آپ کی زندگی بہت بے رنگ ہو گی کیونکہ صنفِ نازک کے بنا زندگی ایسی ہی ہے جیسے پر بن تتلی، جل بن مچھلی۔ راحی جی نے دو کلو چینی ڈال کے جاسوسی کے چینی دان کی چاشنی میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔ نادیہ جی اپنی پسند اپ ڈیٹ کریں۔ بقول ماہا سرخ لپ اسٹک آؤٹ آف فیشن ہے۔ حسنین بھائی! بے چارے: دل گئے آپ، ہم اینٹ کا جواب پھول سے دینا خوب جانتے ہیں۔ سرمد صاحب! دل بڑا رکھو یار، کیا پتا کبھی موڈ میں آ کر انکل آپ سے بھی کوئی خوش گوار مذاق کر لیں۔ جارج اور تابش کے مرو یا مارو چیلنج نے اتنا بے چین کر رکھا تھا کہ سب سے پہلے للکار ہی سے شروعات کی۔ لگتا ہے انکل طاہر ہماری بے چینی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں جب ہی تو سامبر کا لائیو میچ ٹالتے جا رہے ہیں۔ (انتظار... انتظار اور انتظار... لذت بھی... اذیت بھی...) حادثات کی شکار ماہ بانو نے اسلم سے شادی کی بات کر کے ہمیں حیرت کے سمندر میں ڈبو دیا۔ (کیوں... کیا آپ بھی کھڑے تھے لائن میں؟) شاید لاحاصل چاہتیں ایسے ہی فیصلے کرواتی ہیں۔ وڈی چودھرائن کی حالت دیکھ کر دل کو ایک کمینی سی خوشی ملی۔ (آپ سے ایسی ہی امید تھی)۔ منظر امام نے بحرِ تلاطم کی صورت ہمیں ایک ناقابلِ فراموش تحفہ دیا۔ (سنبھالنا ضروری ہے) سمندری کہانیاں مجھے بے حد اچھی لگتی ہیں۔ سائرہ کے جذبے نے بے حد متاثر کیا۔ ابراہیم کی موت نے ثابت کر دیا کہ بھیڑیوں کے بیچ صرف بھیڑیا ہی زندہ رہ سکتا ہے۔ اس کہانی نے یہ سکھایا کہ انسان کو کسی حال میں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ وہ ذات اگر انسان کو مشکلات میں ڈالتی ہے تو اس سے نکلنے کا حوصلہ بھی دیتی ہے۔ کاشف زبیر نے طویل انتظار کے بعد شامی اور تیمور سمیت حاضری دی۔ سمجھ نہیں آتا کہ ہر دفعہ ایک نئی لڑکی سنسنی خیز کہانی سمیت کیسے شامی سے ٹکرا جاتی ہے۔ کبھی تیمور کو بھی تو موقع دیں۔ ویسے اس دفعہ نہ تو نوشی اور شامی کی چھیڑ چھاڑ دیکھنے کو ملی اور نہ ہی دادا جان کے ہاتھوں گوشمالی۔ پھر بھی یہ رنگ ہر لحاظ سے دلچسپ ثابت ہوا۔ جمال دستی کی جادوگر بے حد سنسنی خیز لگی۔ دونوں جادوگروں کی جادوگری سے زیادہ گاؤں والوں کے اتحاد و اتفاق نے متاثر کیا۔ مختصر سی پیش بندی بہت پُراثر ثابت ہوئی۔ واقعی ممکنہ خطرات کے بروقت سدِباب میں ہی دانش مندی ہے۔ محمد عفان آزاد کی آدم خور مختصر کہانیوں میں سب سے شان دار رہی۔ اشارہ اور معجزہ نے بھی جاسوسی کو چار چاند لگا دیے۔'' (اور آپ کے بھرپور تبصرے نے چودھویں کے چاند کی کمی پوری کردی)۔



اٹک سے محمد اسماعیل اجاگر کی پسند ناپسند ''سرورق اچھا تو تھا مگر کلرز جاذبِ نظر نہیں تھے۔ ویسے شاہد حسین سے بھی جاسوسی کا سرورق بنوائیں تو اچھا بنائیں گے۔ (یہ بات آپ سے کس نے کہی... شاہد نے) کیونکہ کہانیوں کے ساتھ تو تصویریں اچھی بناتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ سرورق نئے انداز کا ہو۔ کوئی نیا پچ، کوئی انفرادیت۔ مسندِ صدارت پر اپنا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ کی ڈھیروں نوازش ورنہ ہم اس قابل تو نہ تھے۔ انکل اگر گلاب جامن آپ کو پسند ہیں تو ہم بھجوا دیں؟ (کمال ہے اب بھی گنجائش ہے پوچھنے کی) انفال مرزا اینڈ صبا مرزا ہماری رائٹنگ کی بھی لوگ بہت تعریف کرتے ہیں۔ بہت ہائی کلاس تو نہیں پر ٹاپ ٹیسٹ رائٹنگ

میں ہمارا شمار ہو سکتا ہے۔ پر آپ کو کیسے دکھائیں؟ یکم جولائی کو ہم سرگودھا میں گئے۔ واپسی پر یاد آیا کہ حسنین عباس بلوچ سرگودھا جیل میں ہیں۔ ان کا خط دیکھ کر یاد آیا کہ گئے جو تھے تو ان سے ملاقات کر لیتے۔ بلوچ صاحب معذرت۔ اگلی دفعہ جب بھی چکر لگا تو آپ سے ضرور ملاقات ہوگی۔ اجازت ہے نا۔ جگر خراش تو ہمیں پسند نہیں آئی کیونکہ قسط وار تھی۔ سب سے پہلے پہنچے منظر امام صاحب کے پاس۔ بحرِ تلاطم ایک خوب صورت رنگ۔ دوسرا رنگ بھی ہنگامہ خیز رہا۔ اب سرورق کے رنگوں کا معیار بہتر ہوتا جا رہا ہے۔ جادوگر بھی کافی دلچسپ رہی۔ تھورفل اور اس کی بیوی نے قصبے والوں کو خوب بے وقوف بنایا، پر جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ اشارہ میں بلی نے بروقت دماغ کا استعمال کیا اور فائدے میں رہا۔ البتہ یہ بات حیران کن تھی کہ بلی پیزا شاپ کے مالک کا بیٹا ہے۔ پیش بندی مختصر مگر اچھی کہانی تھی۔ معجزہ اچھی نہیں لگی۔ چھلانگ بھی بور کرنے والی کہانی تھی اور چال باز بھی خاص نہیں رہی۔ دریچۂ عشق وفاداری اور عشق کا صلہ خوب ملا فرانسسکو کو۔ ہمیں بھی کوئی ایسی وفاشناس نازنین مل جائے تو زندگی کے رنگ گہرے ہو جائیں۔ (انشاء اللہ) آدم خور میں ٹریوی نے بہت ہمت کی۔ کاش ہم میں بھی ایسی ہمت پیدا ہو جائے۔ (جزاک اللہ) باقی قسط وار کہانیاں تو ہمیں سرے سے پسند ہی نہیں۔'' (فی امان اللہ)

بدین سے نوید ساجد زیڈ کی درجہ بندی'' اس ماہ کا شمارہ فرسٹ کو ہی مل گیا۔ خوب صورت رنگوں سے مزین ٹائٹل بے حد بہترین تھا۔ سب سے پہلے للکار پڑھی۔ کہانی میں خطرناک موڑ آ چکا ہے۔ سسپنس بڑھ چکا ہے۔ اگلی قسط کا بڑی بے تابی سے انتظار ہے۔ للکار کے بعد گرداب پڑھی۔ گرداب پرست روی کی چھائی گرد دُھل چکی ہے۔ دریچۂ عشق میں مختار صاحب نے اچھا سسپنس پیدا کیا۔ زبردست اسٹوری تھی۔ آخر تک الجھی رہی جب سلجھی تو نقشہ ہی بدل گیا۔ چھلانگ میں میک کی عقلمندی قابلِ تعریف ہے۔ مغرب زدہ کہانیوں کی خصوصیت یہی ہے کہ پیچیدہ سے پیچیدہ کیسز بڑے زبردست طریقے سے حل ہوتے ہیں۔ چالباز میں ڈینی سے زیادہ سیرینا صاحبہ چالباز نکلیں۔ اپنے قلم کی طاقت سے انہوں نے ڈینی کے ذریعے لیو کو جرم کی دلدل سے نکالا۔ ونڈرفل، لکھنے کا حق ادا کر دیا۔ معجزہ از تنویر ریاض کہانی کچھ خاص نہ تھی۔ پرانے قصے کہانیوں کو نئے انداز میں پیش کرنے کی ناکام کوشش کی گئی۔ آدم خور سیدھی سادی کہانی تھی۔ کوئی بل، کوئی الجھن، کوئی پیچیدگی نہ تھی۔ ہر کام توقع کے مطابق تھا۔ شرگزیدہ میں ثنا منظر صاحبہ نے بہترین طریقے سے معاشرتی ناسور کو اجاگر کیا۔ بقول شاعر

یہ کہہ کر بند کر دیا سانپوں کو سپیروں نے
کہ انسان ہی کافی ہے انسان کو ڈسنے کے لیے

جادوگر میں مہذب معاشرے کی درندگی سے پردہ اٹھا۔ توہم پرستی، بدعقیدگی صرف پاکستانیوں یا ایشیائیوں میں نہیں بلکہ پڑھے لکھے مغربی بھی اس کا شکار ہیں۔ پیش بندی میں پولیس کے عمومی کردار کو واضح کیا گیا۔ پولیس چاہے کہیں کی بھی ہو، ایسے لوز کریکٹرز ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ (خوب اور درست اندازہ کیا آپ نے) آخری صفحات پر بکھرے رنگ خاص نہیں تھے۔ بحرِ تلاطم کا پلس پوائنٹ صرف یہ تھا کہ پاکستانی ہر موڑ پر اپنے مصیبت زدہ بھائیوں کی مدد کرنے کے لیے آگے آتے ہیں۔ یہ باتیں صرف کہانیوں تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کا عملی مظاہرہ پوری دنیا دیکھ چکی ہے۔ اس بات کو بحرِ تلاطم میں واضح کیا گیا ہے۔ سب سے آخر میں چینی، نکتہ چینی کی محفل میں جا پہنچے۔ تمام تبصرے، شوخیاں اور فقرے بازیاں اس محفل کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ ذیشان افتخار عرف شانی ہم دعا گو ہیں کہ خدا آپ کی مشکلات ختم کرے۔ آپ کے لیے آسانیاں پیدا فرمائے، آمین۔ ماہا ایمان شاید کسی این جی او سے وابستہ ہیں جو صنفِ کرخت کے خلاف کام کر رہی ہے۔ آغا فرید، ایم اے ہاشمی، رانا ادیب الرحمن ہوشیار ہو جاؤ۔ ویسے ماہا صاحبہ! آپ تبصرہ تو اچھا لکھتی ہیں لیکن... (لیکن کیا... ادھوری بات غلط بات ہے) انفال مرزا اینڈ صبا مرزا، زبردست تبصرہ لکھا۔ سید شکیل حسین کاظمی، نادیہ خان وسیر، علی آتش، حسنین عباس بلوچ اور محمد کبیر کی باتیں پسند آئیں۔''

محمد اقبال بھٹی گاؤں ستو کی قصور سے لکھتے ہیں'' اس دفعہ کا ٹائٹل دیدہ زیب تھا۔ سب سے پہلے کہانیوں کی طرف آئے اور للکار پڑھی۔ کیا کہنے... جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ طاہر جاوید مغل کے قلم میں جادو ہے جو پڑھنے والے کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔ دوسری سلسلہ وار کہانی گرداب پڑھی، وہ بھی ٹھیک رہی۔ بس کہانی کا ٹیمپو سلو ہو گیا ہے۔ مختصر کہانیوں میں آدم خور بہترین تھی۔ سرورق کا رنگ بحرِ تلاطم بہت اچھا رہا۔ باقی رسالہ بھی بہترین تھا۔ ہماری طرف سے جاسوسی کی ٹیم کو ڈھیروں مبارک باد و دعائیں۔''



بنوں سے پامیلا خان کی باتیں'' جولائی کا شمارہ ہاتھ میں آتے ہی انتہائی ناخوشگوار موسم میرے لیے خوشگوار موسم میں تبدیل ہو گیا۔ پھر نہ گرمی کی پروا رہی اور نہ ہی بجلی کی جو کہ حسبِ معمول غائب تھی۔ ٹائٹل پر موجود حسینہ خاصی خوب صورت تھی لیکن ہم اس کی مزید تعریف نہیں کریں گے کیونکہ یہ کام ہم نے صنفِ مخالف پر چھوڑا ہے مگر حسینہ کے سائڈ میں موجود زنجیروں میں بندھا ہوا وہ بے چارہ سا آدمی جو کہ پتا نہیں کہاں سے گزر رہا تھا، وہ مجھے علی آتش لگ رہے تھے۔ ٹائٹل کو چھوڑ کر ہم اپنی پیاری سی محفل میں پہنچے۔ محمد اسماعیل اجاگر کو بڑی وضاحت سے کرسیِ صدارت پر براجمان پایا، میری طرف سے مبارک باد قبول کر لیں۔ سرمد مشتاق! آپ کا خط مجھے بے حد پسند آیا۔ ذیشان افتخار عرف شانی! آپ کو ہماری اس محفل میں بہت بہت خوش آمدید۔ لیکن آپ کے جیل کا سن کر بہت افسوس ہوا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کو جاسوسی جیسی اچھی تفریح جیل میں مہیا ہوتی ہے۔ ماہا ایمان جی! آپ کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح لاجواب تھا۔ آپ بہت زبردست لکھتی ہیں۔ دلنشین جی! آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں پیاری ہوں۔ دلنشین جی، میں نے آپ کے لیے بہت دعائیں کی ہیں کہ اللہ آپ کو جلد صحت یاب کرے۔ اس کے بعد کہانیوں کی طرف آئے اور سب سے پہلی چھلانگ للکار کی طرف لگائی۔ للکار اس دفعہ انتہائی زبردست تھی۔ اس کے بعد گرداب پڑھی، اچھی تھی۔ میرے خیال میں ماہ بانو نے اچھا فیصلہ کیا ہے۔ ویسے بھی اسم اس سے شدید محبت کرتا ہے اور اس کے احسانوں اور محبت کا بہترین صلہ ہے۔ بس ایک دفعہ وہ یہاں سے خیریت سے نکل جائیں۔ کشور اور آفتاب کو ان کی پیاری سی بچی بخیریت مل جائے۔ پتا نہیں ان دونوں کے اور کتنے امتحان باقی ہیں۔ اس کے بعد رنگوں میں پہنچی۔ بحرِ تلاطم بہت اچھی کہانی تھی۔ اس کے بعد کاشف زبیر کی سعی بے لذت پڑھی۔ کاشف صاحب



بہت عرصے بعد شامی اور تیمور کے ساتھ آئے اور چھا گئے۔ چھوٹی کہانیوں میں دریچۂ عشق بہت اچھی کہانی تھی۔ چھلانگ ایک بور کہانی تھی۔ چال باز میں ڈینی اور کیتھی کی ملی بھگت سے لیو پیلسن راہِ راست پر آیا اور ایک بڑا گروہ نیست و نابود ہو گیا، اچھی کہانی تھی۔ شرگزیدہ میں نیاض کے ساتھ ماسٹر میرو اور انعم وغیرہ نے بہت برا کیا۔ سچ ہے اس دور میں کسی کے ساتھ نیکی نہیں کرنی چاہیے۔ جادوگر میں مکار تھورفل اور مسز تھورفل کا یہی انجام ہونا چاہیے تھا۔ باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔''

ملتان سے عائشہ رانی کی وضاحت'' 5 جولائی کو جاسوسی کے درشن ہوئے اور ٹائٹل ٹھنڈا ٹھار محسوس ہوا۔ ٹائٹل کچھ اس لیے بھی اچھا لگا کہ ماہ دولت کا پیدائش کا مہینا ہے ماہِ جولائی۔ لڑکی بھی میری طرح خوب صورت ہے۔ واقعی اسماعیل اجاگر صاحب، سندھ کے گوٹھوں کے حالات نہایت کٹھن اور مشکل ہوتے ہیں۔ میں کئی لوگوں سے اس بارے میں سن چکی ہوں جو کہ اپنا آنکھوں دیکھا حال بتاتے ہیں۔ خیر اللہ پاک ان جاگیرداروں اور وڈیروں کے دل میں رحم پیدا ہو جائے، آمین۔ انفال اینڈ صبا مرزا صاحبہ! سب کی لکھائی ہی گزارے لائق ہوگی یقیناً۔ آپ کی بھی کیا...؟ ذیشان جی شکریہ میرے تبصرے کا انتظار کرنے کا۔ ویسے کس کی یاد دلاتا ہے میرا تبصرہ؟ سید محی الدین اشفاق صاحب! آپ کو کیا لگتا ہے کہ یہ میرا قلمی نام ہے یا شوقیہ رکھا ہوا تو آپ کی سوچ سراسر غلط اور فضول ہے۔ میرے تعلیمی ریکارڈ میں اور حقیقی نام عائشہ رانی ہی ہے۔ مدیرِ اعلیٰ نے بھی درست فرمایا۔ راجی غارس خوش آمدید۔ علی آتش! دیکھ لیں جی یہ شرف حاصل تو ہوا مجھے کہ میں ڈیٹکٹیو ہوں۔ آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے گرداب پڑھی۔ کشور اور آفتاب کی بیٹی اغوا ہوئی۔ اک خوشی وہ بھی چھن گئی... افوہ... افسوس ہوا۔ لگتا ہے کہ چودھری کو اپنے شکنجے میں پھنسانے کے لیے را ایجنٹ والوں نے اغوا کرایا ہے۔ اپنی پسندیدہ للکار پڑھی۔ اتنی خوب صورت منظر نگاری کہ خود کو اس جگہ محسوس کرتے ہیں۔ عمو کی کہانی تو فی الوقت چل رہی ہے۔ دیکھو آگے... بار بار تابش کو اس خطرناک مقابلے سے روکا جا رہا ہے۔ یہ نہ ہو کہ واقعی مقابلہ ٹل بھی جائے۔ جگر خراش انتقامی کارروائی کی کہانی تھی مگر پھر بھی معاشرہ ویسے کا ویسا ہی ہے۔ کل انہی لوگوں کی جگہ دوسرے لوگوں نے لے لی۔ برائی ویسے ہی رہی مگر لوگ بدلتے رہے۔ آہ... ہاں... دونوں رنگ شاندار رہے۔ منظر امام نے اس مرتبہ بھی بھاگم بھاگ اسٹوری لکھی مگر پھر بھی پڑھ کر انجوائے کیا۔ نوک جھونک سے لطف اندوز ہوئے۔ کاشف زبیر صاحب واقعی تسی گریٹ ہو جی...''

عبدالعزیز خان ممکزئی کا تبصرہ میانوالی سے'' اس دفعہ جاسوسی حسبِ معمول 5 جولائی کو ملا۔ سب سے پہلے تو سرورق کا پوسٹ مارٹم کیا۔ ایک میرے جیسا (دکھوں کا مارا) اور دنیا کا ستایا ہوا بے چارے کو زنجیروں میں جکڑ کر پانی میں پھینکا جا رہا تھا۔ ساتھ میں ادھیڑ عمر کا آدمی جس کی شاندار مونچھیں، سر پر ہیٹ اور شاہین جیسی آنکھوں نے اسے بڑا دلکش بنا رکھا تھا۔ ساتھ میں ایک دوشیزہ براجمان تھی جس کی تعریف کے لیے قارئین کی تعداد کی کمی نہیں ہے۔ سرورق کے جائزے کے بعد شوگر ڈاٹ شوگر میں پہنچے۔ اس دفعہ مسندِ صدارت پر محمد اسماعیل اجاگر براجمان تھے۔ مسندِ صدارت کے لیے ڈھیروں مبارکاں۔ حسنین بلوچ! تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ سب سے پہلے جگر خراش پڑھی۔ اینڈ نے بہت مزہ دیا۔ انکل آپ اثر نعمانی (مرحوم) کی تحریریں شائع کیا کیجیے۔ للکار میں دلچسپی اب بڑھتی جا رہی ہے۔ عمران نے اب اپنی آپ بیتی شروع کر دی ہے۔ بڑا مزہ آئے گا جب عمران کی حقیقت سے پردہ اٹھے گا۔ ویسے مغل صاحب نے جارج گورا والے معاملے کو طول دے دیا ہے اور نئی کہانی شروع کر دی ہے۔ انکل ہم پھر بھی خوش ہیں کہ کہانی بغیر کسی اسٹاپ کے چلی جا رہی ہے، ویلڈن طاہر صاحب۔ گرداب میں وڈی چودھرائن کے ساتھ جو کچھ بیت رہی ہے، اسے پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ اب اونٹ پہاڑ کے نیچے آیا ہے۔ سعی بے لذت نے چند لمحوں کے لیے اداسی دور کر دی۔ اچھی کہانی تھی۔ بحرِ تلاطم بکواس اسٹوری تھی۔ صرف آخر میں جو نظم تھی اس نے کہانی کا مورال بلند کر دیا اور پہلا رنگ اسم بامسمّیٰ بن گیا۔ باقی تحریریں بھی بہت زبردست تھیں۔ اس بار جاسوسی چندے آفتاب چندے ماہتاب تھا۔ ہر اسٹوری ایک سے بڑھ کر ایک تھی۔''

جوہرآباد سے احمد اعجاز لکھتے ہیں'' اگر میں کوئی کہانی طبع زاد یا ترجمہ بھیجوں تو آپ کی پالیسی کیا ہے؟ یعنی آپ صرف اپنے منتخب مصنفین کی تحریریں شائع کرتے ہیں یا قارئین کی طرف سے بھیجی گئی ایسی تحریریں جو آپ کے معیار پر پوری اتریں، ان پر بھی اشاعت کے لیے غور کیا جا سکتا ہے۔'' (ضرور بھیجیں، نوآموز مصنفین کی اچھی کہانیاں بھی ضروری قطع و برید کے بعد شائع کی جاتی ہیں)



اسلام آباد سے سید شکیل کاظمی کی ناراضی'' میں آپ کا اور آپ کے ادارے کا بہت مشکور ہوں کہ آپ نے میرے تبصرے کو اپنی محفل کے لیے موزوں قرار دے کر شرفِ اشاعت بخشا اور اس قدر احتیاط کے ساتھ شائع کیا کہ میرے تبصرے میں کوئی ربط ہی نظر نہیں آنے دیا۔ قوی امید ہے کہ یہ مراسلہ بھی اشاعت کے مرحلے تک نہیں پہنچے گا۔ (بدگمانی اچھی چیز نہیں) مگر میں نے بتانا مناسب سمجھا کہ مجھے اپنا تبصرہ پڑھ کر کیا محسوس ہوا۔ (ہمیں خوشی ہے کہ آپ نے اس قابل سمجھا کہ ہمیں اپنے احساسات سے آگاہ کر سکیں) خیر ربط تو میری تحریر میں ویسے بھی نہیں تھا، تھوڑا آپ کی توجہ سے چار چاند لگ گئے۔'' (محترم ہمیں آپ کا پچھلا خط داہنی جانب سے کٹا ہوا موصول ہوا تھا جسے اندازے سے مکمل کر کے آخری لمحات میں شاملِ اشاعت کیا گیا۔ اور ہم نے آپ کی شکایت پر ریکارڈ سے خط نکلوا کے چیک بھی کر لیا کہ ایسا کیونکر ہوا۔ قارئین سے التماس ہے کہ بائیں جانب مناسب حاشیہ دے کر خطوط ارسال کیا کریں۔ شکیل صاحب! کبھی کبھی کچھ غلط ہو جاتا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ کاغذ قلم اٹھا کر رکھ دیا جائے کہ آئندہ خط ہی نہیں لکھیں گے۔ ہمیں آپ کی یہ بات بالکل پسند نہیں آئی... اگلے ماہ تفصیلی تبصرہ ہمیں مل جانا چاہیے... اس کو کچھ بھی سمجھ لیں...)

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

صائم رضا کاظمی، ڈی آئی خان۔ کشف اینڈ اسا در المعروف چودھری سسٹرز، رحیم یار خان۔ انفال مرزا اینڈ صبا مرزا، چکوال۔ ریچل مائیکل، جڑانوالہ۔ محمد طیب، منچن آباد۔ حسنین بلوچ، سرگودھا۔

طویل انتظار کے بعد آپ کے پسندیدہ قلم کار محی الدین نواب کی اوّلین صفحات پر آمد

# خبطی

محی الدین نواب

دل خواہشات کا مسکن ہے--- بقول کسی کے--- خواہشوں کو پیدا نہ ہونے دو--- ورنہ تم عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے--- مگر ہر دل میں خواہشات جنم لیتی ہیں--- اُمنگیں آرزوئیں پنپتی ہیں--- جب آرزو کی کونپل پھوٹتی ہے تو--- انسان چاہتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح تکمیل تک ضرور پہنچے--- اس کے حصول میں قدرت بھی اس کا ساتھ دیتی ہے--- لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خواہش کے پورے نہ ہونے کی راہ میں انسان خود حائل ہو جاتا ہے--- ہزار کوششوں کے باوجود تشنہ کام رہتا ہے--- ایسے دل والوں کی داستاں جن کی بے کلی اور بے قراری کا سبب صرف ایک ہی ہستی تھی--- وہ سب انتظار اور انتخاب کے کڑے پیمانے میں جھول رہے تھے--- اب دیکھنا یہ تھا کہ وہ مسلسل انتظار کس خوش نصیب پر ختم ہوتا---

## خاندانی الجھاووں اور روایات کے شکنجے میں جکڑی داستان عشق

انسان خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ... ! اللہ رب العزت نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے مگر انسان کے اندر موجود خوبیاں اور خامیاں ہی اس کی ترقی و کامیابیوں کا تعین کرتی ہیں۔ کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ خامیوں یا خوبیوں سے عاری ہے۔ میں راؤ بلال اکبر بھی خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہوں اور اپنی خوبیوں کے سبب زندگی کے سفر میں آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

اس روز میں نے اپنی علمی خوبیوں کو اجاگر کیا تھا۔ انگلش لٹریچر میں ایم اے کی سند حاصل کی تھی۔ میں یہ سند سب سے پہلے عینی کو دکھانا چاہتا تھا۔ نورالعین عرف عینی میری آرزو ہے۔ میں اس کے خواب دیکھتا ہوں اور خوابوں کی تعبیر بھی چاہتا ہوں۔

مشکل یہ تھی کہ ایسی تعبیر چاہنے والے اور بھی دیوانے تھے۔ وہ سب چچازاد اور پھوپھی زاد بھائی تھے۔ ہم سب نے بچپن ساتھ گزارا تھا۔ ہمارا دور تک پھیلا ہوا راجپوت خاندان چک نمبر پینتالیس اور چوالیس میں آباد ہے۔ ہم نے اوکاڑہ میں دسویں جماعت تک تعلیم حاصل کی تھی۔ پھر آگے پڑھنے کے لیے لاہور آ گئے تھے۔

دو چچازاد اور پھوپھی زاد بھائی عینی کے عاشق تھے۔ انہیں آگے پڑھنے سے دلچسپی نہیں تھی لہٰذا وہ کھیتی باڑی کے کاموں سے لگ گئے۔ مجھ سمیت سب ہی کے والدین نے عینی کے گھر پیغام بھجوایا تھا۔ سب ہی اسے بہو بنانا چاہتے تھے۔ جواب ملا کہ وہ تعلیم سے فارغ ہو گی' تب بزرگوں کی مرضی سے اس کی شادی کے سلسلے میں فیصلہ کیا جائے گا۔

اس طرح وہ ایک انار اور ہم چار بیمار تھے۔ وہ متنازع تھی۔ آئندہ ہمارے درمیان فسادات برپا ہو سکتے تھے۔ اونٹ کے متعلق کہا جاتا ہے' پتا نہیں وہ کس کروٹ بیٹھنے والا ہے؟ میں عینی کے مزاج کو سمجھ نہیں پاتا تھا کہ وہ ہم طلب گاروں میں سے کس کی طرف فیصلہ کن کروٹ لے گی؟

وہ بچپن سے ہمارے ساتھ ہنستی کھیلتی، لکھتی پڑھتی آئی تھی۔ ہم سب کی عزت کرتی تھی۔ کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دیتی تھی۔ اس کی چاہت میں ہمارے لیے عاشقانہ انداز کبھی نہ رہا، ہمیشہ رشتوں کا احترام رہا تھا۔

وہ لاہور میں اپنے ماموں کے پاس رہتی تھی۔ چھٹیوں میں پنڈ آیا کرتی تھی۔ میں نے یونیورسٹی سے نکل کر سوچا' ایم اے کی ڈگری لے کر پہلے عینی سے ملوں اور اسے متاثر کروں۔ یوں بھی وہ میری علمی قابلیت کی معترف تھی۔ آج میں

پوچھنا چاہتا تھا کہ شادی کے سلسلے میں اس کا فیصلہ کیا ہے؟ کیا وہ میری شریکِ حیات بننا چاہے گی؟

میں نے فون نکال کر اس کا نمبر ملایا۔ چند لمحوں بعد ہی اس کی رس بھری آواز سنائی دی۔ ''ہائے بلال! کیسے ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں... ابھی تم سے ملنے آرہا ہوں۔ آج میرے لیے بہت ہی خوشی کا دن ہے۔ میں اس خوشی میں تمہیں شریک کرنا چاہتا ہوں۔''

''مجھے پتا ہے۔ جناب نے ایم اے کرلیا ہے۔ میری طرف سے مبارکباد قبول کرو۔''

''میں ابھی سمن آباد آکر مبارکباد وصول کروں گا۔''

''اونہو... میں ماما جی کے گھر نہیں ہوں۔ لاہور سے آگئی ہوں۔ یہاں چک (گاؤں) میں ہوں۔''

میں ایک دم سے مرجھا گیا۔ اس نے پوچھا۔ ''ہیلو... چپ کیوں ہوگئے؟''

''میں خوش ہو رہا تھا کہ ابھی تم سے ملاقات ہو جائے گی۔ اب تو میں شام تک وہاں پہنچوں گا۔ دل میں بہت سی باتیں تھیں۔ وہ کہنے کے لیے بے چین تھا۔''

''ایسے ہی بے چین ہو تو فون پر کہہ دو۔''

''ویسے تم سمجھ سکتی ہو، میں کیا کہنا چاہتا ہوں؟''

''پتا نہیں میں کیا سمجھ رہی ہوں؟ اور پتا نہیں، تم کیا کہنے والے ہو؟ کہہ دو تو بہتر ہے۔''

میں نے مسکرا کے کہا۔ ''صرف تین الفاظ ہیں۔ ان تین لفظوں میں دل کی پوری کائنات سما گئی ہے... آئی لو یو۔''

دوسری طرف خاموشی رہی۔ میں نے کہا۔ ''جب بھی میں آئی لو یو کہتا ہوں، تم بڑی خوبصورتی سے ٹال دیتی ہو۔''

''اس کی وجہ تم سمجھ سکتے ہو۔ یہ جانتے ہو، وہ تینوں بھی مجھے چاہتے ہیں۔ میں یہ سوچ کر الجھتی ہوں کہ تمہیں ترجیح دوں تو وہ تینوں احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اپنی توہین برداشت نہیں کریں گے اور کھلی دشمنی پر اتر آئیں گے۔''

''تم اُن کی پروا نہ کرو۔ میں راستے میں آنے والے پتھروں کو توڑنا جانتا ہوں۔''

''پھر بھی ڈر لگتا ہے، بات بڑھے گی تو صرف رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوگی، خون خرابا بھی ہوگا۔ میرے بزرگوں کا فیصلہ تمہارے حق میں ہے مگر وہ فیصلہ سنانے سے پہلے امن و امان کو یقینی بنانا چاہتے ہیں۔''

''میرے لیے سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ تم مجھے چاہتی ہو۔ تمہارا پیار اور تمہارے دل کی دھڑکنیں میرے لیے ہیں۔ ان رقیبوں کی فکر نہ کرو، میں شام تک آرہا ہوں۔ ہمارے تمہارے بزرگ مل کر چچا اور پھوپھی کو اور ان کے بیٹوں کو سمجھائیں گے۔ پھر وہ سب کا فیصلہ ماننے پر مجبور ہو جائیں گے۔''

''خدا کرے، پیار محبت اور امن و سلامتی سے بات بن جائے۔ بس تم آجاؤ۔''

''آرہا ہوں۔ سمجھ لو کہ تمہیں دیکھنے کے لیے اُڑ کر پہنچنے والا ہوں۔''

اس نے ہنستے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔ میں نے دیر نہیں کی۔ آدھے گھنٹے کے اندر ہی ایک کوچ میں اوکاڑہ کے لیے روانہ ہوگیا۔ وہ میری زندگی کا سب سے خوبصورت اور کامیاب دن تھا۔ خوبصورت اس لیے کہ عینی کا حسین وجود میرے نام ہونے کی ضمانت مل رہی تھی۔ اس کے بزرگ میرے حق میں فیصلہ کرنے والے تھے... اور کامیاب دن اس لیے کہ میں نے تعلیم مکمل کرلی تھی۔ یہ ارادہ کیا تھا کہ اپنی زمینوں کے معاملات سنبھالنے کے علاوہ وہاں ایک اسکول تعمیر کراؤں گا اور بچوں کو مفت تعلیم دیا کروں گا۔ بڑا رومانٹک ماحول ہوگا۔ عینی بھی بچوں کو پڑھانے آیا کرے گی۔

موبائل فون کی کالنگ ٹون نے مجھے مخاطب کیا۔ میں کوچ میں کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ گاڑی لاہور شہر سے نکل کر جی ٹی روڈ پر جا رہی تھی۔ میں نے اسکرین پر نام پڑھا۔ میرا چچا زاد بھائی کا چچی کال کر رہا تھا۔

کا چچی کا نام قاسم جان تھا۔ وہ چچا زاد میرا رقیب تھا، عینی کا طلب گار تھا۔ تعلیم میں پیچھے رہ جانے کے باعث احساسِ کمتری میں مبتلا رہتا تھا۔ مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا۔ یہ حیرانی کی بات تھی کہ وہ مجھے فون کے ذریعے مخاطب کر رہا تھا۔

میں نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگا کر کہا۔ ''السلام علیکم...!''

وہ چپ رہا۔ سوچ میں پڑ گیا کہ اپنے رقیب کو وعلیکم السلام کہنا چاہیے یا نہیں؟ اسے عقل نے سمجھایا... نہیں... دشمن پر جواباً سلامتی نہیں بھیجنی چاہیے۔ لعنت ہے اس پر...

وہ بڑے اکھڑ پن سے بولا۔ ''اور پڑھا کو بابو...! سنا ہے، بہت بڑی ڈگری لے کر آرہا ہے۔ خود نے سمجھے کے ہے؟ ایم اے، بی اے، سی اے، ڈی اے بن جانے سے عینی تنے مل جاوے گی؟''



وہ ہماری راجپوت برادری کی خاص بولی رانگھڑی میں بول رہا تھا۔ جب تک ہم شہر پڑھنے نہیں گئے تھے، تب تک میں اور عینی بھی یہی بولی بولا کرتے تھے لیکن پھر جیسے جیسے تعلیم حاصل کرتے گئے، ویسے ویسے یہ لب ولہجہ پھیکا پڑتا چلا گیا۔ ہم شہر میں اردو اور پنجابی بولا کرتے تھے لیکن گاؤں آکر اپنی یہی ماوری زبان منہ میں مٹھاس گھولنے لگتی تھی اور ہم برادری والوں کے ساتھ رانگھڑی میں گفتگو کرنے لگتے تھے۔

میں نے کہا۔ ''علم حاصل کرو تو دنیا میں بہت کچھ ملتا ہے۔ عینی بھی ملے گی۔ تم گرمی کیوں کھا رہے ہو؟''

''تنے سمجھانے کے لیے فون کیا ہے۔ تُو نے بہت اوپر تک پڑھ لیا ہے۔ جدھر جاوے گا، ادھر ایک سے بڑھ کر ایک حسینہ ملے گی۔ عینی کا خیال دماغ سے کاڈ کے پھینک دے۔''

''یہی بات تم سے کہتا ہوں۔ عینی میرے لیے پیدا ہوئی ہے۔ اسے تم بہن بنا لو۔''

وہ دہاڑتے ہوئے بولا۔ ''اے! میں تو تیری بہن کو...''

میں نے فوراً رابطہ منقطع کر دیا۔ وہ غصے میں گندی گالیاں دینے لگا تھا۔ اسی لیے مجھے فون بند کرنا پڑا۔ اگر وہ سامنے ہوتا تو میں اس کا منہ توڑ کر رکھ دیتا۔

میں نے فون بند کر کے گویا اسے دھتکار دیا تھا۔ اپنے پاس آکر بولنے والے کو لات مار کر بھگا دیا تھا۔ وہ یقیناً غصے میں آکر بڑکیں مار رہا ہوگا۔ مجھے گالیاں دے رہا ہوگا۔

وہ چچا زاد، پھوپھی زاد اور ماموں زاد ایک ہی چک میں رہتے تھے۔ میں نے سوچ لیا، وہاں پہنچ کر کا چچی سے نمٹ لوں گا۔ تھوڑی دیر بعد پھر کالنگ ٹون سنائی دی۔ میں نے اسکرین پر نام پڑھا۔ میرے دوسرے چچا کا بیٹا شکور احمد عرف شکوریا مجھے کال کر رہا تھا۔

میں نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگانے کے بعد پوچھا۔ ''ہاں شکوریا! بولو۔ آج میں تم لوگوں کو کیوں یاد آرہا ہوں؟''

اس نے کہا۔ ''سنا ہے، تیری لاٹری نکلنے والی ہے؟''

میں نے پوچھا۔ ''کیسی لاٹری...؟''

''ابھی صرف سنا ہے۔ پکی خبر نہیں ہے۔ تیں بتا، یہ سچ ہے کہ عینی کے ماں باپ تنے داماد بنانا چاوے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''اگر یہ سچ ہے تو تمہارا ردِعمل کیا ہوگا؟''

وہ بڑے ہی سخت لہجے میں بولا۔ ''میں بہت پہلے اپنا فیصلہ سنا چکا ہوں۔ وہ صرف میری گھر والی بنے گی۔ ورنہ نہ گھر کی رہے گی نہ گھاٹ کی...''

> مولانا نعیم صدیقی کی کتاب ''عورت معرضِ کش مکش میں'' کے مقدمے میں عورت کے فرائض اور مرد کے لذائذِ منصبی کے بارے میں لکھتے ہیں:
>
> گویا اصل اور حقیقی عورت اس عورت کے اندر ہوتی ہے جو بہ ظاہر مشین نظر آتی ہے اور دنیا کے ہر مرد کو وہی اصلی عورت درکار ہے، جو باورچی خانے میں ہو تو رسوئی سے اس کے ہاتھوں کی خوشبو نکل رہی ہو۔ ڈرائنگ روم میں ہو تو اس کی خوب صورت گفتگو ماحول میں دھنک رنگ پتیاں برساری ہو... اور اگر بے تکلفی کے لمحے میں ہو تو گویا الف لیلوی رات آسمان سے اتر کر بستر پر بکھر جائے۔ خود سے الجھتا ہوا، زمانے سے لڑتا ہوا، طوفان کی طرح بپھرتا ہوا اور چٹان کی طرح چٹختا ہوا مرد ایسی عورت کے آنچل کی مہک سے ہر صبح صحیح سلامت نکل کر روزگار کے سمندر میں کود جاتا ہے۔ اور ہر شام چہرے پر نئی خراشیں لیے پھر اسی کا سہارا لیتا ہے۔
>
> یوسفی کارواں کا ایک پڑاؤ

''کیا اسے مار ڈالو گے یا سہاگن بننے کے قابل نہیں رہنے دو گے؟''

''میں اسے منہ دکھانے کے قابل ہی نہیں چھوڑوں گا۔''

''مرد ہو تو اس مرد کو چیلنج کرو جو عینی کو حاصل کر رہا ہے۔''

''میں تجھ سے بھی نمٹ لوں گا۔''

''پتا نہیں کب نمٹو گے؟ میں آج ہی تمہارے غبارے سے ہوا نکال دوں گا۔ انتظار کرو، آج شام تک وہاں پہنچنے والا ہوں۔''

میں نے فون بند کر دیا۔ اندازہ ہوگیا کہ عینی کو مجھ سے منسوب کرنے والی بات پورے خاندان میں گردش کر رہی ہے جسے سن کر اس کے تینوں طلب گار انگاروں پر لوٹنے لگے ہیں۔ فون کے ذریعے مجھے غصہ دکھا رہے ہیں۔ ان کے والدین اور بزرگ بھی وہاں میرے خلاف بول رہے ہوں گے۔

اوکاڑہ پہنچنے تک عینی کے تیسرے طلب گار نے بھی مجھے فون پر مخاطب کیا۔ وہ میری پھوپھی کا بیٹا ابرار احمد تھا مگر بائسو پہلوان کے نام سے مشہور تھا۔ میں نے فون اٹینڈ کرتے ہی کہا۔ ''بائسو! میں جانتا ہوں، تم کیا کہنے والے ہو۔ ابھی اوکاڑہ آگیا ہوں۔ آدھے گھنٹے میں چک پہنچنے والا ہوں۔ ذرا صبر کرو۔ اپنا غصہ اور گالیاں بچا کر رکھو۔ میں تمہارے اکھاڑے

میں ضرور آؤں گا۔“

میں نے اس سے رابطہ ختم کر کے امی کو فون پر مخاطب کیا۔ وہ گھر میں نہیں تھیں۔ میری بہن چھانو نے کہا۔ ”بھائی بلال! مبارک ہو۔ امی تمہاری عینی کے گھر گئی ہیں۔ رشتے کی بات ہو رہی ہے۔ پورے خاندان میں بڑی گرما گرمی ہے۔ آؤ گے تو مزہ آجائے گا۔“

”امی سے کہنا‘ میں ابھی آدھے گھنٹے میں پہنچنے والا ہوں۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ مخالفتیں ہوں گی۔ لڑائی جھگڑے کی نوبت آسکتی ہے مگر ہم صلح صفائی کا راستہ اختیار کریں گے۔ میں آتے ہی پنچایت کے تمام بزرگوں سے ملوں گا۔“

میری بہن چھانو کا نام شاہانہ تھا۔ میرے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ میں نے بہن کی ڈولی اٹھائی تھی۔ جہیز میں لاکھوں روپے کا سامان دیا تھا۔ اپنی زمینوں میں سے پانچ مربع بھی دیے تھے۔ میرا بہنوئی حشمت ایک لالچی شخص تھا۔ اس کی نظریں میری تمام زمینوں پر تھیں۔ اگرچہ وہ میٹھا بولتا تھا، پانچ وقت کا نمازی تھا مگر اس کے اندر یہ شیطانی خیال پکتا رہتا تھا کہ میری شادی نہ ہو۔ بیوی بچے نہ ہوں اور میں کنوارا ہی مر جاؤں۔ اس طرح میری بہن چھانو دو سو مربعوں پر پھیلی ہوئی زمینوں کی مالکن بن جائے اور وہ بیوی کے طفیل ایک بڑا زمیندار بن کے وڈا چودھری کہلائے۔

اس روز میں نے تعلیم مکمل کی تھی۔ خوش قسمتی سے عینی مجھے انعام کے طور پر مل رہی تھی۔ ایسے وقت میں، میں اپنے مخالفین سے غافل نہیں تھا۔ جو لوگ میری راہ میں رکاوٹ بننے والے تھے، ان کی طرف سے محتاط رہنے کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے، ہم سوچتے رہ جاتے ہیں اور دشمن شب خون مارنے چلے آتے ہیں۔

شام ڈھل رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد رات کا اندھیرا پھیلنے والا تھا۔ میں کوچ سے اتر کر تانگے کے ذریعے اپنے گاؤں کے کچے راستوں پر چلا آرہا تھا۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی زرد پڑتی روشنی میں سرسبز کھیت بڑے ہی بھلے لگ رہے تھے۔ پرندوں کے جھنڈ اپنے اپنے گھونسلوں کی طرف رواں دواں تھے۔ پورا علاقہ ان کی چہچہاہٹ سے گونج رہا تھا۔ دور گاؤں سے ابھرنے والی چکی کی آواز اس چہچہاہٹ میں گڈمڈ ہو کر روح کو چھو لینے والی ایک جانی انجانی سی دُھن بنا رہی تھی۔

میں نے صاف ستھری فضا میں ایک گہری سانس کھینچی۔ پھر اپنے کھیتوں تک پہنچ کر تانگے والے کو روک دیا۔ پچھلی سیٹ سے اتر کر اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”آگے پیدل جانا چاہتا ہوں۔ یہ لو... اپنا کرایہ...“

میں اسے کرایہ ادا کر کے پیدل چلنے لگا۔ ہرے بھرے کھیتوں کے درمیان سے گزرتا ہوا میں گھر کی طرف رواں دواں تھا۔ شام پوری طرح ڈھل چکی تھی۔ دھیرے دھیرے رات کا اندھیرا پھیلنے لگا۔ ایسے ہی وقت گندم کی کھڑی فصل میں ہلچل سی پیدا ہوئی۔ میں ذرا ٹھٹک گیا۔

میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ اچانک ہی ایک شخص لہلہاتی ہوئی فصلوں کے درمیان سے ابھر کر سامنے آیا۔ اس کے ہاتھ میں گنڈاسا تھا۔ منہ پر ڈھاٹا بندھا ہوا تھا۔ اس نے حملہ کرنے میں دیر نہیں کی۔ میں نے بھی سنبھلنے میں دیر نہیں کی۔ جیسے ہی گنڈاسا میری طرف آیا، میں گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ یوں اپنا بچاؤ کرنے کے باوجود گنڈاسا میری قمیص اور کھال کو چیرتا ہوا گزر گیا۔

میں نے ایک طرف بھاگتے ہوئے کہا۔ ”منہ کیا چھپا رہا ہے؟ میں نے پہچان لیا ہے۔ تُو شکور یا ہے۔ میرے ہاتھوں مرنے آیا ہے۔“




سونا گھاٹ کا پجاری، انکا، اقابلا!...

جیسی یادگار اور سدابہار داستانیں جو آج بھی قارئین کے دلوں میں زندہ ہیں ہوش ربا، پرتحیر، پرتجسس اور سنسنی خیز کہانیوں کے خالق




سسپنس ڈائجسٹ اگست 2011ء میں ملاحظہ فرمائیں

ازل سے برسرِ پیکار، خیر و شر کی متضاد قوتوں کی آویزش کی داستان

میں ایک طرف بھاگتے ہوئے اچانک اسے ڈاج دے کر اس پر حملہ کرنا چاہتا تھا مگر وہ تنہا نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتا، سامنے کھڑی فصل کے درمیان سے دوسرا شخص نمودار ہوا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے لاٹھی گھما کر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ میں چھلانگ مار کر اس سے لپٹ گیا۔ اس کے ساتھ فصل کی ہریالی پر گرتا ہوا اسے گھونسے مارنے لگا۔ میں اسے دبوچ کر اس کے منہ پر بندھے ہوئے کپڑے کو نوچ کر دیکھنا چاہتا تھا کہ کون ہے؟

پہلے حملے میں گنڈاسے سے ہلکا سا زخم لگا تھا۔ شانے پر سے قمیص پھٹ گئی تھی۔ وہاں سے لہو رس رہا تھا۔ اس نے پھر پیچھے سے آ کر حملہ کیا۔ اس بار گنڈاسے کی دھار میرے گوشت میں اترتی ہوئی گزر گئی۔

میرے حلق سے ہلکی سی کراہ نکلی۔ میں نے جسے دبوچ رکھا تھا، اسے چھوڑ کر زخمی شیر کی طرح گرجتا ہوا گنڈاسے والے سے لپٹ گیا۔ اسے رگیدتا ہوا دور جا کر اس طرح گرا کہ وہ میرے نیچے آ گیا۔ اس کے ہاتھ سے گنڈاسا چھوٹ گیا۔

حملہ کرنے والے جانتے تھے کہ میں بہت جی دار اور سخت جان ہوں۔ آسانی سے مجھ پر قابو نہیں پایا جا سکے گا۔ وہ میرے نیچے سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اور میں کچھ فاصلے پر پڑے ہوئے گنڈاسے تک پہنچنا چاہتا تھا۔ دوسرے کے پاس لاٹھی تھی۔

میں نے اچانک ہی اسے چھوڑ کر گنڈاسے کی طرف چھلانگ لگائی۔ ادھر دوسرے نے پیچھے سے آ کر لاٹھی چلائی تو وہ اس کے منہ پر لگی جو میری گرفت سے آزاد ہو کر اٹھ رہا تھا۔ وہ چیخیں مارتا ہوا پھر زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔

اتنی دیر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ شکور یا، کا چچی اور باسو پہلوان میں سے نہیں ہیں۔ وہ جو بھی تھے یقیناً ان کے بھیجے ہوئے موت کے ہرکارے تھے۔ وہ خاموش تھے۔ مجھے مار ڈالنے سے پہلے کچھ نہیں بول رہے تھے۔ یہ اندیشہ تھا کہ اپنی آواز اور لب و لہجے سے پہچانے جائیں گے۔ آخر وہ چک کے لوگوں میں سے ہی ہوں گے۔ بہرحال، اس وقت میرے دشمنوں کے آلۂ کار بن کر آئے تھے۔

گنڈاسا میرے ہاتھوں میں آیا تو میں اپنے زخموں کی تکلیف بھول گیا۔ ادھر وہ دونوں بوکھلا گئے۔ لیکن میں لاعلمی کے باعث دھوکا کھا گیا۔ میں نے اب تک صرف ان دونوں کو دیکھا تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہاں کوئی تیسرا بھی موجود ہے۔

وہ باسو پہلوان تھا۔ اس نے پیچھے سے آ کر لاٹھی کا وار کیا۔ میرے سر پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ میں ذرا لڑکھڑایا۔ ذرا سنبھل کر پلٹ کر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ دوسری طرف سے پھر ایک لاٹھی سر پر پڑی۔ پھر تو دونوں طرف سے لاٹھیاں برسنے لگیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کائنات سر ٹوٹ رہا ہو۔ میں بے جان سا ہو کر زمین پر گر پڑا۔

اس کے بعد میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا ہوتا رہا؟ میری آنکھوں کے چراغ بجھ گئے تھے۔ میرے کان سماعت سے محروم ہو چکے تھے۔ پھر دماغ بھی بجھ کر رہ گیا۔ اس روز پہلی بار عارضی موت کا مزہ چکھ کر معلوم ہوا کہ ذائقۃ الموت کسے کہتے ہیں؟

کچھ لوگ گاؤں سے نکل کر کھیتوں کی طرف آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے چیخ کر کہا۔ ''وہ دیکھو! ادھر کیا ہو رہا ہے؟''

قد آدم فصلوں کے درمیان صرف لاٹھیاں لہراتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ دوسرے نے کہا۔ ''پتا نہیں کون ہیں، ہماری فصلوں کو تباہ کر رہے ہیں۔''

وہ سب للکارتے ہوئے ادھر کی طرف بھاگنے لگے۔ گاؤں والوں کو آتا دیکھ کر ان تینوں کو وہاں سے بھاگنا پڑا۔ میں سر سے پاؤں تک لہو میں نہا چکا تھا۔ بالکل ساکت پڑا تھا۔ وہ مجھے مُردہ سمجھ کر چلے گئے۔ پنڈ والوں نے آ کر دیکھا پھر مجھے پہچان کر چیخنے لگے۔ دوسروں کو آوازیں دینے لگے۔

وہ میری نبض ٹٹول رہے تھے۔ دھڑکنیں سننے کی کوششیں کر رہے تھے۔ پھر انہوں نے کہا کہ میں مر چکا ہوں۔ میری امی، بہن، بہنوئی اور تمام خاندان والے بلکہ پورا گاؤں وہاں اُمڈ آیا تھا۔ امی رو رہی تھیں اور مجھے اسپتال پہنچانے کو کہہ رہی تھیں۔

تھانے دار نے آ کر دیکھا تو اسے بھی یقین ہو گیا کہ میں مر چکا ہوں۔ وہ میری لاش کا پوسٹ مارٹم کرانے کے لیے اوکاڑہ شہر کے اسپتال میں لے آیا۔ وہاں ڈاکٹر نے اچھی طرح معائنہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو زندہ ہے۔ اسے فوراً آکسیجن پہنچاؤ۔ میں ڈاکٹر عالم کو کال کر رہا ہوں۔''

میں ان ڈاکٹروں کا احسان مند ہوں جن کی فرض شناسی، محنت اور لگن کے باعث مجھے نئی زندگی مل گئی۔ یہ میری بدنصیبی تھی کہ ادھوری زندگی ملی تھی۔ ان کی کوششوں سے میری سانسیں بحال ہو گئی تھیں مگر ہوش و حواس بحال نہیں ہو رہے تھے۔ مجھ پر سکتہ طاری تھا۔

میں بولنے اور سننے کے قابل نہیں رہا۔ آنکھیں کھلی رہتی تھیں مگر یہ سمجھ نہیں پاتا تھا کہ کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں؟

میں بہت ہی نازک حالات سے گزر رہا تھا۔ اپنوں اور ڈاکٹروں کی ایک ذرا سی غفلت اور بے پروائی پھر مجھے موت کی طرف لے جا سکتی تھی۔

مجھے وہاں سے لاہور پہنچا دیا گیا۔ امی میرے علاج کے لیے بڑی سے بڑی رقم پانی کی طرح بہا رہی تھیں۔ میری بہن چھ، نو دن رات میرے بستر سے لگی رہتی تھی۔ اس کے باوجود علاج کے سلسلے میں کچھ گڑبڑ ہو رہی تھی جسے وہ ماں بیٹی سمجھ نہیں پا رہی تھیں۔

گڑبڑ دھی کر رہے تھے جو مجھے عینی کے ساتھ ہنستے بستے نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ بیٹھی چھری بن کر رہنے والے رشتے دار کس طرح چپکے چپکے قتل کرتے رہتے ہیں، یہ قتل ہونے والے کو بھی آخری دم تک معلوم نہیں ہوتا۔ جس بے دردی سے مجھ پر حملے کیے گئے تھے، اس کے نتیجے میں دماغ کو بہت زیادہ نقصان پہنچا تھا۔

طب کی اصطلاح میں یہ ٹی بی آئی یعنی ٹراما برین انجری کا کیس تھا۔ دماغ پر اس قدر ضربیں اور چوٹیں کھانے کے بعد میں آئندہ سراسیمگی، بے چینی اور حافظے کی کمزوری میں مبتلا ہو سکتا تھا۔

وہاں ایک ڈاکٹر کو مجھ سے دشمنی تھی یا میرے دشمنوں نے اسے خرید لیا تھا۔ اس نے میرا معائنہ کرنے کے بعد فیصلہ سنا دیا کہ یہ مریض دماغی طور پر ختم ہو چکا ہے۔ اسے سکتے کی حالت سے نکالا جائے گا تو یہ مر جائے گا۔

اس نے اپنے طور پر جاری رہنے والے علاج کو روک دیا۔ میرے دماغ کو قدرے توانائی پہنچانے والی دواؤں سے محروم کر دیا۔ میری امی رو پیٹ کر صبر کرنے والوں میں سے نہیں تھیں۔ انہوں نے دوسرے فرض شناس ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کیں۔ اگلے ایک ماہ تک ڈاکٹرز میرے علاج میں مصروف رہے۔ مجھ پر انتہائی توجہ دیتے رہے۔ یوں ڈاکٹروں کی محنت اور ماں کی ممتا مجھے سکتے کی حالت سے نکال کر کسی حد تک ہوش و حواس میں لے آئی۔

کہتے ہیں، محبت کرنے والے مر جاتے ہیں لیکن محبت نہیں مرتی۔ ایک دن عینی میری عیادت کے لیے آ گئی۔

میں اسپتال کے کمرے میں تنہا وہیل چیئر پر بیٹھا تھا۔ وہ میرے روبرو آ کر کھڑی ہو گئی۔ مجھے چپ چاپ دیکھنے لگی۔ میں بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ یاد نہیں آ رہا تھا کہ پہلے بھی دیکھا ہے۔ میری نگاہوں میں اجنبیت دیکھ کر اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

رونے کی بات تھی۔ پہلے میں ہر دوسرے تیسرے روز فون پر باتیں کیا کرتا تھا، اس سے ملنے کے لیے تڑپتا تھا۔ پھر جب کبھی ملاقات ہوتی تو میری آنکھوں کی چمک اور چہرے کی رونق اسے بتا دیتی تھی کہ میں حد سے آگے نکل جانے والا اس کا دیوانہ اور شیدائی ہوں۔

میں نے ان لمحات میں یہ محسوس کیا کہ وہ اجنبی لڑکی اچھی لگ رہی ہے۔ اتنی اچھی کہ اسے دیکھتے رہنے کو جی کر رہا ہے۔ اس نے بڑے دکھ سے پوچھا۔ ''کیا مجھے بھول گئے؟''

میں نے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ یاد کرنے کی کوشش کی پھر کہا۔ ''مجھے افسوس ہے۔ جو یہاں آتے ہیں، وہ یہی کہتے ہیں کہ میں انہیں بھول گیا ہوں۔ مگر ہاں، جب امی اور چھانو ان کا تعارف کراتی ہیں تو مجھے کچھ کچھ یاد آنے لگتا ہے۔ تم بیٹھو۔ وہ آتی ہوں گی۔ ابھی تمہاری پہچان کرائیں گی۔''

وہ سامنے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''وہ نہیں آئیں گی۔ جب تک میں یہاں ہوں، کوئی نہیں آئے گا بلال...!''

وہ مجھے بڑی محبت سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ہمارے درمیان پیار کا جو رشتہ ہے، وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ محبت کبھی ختم نہیں ہوتی۔ یہ تمہارے اندر ہے۔ کہیں چھپی ہوئی ہے۔ ذہن کی تاریکیوں میں دیکھنے کی کوشش کرو۔ میرے نام سے جگنو کی ایک چمک، ایک جھلک بھی دکھائی دے گی تو میں خوشی سے پاگل ہو جاؤں گی۔''

وہ بول رہی تھی اور دل اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''تمہاری باتیں اچھی لگ رہی ہیں۔ دل کہتا ہے، تم سے کوئی گہرا رشتہ رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں، تم میرے پاس رہو۔ مجھے بھولی ہوئی باتیں یاد دلاتی رہو۔''

''ہمارا جو رشتہ ہے، اسے دنیا والے شادی کے بغیر تسلیم نہیں کریں گے۔ مجھے بار بار یہاں نہیں آنے دیں گے۔ پہلے ہی مخالفتیں کم نہیں تھیں۔ اب تو کہا جا رہا ہے کہ تم ایب نارمل ہو۔ جو حاسد ہیں، رقیب ہیں، وہ تمہیں پاگل کہہ رہے ہیں۔''

اس نے چپ ہو کر بڑی پریشانی سے سر پر ہاتھ رکھا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

''میرے بزرگوں کے فیصلے بدلنے والے ہیں۔ وہ تمہیں نیم پاگل سمجھ رہے ہیں۔ کہتے ہیں، تم کبھی بے تکی اور کبھی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو۔ خبط الحواس ہو۔ تمہارا علاج ممکن نہیں ہے۔''

''مجھے یہ پروا نہیں ہے کہ دنیا والے کیا کہتے ہیں؟ ابھی ایسا لگ رہا ہے، تم ہی میری دنیا ہو۔ مجھے صرف تمہیں دیکھنا چاہیے۔ صرف تمہیں یاد رکھنا چاہیے۔''

اس نے خوش ہو کر ایک گہری سانس لی پھر کہا۔ ''میرا دل کہتا ہے، تم مجھے اچھی طرح پہچاننے کے دوران دوسری بہت سی بھولی ہوئی باتیں بھی یاد کرتے رہو گے۔ تمہاری یادداشت بحال ہو گی تو بے تکی اور بے سر و پا باتیں نہیں کرو گے۔ پھر کوئی تمہیں پاگل یا نیم پاگل نہیں کہے گا۔''

''پھر تو تم روز آیا کرو۔ روز مجھ سے باتیں کیا کرو۔''

''تم میری مجبوری نہیں سمجھو گے۔ میں شاید آج کے بعد نہیں آسکوں گی۔ میرے بزرگ مجھے یہاں آنے نہیں دیں گے۔''

میں نے مایوس ہو کر بڑے دکھ سے اسے دیکھا۔ وہ بولی۔ ''لیکن ہاں، میں فون پر روز تم سے باتیں کر سکتی ہوں۔''

وہ ایک موبائل فون دکھاتے ہوئے بولی۔ ''یہ یاد ہے نا؟ اسے موبائل فون کہتے ہیں۔ اسے استعمال کرنا آتا ہے؟''

اس نے فون میری طرف بڑھایا۔ میں نے اسے لے کر کہا۔ ''ایسا ہی فون میں نے ڈاکٹر صاحب کے اور امی کے پاس دیکھا ہے۔ وہ اسے کان سے لگا کر باتیں کرتے ہیں۔''

''تم بھی اسے کان سے لگا کر مجھ سے باتیں کر سکو گے۔''

میں نے خوش ہو کر پوچھا۔ ''کیا میں اسے اپنے پاس رکھ لوں؟''

''میں یہ تمہارے لیے ہی لائی ہوں۔ میں جانتی تھی' تمہارا اپنا فون گم ہو چکا ہو گا۔ آئندہ تم سے رابطہ رکھنے کے لیے میں بہت کچھ سوچ کر آئی ہوں۔''

وہ مجھے فون کو استعمال کرنے کے سلسلے میں بہت سی اہم باتیں سمجھانے لگی۔ جب میں اچھی طرح سمجھنے لگا تو اس نے اپنا فون نمبر بتا کر کہا۔ ''میرا نمبر پنچ کرو۔''

میں نے نمبر پنچ کیے تو اس کے فون سے کالنگ ٹون سنائی دینے لگی۔ میں نے خوش ہو کر کہا۔ ''وہ دیکھو، رابطہ ہو گیا۔''

اس نے کہا۔ ''فرض کرو کہ میں تمہارے سامنے نہیں ہوں۔ یہی بات فون پر کہو۔''

میں نے فون کو کان سے لگا کر اس سے باتیں کیں۔ پھر خوش ہو کر کہا۔ ''اب میں دن رات تم سے باتیں کرتا رہوں گا۔''

اس نے کہا۔ ''تم کال کرو گے اور گھر والوں کو معلوم ہو گا تو مجھ سے فون چھین لیا جائے گا۔ یہ بات اچھی طرح یاد رکھو۔ جب میں کال کروں گی، تب ہی مجھ سے باتیں کر سکو گے اور مجھے آدھی رات کے بعد تنہائی میں کال کرنے کا موقع ملا کرے گا۔''

اس کی تمام باتیں سن کر میں سمجھ گیا کہ میرے اور اس کے بزرگ ہمارا میل جول پسند نہیں کریں گے۔ ہمیں دنیا والوں سے چھپ کر باتیں کرنی ہوں گی۔ اس نے مجھے فون کا چارجر دیا اور اسے بھی استعمال کرنے کا طریقہ سمجھایا پھر کہا۔ ''اب میں چلتی ہوں۔''

میں نے ان لمحات میں دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا کہ وہ چلی جائے گی تو مجھے یہ کمرا خالی خالی سا لگے گا۔ میں نے کہا۔ ''تم چلی جاؤ گی تو مجھے اچھا نہیں لگے گا۔''

وہ بولی۔ ''میں چاہتی ہوں' میرے جانے کے بعد بھی مجھے اس کمرے میں محسوس کرو۔ جب میں فون پر باتیں کروں تو تصور میں اپنے سامنے دیکھتے رہو۔''

وہ جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ میں بھی کرسی سے اٹھ گیا۔ وہ بولی۔ ''آج تک ہم دور ہی دور سے ملتے رہے۔ میں نے کبھی ہاتھ پکڑنے کا موقع نہیں دیا۔''

پھر اس نے دایاں ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آج مجھے چھو لو۔ اس ہاتھ کو تھام لو۔ میں چاہتی ہوں جانے کے بعد ہر لمحہ تمہیں یاد آتی رہوں۔''

میں نے اس کے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ یوں لگا جیسے گلاب کی نرم ملائم پتیاں ہاتھوں میں آ گئی ہیں۔ اس کے لمس سے میں پگھل رہا تھا۔

اس نے بڑی آہستگی سے ہاتھ چھڑا لیا۔ وہ ہاتھ میرے ہاتھوں سے ایسے گیا، جیسے سینے سے دل اور جسم سے جان جاتی ہے۔ وہ دروازے تک گئی۔ پھر پلٹ کر مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہاری صحت یابی کے لیے دعا مانگتی رہوں گی۔''

وہ چلی گئی۔ میرے دونوں ہاتھ اسی طرح اٹھے ہوئے تھے جیسے اب تک میں نے اس کے ہاتھوں کو تھام رکھا ہو۔ وہ جانے کے بعد بھی میرے ہاتھوں میں محسوس ہو رہی تھی۔ جب ہم زندہ رہنے کے لیے میدانِ کارزار میں ہوں' دشمن ہر طرف سے حملے کر رہے ہوں اور ایسے میں محبت سر پر سایہ اور سینے پر ڈھال بن جائے تو دشمنوں سے لڑنے کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے۔

بہت کچھ بھول جانے کے بعد عینی نے آ کر سمجھا دیا کہ محبت زندگی کو خوبصورت بنا دیتی ہے۔ بہرحال، اب میں کانٹوں کی باتیں کروں گا۔ وہ لوگ مجھے مار ڈالنا چاہتے تھے لیکن مقدر سے جی رہا تھا۔ جیسے بھی جی رہا تھا، انہیں کاٹنے کی



طرح چبھ رہا تھا۔ انہیں اندیشہ تھا کہ میں پوری طرح صحت یاب ہو جاؤں گا، نیم پاگل نہیں کہلاؤں گا تو عینی کے والدین پھر مجھے داماد بنانے پر راضی ہو جائیں گے۔

امی نے تمام رشتے داروں سے کہہ دیا تھا کہ وہ لوگ ماں کی موجودگی میں بیٹے کی عیادت کے لیے اسپتال آسکتے ہیں۔ وہ کسی کو مجھ سے تنہائی میں ملنے کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔ لیکن چھپ کر آنے والے آ ہی جاتے تھے کیونکہ وہ دن رات میرے ساتھ اسپتال میں نہیں رہ سکتی تھیں۔ دو چار گھنٹوں کے لیے گھر جاتیں تو میں یہاں تنہا رہ جاتا تھا۔ ایک دن ان کی غیر موجودگی میں کاچھی اور باسو پہلوان میرے کمرے میں آ گئے۔

میں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔ وہ دونوں ہنسنے لگے۔ باسو نے کہا۔ ''یہ ہم کو پہچان نہیں رہا ہے۔''

کاچھی نے کہا۔ ''جب یو پہلی بار ہوش میں آیا تھا اور بولنے کے قابل ہوا تھا، تب اپنی پیدا کرنے والی ماں کو بھی نہیں پہچان رہا تھا۔ پھر ماں نے سمجھایا، اپنی پہچان کرائی۔''

باسو پہلوان نے اپنے بازو کے مسلز پھلاتے ہوئے کہا۔ ''آج یہ ہم کو ابا کہے گا۔ را کا چھی! اس کو ہماری پہچان کرا دے۔''

میں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ کاچھی نے میرے قریب آ کر آنکھوں کے سامنے ہتھیلی پھیلائی پھر پانچوں انگلیوں کو لہراتے ہوئے پوچھا۔ ''گنتی یاد ہے تنے یا بھول گیا؟ یو کتنی انگلیاں ہیں؟''

مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ پہلے کبھی انہیں دیکھا ہے۔ میرے دیدے اس کی لہراتی ہوئی انگلیوں کے ساتھ ساتھ ادھر اُدھر ہو رہے تھے۔ میں نے معصومیت سے کہا۔ ''ڈاکٹر نے ایک سے دس تک گنتی پڑھائی تھی۔ یہ... یہ تمہاری پانچ انگلیاں ہیں۔''

کاچھی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ارے! اس کو تو گنتی یاد ہے۔ چل... آج سے یہ بھی یاد رکھ کہ تیرے دو باپ ہیں۔ ایک میں ہوں۔''

باسو پہلوان نے سینہ تان کر کہا۔ ''دوسرا میں ہوں۔ آج تجھے دن میں تارے دکھاؤں گا۔''

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کیا دن کی روشنی میں ستارے دکھائی دیتے ہیں؟''

اس نے میرے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر ایک جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ ''اس کمرے میں تو بہت کچھ دیکھے گا۔''

میں نے اپنے بالوں کو اس کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''پیچھے ہٹو۔ یہ کیسی حرکتیں کر رہے ہو؟''

کاچھی نے کہا۔ ''ہم باپ ہیں۔ بیٹے کی پٹائی کرنے آئے ہیں۔''

شکوریا نے دروازے پر آ کر کہا۔ ''یہ دونوں تمہارے باپ ہیں اور میں تمہارا بہنوئی ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''جھوٹ بولتے ہو۔ میرا بہنوئی حشمت ہے۔ میری بہن چھانو نے پہچان کرائی ہے۔ اسے اپنا خاوند اور میرا بہنوئی کہا ہے۔''

شکوریا نے کمرے میں آ کر پوچھا۔ ''یاد ہے تُو نے فون پر کہا تھا' عینی تیرے لیے پیدا ہوئی ہے۔ تو اُس سے شادی کرے گا اس لیے ہم اسے اپنی بہن بنا لیں... اب اس بات کا جواب دینے آیا ہوں۔ آج سے تُو اسے اپنی بہن کہے گا۔ میں اس سے شادی کرنے کے بعد تیرا بہنوئی کہلاؤں گا۔''

کاچھی نے کہا۔ ''اسے یہ بھی بتا دے کہ عینی سے شادی کیسے ہووے گی؟''

باسو پہلوان نے کہا۔ ''تُو کیا سمجھتا ہے، ہم تینوں ایک چھوری کو دلہن بنانے کے لیے آپس میں لڑیں گے؟ نہ رے... یہ نہیں ہووے گا۔''

شکوریا نے کہا۔ ''ہم تو بڑے پیار سے بڑی صلح صفائی سے اس کو حاصل کریں گے۔ ہم تینوں اس کے نام کی پرچیاں اٹھائیں گے۔ جس کے نام سے پرچی نکلے گی، وہ بیاہ کا پیغام بھیجے گا۔ پھر اسے دلہن بنا کر گھر لے جائے گا۔ ایک ماہ تک موج کرے گا پھر اسے طلاق دے دے گا۔''

کاچھی نے کہا۔ ''پھر دوسرا اس مطلقہ سے بیاہ رچائے گا۔ ہم تینوں کے بیچ یہ طے ہو چکا ہے کہ تجھ سے پیار کرنے والی کتیا کو ایک ماہ سے زیادہ اپنے پاس نہیں رکھیں گے۔''

میں ایک دم سے تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔ ''اے خبردار! اسے گالی نہ دینا۔ نہیں تو...''

''نہیں تو کیا کرلے گا تُو؟''

ایک نے میرے منہ پر الٹا ہاتھ رسید کیا۔ میں جواباً اس پر ہاتھ اٹھانا چاہتا تھا مگر ان میں سے دونے دو طرف سے مجھے جکڑ لیا۔ تیسرا مجھے گھونسے مارنے لگا۔ پھر باسو پہلوان نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ادھر کوئی بھی آسکتا ہے۔ اسے غسل خانے میں لے چلو۔''

وہ سب مجھے کھینچتے ہوئے دھکا دیتے ہوئے ٹوائلٹ میں لے آئے۔ باسو نے کہا۔ ''اس کے لیے میں اکیلا کافی ہوں۔

تم دونوں باہر محتاط رہو۔ کوئی آئے تو مجھے بتا دینا۔''

وہ دونوں باہر ہو رہے۔ باسو پہلوان نے دروازے کی چٹخنی لگائی پھر اس کے ہینڈل کا بٹن دبا کر لاک کر دیا۔ ''یہاں سے تیرا باپ بھی باہر نہیں جاوے گا۔''

میں نے کہا۔ ''پہلے سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کر رہے ہو؟ اب سمجھ رہا ہوں۔ تم سب میری عینی کے دشمن ہو۔''

پہلوان نے خم ٹھونک کر میری گردن پر ہاتھ رکھا۔ پھر جانے کیسا داؤ مارا کہ میں اس کے سامنے سے سر کے بل الٹ کر دوسری طرف جا گرا۔ وہ پھر خم ٹھونک کر بولا۔ ''چل اٹھ! تُو نے فون پر کہا تھا' مجھ سے لڑنے کے لیے اکھاڑے میں آئے گا۔ سالے...! یہاں سے نکل کر پیروں پر کھڑے رہنے کے قابل رہے گا تو اکھاڑے میں آئے گا نا۔''

میں فرش پر سے اٹھ کر کھڑا ہو رہا تھا۔ اس بار اس نے ایسا داؤ مارا کہ میں اس کی پیٹھ اور شانے پر سے ہوتا ہوا اس کے آگے فرش پر چاروں شانے چت ہو گیا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میں اسی طرح عینی کو چت کروں گا۔ پھر اس کی عزت کی دھجیاں...''

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں نے گرج کر کہا۔ ''اپنی گندی زبان سے اس کا نام مت لے۔ نہیں تو تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

''تُو سالا مٹی میں رینگنے والا کیڑا مجھے للکار رہا ہے۔''

میں فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس نے میرے منہ پر لات مارنی چاہی۔ میں نے اس کی ٹانگ پکڑ لی۔ وہ خود کو چھڑانے کے لیے دوسری ٹانگ پر اچھلنے لگا۔ میں نے دوسری ٹانگ پر ٹانگ ماری تو وہ قریب ہی فرش پر گر پڑا۔ آخر پہلوان تھا۔ جسے کمزور سمجھ رہا تھا، اس کے مقابلے میں کمزور پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے فوراً اٹھنا چاہا مگر اس سے پہلے ہی میں نے اس کی گردن دبوچ لی۔

میں نے بڑے زخم کھائے تھے۔ دو ماہ سے اسپتال میں زیرِ علاج تھا۔ ایک پہلوان سے مقابلہ کرنے والی جسمانی توانائی نہیں تھی مگر حوصلہ تھا۔ عینی کے لیے تڑپا دینے والے جذبات تھے۔ میں اس کے خلاف کوئی گندی بات سن نہیں سکتا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن اس طرح دبوچ رکھی تھی کہ وہ خود کو چھڑا نہیں پا رہا تھا۔

اس کی سانسیں رک رہی تھیں۔ حلق سے ''اونک اونک'' کی پھنسی پھنسی آوازیں نکل رہی تھیں۔ باہر وہ دونوں دروازے سے لگے کھڑے تھے۔ شکور یا نے کہا۔ ''بڑے بھائی باسو! معلوم ہووے ہے' تیں اس کا گلا دبا رہا ہے۔ دیکھ... جان سے نہ مارنا۔ ورنہ ہم سب قتل کے کیس میں دھر جاویں گے۔''

میں شاید اسے مار ہی ڈالتا۔ اس کی گردن کبھی نہ چھوڑتا مگر شکور یا کی بات سن کر یہ عقل آئی کہ کسی کو جان سے نہیں مارنا چاہیے۔ میں اسے چھوڑ کر فرش پر سے اٹھ گیا۔ وہ اپنے حلق کو سہلاتے ہوئے کھانس رہا تھا۔ لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔ میں نے اس کے منہ پر زور کی لات ماری مگر مجھ بیمار کی لات زوردار نہیں تھی۔ وہ فرش پر سے اٹھنے لگا۔ میں نے پانی سے بھری ہوئی بالٹی اس کے سر پر دے ماری۔ اس کے حلق سے کراہ نکلی۔ باہر سے کاچھی نے کہا۔ ''ارے یہ تو پہلوان کی آواز ہے۔ بھائی باسو! وہاں کیا ہو رہا ہے؟''

وہ ایک ہاتھ سے سر تھامے اور دوسرا ہاتھ فرش پر ٹیک کر اٹھ رہا تھا۔ میں نے کموڈ صاف کرنے والا برش اٹھا کر اس کے سر پر یکے بعد دیگرے کئی ضربیں لگائیں۔ وہ چیختا ہوا اور لڑکھڑاتا ہوا بند دروازے سے جا ٹکرایا۔

شکور یا نے پوچھا۔ ''بھائی باسو! کیوں چیخ رہا ہے؟ کیا وہ بھاری پڑ رہا ہے؟ دروازہ کھول... ہم آ کر اس کی ایسی کی تیسی کر دیں گے۔''

باسو پہلوان دروازے کی طرف منہ کیے تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ دروازہ کھولنے کے لیے اپنا ہاتھ ہینڈل کی طرف لے جا رہا تھا۔ میں نے اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر ایک زور کا جھٹکا دیا اور سر کو دروازے پر دے مارا۔ اس کے حلق سے چیخیں نکلنے لگیں۔

اس کے دونوں ساتھی باہر تڑپ رہے تھے۔ دروازہ پیٹ رہے تھے اور جھنجلا کر کہہ رہے تھے۔ ''بلال! دروازہ کھول۔ نہیں تو ہم توڑ کر اندر آئیں گے اور تیرا سر توڑ ڈالیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''تم سب عینی کو بہن بولو۔ نہیں تو یہ زندہ باہر نہیں نکلے گا۔''

پہلے بھری ہوئی بالٹی نے اس کے سر کے بارہ بجائے تھے۔ پھر کموڈ کے برش سے پے در پے حملے ہوتے رہے تھے۔ دروازے سے ٹکرانے کے باعث اس کی ناک اور باچھوں سے لہو رسنے لگا تھا۔ میں نے اس کے بالوں کو ایک بار پھر مٹھی میں جکڑ کر جھٹکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا آگے جا کر کھلے ہوئے کموڈ پر گر پڑا۔ پھر گردن پر ہاتھ پڑتے ہی اس کا منہ



کموڈ کے اندر چلا گیا۔

باہر سے کئی لوگوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پوچھا جا رہا تھا۔ ''یہاں کیا ہو رہا ہے؟ ٹوائلٹ کا دروازہ کیوں پیٹ رہے ہو؟''

وہ دونوں کہہ رہے تھے۔ ''کسی طرح دروازے کو توڑو۔ بلال پر دورہ پڑا ہے۔ ہم اس کی عیادت کے لیے آئے تھے۔ وہ پاگل ہمارے بھائی کو اندر لے جا کر مار ڈالنا چاہتا ہے۔''

میں باسو کے سر کو کموڈ میں گھسا کر اس کی گردن اور پیٹھ پر گھونسے اور لاتیں مار رہا تھا۔ باہر سے دروازے پر یوں دھکے مارے جا رہے تھے جیسے وہ اسے توڑ ڈالنا چاہتے ہوں۔ وہ سب مجھے دروازہ کھولنے کو کہہ رہے تھے۔ میں نے ایسے وقت امی کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ ''بلال! میرے بیٹے... دروازہ کھول۔ یہ تجھے پاگل سمجھ رہے ہیں۔ ماں کی بات مان لے بیٹا! دروازہ کھول دے۔''

میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ میرے کمرے میں بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ شکور یا اور کاچھی نے حیرانی سے باسو کو دیکھا۔ اس کا منہ کموڈ کے اندر تھا۔ وہ اس پر اوندھا پڑا ہوا تھا۔ ہوش میں رہنے کے باوجود وہاں سے اٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ شکور یا اور کاچھی نے ایک وارڈ بوائے کے ساتھ جا کر اسے وہاں سے اٹھایا۔ پھر سہارا دے کر کمرے میں لے آئے۔

ایک ڈاکٹر بھی وہاں آ گیا تھا۔ وہ دونوں قسمیں کھا کر کہہ رہے تھے۔ ''بلال ہمارا بھائی ہے۔ ہم یہاں مزاج پرسی کے لیے آئے تھے۔ اچانک اس پر دورہ پڑا۔ ہم دونوں بھائی اس وقت کمرے میں نہیں تھے۔ بھائی باسو کے چیخنے کی آواز سن کر یہاں آئے تو نسل خانے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ یہ تینوں مجھے مارنے .... کے لیے آئے تھے۔ باسو نے مجھے ٹوائلٹ میں لے جا کر دروازے کو اندر سے بند کیا تھا۔''

شکور یا نے کہا۔ ''یہ کیسی الٹی باتیں کر رہا ہے؟ بھائی باسو اسے مارنے کے لیے وہاں لے گیا تھا تو خود کیوں مار کھا کر آیا ہے؟''

کاچھی نے کہا۔ ''دراصل یہ بلال کو بہت چاہتا ہے۔ اسی لیے پہلوان ہو کر بھی اس پر ہاتھ نہیں اٹھا رہا تھا۔ لاڈ پیار سے سمجھا رہا ہوگا۔''

میں نے غصے سے کہا۔ ''تم سب کتے ہو' کمینے ہو۔ جھوٹ بولو گے تو تم دونوں کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

ڈاکٹر نے میرے سامنے ڈھال بن کر شانے کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''ایزی بلال ایزی! تمہیں غصہ نہیں کرنا چاہیے۔ گالیاں نہیں دینی چاہئیں۔ میرے ساتھ آؤ۔ میرے چیمبر میں چلو۔ میں تمہیں سکون پہنچانے والی دوائیں کھلا دُں گا۔''

شکور یا اور کاچھی ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق باسو کو مرہم پٹی کے لیے لے گئے۔ میں امی کے ساتھ چیمبر میں آیا۔ میری بہن اور بہنوئی بھی وہاں آ گئے۔ ڈاکٹر نے مجھے ایک دوا کھانے کو دی۔ میں نے اسے کھانے کے بعد کہا۔ ''آپ یقین کریں' مجھ پر دورہ نہیں پڑا تھا۔ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔''

ڈاکٹر نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''آرام سے بیٹھو اور میرے سوالوں کے جواب دو۔ تمہیں بے خوابی کی شکایت ہے؟ بھوک نہیں لگتی؟''

''جی ہاں۔ ذرا دیر کے لیے آنکھ لگتی ہے پھر جاگ جاتا ہوں۔ بھوک بڑھانے کی دوائیں بھی کھا رہا ہوں۔''

''تمہیں غصہ جلدی آتا ہے؟''

''نہیں۔ انہوں نے غصہ دلایا تھا۔''

''کوئی مجھے غصہ دلائے' تمہاری امی کو غصہ دلائے تو ہم برداشت کرتے ہیں۔ تم مانو یا نہ مانو۔ کوئی بات تمہارے مزاج کے خلاف ہو تو ایک دم سے بھڑک جاتے ہو۔ مار پیٹ پر اتر آتے ہو۔''

میں نے تھوڑی دیر پہلے باسو پہلوان کی پٹائی کی تھی۔ ڈاکٹر کو معقول جواب نہ دے سکا۔ اس نے کہا۔ ''اب سے پہلے تم نے ایک بار کھانے کے برتن پھینک دیے تھے۔ ہم تمہاری اسٹڈی کرتے رہتے ہیں۔ تم دو بار نیند میں کسی کو گالیاں دے چکے ہو۔''

میں بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ امی نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تھپتھپایا پھر کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! بے شک اسے غصہ آتا ہے مگر آپ نہیں جانتے' وہ تینوں میرے بیٹے کے دشمن ہیں۔''

وہ بولا۔ ''ہم سب کی زندگی میں دوست بھی ہوتے ہیں اور دشمن بھی۔ ہم یہاں دماغی مریضوں کو دشمنوں سے جھگڑا کرنے نہیں، سہولت سے کترانے کی ہدایات اور مشورے دیتے ہیں۔ آپ کے صاحبزادے مالیخولیا SCHIZOPHRENIA میں مبتلا ہیں۔ میں نے ابھی جتنے سوالات کیے تھے' ان کا تعلق اسی مرض سے ہے۔''

امی نے پریشان ہو کر مجھے دیکھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ''آپ

خود دیکھتی ہیں، یہ کبھی مسلسل خاموش رہتے ہیں اور جب بولتے ہیں تو بولتے ہی چلے جاتے ہیں۔ یہ اپنے عزیزوں اور رشتے داروں پر شبہ کرتے ہیں۔ انہیں اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ یہ سب مالیخولیا کی علامتیں ہیں۔''

میرے سر کا آپریشن ہونے کے بعد زخموں کا علاج ہوتا رہا۔ پھر مجھے نفسیاتی اسپتال میں داخل کرایا گیا۔ پچھلے روز ڈاکٹر نے کہا تھا۔ ''مسٹر بلال اب پُرسکون رہنے لگے ہیں۔ دماغی کمزوری کے باعث مالیخولیا کے اثرات ظاہر ہوتے رہیں گے لیکن یہ خطرناک مریض نہیں ہیں۔ آپ جب چاہیں، انہیں گھر لے جا کر علاج جاری رکھ سکتے ہیں۔''

ڈاکٹر نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آج تم پر خطرناک دورہ پڑا ہے۔ اگر آئندہ بھی یہ شدت رہے گی تو تم کسی کی جان بھی لے لوگے۔ سوری ٹو سے... ابھی تمہیں چھٹی نہیں ملے گی۔ مزید ایک ہفتے تک تمہیں آبزرویشن میں رکھا جائے گا۔''

عجیب صورتِ حال تھی۔ وہ تینوں مجرم تھے۔ انہیں سزا ملنی چاہیے تھی کیونکہ وہ نفسیاتی اسپتال میں نہیں تھے، اس لیے مجرمانہ حرکتیں کرنے کے باوجود نارمل کہلا رہے تھے اور مجھ پر ایب نارمل ہونے کی مہر لگا دی گئی تھی۔

میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ امی نے سمجھایا۔ ''آئندہ وہ تینوں آئیں تو ان کے منہ نہ لگو۔ فوراً کسی نرس یا وارڈ بوائے کو آواز دو۔ تمہارے پاس فون ہے۔ مجھے اطلاع دے سکتے ہو۔ میں دوڑی چلی آؤں گی۔''

میری بہن چھانو نے کہا۔ ''آپ خاموشی سے امن و امان سے رہیں گے تو ڈاکٹروں کی رپورٹ آپ کے حق میں ہوگی۔ پھر کوئی آپ کو ایب نارمل یا خبطی نہیں کہے گا۔''

میرے بہنوئی حشمت نے بھی یہی سمجھایا کہ مجھے غصہ برداشت کرنا چاہیے لیکن تنہائی میں اس نے بڑی رازداری سے کہا۔ ''یہ عورتیں ہمیشہ بزدلی کی باتیں سمجھاتی ہیں۔ دشمنوں سے ڈر کر اور دب کر رہنا سکھاتی ہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ ایک ہفتے بعد گھر آؤ گے تو میں تمہیں دشمنوں کی کمزوریاں بتاؤں گا۔ پھر تم بہ آسانی ان سے نمٹ سکو گے۔''

ڈاکٹر اور امی وغیرہ مجھے غصہ، نفرت اور لڑائی جھگڑے سے باز رکھنا چاہتے تھے مگر حشمت تنہائی میں دشمنوں کے خلاف بھڑکاتا رہتا تھا۔ اسے یقین ہوگا کہ میں کسی دن کسی کے ہاتھوں مارا جاؤں گا۔

ہم نصیحتیں کرنے والوں اور مشورے دینے والوں سے متاثر ہوتے ہیں مگر ان کی اچھی بُری نیتوں کو سمجھ نہیں پاتے۔ میں خود کو اچھی طرح سمجھنے کے قابل نہیں تھا۔ اس لیے حشمت کی بزرگانہ نصیحتوں کے پیچھے چھپی ہوئی سازشوں کو سمجھ نہیں سکا تھا۔

ایسے مخالف اور دشمن حالات سے گزرنے کے دوران میرے اندر ایک خوشی چھپی ہوئی تھی کہ رات کو کسی وقت عینی کی رس بھری آوازسنوں گا اور اس سے ڈھیر ساری باتیں کروں گا۔ یہ طلسمِ محبت تھا کہ میرا حافظہ کمزور ہونے کے باوجود وہ میرے اندر کہیں چھپ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک بار سامنے آتے ہی وہ ریا کی لہروں کی طرح بہائے لیے جا رہی تھی۔

اس کے انتظار میں مجھ سے رات کا کھانا کھایا نہ گیا۔ میں بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ گیارہ بج گئے۔ اس نے فون نہیں کیا۔ پھر بارہ بج گئے۔ میں دل کو سمجھانے لگا۔ ''شاید اس کے گھر والے جاگ رہے ہوں گے۔ اسے موقع نہیں مل رہا ہوگا۔''

میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ اچانک ہی اس خیال نے پریشان کیا کہ وہ دشمن میرے ہاتھوں ذلیل ہو کر گئے ہیں۔ کہیں انتقام لینے کے لیے اسے اور اس کے گھر والوں کو پریشان نہ کر رہے ہوں۔

میں اس کی خیریت معلوم کرنے کے لیے اضطراب میں مبتلا ہو گیا۔ ادھر سے اُدھر ٹہلنے لگا۔ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے ملنے کے بعد اسی شہر میں ہے یا چک چلی گئی ہے؟ میں امی کے ذریعے اس کی خیریت معلوم کر سکتا تھا۔

میں نے سرہانے رکھے فون کو اٹھا کر دیکھا۔ اسے اب تک استعمال نہیں کیا تھا۔ یاد کرنے لگا کہ عینی نے کس طرح رابطہ کرنا سکھایا تھا؟ میں اس فون کو دیکھ کر سوچنے اور سمجھنے لگا۔ ایسے ہی وقت چونک گیا۔ کالنگ ٹون سنائی دے رہی تھی۔ میں نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔ پھر پوچھا۔ ''عینی! تم ہو...؟''

اس کی دھیمی سی رس بھری آواز سنائی دی۔ ''ہاں۔ میں بول رہی ہوں۔''

''جب سے گئی ہو، تب سے فون کو بار بار دیکھ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا، تم بولنے ہی والی ہو۔''

''میں نے کہا تھا' آدھی رات سے پہلے کال نہیں کر سکوں گی۔۔۔ ابھی گھر والوں کی آنکھ لگی ہے۔ میں کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے بول رہی ہوں۔''

''کیا تم لاہور میں ہو؟''

''نہیں۔ یہاں اپنی حویلی میں ہوں۔ باسو' شکوریا اور کاچھی کے گھر والے آئے تھے۔ تمہارے خلاف بول رہے تھے۔ کیا واقعی تم پر دورہ پڑا تھا اور تم نے باسو کو مار مار کر زخمی کیا ہے؟''

''میں کیا کہوں؟ ڈاکٹر بھی یہی کہتا ہے کہ مجھے دورہ پڑا تھا۔ یقین کرو، تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ انہوں نے غصہ دلایا تھا۔ تمہارے بارے میں گندی باتیں کہہ رہے تھے۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں نے باسو پہلوان کی ساری پہلوانی نکال دی۔''

''میں مانتی ہوں، تمہیں غصہ آیا ہوگا۔ گالیاں سن کر یا مزاج کے خلاف کوئی بات سن کر سب ہی کو غصہ آتا ہے مگر سب مار پیٹ نہیں کرتے۔ یہاں جس کو دیکھو، وہ یہی کہہ رہا ہے کہ تم پر خطرناک دورہ پڑا تھا۔ اگر تمہاری امی وہاں نہ پہنچتیں تو تم باسو کو مار ہی ڈالتے۔''

''میں آئندہ بھی اسے نہیں چھوڑوں گا۔ سب ہی مجھے الزام دے رہے ہیں۔ کوئی اسے نہیں سمجھاتا کہ وہ تمہارے بارے میں گندی باتیں نہ کرے۔ مجھے غصہ دلانے والی کوئی بات نہ بولے۔''

''لوگ اپنی غلطیوں کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ تمہیں ہی الزام دیتے رہیں گے۔ یہ ثابت کرتے رہیں گے کہ تم پورے پاگل نہ سہی، آدھے ہو۔ خطرناک ہو۔ میری بات مانو۔ کبھی ان کا سامنا نہ کرو۔ کبھی ان سے بات نہ کرو۔ کیچڑ سے دور رہو گے تو تم پر چھینٹے نہیں پڑیں گے۔''

''امی نے بھی یہی سمجھایا ہے۔ تم بھی یہی کہہ رہی ہو۔ میں ان سے دور رہنے کی کوشش کروں گا۔ وہ میری طرف آئیں گے تو ان سے کترا کر نکل جاؤں گا۔''

''تم بہت اچھے ہو۔ اچھی باتیں سمجھ لیتے ہو۔ اسی طرح سمجھتے ہوئے اور عمل کرتے ہوئے یہ ثابت کرتے رہو کہ ایب نارمل نہیں ہو۔''

''تم مجھ سے روز بولتی رہو پھر مجھ سے جو کہو گی، وہی کرتا رہوں گا۔ ڈاکٹر نے کہا ہے' ایک ہفتے بعد یہاں سے چھٹی ملے گی۔ میں سیدھا اپنے چک آؤں گا۔ تمہارے بہت قریب پہنچ جاؤں گا۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''ہم تو بچپن سے ہی قریب رہے ہیں۔ ایک ہی گاؤں میں ہنستے کھیلتے جوان ہوئے ہیں۔ یہ نہیں جانتے تھے کہ ہمارے ساتھ ساتھ عداوتیں بھی جوان ہوتی رہیں گی۔ دو ماہ پہلے میرے بزرگوں نے تمہارے حق میں فیصلہ کیا تھا مگر اب وہ فیصلہ بدل رہے ہیں۔''

''میں وہاں آ کر ان کے سامنے سر جھکاؤں گا۔ ان کی ہر بات مانوں گا۔ وہ جو کہیں گے' وہی کروں گا۔ تمہیں پانے کے لیے اپنا سب کچھ ہار جاؤں گا۔ کیا پھر بھی وہ مجھے گلے نہیں لگائیں گے؟''

''تم خدا پر بھروسا کرو اور ہر حال میں خود کو نارمل ثابت کرتے رہو۔ انشاء اللہ... ہمارے دل کی مرادیں ضرور پوری ہوں گی۔''

میں دماغی طور پر کمزور تھا۔ یہ سمجھ نہیں پاتا تھا کہ کس طرح مجھ سے اچانک ہی غلطی سرزد ہو جاتی ہے اور کس طرح مجھے بے سرو پا باتیں کرنے اور بے تکی حرکتیں کرنے کے سلسلے میں بھڑکایا جاتا ہے' ایسے وقت عینی مجھے ڈوبنے سے بچانے کی کوششیں کر رہی تھی۔

وہ ہر رات مجھ سے فون پر باتیں کرتی رہی۔ میرا حوصلہ بڑھاتی رہی۔ میں ڈاکٹروں کے سامنے ہنستا بولتا تھا۔ خوب سوچ سمجھ کر ان سے گفتگو کرتا تھا۔ یوں میں نے ایک ہفتے میں ان کا اعتماد حاصل کر لیا۔ پھر میڈیکل رپورٹ کے مطابق مجھے اسپتال سے چھٹی مل گئی۔ میں اس گاؤں میں چلا آیا جہاں کی فضا میں عینی کی سانسیں رچی بسی ہوئی تھیں۔ ہمارے مکانات زیادہ فاصلے پر نہیں تھے۔ ہوائیں اس کے بدن کو چھو کر سیدھی میرے پاس چلی آتی تھیں۔

☆☆☆

میں چھانو اور حشمت کے ساتھ لاہور سے اوکاڑہ آیا۔ وہاں سے ایک تانگے میں بیٹھ کر چک پینتالیس میں پہنچا تو لوگوں کا ہجوم دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ بات گھر گھر پہنچی ہوئی تھی کہ میں پاگل ہو گیا ہوں۔ ابھی ایک ہفتہ پہلے میں نے باسو پہلوان کو مار ڈالنا چاہا تھا۔ لہٰذا ایک پاگل کو دیکھنے کے لیے پورا گاؤں اُمڈ آیا تھا۔

امی نے میرے صحت یاب ہونے اور گھر آنے کی خوشی میں دیگیں پکوائی تھیں۔ پورے گاؤں کو کھانے کی دعوت دی تھی۔ کھانا رات کو تھا مگر تمام مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے دن کی روشنی میں دیکھنے چلے آئے تھے کہ میں پاگل ہونے کے بعد کیسا دکھائی دیتا ہوں؟ کیا میں کاٹنے دوڑتا ہوں یا مجھے زنجیروں سے باندھ کر لایا جا رہا ہے؟

وہاں میرے خلاف طرح طرح کی باتیں پھیلائی گئی تھیں۔ اب وہ سب ہی مجھے دیکھ کر مایوس ہو رہے تھے کیونکہ میں روایتی پاگل نہیں لگ رہا تھا۔ خاندان کے بزرگوں سے مسکرا کر گلے مل رہا تھا۔ امی ان سے پہچان کروا رہی تھیں۔ وہ سب میرے سر پر ہاتھ پھیر کر مجھے دعائیں دے رہے تھے کہ

میری یادداشت جلد... بحال ہوجائے اور میں وہاں کے ایک ایک بندے کو اور ایک ایک چیز کو متعارف کیے بغیر پہچانتا رہوں۔

ایسے ہی وقت گولی چلنے کی زوردار آواز سنائی دی۔ سب نے چونک کر ادھر دیکھا۔ باسو پہلوان ہاتھوں میں گن لیے اپنے مکان کی چھت پر کھڑا تھا۔ ہم سب کے مکانات پچاس گز اور سو گز کے فاصلوں پر تھے۔ ہم چھت پر چڑھ کر بہت دور تک دیکھ سکتے تھے۔ فائرنگ رینج پر تھے۔ نفرت سے ایک دوسرے پر گولیاں بھی چلا سکتے تھے۔

جو لوگ مجھے تماشا سمجھ کر دیکھنے آئے تھے، وہ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ یہ نہیں جانتے تھے کہ وہاں موت کا تماشا شروع ہوجائے گا۔ ویسے یہ سب جان گئے تھے کہ ہم پھوپھی زاد، ماموں زاد اور چچازاد کے درمیان نفرتیں اور عداوتیں بڑھ گئی ہیں۔ اب ہم میں سے کوئی خونِ خرابے سے باز نہیں آئے گا۔

گولی چلتے ہی امی مجھے کھینچتی ہوئی ایک دیوار کی آڑ میں لے گئیں۔ میں نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''میں بزدل نہیں ہوں۔ کیا ہمارے گھر میں بندوق نہیں ہے؟''

چھانو نے کہا۔ ''ہے، پر تم کو پھر سے سمجھانا ہوگا، سکھانا ہوگا کہ اسے کیسے چلایا جاتا ہے؟''

میں نے امی سے کہا۔ ''آپ فوراً بندوق لے آئیں۔ بھائی حشمت مجھے بندوق چلانا سکھادیں گے۔''

حشمت یہی چاہتا تھا کہ ایک نیم پاگل کے ہاتھ میں ہتھیار آجائے۔ اس نے کہا۔ ''بلال ٹھیک کہتا ہے۔ دشمن کے پاس ہتھیار ہو تو ہمیں خالی ہاتھ نہیں رہنا چاہیے۔ اس کم بخت باسو نے بلال پر رحم کھانے کے لیے گولی نہیں چلائی ہے۔''

ایک بزرگ نے کہا۔ ''باسو نے اُدھر سے گولی نہیں چلائی ہے۔ ہوائی فائر کیا ہے۔''

حشمت نے کہا۔ ''ہم بھی ہوائی فائر کریں گے۔ وہ ہتھیاروں کی نمائش کررہا ہے۔ ہم بھی نمائش کریں گے۔ میں ابھی بندوق لے کر آتا ہوں۔''

وہ تیزی سے پلٹ کر مکان کے اندر چلا گیا۔ دائیں بائیں اور بالکل سامنے ان تینوں کے مکانات تھے۔ شکوریا، کاچھی اور باسو پہلوان اپنے اپنے گھر کی چھت پر گنیں اٹھائے تن کر کھڑے ہوئے تھے۔ باسو نے کہا۔ ''یہاں سب دیکھ رہے ہیں۔ سب ہی چشم دید گواہ ہیں۔ ہم نے کسی پر گولی نہیں چلائی ہے۔ ہم تو پرندے مار رہے ہیں۔''

کاچھی نے کہا۔ ''پرندے کبھی اُونچے اڑتے ہیں۔ کبھی نیچے آتے ہیں۔ ایسے وقت ہم گولی چلائیں گے تو وہ نیچے آئے گی۔ کسی بندے کو لگے گی تو یہ ہماری ذمے داری نہیں ہوگی۔''

ایک بزرگ نے کہا۔ ''شکار کھیلنا ہے تو کھیتوں، جنگلوں میں جاؤ۔ تم گولیاں چلاتے رہو گے تو کیا ہم گھروں میں گھس کر بیٹھے رہیں گے؟''

شکوریا نے کہا۔ ''او چاچا! گرمی نہ دکھا۔ گولی جس کے نصیب میں ہوگی، اسے ہی لگے گی۔ فکر نہ کر۔ آج تو دعوت شادت ہے۔ خوب مزے اڑاؤ۔''

حشمت ایک رائفل لے کر چھت پر آگیا۔ اس نے وہاں سے باسو پہلوان، شکوریا اور کاچھی کو اشارے سے کہا کہ وہ میرے ہاتھوں میں رائفل تھمانے جارہا ہے۔ انہوں نے مسکرا کر اسے شاباشی دی۔ وہ دوڑتا ہوا نیچے آگیا۔ مکان کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا میرے پاس آیا۔ میں نے لپک کر اس کے ہاتھوں سے رائفل لے لی۔

چھانو نے کہا۔ ''میرے بھائی کی بندوق لائے ہو۔ اپنے لیے کیوں نہیں لائے؟ کیا گھر میں چھپ کر بیٹھو گے؟''

حشمت نے کہا۔ ''تو جانتی ہے، میں نے نمائش کے لیے ایک بندوق رکھی ہے۔ آج تک کبھی ایک گولی نہیں چلائی۔''

میں اپنی رائفل کو..... دیکھ رہا تھا۔ یہ یاد آرہا تھا کہ اسے کس طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ میں نے کارٹریج نکال کر دیکھا۔ اس میں دو ہی گولیاں تھیں۔ میں نے پوچھا۔ ''یہ کیا؟ اس میں صرف دو ہی گولیاں ہیں؟''

حشمت نے کہا۔ ''میں نے جلدی میں نہیں دیکھا۔ ابھی گولیوں سے بھرا ہوا تھیلا لے کر آتا ہوں۔''

اس نے وہاں سے جاتے ہوئے امی کو دیکھا۔ وہ فون پر کسی سے کہہ رہی تھیں۔ ''میں نے پہلے ہی کہا تھا، میرے بیٹے کی جان کو خطرہ ہے۔ وہ تینوں اپنی اپنی چھتوں سے گولیاں چلا رہے ہیں۔ خدا کے لیے فوراً آجاؤ۔ دیر نہ کرو...''

حشمت یہ باتیں سنتا ہوا کمرے میں آیا۔ وہاں ایک بیگ میں میری رائفل کی بے شمار گولیاں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ بیگ اٹھا کر دوڑتا ہوا چھت پر آگیا۔

ان تینوں نے اپنی چھتوں پر سے اسے دیکھا۔ اس نے اشارے سے سمجھایا کہ میری امی تھانے دار کو فون کررہی ہیں۔ پولیس والے کسی وقت بھی ادھر آسکتے ہیں۔ وہ انہیں خطرات سے آگاہ کرتے ہی دوڑتا ہوا نیچے آگیا۔ آتے ہوئے میری امی سے بولا۔ ''یہ آپ نے اچھا کیا جو تھانے دار کو فون کردیا۔ ان بدمعاشوں کو پولیس والے ہی سیدھا کریں گے۔''



امی نے کہا۔ ''میں نے تھانے دار کو فون نہیں کیا ہے۔ ہم راجپوت ہیں۔ گولی کا جواب گولی سے دینا جانتے ہیں۔ ابھی ان تینوں کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوجائے گا۔''

چھانو دوڑی ہوئی آئی۔ پھر ہانپتی ہوئی بولی۔ ''بھائی نے گولی چلائی ہے۔ وہ بھولا نہیں ہے امی! اسے یاد ہے۔ وہ انہیں للکار رہا ہے۔''

میں مکان کے بیرونی حصے میں چھت کے نیچے ایک ستون کی آڑ میں کھڑا ہوا تھا۔ میں نے آزمائش کے طور پر ایک گولی چلائی تھی۔ پتا نہیں وہ کدھر گئی تھی؟ مگر وہ تینوں اِدھر اُدھر بھاگتے ہوئے چھپ رہے تھے۔ کاچھی کہہ رہا تھا۔ ''میں نے بلال کو دیکھا ہے۔ وہ ایک پلر کے پیچھے ہے۔ اِدھر گولیاں چلاؤ۔''

میں نے فوراً ہی جگہ بدل دی۔ وہاں سے دوڑتا ہوا مکان کے اندر آیا۔ حشمت نے گولیوں سے بھرا ہوا تھیلا میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''چھانو کہہ رہی تھی، تمہیں بندوق چلانی آتی ہے۔ تم نے ابھی گولی چلائی ہے۔''

میں اس سے بیگ لے کر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ امی نے پوچھا۔ ''کہاں جارہے ہو؟ کیا تمہیں یاد ہے، تمہارا کمرا کہاں ہے؟ پچھلا دروازہ کدھر ہے؟ اوپر جانے والی سیڑھیاں کہاں ہیں؟''

وہ بولتی ہوئی میرے پیچھے آرہی تھیں۔ میں ان کی راہنمائی کے بغیر مکان کے مختلف حصوں سے گزر رہا تھا۔ وہاں کا ایک ایک گوشہ جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ میں سیڑھیوں کے پاس پہنچ کر اوپر جانے لگا تو امی نے کھینچ کر کہا۔ ''اوپر نہ جاؤ۔ ان تینوں سے کھلا آمنا سامنا ہوگا۔''

میں نے پلٹ کر کہا۔ ''میری فکر نہ کریں۔ آپ ادھر نہ آئیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں، دشمنوں کا سامنا کرکے گولی کھانے کی حماقت نہیں کروں گا۔''

وہ جہاں تھیں، وہیں رک گئیں۔ میں دبے قدموں سیڑھیوں کے ایک ایک پائدان پر قدم رکھتا ہوا چھت کی طرف جانے لگا۔ باہر سے لوگوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ''خونِ خرابے سے باز آجاؤ۔ بلال اور تم تینوں پنچوں کے سامنے آؤ۔ ہم صلح صفائی کرائیں گے۔ ایسی دشمنی پہلے بھی کسی نے کسی سے نہیں کی۔ ہم یہاں کسی کا خون نہیں بہنے دیں گے۔''

باسو نے گرجتے ہوئے کہا۔ ''خون تو بہے گا۔ یہاں جو پاگل کتا آیا ہے، اسے گولی مارنے کے بعد پھر کسی سے جھگڑا نہیں کریں گے۔''

کاچھی اور شکوریا بھی اپنی چھتوں سے کہہ رہے تھے۔ ''بہنو اور بھائیو! تم نہیں جانتے، یہ پاگل کتا تمہاری عورتوں اور بچوں کو کس طرح کاٹے گا اور ہم اسے گولی مارنے سے پہلے پنچوں کی کوئی بات نہیں سنیں گے۔''

وہ قسمیں کھا رہے تھے کہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ یہ میں اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ اپنے علاقے میں رہنے کے لیے اپنی جائداد اور زمینیں سنبھالنے کے لیے ان سے فیصلہ کن جنگ لڑنی ہوگی۔ اس چک میں یا تو وہ زندہ رہیں گے یا میں سلامت رہوں گا۔

میں نے چھت تک پہنچنے والی سیڑھی سے ذرا سر اٹھا کر دیکھا۔ مجھ سے تقریباً چالیس گز کے فاصلے پر دوسرے مکان کی چھت تھی۔ وہاں شکوریا ایک دیوار سے لگا کھڑا تھا اور بڑے محتاط انداز میں میرے مکان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میں اپنے مکان کے کس حصے میں ہوں؟

میں ذرا اور سر اٹھا کر دیکھتا اور چھت پر آتا تو دائیں بائیں مکان کی چھتوں پر باسو اور کاچھی بھی دکھائی دے جاتے۔ ایسے وقت عینی کے باپ کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''پاگل صرف بلال نہیں ہے۔ تم تینوں بھی ہو۔ آپس کے جھگڑوں میں میری لڑکی کو تماشا بنا رہے ہو۔ اسے یہاں سے لاہور تک بدنام کررہے ہو۔''

عینی کی ماں چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ ''تمہاری بہنوں اور بیٹیوں کو لوگ اسی طرح بدنام کریں گے تو کیا تمہارے سر شرم سے نہیں جھکیں گے؟ خدا کے لیے ہماری شرم اور غیرت کا کچھ تو خیال کرو۔''

کاچھی نے کہا۔ ''راجا جی! یہ جھگڑا ابھی ختم ہوجائے گا۔ تُو ابھی سب کے سامنے یہ کہہ دے کہ ہم تین بھائیوں میں سے کسی ایک کو داماد بنائے گی۔''

شکوریا نے عینی کے باپ سے کہا۔ ''چاچا! تُو بھی اچھی طرح سمجھ لے۔ یہ جھگڑا پولیس والے بھی ختم نہ کرسکیں گے۔ تُو اپنی عقل مندی سے جھگڑا ابھی ختم کرا سکتا ہے اور بیٹی کو بدنامی سے بچا سکتا ہے۔''

وہ بولتا ہوا اپنی چھت کے کنارے آگیا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ''یہاں ہمارے چک کے کتنے ہی بزرگ ہیں۔ یہ ابھی بلال کو بلا کر حکم دیں گے کہ وہ باسو سے معافی مانگے اور سب کے سامنے عینی کو بہن کہہ دے۔ نہیں کہے گا تو میری بندوق کی ایک گولی...''

وہ اپنی بات پوری نہ کرسکا۔ میں نے اسے نشانے پر رکھ لیا تھا۔ اسی لمحے میں نے ٹریگر دبا کر اس کی بولتی بند کردی مگر افسوس میرا نشانہ پکا نہیں تھا۔ ابھی میں بھولا ہوا سبق دہرا رہا تھا اس لیے ذرا کچا تھا۔ گولی اس کی بندوق پر لگی تھی۔ بوکھلاہٹ میں بندوق ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ چھت کے بالکل کنارے پر تھا۔ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا بلندی سے گرتا ہوا نیچے زمین پر پہنچ گیا۔

''ہائے یہ کیا ہوگیا؟'' پورے محلے میں شور مچ گیا۔ ''ارے! مار ڈالا رے مار ڈالا... بلال نے شکوریا کو مار ڈالا...''

کاچھی اور باسو نے بھی یہی سمجھا کہ وہ مارا گیا ہے۔ وہ دونوں میری چھت کی طرف اندھا دھند فائر کرتے ہوئے کہیں جا کر چھپ گئے تھے۔ باہر لوگ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔ ''کون کہتا ہے، بلال پاگل ہے؟ وہ تو بڑی چالاکی سے مقابلہ کررہا ہے۔''

کوئی کہہ رہا تھا۔ ''وہ پاگل نہیں ہے۔ بندوق پکڑنا اور چلانا جانتا ہے۔ دیکھو تو سہی، کیا پکا نشانہ لیا ہے؟''

پھر شور سنائی دیا۔ ''شکوریا زندہ ہے۔ اسے گولی نہیں لگی ہے۔ وہ چھت سے گر کر بے ہوش ہوگیا ہے۔''

اسے ہوش میں لانے کے لیے مکان کے اندر پہنچایا جارہا تھا۔ کاچھی اور باسو کہیں چھپے ہوئے تھے۔ وہاں سے بڑکیں مار رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ابھی میرے گھر میں گھس کر مجھے مار ڈالیں گے۔

میں نے دروازے کی آڑ سے دائیں بائیں ان دونوں مکانوں کی چھتوں کی سمت دیکھا۔ وہ نظر نہیں آرہے تھے۔ میں نے بڑی پھرتی سے دونوں چھتوں کی طرف باری باری فائر کیے۔ کئی گولیاں چلائیں۔ پھر پیچھے ہٹ کر سیڑھیوں پر آگیا۔ دشمنوں کے محاذوں پر موت کا سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ان کی بڑکیں ختم ہوگئی تھیں۔ وہ سوچ میں پڑ گئے تھے کہ میرے خلاف جوابی کارروائی کیسے کی جائے؟

میں سیڑھی کے پائدان پر دیوار سے ٹیک لگائے کارٹریج لوڈ کررہا تھا۔ ایسے وقت کالنگ ٹون سنائی دی۔ میں نے جیب سے فون نکال کر اسکرین دیکھی تو خوشی سے کھل گیا۔ مجھے عینی پکار رہی تھی۔ میں نے فوراً ہی بٹن دبا کر اسے کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''یا خدا۔ عینی! یہ تم ہو نا؟''

''ہاں۔ میں بول رہی ہوں۔''

میں نے بڑے جذبے سے کہا۔ ''ہاں، بولو عینی! بولو... ایسے وقت تمہاری آواز میرے اندر بارود بھرتی رہے گی۔ میں زندگی اور موت کی اس جنگ میں تمہیں اپنے ساتھ ساتھ محسوس کررہا ہوں۔''

''اور میں اس وقت خوشی کے مارے رو رہی ہوں۔ یہاں سب کی زبان سے سن رہی ہوں کہ تم پاگل نہیں ہو۔ ہائے ربا! مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔ سب ہی تمہیں نارمل تسلیم کررہے ہیں۔''

''خدا کا شکر ہے عینی! میں اپنے گھر کو، باہر اور اندر سے پہچان رہا ہوں۔ مجھے بہت کچھ یاد آرہا ہے۔ میں بندوق چلانا جانتا ہوں۔ ابھی شکوریا کو مار گرایا ہے۔''

''مگر وہ بچ گیا ہے۔ اللہ کرے وہ تڑپ تڑپ کر مر جائے۔ میں کیا بتاؤں، مجھے کتنا فخر ہورہا ہے۔ میرا چاہنے والا، میرے لیے لڑ رہا ہے اور میدان مار رہا ہے۔ میں تم پر جتنا بھی فخر کروں کم ہے۔''

''میں حیران ہوں' آج تم نے دن کے وقت فون کیا ہے۔ کیا تم گھر میں تنہا ہو؟''

''تنہا ہی سمجھو۔ گھر کے تمام مرد تمہاری طرف ہی گئے ہوئے ہیں۔ تمہاری جواں مردی کا چرچا سن کر مجھ سے برداشت نہیں ہورہا تھا۔ میں خیال ہی خیال میں تم پر قربان ہو رہی ہوں۔ جی چاہتا ہے، ابھی اڑ کر چلی آؤں۔''

''آجاؤ عینی! میں تمہیں یہاں سے اڑا کر کہیں لے جاؤں گا۔ یہ دنیا والے ہمیں آسانی سے ملنے نہیں دیں گے۔ سوچتا ہوں کسی دن تمہارے ساتھ اڑ ہی جاؤں۔''

اس نے پوچھا۔ ''اس کا انجام جانتے ہو؟''

''کچھ جاننے سے پہلے ہی بندوق اٹھالی ہے۔ آگے جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔ بولو راضی ہو؟''

وہ ہچکچاتے ہوئے انجان بن کر بولی۔ ''کس بات پر راضی کررہے ہو؟''

''ابھی تم نے کہا ہے، اڑ کر آنا چاہتی ہو تو پھر بسم اللہ... میں اپنے پر تول رہا ہوں۔ جہاں کہو گی، ابھی اڑا کر لے جاؤں گا۔''

''توبہ کرو۔ گھر سے بھاگنے والی لڑکیاں بدنام ہو جاتی ہیں۔ کیا میری بدنامی چاہو گے؟''

''ہرگز نہیں۔ ہم اپنے بزرگوں کا اعتماد اور ان کی رضا مندی حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''آئی لو یو۔ تم بہت اچھے ہو۔ انشاء



اللہ تعالیٰ... دشمن ذلتیں اٹھائیں گے اور ہمیں بزرگوں کی حمایت حاصل ہوگی۔''

میں بولتے بولتے چپ ہوگیا۔ فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں ایک دم سے تن کر کھڑا ہوگیا۔ آوازوں سے اندازہ ہورہا تھا کہ فائر کرنے والے کئی لوگ ہیں اور وہ دور سے گولیاں چلاتے ہوئے ہماری طرف آرہے ہیں۔

عینی نے گھبرا کر پوچھا۔ ''یہ فائر کرنے والے کون ہیں؟''

پھر وہ خود ہی بولی۔ ''بلال! تم کہاں ہو؟''

''فکر نہ کرو۔ میں مکان کے اندر ہوں۔ ابھی معلوم کرتا ہوں کہ یہ گولیاں چلانے والے کہاں سے آگئے ہیں؟''

''میں فون بند کررہی ہوں۔ تم ادھر دھیان دو۔''

''وعدہ کرو' تھوڑی دیر بعد موقع ملے گا تو پھر آؤ گی۔ اپنی آواز سناؤ گی۔''

''ہاں آؤں گی۔ خوب باتیں کروں گی۔ خدا کے لیے ادھر دھیان دو۔ اللہ تمہارا نگہبان ہے۔''

اس نے رابطہ ختم کردیا۔ میں نے فون جیب میں رکھا۔ اپنی گن سنبھالی پھر سیڑھیوں سے اترنے لگا۔ چھانو دوڑتی ہوئی آرہی تھی۔ قریب آتے ہی خوشی سے تھرکتے ہوئے تالیاں اور چٹکیاں بجاتے ہوئے بولی۔ ''بھائی بلال! ہمارے دشمن کتے کی موت مریں گے۔ ہمارے سات ماموں آگئے ہیں۔ اپنے بے شمار بندوق والوں کو ساتھ لائے ہیں۔ باہر آکر تو دیکھو... ایسے گولیاں برسا رہے ہیں، جیسے اولے پڑ رہے ہوں۔''

میں اپنے تمام ماموؤں سے اسپتال میں مل چکا تھا۔ وہ کئی بار وہاں آچکے تھے اور قسمیں کھا چکے تھے کہ مجھے دماغی مریض بنانے والوں کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اس وقت ہمارے مکان کے سامنے ان کی دس گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ تقریباً پچیس مسلح افراد بندوقیں اٹھائے کھڑے تھے۔

میں باہر آکر ایک ایک ماموں کے گلے لگنے لگا۔ وہ بڑکیں مارتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ''اے بھونکنے والے کتو! سامنے آؤ۔ کہاں اپنی ماؤں کی گود میں چھپ گئے ہو؟ ہم تو تمہیں گھروں سے نکال کر ماریں گے۔ یہاں تمہاری قبریں کھدوا کر ہی جائیں گے۔''

پورے چک میں دہشت طاری ہوگئی تھی۔ میرے تمام ماموؤں نے آتے ہی اتنی گولیاں برسائی تھیں کہ تمام لوگ اپنی سلامتی کے لیے گھروں میں گھس کر بیٹھ گئے تھے۔ شکوریا، کاچھی اور باسو پہلوان کی تو آوازیں بھی سنائی نہیں دے رہی تھیں۔

ان کے گھروں کے اندر اور باہر سناٹا چھا گیا تھا۔ میری امی ان تینوں مکانوں کی طرف جاتے ہوئے سینہ تان کر کہہ رہی تھیں۔ ''میں ست بھرائی ہوں۔ سات بھائیوں کی ایک بہن ہوں۔ میرا ایک ہی جوان بیٹا ہے۔ اس کی رکھوالی کے لیے سات گاؤں سے بھائیوں کی فوج آئی ہے۔ میرے بیٹے کو تنہا سمجھنے والو... آؤ۔ اپنے جوان بیٹوں کی خیر مناؤ۔ وہ آج کے بعد کل کا سورج نہیں دیکھیں گے۔''

وہ بول رہی تھیں اور میرے دشمنوں کی ماؤں نے سہم کر دروازے بند کرلیے تھے۔ یہ بات اچھی طرح ذہنوں میں سما گئی تھی کہ ان کے جوان بیٹے مارے جائیں گے۔ پولیس والوں کو خود ان کے بیٹوں نے رشوت دی تھی کہ آج وہ چک پینتالیس کا رخ نہ کریں۔ چاہے وہاں قیامت ہی کیوں نہ آجائے۔ یوں انہوں نے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری تھی۔

اب وہ اپنے گھروں میں چھپے ہوئے تھانے دار کو فون پر پکار رہے تھے۔ فوراً پولیس فورس کے ساتھ آنے کو کہہ رہے تھے۔ تھانے دار نے کہا۔ ''کہاں ہے پولیس فورس؟ میرے تھانے میں پچھلے چھ برس سے کل چھ سپاہی ہیں۔''

باسو پہلوان کی ماں یعنی میری پھوپھی نے کہا۔ ''آپ اوکاڑہ سے پولیس فورس بلائیں۔ خدا کے لیے جلدی آئیں۔''

تھانے دار بولا۔ ''آپ کہتی ہیں، وہاں بیس پچیس بندے آکر فائر کررہے ہیں۔ کاچھی نے بتایا ہے' ان کے پاس کلاشنکوف اور سیون ایم ایم رائفلز ہیں۔ ہم اب تک سن سینتالیس کے ہتھیاروں سے تھانہ چلا رہے ہیں۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ کیا پولیس ہماری مدد نہیں کرے گی؟''

''ضرور کرے گی۔ پر ہم اپنی زنگ خوردہ بندوقوں سے انہیں مرعوب نہیں کرسکیں گے۔ وہاں آکر صلح صفائی کرائیں گے اور امن وامان قائم کرنے کی کوشش کریں گے۔''

''تو پھر یہی کریں۔ جلدی آجائیں۔ ان دشمنوں سے ہماری جان چھڑائیں۔ نہیں تو یہ ہمارے جوان بیٹوں کو مار ڈالیں گے۔''

''آپ فکر نہ کریں۔ ہم ابھی آرہے ہیں۔''

رابطہ ختم ہوگیا۔ تھانے دار نے انہیں دلاسا دیا تھا کہ وہ آرہے ہیں مگر ان تین ماؤں کی جان نکلی جارہی تھی۔ ان میں

سے ایک میری پھوپھی تھی اور دو چاچیاں تھیں۔ تین تگڑے جنگجو بیٹوں کی جوانی پر غرور سے پھولی نہیں سماتی تھیں۔ اس روز ہوا نکلے ہوئے غبارے کی طرح پچک رہی تھیں۔

ان میں سے ایک نے کہا۔ ''ہمارے بیٹوں نے گولیاں چلاتے وقت تن کر کہا تھا کہ پولیس والے ادھر نہیں آئیں گے اور وہ پنچوں کا بھی کوئی فیصلہ نہیں مانیں گے۔ اب ہماری یہ بھابھی مَنّو اکڑ دکھاویں گی۔ نہ پولیس کی سنیں گی، نہ پنچوں کی مانیں گی۔''

میری امی کا نام آمنہ تھا۔ وہ تینوں انہیں مَنّو بھابھی کہا کرتی تھیں۔ چاچی نے کہا۔ ''ہمارے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ بھابھی مَنّو کے سات بھائی فوج لے کر چلے آویں گے۔ اب یہ جب تک نہ جاویں گے، تب تک ہمارے بیٹے گھروں سے نکل نہ سکیں گے۔''

میری پھوپھی نے کہا۔ ''وہ گھروں میں گھس کر مارنے آویں گے تو ہم کے کرلیں گے؟ ابھی عقل مندی یو ہوگی کہ ہم بھابھی کے آگے جھک جائیں۔''

پھر چاچی نے کہا۔ ''یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ہم ہاتھ جوڑ کر اور پاؤں پڑ کر انہیں راضی کرلیں۔ ہمارے سر جھکیں گے۔ ہمیں شرم تو آوے گی۔ پر کیا کریں، ہمارے جوان بیٹوں کی سلامتی اسی میں ہے۔''

وہ تینوں اپنے اپنے گھر میں بیٹوں کے ساتھ چھپی ہوئی تھیں۔ فون کے ذریعے ایک دوسرے سے مشورے کر رہی تھیں۔ پھر وہ اپنے اپنے مکان کی کھڑکیوں کے پاس آگئیں۔ انہیں کھول کر دیکھا۔ میری امی ان مکانوں کے سامنے ایک اونچی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ میرے تمام ماموں ان کے آس پاس باڈی گارڈز کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔

پھوپھی نے کہا۔ ''بھابھی مَنّو! تیرا بیٹا جیوے۔ ہمارا بلال جگ جگ جیوے۔''

امی نے کہا۔ ''میرا بلال تب جیوے گا، جب تین دشمن مٹی میں مل جائیں گے۔''

ایک چاچی نے اپنی کھڑکی سے کہا۔ ''دشمنی بہت ہوگئی بھابھی! ہمیں سمجھ آگئی ہے۔ اب ہم نے پہلے جیسی رشتے داری اور محبت نہ رکھی تو ہمارے تمہارے سب ہی کے بچے مارے جاویں گے۔ یوں ہماری گود خالی رہ جائے گی۔''

امی نے کہا۔ ''یہی باتیں میں پہلے سمجھاتی تھی۔ پر تم سب کو تین جوان بیٹوں پر بڑا غرور تھا۔''

دوسری چاچی نے کہا۔ ''اب نہیں ہے۔ پچھلی باتیں بھول جاؤ۔ ہمارے بچوں کی غلطیاں معاف کردو۔''

ایک بوڑھا شخص لاٹھی ٹیکتا ہوا آرہا تھا۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''دمی مَنّو! بندہ غلطی مان لیتا ہے اور جھک جاتا ہے تو خدا بھی اسے معاف کردیتا ہے۔ تو بھی معاف کر دے۔ ہمارے باپ دادا نے کبھی اس زمین پر ایسی گولیاں چلتی نہیں دیکھیں۔ ہمارے بیٹوں نے جو غلطیاں کی ہیں، انہیں معاف کردے۔''

وہ باسو پہلوان کا نانا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔ پھر ایک مُنجھی پر لا کر بٹھا دیا۔ اس کے بعد خاندان کے دوسرے بزرگ بھی آنے لگے۔ ان کے لیے بھی مُنجھیاں بچھائی گئیں۔ تھانے دار بھی سپاہیوں کے ساتھ آگیا۔ اسے امی کے قریب ایک کرسی پر بٹھایا گیا۔ وہ جھکی جھکی نظروں سے تمام ماموؤں کو اور ان کے تمام مسلح کارندوں کے جدید ہتھیاروں کو دیکھ رہا تھا۔

پولیس والے بندوقوں اور ڈنڈوں سے اپنی طاقت منواتے ہیں۔ اس وقت تھانے دار نے کہا۔ ''میں تو ہمیشہ ایک ہی بات کہتا ہوں۔ مجرموں کو ہتھیاروں سے قابو میں لایا تو جاسکتا ہے پر انہیں پُرامن شہری نہیں بنایا جاسکتا۔ میٹھے بول میں جادو ہے۔''

اس نے مجھ سے کہا۔ ''بلال! میں اس لیے میٹھا بول رہا ہوں تاکہ شکوریا، کاچھی اور باسو نے تمہارے ساتھ جو بھی زیادتی کی ہے، اسے بھول جاؤ۔ انہیں معاف کردو۔''

میرے ایک ماموں نے پوچھا۔ ''کیا آپ مجرموں کے سر پر ہاتھ پھیر کر معاف کردیتے ہیں؟ یا تھانے لے جا کر ان کی پٹائی کرتے ہیں؟''

تھانے دار ذرا سٹپٹایا پھر بولا۔ ''مجرموں کو تھوڑی بہت سزائیں دی جاتی ہیں۔ تم انہیں بڑی سزائیں نہ دو۔ جرمانہ شرمانہ لگادو۔ معاملہ رفع دفع کرو۔''

میرے ماموں نے پوچھا۔ ''اس کی کیا ضمانت ہے کہ ہمارے جانے کے بعد یہ لوگ شرافت سے رہیں گے اور ہمارے بھانجے کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے؟''

تھانے دار نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''میں ضمانت دیتا ہوں۔ ان تینوں کا اسلحہ یہاں سے لے جاؤں گا۔ جب تک بلال کی والدہ اور بچوں کو راضی نامہ پیش نہیں کیا جائے گا، انہیں اسلحہ واپس نہیں ملے گا۔''

تمام بزرگوں اور جوانوں نے کہا کہ یہ طریقہ کار مناسب ہے۔ وہ تینوں اسلحے کے بغیر فتنہ و فساد برپا نہیں کریں گے۔

میں نے کہا۔ ''جب تک نفرت اور عداوت کی بنیادی وجہ کو ختم نہیں کیا جائے گا' تب تک وہ تینوں اپنی زبان سے اور کینے پن سے عداوت جاری رکھیں گے۔''

تھانے دار نے پوچھا۔ ''تم لوگوں کے بیچ عداوت کی وجہ کیا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ہماری مائیں، ہمارے بزرگ صرف ایک شریف زادی کو اپنی بہو بنانا چاہتے ہیں۔ اسے اپنی انا کا مسئلہ بنالیا ہے۔ وہ بیچاری ہماری وجہ سے بدنام ہورہی ہے۔ لہٰذا ہمارے درمیان صرف ایک ہی شرط پر صلح ہوسکتی ہے۔''

میں ذرا چپ ہوا۔ دور تک کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے لوگ میرا منہ تک رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ''شرط یہ ہے کہ وہ تینوں اس شریف زادی کی طلب سے باز آجائیں۔''

کاچھی نے چھت پر آکر ایک دیوار کی آڑ میں رہ کر کہا۔ ''یہ نہیں ہوگا۔ یہ ہمارا سر جھکانے والی بات کررہا ہے۔ ہم اس کے آگے جھک کر نہیں رہیں گے۔''

دوسری چھت سے باسو نے کہا۔ ''انصاف کی بات کر۔ اگر ہم طلب نہیں کریں گے تو تو بھی عینی کو طلب نہیں کرے گا۔''

میں نے کہا۔ ''خبردار! ایک شریف زادی کا نام زبان پر نہ لانا۔ ورنہ ابھی گھر میں گھس کر تمہاری زبانیں ہمیشہ کے لیے بند کردوں گا۔''

تھانے دار نے چھت کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''اوئے! چپ کر۔ بات بگڑے گی تو تم لوگوں کے لیے کچھ نہیں کرسکوں گا۔''

چھت پر خاموشی چھا گئی۔ ان کی مائیں بھی انہیں سمجھا رہی تھیں کہ وہ مجھ سے جھگڑے والی کوئی بات نہ کریں۔ خاموش رہیں۔ پھر میں نے تمام لوگوں پر سرسری سی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''آپ سب جانتے ہیں، ہمارے خاندان کے تمام بزرگ بھی جانتے ہیں کہ لڑکی والوں نے میرے حق میں فیصلہ کیا تھا۔ وہ مجھے داماد بنانا چاہتے تھے مگر میں عارضی طور پر ایب نارمل ہوگیا تھا۔ میرے دشمنوں نے یہ جھوٹی خبر پھیلائی کہ میں خطرناک پاگل بن چکا ہوں۔''

وہاں عینی کے والد اور دوسرے رشتے دار بھی موجود تھے۔ میں نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کے سامنے ہوں۔ سب مجھے دیکھ رہے ہیں۔ کیا میں ہوش مند نہیں ہوں؟ جب سے آیا ہوں، تب سے کوئی پاگلوں والی کوئی حرکت کی ہے؟ آئندہ بھی آپ کے سامنے یہاں رہوں گا۔ آپ مجھے اچھی طرح جانچ لیں، پرکھ لیں۔ پھر اپنے دل سے اور اپنے ایمان سے میرے حق میں فیصلہ کریں۔''

عینی کے بزرگ نے کہا۔ ''تمنے بھری محفل میں شریف زادی کا نام لینے پر اعتراض کیا۔ بے شک تم ان تینوں سے زیادہ ہوش مند ہے۔ ہماری دعا ہے، خدا تیری دماغی توانائی بحال رکھے۔ آمین۔''

پنچوں میں سے ایک بزرگ نے کہا۔ ''تہذیب اور اخلاق کا تقاضا یہی ہے کہ یہاں کسی شریف زادی کا ذکر نہ کیا جائے۔ عداوت کی بنیاد یہی ہے تو بلال کی بات مان لی جائے۔ شکور یا' کاچھی اور باسو کو حکم دیا جائے کہ وہ کبھی اس شریف زادی کا نام بھی اپنی زبانوں پر نہ لائیں۔''

ایک اور بزرگ نے کہا۔ ''بلال نے اپنا فیصلہ بھی لڑکی والوں پر چھوڑ دیا ہے۔ اس سے زیادہ امن و امان قائم رکھنے والی بات اور کیا ہوسکتی ہے؟''

سب ہی میری حمایت میں بولنے لگے۔ پھر کہا گیا کہ بات اور نہ بڑھائی جائے۔ ابھی پنچ نامہ لکھ کر ان تینوں کے اور ان کے بزرگوں کے دستخط لیے جائیں۔

وہ تینوں مجبور ہوگئے تھے۔ انہیں دستخط کرنے اور انگوٹھا لگانے کے لیے کہا گیا۔ انہوں نے اپنے اپنے گھروں سے نکل کر ہر سو بندوقیں ہی بندوقیں دیکھیں۔ اسلحہ کے سامنے بڑے بڑے حکمران تاج و تخت چھوڑ دیتے ہیں۔ انہوں نے بھی ضد چھوڑ دی۔ دستخط کردیے۔ پھر سر جھکا کر اپنے گھروں میں چلے گئے۔

☆☆☆

شیطان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ جان سے نہیں مارتا البتہ ہلکان کرتا رہتا ہے۔ وہ تینوں مجھے جان سے نہیں مار سکتے تھے۔ ان کے ہتھیار تھانے دار لے گیا تھا مگر وہ شر انگیزی سے باز نہیں آسکتے تھے۔ ان پر پابندی عائد کی گئی تھی کہ عینی کا رشتہ نہیں مانگیں گے۔ آئندہ میرے رقیب بن کر فساد نہیں پھیلائیں گے۔

بظاہر تو وہ مان گئے تھے مگر یہ قسم کھا چکے تھے کہ عینی کو میری زندگی میں کبھی نہیں آنے دیں گے۔ میں ان کی توقع کے خلاف نارمل ہوگیا تھا۔ وہ طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے مجھے ایب نارمل ثابت کرنے کی کوششیں کرتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہوجائیں گے۔ مجھے جھلا ثابت کردیں گے تو عینی کے والدین مجھے کبھی اپنا داماد نہیں بنائیں گے۔

فی الحال راوی امن و امان لکھ رہا تھا۔ میں اپنی زمینوں



کے معاملات سمجھنے اور ساری ذمے داریاں سنبھالنے کی کوششیں کررہا تھا۔ پتا چلا، زمینوں کے معاملات میں بھی ان تینوں کی مخالفتوں کا سامنا کرتے رہنا ہوگا۔

وہ تینوں شیطان جیسے میرے مقدر میں لکھ دیے گئے تھے۔ امی نے اور ہمارے منشی نے بتایا کہ زمینداری ایسی بلا ہے جو ہمیشہ تھانے کچہری کی طرف ہانک کر لے جاتی ہے۔ میں مقدمے بازی میں ان سے کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا مگر بعض اوقات میرا سر درد کھنے لگتا تھا۔ کبھی کبھی تو میں چکرا کر بیٹھ جاتا تھا۔ یہ پریشانی کی بات تھی کہ دماغی کمزوری پھر سے پلٹ کر آرہی ہے۔

میں دل بہلانے اور دماغی تھکن دور کرنے کے لیے گھومنے پھرنے نکل جاتا تھا۔ اپنے مکان کی چھت پر بیٹھ کر دور اور قریب کے مناظر دیکھتا رہتا تھا۔ ماضی کی بہت سی باتیں یاد آتی رہتی تھیں۔ ماضی میں بھی میرے لیے عینی بہت اہم تھی۔ بچپن کی معصومیت ہو، لڑکپن کی شوخیاں ہوں یا جوانی کی رنگینیاں... وہ ہر دور میں میرے ساتھ رہتی آئی تھی۔

اس سلسلے میں بچپن کا ایک واقعہ بیان کروں گا۔ یہ واقعہ ایسا ہے کہ یاد آتے ہی میری بدنصیبی پلٹ آئی تھی۔ اس روز میں چھت کے کنارے بیٹھا اس ہینڈ پمپ کو دیکھ رہا تھا جہاں میرا بچپن چہک رہا تھا۔ اس چہکار میں عینی کی مترنم ہنسی اور شرارتیں بھی تھیں۔

وہ مجھ سے کہہ رہی تھی۔ ''اے بلال! ٹلکا گیڑ... جوروں کی پیاس لگی ہے۔ منے پانی پینا ہے۔''

عینی التجا کررہی تھی اور میں کمر پر ہاتھ رکھے اسے گھور رہا تھا۔ پھر بولا۔ ''ضرورت پڑی ہے تو کیسی میسنی بن رہی ہے۔''

پھر میں نے تنبیہہ کے انداز میں اسے انگلی دکھاتے ہوئے پوچھا۔ ''اب بتا... منے نوچ کے بھاگے گی؟''

وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔ ''نہ رے نہ... میری توبہ۔ میرے باپ کی توبہ... اب نہیں بھاگوں گی۔''

میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''یعنی نوچے گی پر بھاگے گی نہیں؟''

وہ جلدی سے بولی۔ ''نہ نہ... نہ نوچوں گی نہ بھاگوں گی۔ اب خوش...؟''

میں تھوڑی دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ پھر جیسے واقعی خوش ہوگیا۔ فوراً ہی ہینڈ پمپ کی ہتھی پکڑ کر اسے اوپر نیچے کرنے لگا۔ نل سے ٹھنڈا میٹھا پانی بہہ رہا تھا۔ وہ فوراً ہی جھک کر منھی

کیا آپ
لبوب مُقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟
کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مُقوّی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مُقوّی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مُقوّی اعصاب ٹیلیفون کرکے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں فون صبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک
المسلم دارلحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
آپ صرف فون کریں۔ آپ تک لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

ہتھیلیوں کو چلو بنا کر غٹا غٹ پینے لگی۔ اس نے مجھے تنگ نہ کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر اس کی آنکھوں میں شرارت بھری ہوئی تھی۔ اس نے پیتے پیتے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا پھر چلو میں بھرا ہوا پانی مجھ پر اچھال کر وہاں سے دوڑتی چلی گئی۔

میں اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھا۔ ایک دم سے بوکھلا کر اسے گھورنے لگا۔ وہ دور جا کر مجھے ٹھینگا دکھا رہی تھی۔ میں تلملا کر ادھر دوڑتے ہوئے بولا۔ ''ٹھہر جا... ابھی مزہ چکھاتا ہوں۔ تو شیطان کی خالہ ہے تو میں بھی اس کا خالو ہوں۔''

وہ آگے آگے دوڑ رہی تھی۔ میں پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ آگے کھیتوں کو پانی دینے والا ایک چھوٹا سا کھالا تھا۔ وہ بھاگتے بھاگتے چھلانگ لگا کر اسے عبور کرنا چاہتی تھی مگر اس کی چھوٹی چھوٹی ٹانگیں اس کھالے کو کراس نہیں کر سکتی تھیں۔ پھر بھی اس نے مجھ سے بچنے کے لیے چھلانگ لگائی۔ دوسرے کنارے کے بالکل سرے پر اس کے پاؤں ٹک گئے تھے مگر گیلی چکنی مٹی نے اسے توازن برقرار رکھنے کا موقع نہ دیا۔ وہ ڈگمگاتے ہوئے چلاتی ہوئی پھسل کر کھالے میں گر گئی۔

اس کی یہ حالت دیکھ کر میں نے دوڑتے دوڑتے اسے پکارا۔ ''عینی! میں آرہا ہوں... میں آرہا ہوں عینی!''

ایسے ہی وقت میرے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا۔ میں پلک جھپکتے ہی ماضی سے نکل کر حال میں چلا آیا۔ میرے دونوں بازو جکڑ لیے گئے تھے۔ ایک طرف سے امی نے، دوسری طرف سے ایک ملازم نے مجھے مضبوطی کے ساتھ تھام لیا تھا اور پیچھے کی طرف کھینچ رہے تھے۔

تب مجھے ہوش آیا کہ میں چھت کے کنارے بیٹھا ہوا تھا۔ عینی کو بچانے کی دھن میں وہاں سے نیچے چھلانگ لگانے والا تھا۔ امی نے جھنجوڑ کر پوچھا۔ ''کہاں ہے عینی...؟ کیا جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتے دیکھتے مرنا چاہتا ہے؟''

میں پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ 'یہ مجھ سے کیسی حماقت سرزد ہونے والی تھی؟ اگر کوئی دیکھ لیتا تو...؟'

ایسے ہی وقت ان تینوں کے قہقہے سنائی دیے۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ شکور یا اپنی چھت پر تھا۔ کاچھی اور باسو پہلوان نیچے مکان کے سامنے قہقہے لگا رہے تھے۔ آنے جانے والوں سے کہہ رہے تھے۔ ''دیکھو...! یہ عینی کو پکارتا ہوا چھت سے چھلانگ مارنا چاہتا ہے۔ اس جھلے کو سمجھاؤ۔''

وہاں سے گزرنے والے دو افراد رک گئے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا۔ ''میں عینی داناں سن کر چونک گیا تھا۔ اوپر دیکھا تو یہ چھال مارنے والا تھا۔''

دوسرے نے کہا۔ ''ماں نے اور ملازم نے پکڑ لیا۔ نہیں تو یہ سیدھا نیچے آکر اوپر چلا جاتا۔''

کاچھی دونوں ہاتھ اٹھا کر گھوم گھوم کر آوازیں لگا رہا تھا۔ ''بزرگو اور بھائیو! دیکھو اور سمجھو... اس کے پاگل پن کو چھپایا جاتا ہے۔ پر چھپانے سے کیا ہوتا ہے؟''

اس نے ایک ہاتھ میری طرف لہراتے ہوئے کہا۔

''صداقت چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے
کہ خوشبو آ نہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے...''

شکور یا چھت پر سے اتر آیا تھا۔ وہ تینوں آنے جانے والوں کو پکڑ پکڑ کر میری دیوانگی کے متعلق بتا رہے تھے۔ طنزیہ انداز میں افسوس ظاہر کر رہے تھے۔ ''ہائے بے چارہ...! اپنی اصلیت چھپا نہیں پا رہا ہے۔ بے اختیار پاگل پن پر اتر آتا ہے۔''

امی چھت پر کھڑی انہیں باتیں سنا رہی تھیں۔ میں واقعی چھت سے چھلانگ لگانے والا تھا۔ وہ اس حقیقت سے انکار کر رہی تھیں۔ چشم دید گواہوں نے کہا۔ ''پتر کا عیب چھپانے کے لیے کیوں بڑھاپے میں جھوٹ بول رہی ہو؟ ہم تمہاری عزت کرتے ہیں۔ سچ کو سچ کہنا تمہارا فرض ہے۔''

میں نے ان سے کہا۔ ''بعض لوگوں سے ایسی غلطیاں بے خودی میں ہو جاتی ہیں۔ بے خودی کا مطلب پاگل پن نہیں ہوتا۔ تم لوگ دیکھ رہے ہو، میں نارمل ہوں۔ چھت پر کھڑا ہوں پر چھلانگ نہیں لگا رہا ہوں۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گا۔''

میں نے امی کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''یہاں سے چلیں۔ دشمنوں کو کیچڑ اچھالنے کا موقع ملا ہے۔ کوئی بات نہیں۔ میرے دامن پر جو چھینٹے آرہے ہیں، وہ دھل جائیں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔''

ہم سمجھ رہے تھے' بات آئی گئی ہو جائے گی مگر ہم نے دیکھا، وہ چھوٹی سی بات پھیل رہی تھی۔ مجھ پر تبصرے ہونے لگے تھے۔ کوئی منہ کے سامنے کچھ نہیں کہتا تھا۔ سب پیٹھ پیچھے کھُل کھُلا کر کہتے تھے۔ ''بلال اکبر جھلا ہے، جھلا ہی رہے گا۔ اس پر پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں مگر اس کے گھر والے کہتے ہیں کہ ٹھیک ہو گیا ہے۔ اب بھلا بتاؤ... بیٹھے بٹھائے الٹی سیدھی باتیں کرنے والے کو بھلا چنگا کہا جا سکتا ہے؟''



کوئی حتمی رائے دیتے ہوئے کہتا تھا۔ ''ایک بار دماغ خراب ہو جائے پھر دنیا کا کوئی ڈاکٹر اس خرابی کو دور نہیں کر سکتا۔ بلال کے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہے۔ ڈاکٹروں نے کچھ دوائیں شوائیں دے کر اس کے گھر والوں کو بہلا دیا ہے۔ جب ان دواؤں کا اثر ختم ہونے لگتا ہے تو اس پر دورہ پڑ جاتا ہے۔ پھر جب وہ گولیاں دوبارہ اثر کرنے لگتی ہیں تو وہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ پر ہمارے لیے وہ کبھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ باؤلا ہے، باؤلا ہی رہے گا۔''

کسی بے گناہ کو گناہ گار کہا جائے تو اسے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ مجھ سے ایک معمولی سی غلطی ہوئی تھی۔ چھت پر گڈیاں اڑانے والے بے خبری میں جان سے جاتے ہیں۔ انہیں کوئی ذہنی مریض نہیں کہتا۔ مجھے خوامخواہ کہا جا رہا تھا۔ یوں مجھے دماغی صدمہ پہنچایا جا رہا تھا۔

☆☆☆

جاکھا میرا دور کا رشتے دار تھا۔ اس کا اصل نام جعفر تھا مگر سب اسے جاکھا کہہ کر بلاتے تھے۔ ہماری برادری کی یہ ریت ہے' کسی بھی رشتے دار کے گھر میں شادی ہو' وہاں خاندان کے ہر فرد کا پہنچنا لازمی ہوتا ہے۔ جاکھے کی شادی کے سلسلے میں میرے لیے یہ کشش تھی کہ وہاں عینی سے ملاقات ہونے والی تھی۔ میں نے سوچا' کوئی میرے منہ پر مجھے پاگل نہیں کہتا۔ پیٹھ پیچھے کہتے ہیں تو کہتے رہیں۔ میں شادی میں جاؤں گا۔ وہاں عینی کو صبح شام دیکھتا رہوں گا۔'

جاکھے کا گھر چک نمبر چوالیس میں تھا۔ شادی کے گھر میں دو چار روز گزارنے تھے۔ لہٰذا ہم دو ملازموں کو مال مویشی کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر وہاں چلے آئے۔ امی کے علاوہ چھانو اور حشمت بھی ہمارے ساتھ تھے۔ میں بڑے عرصے بعد اپنی ذاتی جیپ کو استعمال کر رہا تھا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو مجھے ڈرائیونگ سیٹ پر دیکھ کر بہت سے لوگوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

جاکھے کے گھر والے ہمارے استقبال کے لیے باہر آئے۔ میں نے اس کی ماں کو سلام کرتے ہوئے اس کے آگے سر جھکایا، وہ میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔ ''ماشاء اللہ...! یو تو منے کہیں سے بیمار نہ دکھائی دیوے۔ گڈی چلا کے آیا ہے۔ تنے یوں دیکھ کر ہم نے بڑی خوشی ہو رہی ہے۔''

شادی کے اس ہنگامے میں بہت سے لوگوں سے ملاقات ہو رہی تھی۔ سلام دعا ہو رہی تھی لیکن میری نگاہیں تو بس ایک ہی چہرے کو دیکھنے کے لیے بے چین تھیں۔ اس کی تلاش میں ادھر اُدھر بھٹک رہی تھیں اور وہ نہ جانے کس کونے میں چھپی بیٹھی تھی؟

اتنا تو اندازہ تھا کہ اس کے کانوں تک میری آمد کی اطلاع پہنچ گئی ہوگی۔ ویسے بھی امی اور چھانو خاندان بھر کی عورتوں سے ملاقات کر رہی تھیں۔ اس کے باوجود وہ سامنے نہیں آرہی تھی۔ اپنا دیدار نہیں کرا رہی تھی۔ میں نے بے چین ہو کر اسے فون پر مخاطب کرنا چاہا۔ لیکن پھر یاد آیا کہ اس نے مجھے فون کرنے سے منع کیا ہے۔ جب موقع ملتا تھا، وہ خود ہی مجھے کال کرتی تھی۔

میں اس سے ملنے کے لیے بے چین تھا مگر وہاں رقیبوں سے ملاقات ہو گئی۔ میں بیٹھک میں آیا۔ وہ تینوں وہاں دوست احباب کے ساتھ مختلف منجھیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے ایسا منہ بنایا جیسے دانتوں تلے کڑوا بادام آگیا ہو۔

میں نے انہیں نظر انداز کرتے ہوئے دوسرے افراد سے مصافحہ کیا۔ پھر جاکھے کے ساتھ ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ باسو نے اپنی جگہ سے اٹھ کر میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے تیری یادداشت پوری طرح واپس نہیں آئی ہے۔ ہم بھی تیرے رشتے دار ہیں۔''

وہ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھائے کھڑا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ کو دیکھا پھر طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''میں اپنے دوستوں اور خیر خواہوں سے ہاتھ ملانے کا عادی ہوں۔ دکھاوے کے لیے کسی دشمن کو گلے نہیں لگاتا۔ جا کر اپنی جگہ بیٹھ جا۔ نہیں تو بات بڑھ جائے گی۔''

اُسے ایسے جواب کی توقع نہیں تھی۔ بھری محفل میں شرمندگی ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ پھر پانچوں انگلیوں کو گھونسے کی صورت یوں بند کر لیا جیسے وہ گھونسا میرے منہ پر جڑ دینا چاہتا ہو مگر بے بس تھا۔ فوراً ہی اپنی بے عزتی کا انتقام نہیں لے سکتا تھا۔ وہاں لوگ میری حمایت میں بولنے لگتے۔ وہ ہاتھ جھٹک کر پاؤں پٹختا ہوا شکور یا اور کاچھی کے درمیان جا کر بیٹھ گیا۔ چارپائی کے قریب ہی رکھے ہوئے حقے کو منہ لگا کر یوں گہرے گہرے کش لینے لگا، جیسے اندر پکنے والے انتقامی جذبے کو دھوئیں میں اڑانا چاہتا ہو۔

کاچھی نے اس کی پیٹھ ٹھوکتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ ''اس نے شعلوں کو ہوا دی ہے۔ ماں قسم... اسے شادی کے اسی گھر میں جلا کر راکھ نہ کر دیا تو میرا نام کاچھی نہیں۔''

وہ تینوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ یقیناً میرے خلاف کوئی نئی سازش تیار کر رہے تھے۔ ادھر میرے فون کی کالنگ ٹون سنائی دی۔ میں نے اسے نکال کر دیکھا۔ عینی مجھے مخاطب کر رہی تھی۔ میں اندر ہی اندر مسرتوں سے بھر گیا۔

پھر اس سے پہلے کہ وہ پکارنے والی پلٹ جاتی، میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے جلدی سے کہا۔ ''میں ابھی آیا۔''

میں فون کو کان سے لگائے ہوئے وہاں سے اٹھ کر دوسرے دروازے سے نکل کر باہر گلی میں آ گیا۔ دوسری طرف سے اس کی دبی دبی سی ہنسی سنائی دے رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''ہنس کیوں رہی ہو؟''

اس نے کھنکتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تمہاری حالت پر ہنس رہی ہوں۔ مجھے تلاش کرتے کرتے تھک گئے۔ اسی لیے بیٹھک میں چلے گئے۔''

''یعنی تم مجھے چھپ کر دیکھ رہی تھیں؟''

''ہاں اور اب بھی دیکھ رہی ہوں۔''

میں نے ایک دم سے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا۔ گلی میں دور تک نظریں دوڑائیں۔ وہاں کتنے ہی لوگ آ جا رہے تھے۔ بچے کھیل رہے تھے لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے شوخی سے پوچھا۔ ''ادھر اُدھر کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا میں دکھائی نہیں دے رہی ہوں؟''

میں نے پلٹ کر گھر کے دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر چھت کی طرف نظریں دوڑائیں۔ بیٹھک کو دیکھا۔ وہ کہیں بھی تو نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''یہ کیسی آنکھ مچولی کھیل رہی ہو؟ کہاں چھپی ہو؟ سامنے آؤ۔''

''تمہارے دل میں چھپی بیٹھی ہوں۔ ذرا گردن جھکاؤ... دیکھ لو...''

میں نے سینے پر دل کی جگہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہاں تو دن رات تمہیں دیکھتا ہوں مگر آج روبرو دیکھنا چاہتا ہوں۔ پلیز آ جاؤ...''

''اچھا... تو اندر چلے آؤ۔ رابطہ ختم نہ کرنا۔ یہاں عورتوں کا بہت ہجوم ہے۔ میں گائیڈ کرتی رہوں گی۔''

وہ چاہتی تو خود اس ہجوم سے نکل کر میرے روبرو آ کر یہ الجھن دور کر سکتی تھی لیکن محبوب کو بڑے پیار سے بھٹکانے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ میں بھی اس آنکھ مچولی سے محظوظ ہو رہا تھا۔ لہٰذا فون کو کان سے لگائے، دوسرے دروازے سے صحن میں آ گیا۔ عورتوں اور بچوں کے جمِ غفیر میں فون پر بولا۔ ''ہاں۔ اب بتاؤ کدھر جانا ہے؟''

وہ بولی۔ ''برآمدے کے پہلے کمرے کی طرف آؤ۔''

میں اس کی ہدایت کے مطابق مہمانوں کے درمیان سے گزرتا ہوا مطلوبہ کمرے کے دروازے پر آ گیا۔ اس دوران کئی بزرگ خواتین سے سلام دعا بھی ہوتی رہی۔ میں نے کمرے میں جھانکتے ہوئے فون پر پوچھا۔ ''کہاں ہو؟''

ایسے ہی وقت ایک بوڑھی خاتون نے پیچھے سے میری کمر پر ایک دھپ جماتے ہوئے کہا۔ ''ہائے! تُم ادھر کے کر رہا ہے؟ یو جوان چھوریوں کا کمرا ہے۔ وہ تیار ہو رہی ہیں اور تیں اندر جھانک رہا ہے؟''

میں ایک دم سے جھینپ گیا۔ فوراً ہی بات بناتے ہوئے بولا۔ ''وہ بوا! میں وہ... میں چھانو کو ڈھونڈ رہا تھا۔''

فون میرے کان سے لگا ہوا تھا۔ دوسری طرف سے عینی کی گنگناتی ہوئی ہنسی سنائی دے رہی تھی۔ میں جواباً کچھ کہنا چاہتا تھا۔ ادھر چھانو نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا بات ہے بھائی؟ تم مجھے ڈھونڈ رہے ہو؟''

میں نے اس سے پوچھا۔ ''تم نے عینی کو دیکھا ہے؟''

وہ ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''ہاں۔ وہ اُدھر بڑے کمرے میں ہے۔''

میں نے وہاں سے پلٹتے ہوئے فون پر کہا۔ ''بس یہ آنکھ مچولی بند کرو۔ میں بڑے کمرے کی طرف آ رہا ہوں، سیدھی شرافت سے باہر آ جاؤ۔''

اس نے جواباً کچھ نہ کہا۔ میں نے اپنے فون کو دیکھا۔ دوسری طرف سے رابطہ ختم کر دیا گیا تھا۔ میں صحن کے اس پار پہنچا۔ وہ ادھر ایک کمرے میں تھی مگر نہیں... میری نظریں سیڑھیوں کی طرف گئیں۔ عینی فون کو ہاتھ میں دبائے چوروں کی طرح چلتی ہوئی آخری پائدان عبور کرتی ہوئی چھت پر جا کر نظروں سے اوجھل ہو رہی تھی۔

میں فوراً ہی لپک کر سیڑھیوں کی طرف آیا۔ پھر دو دو پائدان عبور کرتا ہوا لپک جھپکتے ہی چھت پر پہنچ گیا۔ وہ مجھ سے آنکھ مچولی کھیلنے والی فون پر نمبر پنچ کرتے ہوئے چھت کے کنارے کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے فوراً ہی آگے بڑھ کر اس کا پراندہ پکڑ لیا۔ وہ آگے بڑھتے بڑھتے ایک دم سے ٹھٹک کر رک گئی۔ بالوں کے کھنچاؤ سے ایک ذرا تکلیف ہوئی تھی۔

وہ ایک سسکاری لے کر گندھی ہوئی چوٹی کو ایک ہاتھ سے تھام کر پلٹتے ہوئے بولی۔ ''ہائے ربا! کون ہے؟''

پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی چونک گئی۔ ''تم یہاں...؟'' وہ ایک جھٹکے سے اپنا پراندہ چھڑاتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں کیسے



پتا چلا، میں یہاں ہوں؟''

میں نے بڑے ہی میٹھے لہجے میں کہا۔ ''تمہاری خوشبو نے پتا دیا تھا۔''

میں اسے بڑی محبت سے، بڑی لگن سے دیکھ رہا تھا۔ میری آنکھیں کسی اور سمت دیکھنا نہیں چاہتی تھیں۔ کھلتے ہوئے گلابی رنگ کے لاچے کُرتے میں وہ پکی مُیار لگ رہی تھی۔ میں نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''اس لباس نے تو تمہاری شخصیت ہی بدل دی ہے۔''

وہ اپنے لباس کو اِدھر اُدھر سے چھوتے ہوئے بولی۔ ''پہلی بار پہنا ہے۔ کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔ تم بتاؤ...؟''

''خوب جچ رہا ہے۔''

وہ اپنی تعریف سن کر ایک ذرا لہرا سی گئی۔ پھر نیچے صحن میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ''وہ تینوں بھی یہاں پہنچے ہوئے ہیں۔ تمہاری ان سے ملاقات ہوئی ہے؟''

وہ کاکی تھی، باسو اور شکور یا کی بات کر رہی تھی۔ میں نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ ''ہاں، ہوئی تھی لیکن میں نے ان سے ہاتھ نہیں ملایا۔''

ایسے وقت ہمیں باسو کی آواز سنائی دی۔ وہ سیڑھیوں پر سے نمودار ہوتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بول رہا تھا۔ ''واہ... کیا بات ہے؟ مردوں سے ہاتھ نہیں ملاتے اور چھوریوں کے پراندے پکڑتے پھرتے ہو۔''

وہ پتا نہیں کب سے چھپ کر ہماری باتیں سن رہا تھا؟ میں نے کہا۔ ''دھتکار نے کے بعد تو کتا بھی پلٹ کر نہیں آتا۔ تم میرا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟''

اس نے تلملا کر کہا۔ ''زبان سنبھال کر بات کر... میں تیرے نہیں، عینی کے پیچھے آیا ہوں۔''

عینی نے شانے اُچکا کر کہا۔ ''لیکن میں نے تو کسی کتے کو نہیں پچکارا۔''

میں زیرِ لب مسکرانے لگا۔ وہ اس کی بات سن کر آگ بگولہ ہو گیا۔ اس کی طرف لپکتے ہوئے غرایا۔ ''تیں منے کتا کہہ رہی ہے؟''

میں نے فوراً راستہ روک کر باسو کے سینے پر دونوں ہتھیلیاں جما کر اس زور کا دھکا دیا کہ وہ پیچھے کی طرف جا کر فرش پر گر پڑا۔ عینی میرے پیچھے تھی۔

وہ بس نام کا پہلوان تھا۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا۔ ''کیا پھر اسپتال کے کموڈ میں پہنچا دوں؟''

اس نے غصے سے تلملا کر ایک جھٹکے سے اپنا گریبان چھڑانا چاہا تو دامن تک قمیص پھٹتی چلی گئی۔ عینی منہ دبا کر ہنسنے لگی۔ اس نے اپنی قمیص کو دیکھا۔ میں نے اسے دھکا دیتے ہوئے کہا۔ ''نیچے جا اور پوری برادری کو بتا... کہ پھر ایک بار مار کھا کر آیا ہے۔''

وہ سیڑھیوں سے جاتے ہوئے بولا۔ ''میرا کام بن گیا... میں نیچے جا کر وہ نہیں کہوں گا جو تُو کہہ رہا ہے۔ میں پوری برادری کو بتاؤں گا۔ یہ قمیص دکھا کر کہوں گا کہ تُو پاگل ہے۔ تُو نے میرے کپڑے پھاڑے ہیں۔''

وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے چلا گیا۔ عینی کی مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔ اس نے ایک ذرا تشویش سے کہا۔ ''یہ تو تم پر چھاپ لگنے والی بات ہو گئی۔ ادھر خواتین کے درمیان ان کی ماں بہنیں پہلے ہی تمہارے خلاف بہت کچھ بول رہی تھیں اور اب...''

واقعی تشویش کی بات تھی۔ وہ پہلوان جان بوجھ کر میرے مقابلے میں کمزور پڑ گیا تھا اور وہاں سے میرے ایبنارمل ہونے کا ثبوت لے گیا تھا۔

عینی نے کہا۔ ''میں جا رہی ہوں۔ پتا نہیں، وہ نیچے جا کر کس طرح زہر اگلنے والا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''یہ بھی کوئی ملنا ملانا ہے؟ دو باتیں بھی نہ ہو سکیں۔''

''مجبوری ہے۔ ہم فون پر بات کریں گے۔''

وہ وہاں سے دوڑتی ہوئی، سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔ اس کی گنگناتی ہوئی پائل اور کھنکتی ہوئی چوڑیوں کی آواز میرے دل میں اترتی چلی گئیں۔

شادی بیاہ کے گھروں میں جھگڑے ہوتے ہی ہیں۔ ہماری بات لے کر بھی خوب جھگڑا ہوا۔ باسو اپنی پھٹی ہوئی قمیص دکھاتا پھر رہا تھا۔ اس کے بھائی اور اس کی ماں بہنیں کہہ رہی تھیں کہ ایک سر پھرے کو شادی کی خوشیوں میں شریک کر کے بدمزگی پیدا نہیں کرنا چاہیے۔ اس جھلّے کو یہاں سے بھگاؤ۔

ہماری طرف سے صفائی پیش کی جا رہی تھی۔ میں قسمیں کھا کر کہہ رہا تھا۔ ''میرے خلاف سازشیں کی جا رہی ہیں۔ باسو جان بوجھ کر جھگڑا کرنے اور اپنی قمیص پھاڑنے آیا تھا۔''

میری باتوں پر صرف میرے اپنے ہی یقین کر رہے تھے۔ اس کی پھٹی ہوئی قمیص کہہ رہی تھی کہ دیوانے اپنا ہی گریبان چاک کرتے ہیں مگر مجھ جیسے پاگل دوسروں کی دھجیاں

اڑاتے ہیں۔

جو لوگ بیٹھک میں تھے' انہوں نے بیان دیا۔ ''باسو بڑی محبت سے بلال کے پاس گیا تھا۔ اس سے ہاتھ ملانا چاہتا تھا مگر بلال نے اسے دھتکار دیا تھا۔ وہ جھلا ہے۔ ہاتھ ملانا اور محبت کا جواب محبت سے دینا نہیں جانتا۔''

میں سرتھام کر رہ گیا۔ زیرلب بڑبڑانے لگا۔ ''مجھ پر جو پاگل پن کی مہر لگادی گئی ہے' یہ کب مٹے گی؟ کسی سے کوئی غلطی ہوتی ہے تو اسے حادثے یا اتفاقات کا نام دیا جاتا ہے۔ مجھ سے جانے انجانے میں کوئی بھول ہوتی ہے تو سوچے سمجھے بغیر پاگل کہہ دیا جاتا ہے۔''

امی نے بڑی محبت سے مجھے تھپکتے ہوئے کہا۔ ''لوگوں کی تو عادت ہوتی ہے' ایک بات ان کے دماغوں میں گھس جائے تو مشکل سے نکلتی ہے۔ تم نفرت کرنے والوں سے نہیں' صرف محبت کرنے والوں سے بولا کرو۔ یہ دیکھو کہ جاکھے کے گھر والے تم سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ اب تک تمہاری حمایت میں بول رہے ہیں۔''

جاکھے کی ماں نے بھی سمجھایا۔ ''شادی بیاہ کے گھروں میں جھگڑے تو ہوتے ہی ہیں۔ تیں اپنا جی خراب نہ کر۔''

جی خراب کیسے نہ ہوتا؟ ضرور ہوتا... لیکن یہ محبت کا کرشمہ تھا۔ عینی کا وجود تھا جس نے بدمزہ ہونے والی شادی کے ہنگاموں میں مجھے روک رکھا تھا۔ ادھر دلہن آنے والی تھی۔ ادھر میں اسے اپنی دلہن کے روپ میں دیکھتا رہتا تھا۔

عداوت شروع ہوجائے تو پھر ختم نہیں ہوتی۔ منہ زور سیلابی ریلے کی طرح ادھر اُدھر سے راستہ بناتی چلی جاتی ہے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ دشمن میرے خلاف کیسی سازشیں کررہے ہیں؟ شادی کے اس ہنگامے میں کیسے میری بربادی کا سامان کررہے ہیں؟ وہاں دن کے وقت شادی کا رواج تھا۔ ہم برات لے کر دوسرے گاؤں گئے تھے۔ دوپہر کے کھانے سے پہلے نکاح ہوا اور مغرب سے پہلے پہلے رخصتی کردی گئی۔

دستور کے مطابق نئی آنے والی دلہن کو لمبا سا گھونگھٹ نکال کر ایک سجی سجائی پیڑی پر بٹھادیا گیا تھا۔ اس بڑے سے کمرے میں کوئی مرد نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس نوبیاہتا دلہن کو پردہ کرایا جارہا تھا کیونکہ ابھی منہ دکھائی کی رسم ہونے والی تھی۔ اس لیے درجنوں خواتین اور بچے اس کے اردگرد گھیرا ڈالے بیٹھے تھے۔

منہ دکھائی کی رسم کا طریقہ یہ تھا کہ ایک ایک خاتون دلہن کے پاس جاتی تھی۔ لمبے سے گھونگھٹ کو صرف اس حد تک اوپر اٹھاتی تھی کہ دلہن کا چہرہ سوائے اس کے کوئی دوسرا۔ دیکھ نہ پائے۔ پھر منہ دکھائی کے طور پر دس بیس روپے اس کی ہتھیلی پر رکھتی تھی۔ جو اچھی حیثیت والی ہوتی تھیں، وہ ہزار پانچ سو روپے بھی رکھتی تھیں اور سونے کی انگوٹھیاں بھی پیش کرتی تھیں۔

میں بھی منہ دیکھنے کے لیے بے چین تھا مگر دلہن کا نہیں، اپنی عینی کا دیدار کرنا چاہتا تھا۔ وہ عورتوں کی بھیڑ میں ایسے چھپ جاتی تھی جیسے چاند بدلیوں میں رہ کر چھپ چھپ کر جھلک رہا ہو۔

پھوپھی نے کہا۔ ''ذرا بلال کو تو دیکھو... آتے جاتے دلہن کو تک رہا ہے۔ خدا خیر کرے۔ آخر اس کے ارادے کیا ہیں؟''

چاچی نے کہا۔ ''سیانا پاگل ہے۔ اپنی بہن کو اور عینی کو ڈھونڈنے کے بہانے دلہن کو تاڑ رہا ہے۔''

میں نے اپنے خلاف سرگوشیاں سنیں تو جھنجلا کر وہاں سے چلا آیا۔ رات کے کھانے تک منہ دکھائی کی رسم چلتی رہی۔ میرے دوسرے کزنز نے نئی بھابھی کی تصاویر اتارنی چاہیں تو جاکھے کی ماں نے صاف کہہ دیا۔ ''چھوروں کے سامنے بہو کا گھونگھٹ نہیں اٹھایا جائے گا۔ پردے میں تصویریں اتارنی ہیں تو اتارلو۔''

بھلا گھونگھٹ میں کیا تصویریں اترتیں؟ صورت تو چھپی ہی رہتی۔ جاکھے نے بھی اب تک اپنی دلہن کو نہیں دیکھا تھا۔ حجلۂ عروسی میں جاکر دیکھنے والا تھا۔

ہمارے ہاں سہاگ کے کمرے تک جانے کا رواج کچھ خاص اور عجیب سا ہے۔ رواج یہ ہے کہ شرم وحیا کا پاس رکھنے کے لیے دولہا سب کے سامنے اپنی دلہن کے پاس نہیں جاتا۔ ہوتا یوں ہے کہ جب تک تمام براتی لمبی تان کو سو نہیں جاتے، تب تک وہ گھر کے کسی دوسرے کمرے میں جاگتا رہتا ہے... یا دوستوں کی محفل میں وقت گزارتا ہے۔ جب یہ اطمینان ہوجاتا ہے کہ سب سو چکے ہیں، تب وہ دبے قدموں چلتا ہوا چوروں کی طرح حجلۂ عروسی میں داخل ہوکر پہلی بار دلہن کا منہ دیکھتا ہے۔

یہ رسم کچھ عجیب سی ہے لیکن ہمارے ہاں یہی دستور تھا۔ ایک دوسرے کے لیے محرم ہوجانے والے بھی دنیا سے چھپ کر چوروں کی طرح اپنے ملتے تھے جیسے واقعی چوری کررہے ہوں۔ صرف اتنا ہی نہیں دولہا کے لیے یہ شرط بھی عائد کی جاتی تھی کہ وہ منہ اندھیرے مرغ کے بانگ دینے



سے پہلے اس کمرے سے نکل آئے تاکہ کسی رشتے دار کی نظروں میں نہ آسکے۔

کمرے میں دھندلکا سا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ چوروں کی طرح اندر آنے والا چٹخنی چڑھانے کے بعد تھوڑی دیر تک وہیں کھڑا رہا۔ روشن دان سے آنے والی روشنی میں وہاں کی ہر چیز سایہ سایہ سی دکھائی دے رہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد ہی آنکھیں اس اندھیرے ماحول سے مانوس ہوگئیں۔

اس نے سجی دھجی مسہری کی طرف دیکھا۔ دن بھر کی تھکن نے دلہن کو دولہا کے انتظار میں گھڑیاں گننے کی مہلت نہیں دی تھی۔ شاید تھک کر سو چکی تھی۔ وہ دبے قدموں چلتا ہوا پلنگ کی طرف آیا۔ پھر اس کے ایک پاؤں کے انگوٹھے کو پکڑ کر ہولے سے ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اے...!''

سونے والی نے ایک ذرا چونک کر آنکھیں کھولیں۔ کوئی اس کے پیروں کی طرف کھڑا ہوا تھا۔ یقیناً وہ وہی تھا جس کے نام سے منسوب ہوکر وہ اس کمرے تک پہنچی تھی۔

وہ ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ نظریں جھکا کر گھونگھٹ نکال کر اندر ہی اندر سمٹنے لگی۔ وہ اس کے قریب بیٹھ کر گھونگھٹ اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''مہمانوں نے سونے میں بہت دیر کی۔ وقت کم ہے' سویر ہونے والی ہے۔ منے جلدی واپس جانا ہوگا۔''

باہر آنگن میں اور دوسرے کمروں میں مہمان گہری نیند سو رہے تھے۔ میں بیٹھک میں تھا۔ گرمی کے دن تھے اور میں ایسے موسم میں چھت کے نیچے سونے کا عادی نہیں تھا۔ اپنے گھر کے آنگن یا چھت پر سویا کرتا تھا۔ شادی کے گھر میں مجبوری تھی۔ جسے جہاں جگہ ملی تھی، وہ وہاں سو رہا تھا۔ لیکن مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ پنکھا چلنے کے باوجود گرمی سے بُرا حال تھا۔

ادھر حجلۂ عروسی میں جانے والا آدھے گھنٹے بعد ہی باہر آگیا تھا۔ ادھر میں بے چین ہوکر اٹھ بیٹھا تھا۔ گرمی اور حبس نے اتنا پریشان کیا کہ نہانے کے لیے غسل خانے میں چلا گیا۔ وہاں عموماً گھرانوں میں غسل خانوں کی چھتیں نہیں ہوتیں۔ بس ایک چار دیواری کھینچ کر فرش پکا کرکے ہینڈ پمپ لگادیا جاتا ہے۔ میں نے اپنا لباس اتار کر دیوار پر رکھ دیا۔ پھر ہینڈ پمپ سے ڈونگا بھر بھر کر ٹھنڈا پانی اپنے جسم پر ڈالنے لگا۔

ادھر میں نہا رہا تھا اور اُدھر حجلۂ عروسی کے اندر دلہن اپنا حلیہ درست کررہی تھی۔ ایسے وقت دروازے پر دستک سن کر چونک گئی۔ اس نے قریب آکر پوچھا۔ ''کون ہے؟''

باہر جاکھے نے محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں ہوں۔ جاکھا... کنڈی کیوں لگائی ہے؟''

دلہن نے زیرلب تعجب سے کہا۔ ''جاکھا...؟''

پھر یہ سوچ کر دروازہ کھول دیا کہ وہ کسی ضروری کام سے واپس آیا ہوگا۔ جاکھے نے اندر آکر دروازہ بند کردیا۔ دلہن کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ کمرے میں اب بھی اندھیرا تھا۔ اس نے پھر دوپٹے کو گھونگھٹ کی طرح اوڑھتے ہوئے پوچھا۔ ''اب کیا کام ہے؟''

اس نے چونک کر پوچھا۔ ''کیا مطلب...؟''

''واپس کیوں آئے ہو؟''

اس نے پھر چونک کر پوچھا۔ ''واپس...؟ واپس کون آیا ہے؟''

''میں تمہاری بات کررہی ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو یہاں سے گئے تھے۔''

اس نے شدید حیرانی سے پوچھا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو؟ میں تو ابھی آیا ہوں۔ پھر تھوڑی دیر پہلے یہاں سے کون گیا ہے؟''

اس نے پہلی بار گھونگھٹ سے جھانک کر سایہ سایہ سے دکھائی دینے والے جاکھے کو دیکھا۔ وہ کچھ بدلا بدلا سا دکھائی دے رہا تھا۔ غور کرنے پر محسوس ہوا کہ لب ولہجہ بھی پہلے جیسا نہیں ہے۔ اس کے اندر گھٹن سی ہونے لگی۔ اس نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔ ''تم... تم کون ہو؟''

وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''میں جاکھا ہوں...''

اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اس کے وجود سے اور قد کاٹھ سے صاف اندازہ ہورہا تھا کہ یہ وہ نہیں ہے جو تھوڑی دیر پہلے آکر جاچکا ہے۔ جاکھا کچھ الجھ سا گیا۔ اس نے فوراً ہی سوچ بورڈ کی طرف ہاتھ بڑھا کر لائٹ آن کردی۔ پلک جھپکتے ہی وہ کمرا روشن ہوگیا۔ لیکن دل ودماغ میں جیسے اندھیرا چھانے لگا۔

پہلے کمرے کے اندھیرے میں کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ اب روشنی میں جو کچھ دکھائی دے رہا تھا، اسے ذہن قبول نہیں کررہا تھا۔ دلہن کا سرخ جوڑا ایک طرف فرش پر یوں پڑا تھا جیسے گلاب کی پتیاں نوچ کر پھینک دی گئی ہوں۔ بستر کی بے ترتیبی چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ وہ اپنے دولہا کے آنے سے پہلے ہی سہاگ کی سیج پر لٹ چکی ہے۔

جاکھے نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اُدھر وہ شرم کی ماری حقیقت واضح ہوتے ہی اپنے پیروں پر کھڑی نہ رہ سکی۔ صدمے سے چکرا کر فرش پر گر پڑی۔ پھر اُس لٹنے والی کا قصہ جنگل کی آگ کی طرح پھیلتا چلا گیا۔ تمام مہمان اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔ کسی

نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

کسی نے جواب دیا۔ ''دوہٹی کے کمرے میں روشنی ہے۔''

''یہ تو بے حیائی ہے۔ کیا جاکھا چھپ کر نہیں گیا ہے؟''

''گیا تھا مگر چھپ کر تو چور آوے ہیں۔ اُس سے پہلے کوئی چور آیا تھا۔''

''ہائے ربا! کے چرا کرلے گیا ہے؟''

جواب میں دس طرح کی باتیں بنائی جارہی تھیں۔ اُدھر دلہن کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے جارہے تھے۔ اس سے پوچھا جارہا تھا کہ قصہ کیا ہے؟

قصہ ایسا تھا کہ وہ بول نہیں پارہی تھی۔ ایک تو لٹ جانے کا صدمہ تھا۔ دوسرا یہ کہ شرم سے مری جارہی تھی۔ کہتی بھی تو کیا کہتی؟ کچھ بولنے سے پہلے مرجانا چاہتی تھی۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ جاکھا اپنا سر پکڑے بیٹھا تھا۔ جھنجلا کر بولا۔ ''یہ مگر مچھ کے آنسو بہارہی ہے۔ جب وہ آیا تھا' تب شور مچاسکتی تھی۔ کسی کو آواز دے سکتی تھی۔''

دلہن کے ساتھ آنے والی ایک بوڑھی خاتون نے کہا۔ ''ہماری دھی کو غصہ نہ دکھا۔ کے اس نے پہلے کبھی تنے دیکھا تھا؟ اس بے چاری نے تو آنے والے کو اپنا آدمی سمجھ لیا تھا۔''

جاکھے کی ماں نے بہو کو تھپکتے ہوئے، پچکارتے ہوئے کہا۔ ''تنے اسے دیکھا ہوگا۔ ہم کو بتا، وہ دیکھنے میں کیسا تھا؟''

وہ کچھ بول نہیں پارہی تھی۔ گھٹی گھٹی سسکیوں اور ہچکیوں کی تال پر ایسے رو رہی تھی جیسے سانسیں رک رک کر آرہی ہوں۔ بوڑھی خاتون نے کہا۔ ''بیٹی! میرے کان میں بول۔ کچھ تو بول۔ تیرے ساتھ اندھیر ہوا ہے۔''

دور کھڑے ہوئے سسر نے کہا۔ ''ہم اس بدمعاش کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ہم کو معلوم ہونا چاہیے، وہ کون تھا۔ بہو سے اس کا حلیہ پوچھو۔''

وہ حلیہ کیا بتاتی؟ دلہن پہلی رات پاس آنے والے کو آنکھ بھر کر دیکھ نہیں پاتیں۔ حیا سے نظریں جھکی رہتی ہیں۔ اس نے نیم تاریکی میں اسے ایک آدھ بار دیکھا تھا۔ وہ سایہ سایہ سا، مٹا مٹا سا دکھائی دیتا رہا۔ تیز روشنی میں شاید اسے پہچان نہیں سکتی تھی۔

بڑی مشکل تھی۔ نہ وہ شناخت کرسکتی تھی' نہ شرم کے مارے کچھ بول پارہی تھی۔ ساس نے کہا۔ ''تو نے اس کے ہاتھ پاؤں دیکھے ہوں گے۔ وہ کیسے تھے؟ کے وہاں کوئی تل یا مسا تھا؟ یا کسی زخم کا نشان تھا؟''

دلہن نے انکار میں سر ہلایا۔ یوں پہچان لینے والی کوئی بات نہیں تھی۔ شکوریا، کاچھی اور باسو وہاں موجود تھے۔ ان کی مائیں بھی تھیں۔ ایک نے کہا۔ ''میں نے بلال کو غسل خانے میں دیکھا ہے۔ پتا نہیں، وہ پاگل کا بچہ اتنی رات کو کیوں نہارہا ہے؟''

یہ بات اس لیے پھونکی گئی کہ سننے والے اتنی رات کو نہانے کی وجہ معلوم کریں اور واقعی یہ بات کتنی ہی عورتوں اور مردوں کو کھٹکنے لگی تھی۔

پھوپھی نے دلہن کے پاس آکر کہا۔ ''بیٹی! شرمائے گی تو تجھ سے دشمنی کرنے والے کو سزا نہیں ملے گی۔ جب وہ دھوکے سے دولہا بن کر آیا تھا تو اس نے کچھ منہ دکھائی دی ہوگی یا تجھ سے کچھ لیا ہوگا؟''

دلہن کو یاد آیا۔ اس نے چونک کر کہا۔ ''ہاں۔ اس نے کہا تھا' میری کوئی نشانی رکھنا چاہتا ہے۔ وہ جاتے وقت ایک انگوٹھی لے گیا تھا۔''

''انگوٹھی...؟'' باسو پہلوان نے تقریباً چیخ کر کہا۔ ''میں نے تھوڑی دیر پہلے بلال کے پاس ایک انگوٹھی دیکھی ہے۔ وہ اسے چوم کر قمیص کی سائڈ والی بوجی میں رکھ رہا تھا۔''

میری امی نے غصے سے کہا۔ ''تم لوگ کیوں میرے بیٹے کے پیچھے پڑ گئے ہو؟ کیوں خوامخواہ اسے بدنام کرنا چاہتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''تمہارے بیٹے کو بدنام کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ میں نے جو آنکھوں سے دیکھا ہے' وہی کہہ رہا ہوں۔''

جاکھا، اس کا باپ اور اس کے بھائی کمرے سے نکلتے ہوئے بولے۔ ''ہم ابھی معلوم کرتے ہیں' بلال کہاں ہے اور کیا کررہا ہے۔''

ان کے پیچھے کتنی ہی عورتوں اور مردوں کا قافلہ چل پڑا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ دلہن کے کمرے میں کیسی شرمناک واردات ہوچکی ہے۔ پہلے دور سے لوگوں کے بولنے کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ اب وہ آوازیں قریب آرہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ہی غسل خانے کے باہر جاکھے کی آواز سنائی دی۔ ''بلال...! تیں اتنی رات کو کیوں نہارہا ہے؟ باہر آ...''

میں نے کہا۔ ''آرہا ہوں۔ گرمی سے طبیعت گھبرا رہی تھی۔ ٹھنڈے پانی سے بڑی ٹھنڈک مل رہی ہے۔''

کاچھی نے کہا۔ ''باہر نکل... تنے اچھی طرح ٹھنڈا کیا جاوے گا۔''

جاری ہے

# بدلہ

تنویر ریاض

پیشہ ورانہ اُمور نمٹاتے ہوئے معمولی اور غیر معمولی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے ...ذی فہم اور پاسانِ عقل کے سپاہی پیچیدہ اور دقیق معاملات کو نہایت جانفشانی سے حل کرلیتے ہیں... عدالتِ عالیہ سے متعلق ایک دلچسپ اور منفرد انداز پیرائے میں بیان کی گئی جرم کتھا...

**اس ملزم کی بے چارگی جسے نا کردہ جرم میں ملوث کردیا گیا تھا**

پیٹر اور راکیل کے تعلق کو کوئی خاص نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ البتہ ان کے درمیان کام کے حوالے سے ایک رشتہ ضرور تھا۔ وہ دفتر کے ساتھی تھے اور کام کے دوران ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ پیٹر کے دل میں اس کے لیے کچھ جذبات ہوں لیکن اس نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ایک روز کھانے کے وقفے کے دوران وہ دونوں بنچ پر بیٹھے یورپی سیاحوں کو عدالت کی سیڑھیوں پر تصویریں بنواتے دیکھ رہے تھے کہ پیٹر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''ہم تو بس کام کے عاشق ہیں۔ اس سے ہٹ کر کچھ نہیں سوچ سکتے۔''

راکیل یہ جملہ سن کر دل ہی دل میں بہت خوش ہوئی لیکن وہ کسی کی محبوبہ نہیں بننا چاہتی تھی۔ گو کہ اسے اعتراف تھا



www.digestpk.com

کہ پیٹر کی غیر معمولی ذہانت اور سمجھ بوجھ اسے ایک دوسری دنیا میں جانے پر راغب کرتی ہے پھر بھی اسے پیٹر کی بات کے جواب میں مسکرانا پڑا۔ پیٹر کے ہونٹوں پر بھی طنزیہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس کا مطلب وہ ہرگز نہیں تھا جو راکیل سمجھ رہی تھی کیونکہ ان دونوں کے درمیان ایسا کوئی جذباتی تعلق نہیں تھا۔ ایک ساتھ کام کرنے یا سارا دن اکٹھے گزارنے کے باوجود شاید ہی کبھی کوئی ایسا موقع آیا ہو جب انہوں نے ایک دوسرے کو چھوا ہو۔ اس کے باوجود ان دونوں میں گہری انسیت تھی اور وہ اپنے کام سے بے حد محبت کرتے تھے۔ پھر اچانک ہی وہ حادثہ رونما ہوا جس نے انہیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔

☆☆☆

وہ جمعے کا دن تھا اور اس روز کام کی نوعیت دوسرے دنوں کی نسبت مختلف ہوتی تھی۔ راکیل معمول کے مطابق بینک جانے کے لیے اپنے کمرے سے نکلی۔ جج اپنی میز پر بیٹھا ان فیصلوں کو پڑھ رہا تھا جو پیٹر نے پورے ہفتے کے دوران لکھے تھے جبکہ پیٹر تین منزلیں نیچے کورٹ روم میں کانفرنس کر رہا تھا۔ راکیل کو جج کے کاموں کے سلسلے میں بینک جانا پڑتا تھا جو عدالتی کاموں کے ساتھ ساتھ اپنی ذاتی زندگی میں کمپیوٹر کے استعمال کا قائل نہ تھا۔ اسی لیے وہ ابھی تک اپنی تنخواہ کا چیک وصول کیا کرتا اور راکیل وہ چیک بینک میں جمع کرواتی۔ اسی طرح بینک سے رقم نکالنے کے لیے بھی راکیل کو ہی جانا پڑتا۔ اس نے اپنی میز کی دراز میں ایک فائل رکھی ہوئی تھی جس میں وہ بینک سے پیسے نکالنے اور جمع کرانے کا سارا ریکارڈ رکھتی تھی۔

یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ تقریباً سبھی جج اپنے ماتحتوں سے ذاتی کام لیتے تھے۔ راکیل تو اسی پر شکر ادا کرتی تھی کہ جج نے کبھی اسے گھٹیا کاموں کے لیے نہیں بھیجا، مثلاً لانڈری سے کپڑے لانا یا کار کے انجن کا آئل تبدیل کرنا وغیرہ وغیرہ۔ اس نے ہمیشہ ایسے کاموں سے اپنے آپ کو دور رکھا اور اگر کبھی اس سے کہا گیا تو اس نے بڑی خوب صورتی سے ٹال دیا۔

کچھ سیکریٹریز اپنے ججوں کی ذاتی زندگی میں جھانکنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھیں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس طرح وہ بہت کچھ جان سکتی ہیں اور یوں ان کے لیے آگے بڑھنے کا راستہ ہموار ہو سکتا ہے لیکن راکیل اس طرح کی بلیک میلنگ کو پسند نہیں کرتی تھی۔ اسے اپنے جج کے بارے میں پہلے ہی سے سب کچھ معلوم تھا اور وہ مزید جاننے کی خواہش مند نہیں تھی۔ اس نے تو کبھی بینک میں رقم جمع کرواتے یا نکالتے وقت اسے گننے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ بینک کا کیشیئر رقم اور رسیدیں لفافے میں پکڑا دیتا اور وہ اس لفافے کو ججوں کا تو جج کے حوالے کر دیتی۔

وہ وسط مارچ کی ایک صبح تھی۔ راکیل دفتر جانے کے لیے گھر سے روانہ ہوئی۔ بہار کی آمد آمد تھی اور پودوں پر کلیاں چٹکنا شروع ہو گئی تھیں۔ وہ سرخوشی کے عالم میں پہنچی تو عدالت کے دروازے پر پولیس کی بھاری نفری کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ مرکزی دروازے کی سیڑھیوں کے ساتھ ہی پولیس کی پانچ گاڑیاں اور ایک ٹرک کھڑا تھا جبکہ احاطے کے اندر لوگ ٹولیوں کی شکل میں باتیں کر رہے تھے۔ عدالتی عملہ نیویارک پولیس کے سراغ رسانوں سے بحث کر رہا تھا۔ وہ ان کے پاس سے گزری تو اس کے کانوں میں دو لفظ پڑے..... حادثہ اور سیڑھیاں!

وہ لفٹ کے ذریعے اوپر پہنچی۔ سارے چیمبرز خالی پڑے تھے۔ جس حصے میں وہ اور پیٹر بیٹھ کر کام کرتے تھے، وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ اس نے جج کے پرائیویٹ دفتر میں جھانکا، وہاں جج اور پیٹر ایک لمبی سی میز کے آخری سرے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جج نے اسے مسکرا کر دیکھا جیسے اندر آنے کی دعوت دے رہا ہو۔

''کیا ہوا؟'' راکیل نے پوچھا۔

''بہتر ہوگا کہ پیٹر ہی تمہیں اس بارے میں بتائے۔'' جج نے کہا۔

پیٹر اپنی کرسی سے اٹھا۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنے کمرے میں جانے کے لیے قدم بڑھایا ہی تھا کہ اس کا پاؤں قالین پر پڑی کسی چیز سے ٹکرایا۔ وہ بُری طرح لڑکھڑایا لیکن اس نے کرسی کا سہارا لے کر اپنے آپ کو گرنے سے بچا لیا۔ اس نے راکیل کو اس کی کرسی پر بٹھایا اور خود اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ دونوں کے چہرے آمنے سامنے تھے۔ پیٹر نے اپنی دونوں آنکھیں صاف کیں اور بولا۔

''میں کانفرنس ختم ہونے کے بعد سیڑھیوں کے ذریعے اوپر آ رہا تھا کہ میں نے کسی کے گرنے کی آواز سنی اور دیکھا کہ میکس ہل مین سیڑھیوں پر گرا ہوا ہے۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا اور اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے فوراً ہی اپنے سیل فون کے ذریعے کیپٹن کو اطلاع دی اور فوراً ہی



سارے آفیسرز وہاں پہنچ گئے۔''

''وہ ٹھیک تو ہے نا؟'' راکیل نے پوچھا۔

''نہیں۔'' پیٹر بولا۔ ''وہ مر چکا ہے۔''

راکیل نے بے اختیار اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا اور ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

''اوہ، یہ تو بہت بُرا ہوا۔'' اس سے پہلے کہ وہ پیٹر سے مزید کچھ پوچھتی، چیمبر کا دروازہ کھلا اور دو سراغ رساں اندر چلے آئے۔

''پیٹر روگیرو!'' ان میں سے ایک بولا۔ ''تم اپنے آپ کو زیرِ حراست سمجھو۔ تم پر میکس مین کے قتل کا الزام ہے۔''

☆☆☆

پولیس نے واقعاتی شہادتوں کی بنا پر پیٹر کو ملزم ٹھہرایا لیکن اگر وہ تفصیل میں جاتے تو عدالتی عملے کا ہر فرد مشتبہ قرار پاتا کیونکہ اس بلڈنگ میں کام کرنے والے ہر شخص کا کم از کم ایک بار میکس ہل مین سے جھگڑا ضرور ہوا ہوگا۔ وہ تھا ہی اتنا بدتمیز اور جھگڑالو کہ کوئی بھی اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ قدرے فربہ جسم اور بھدے نقوش۔ اس کا سر تیزی سے گنجا ہو رہا تھا جسے چھپانے کے لیے وہ ہمیشہ بال کیپ پہنا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ سرگوشیوں میں بات کرتا اور لوگ مجبور ہو جاتے کہ اس کے قریب ہو کر بات سنیں اور اس طرح انہیں اس کی بدبودار سانس کے بھبکے بھی برداشت کرنا پڑتے۔

کیپٹن نے اس کی ڈیوٹی پانچویں منزل کی سیکیورٹی پوسٹ پر لگائی تھی۔ تمام ججوں کے چیمبرز میں جانے کے لیے یہی مرکزی داخلی راستہ تھا۔ یہاں عام طور پر ایسے آفیسرز کو تعینات کیا جاتا تھا جو انتظامیہ کے لیے مسئلہ بنتے ہوں۔ گویا یہ ایک طرح سے ان کے لیے سزا تھی لیکن میکس کو یہاں خود اس کی اپنی حفاظت کی غرض سے تعینات کیا گیا تھا تاکہ عملے کے دوسرے لوگوں سے اس کا واسطہ کم سے کم ہو۔ میکس کا انداز ہی ایسا تھا جب وہ بولتا تو سامنے والے کو یوں محسوس ہوتا جیسے اس کی بے عزتی کی جا رہی ہے۔

راکیل کے ساتھ میکس کا آخری جھگڑا دو سال پہلے ہوا تھا۔ وہ ایک مصروف دن تھا۔ اپیل کورٹ کے لیے درخواستیں مانگی گئی تھیں اور عدالتی عملہ ان درخواستوں کی جانچ پڑتال کرنے کے بعد ان کی مختصر فہرست بنا رہا تھا۔ راکیل اپنے ہاتھ میں کوئی ضروری فائل لیے ہوئے اس کے پاس سے گزری تو میکس نے اپنی مخصوص سرگوشی کے ذریعے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ راکیل کو مجبوراً رکنا پڑا۔ وہ اس وقت برگر کھا رہا تھا۔ اس نے بچا ہوا ٹکڑا میز پر رکھا اور وہی الفاظ دہرائے جو وہ پہلے بھی ادا کر چکا تھا۔

راکیل میں مزید کچھ سننے کی ہمت نہیں تھی اور نہ ہی وہ اس کے منہ لگنا چاہتی تھی لہٰذا تقریباً دوڑتی ہوئی اپنے چیمبر تک چلی آئی۔ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہی وہ سسکیاں لے کر رونے لگی۔ پیٹر نے سر اٹھا کر دیکھا اور فوراً ہی سمجھ گیا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ وہ غصے کے عالم میں اپنی جگہ سے اٹھا۔ راکیل اسے روکتی رہ گئی لیکن وہ آندھی اور طوفان کی طرح میکس کے سر پر سوار ہو گیا اور اس کے ماتھے پر انگلی رکھتے ہوئے بولا۔

''آئندہ اگر تم نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی تو پوری بتیسی باہر نکال دوں گا۔''

میکس پیچھے کی جانب ہٹا اور سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ ''تم اپنی دوست کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔''

☆☆☆

پیٹر کے مقدمے کی سماعت شروع ہو چکی تھی۔ راکیل روزانہ ہی وہاں جاتی۔ پیٹر نے اعتراف کیا کہ وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح میکس کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن راکیل والے واقعے کے بعد وہ اسے اپنا رقیب اور دشمن سمجھنے لگا تھا تاہم اس پر لگایا ہوا الزام غلط ہے۔ اس نے میکس کو دھکا نہیں دیا لیکن جیوری نے ان دو آفیسرز کے بیانات کو کافی جانا جنہیں پیٹر نے حادثے کے وقت فون کر کے بلایا تھا۔ ان میں سے ایک نے تصدیق کی تھی کہ میکس کو وقتی طور پر ہوش آ گیا تھا اور اس نے بمشکل تمام دھکا، کا لفظ ادا کیا۔ جب دوسرے آفیسر نے پوچھا کہ اسے کس نے دھکا دیا تھا تو اس نے پیٹر کی جانب اشارہ کر دیا۔ ان گواہوں کے بیانات کی روشنی میں جیوری نے اسے مجرم قرار دے دیا۔

پیٹر کے جیل جانے کے بعد جج نے اس کی جگہ ایک قبول صورت عورت صوفی کو رکھ لیا۔ بظاہر وہ بہت اچھی عورت تھی لیکن پیٹر سے اس کا کوئی موازنہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ راکیل جانتی تھی کہ صوفی کے ساتھ اس کی دوستی نہیں ہو سکتی۔ وہ نہ تو اس کے ساتھ لنچ کر سکتی ہے اور نہ ہی کہیں گھومنے کے لیے جا سکتی ہے۔ پیٹر سے اسے بڑی ڈھارس تھی۔ وہ اس کے بہت سے کام کر دیا کرتا تھا۔ سب سے خراب بات یہ ہوئی کہ پیٹر کی غیر موجودگی میں وہ ہر ایک کا نشانہ بن گئی۔ سب سے پہلے ایک پارٹ ٹائم کلرک نے اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی پھر ایک اور کلرک اس کے پیچھے پڑ گیا۔ وہ ہر ایک کی نظروں میں آ گئی تھی۔ اب اسے شدت سے پیٹر کی کمی کا احساس ہو رہا

تھا۔ وہ واقعی اس کے لیے ایک ڈھال تھا۔ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا پھر ایک دن فوکس اس کی زندگی میں آگیا۔

وہ عدالتی افسر تھا لیکن کسی مخصوص پوسٹ پر کام کرنے کے بجائے سارا وقت عدالت کی عمارت میں گھومتا رہتا۔ اس کی گہری نیلی آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی اور وہ دوسرے شخص کی کمزوریوں کو سمجھنے کا فن جانتا تھا۔ اس لیے راکیل کو بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی جب وہ جمعے کی صبح اس کے کمرے میں آیا اور بے تکلفی سے پوچھنے لگا کہ ہفتے کی شب اس کی کوئی مصروفیت تو نہیں ہے۔

''نہیں۔'' راکیل نے جواب دیا۔

''کیا تم کل کی شام میرے نام کرسکتی ہو؟'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

راکیل اس کی نیلی آنکھوں کے سحر میں کھو گئی۔ اس سے انکار نہیں ہوسکا اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پہلے انہوں نے ایک سی فوڈ ریسٹورنٹ میں ڈنر کیا پھر ایک پب میں جا کر موسیقی اور شراب نوشی سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ ان کی اگلی منزل سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی ایک عمارت تھی جس کے ایک اپارٹمنٹ کے دروازے پر وہ رک گئے۔ فوکس نے اپنی جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا اور تالا کھولنے لگا۔ راکیل نے بھی اپنا پرس ٹٹولا۔ اب تک سب ٹھیک چل رہا تھا لیکن مرد کی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ فوکس نے اپنی زبان سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن اس کا پُراعتماد انداز بتا رہا تھا کہ وہ اس شام کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔

راکیل کی نظر سب سے پہلے اخبارات کے ڈھیر پر گئی جو ڈیوڑھی میں رکھا ہوا تھا۔ مختصر سی راہداری پار کر کے وہ ایک دوسرے کمرے میں آئے۔ وہاں بھی اخبارات کے کئی بنڈل نظر آئے۔ اس کمرے میں بدبو اور گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔

راکیل نے حیرت سے پوچھا۔ ''تم یہاں رہتے ہو؟''

''میں نہیں بلکہ میکس یہاں رہتا تھا۔'' فوکس نے لیونگ روم کے صوفے کو صاف کرتے ہوئے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی اور بولا۔ ''پیٹر نے کہا تھا کہ میں تم پر بھروسا کرسکتا ہوں۔''

''میں نہیں جانتی تھی کہ تم اس کے دوست ہو۔''

''تمہارا خیال درست ہے۔'' فوکس بولا۔ ''ہم دوست نہیں ہیں بلکہ میں انسپکٹر جنرل کے لیے خفیہ طور پر کام کرتا ہوں۔ اسے پورا یقین ہے کہ میکس کی موت کے بہت سے پہلو حل طلب ہیں۔''

''کیا وہ سمجھتی ہے کہ پیٹر بے گناہ ہے؟''

''یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہ پولیس کے مقابلے میں اس کیس کا زیادہ گہرائی سے جائزہ لے رہی ہے۔'' فوکس بولا۔ ''کیا تم جانتی ہو کہ لوگ میکس کی دولت کے بارے میں کیسی کیسی باتیں کررہے ہیں؟''

''نہیں۔'' راکیل بولی۔ ''میں نے کبھی اس بارے میں غور نہیں کیا۔ بظاہر وہ اپنے اوپر زیادہ خرچ نہیں کرتا تھا۔ اس کا لباس، کھانا پینا اور یہ اپارٹمنٹ دیکھ کر یقین کرنا مشکل ہے کہ وہ کوئی دولت مند شخص تھا۔''

فوکس نے صوفے کے نیچے سے ایک دھات کا صندوق نکالا اور اسے میز پر رکھ دیا پھر اس نے دراز میں سے ایک چابی نکالی اور اس کی مدد سے صندوق کھولنے لگا۔

''نیویارک پولیس نے کبھی اس جگہ کی تلاشی نہیں لی۔'' اس نے بکس کا ڈھکنا اٹھاتے ہوئے کہا۔

اس بکس میں نوٹوں کی دس گڈیاں موجود تھیں جن میں سے ہر ایک پر ربر بینڈ بندھا ہوا تھا۔ راکیل نے ان میں سے ایک گڈی اٹھا کر اس کے کنارے کو چھوا۔ اس میں کم از کم تین ہزار ڈالرز، بیس اور پچاس کے نوٹوں کی شکل میں تھے جبکہ بقیہ نو گڈیاں اس کے مقابلے میں موٹی تھیں۔

''ان گڈیوں پر جو چٹ لگی ہوئی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر دو ہفتے بعد اس رقم میں اضافہ ہو جاتا تھا۔'' فوکس نے خیال ظاہر کیا۔

''اس سے تم نے کیا اندازہ لگایا؟'' راکیل نے پوچھا۔

''ہمارا خیال ہے کہ وہ کسی غیر قانونی کاروبار میں ملوث تھا۔ مثلاً منشیات، فحش فلمیں یا ممکن ہے کہ عورتوں کا سپلائر۔''

''کم از کم وہ سپلائر تو نہیں ہوسکتا۔'' راکیل نے کہا۔ ''اس کے بارے میں یہ سوچنا ہی مضحکہ خیز تھا کہ وہ کسی عورت کو اپنے جال میں پھنسا سکتا ہے۔''

''ہم کسی امکان کو نظر انداز نہیں کرسکتے۔'' فوکس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''وہ پیٹر کو نیچا دکھانے کے لیے کچھ بھی کرسکتا تھا۔''

''مگر کیوں؟'' راکیل نے کہا۔ ''پیٹر بہت ہی نفیس انسان ہے۔ اس کا اندازہ تمہیں بھی ہو جائے گا۔''

فوکس نے صندوق بند کیا۔ اسے صوفے کے نیچے کھسکایا اور چابی واپس دراز میں رکھ دی۔

''اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھو۔ اگر کوئی بات معلوم



ہو تو مجھے فوراً اطلاع کر دینا۔''

☆☆☆

پیر کی صبح راکیل وقت سے پہلے ہی اپنے چیمبر میں پہنچ گئی۔ اس نے ڈاک میں سے نیویارک لاء جرنل کی دو تہ کی ہوئی کاپیاں نکالیں۔ ایک جج کی میز پر رکھی اور دوسری کاپی کو اپنی میز پر پھیلا لیا۔ وہ دیکھنا چاہ رہی تھی کہ اپیل کورٹ نے جج کے کسی فیصلے کی توثیق یا اسے مسترد تو نہیں کیا۔ اچانک ہی اس کی نظر ایک کاغذ پر گئی جو تہ شدہ اخبار کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ اس نے کاغذ کو غور سے دیکھا اور اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ ''اوہ۔''

''کیا ہوا؟'' صوفی بولی جو ایک منٹ پہلے ہی وہاں آئی تھی۔

''اپیل کورٹ میں ایک جگہ خالی ہوئی ہے اور گورنر نے اس کے لیے درخواستیں مانگی ہیں۔''

''کیا ہمارا جج بھی اس عہدے کے لیے درخواست دے گا؟''

''ہاں..... ہاں..... کیوں نہیں۔ مجھے پورا یقین ہے۔'' راکیل نے جواب دیا۔

آدھ گھنٹے بعد جج بھی آگیا۔ اس نے باری باری دونوں لڑکیوں کو دیکھا پھر راکیل سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''تم نے نوٹس دیکھ لیا ہوگا۔ ٹھیک ہے۔ اس بار ہم پیچھے نہیں ہٹیں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی مٹھیاں بھینچیں اور تیزی سے اپنے دفتر میں چلا گیا۔

''یہ کیا کہہ رہا تھا۔ میں کچھ سمجھی نہیں۔'' صوفی نے سرگوشی کی۔

''دو سال پہلے بھی ایسی ہی ایک اسامی آئی تھی۔'' راکیل نے آہستہ سے کہا۔ ''میں اور پیٹر پورے ایک ہفتے تک درخواست بھیجنے کی تیاری کرتے رہے۔ اس عمل کے دوران ہمیں ان تمام مقدمات اور فیصلوں کا جائزہ لینا ہوتا ہے جو جج نے دیے ہوتے ہیں۔ ہمارا جج روزانہ پندرہ سے بیس مقدمات کی سماعت کرتا ہے اور اس نے ایک سال میں تقریباً چار سو فیصلے دیے۔ پھر ایک کمیٹی سب درخواستوں کی جانچ پڑتال کرتی ہے اور تقریباً ایک درجن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے بلایا جاتا ہے۔ ان میں سے پانچ افراد کے نام گورنر کو پیش کیے جاتے ہیں۔ ہمارا جج ان پانچ میں سے ایک تھا لیکن اس نے عین وقت پر اپنا نام واپس لے لیا۔''

''لیکن کیوں؟'' صوفی نے حیرت سے پوچھا۔

''میں نے ہی اس کی دست برداری کا خط ٹائپ کیا تھا۔ اس میں نام واپس لینے کی کوئی وجہ نہیں بتائی گئی تھی۔''

☆☆☆

پیٹر اسے جیل سے ہر منگل کو فون کیا کرتا تھا۔ ان کے درمیان بہت مختصر گفتگو ہوتی تھی۔ دراصل پیٹر صرف اس لیے باہر کی دنیا سے رابطہ رکھنا چاہتا تھا کیونکہ اس کی پیرول پر رہائی میں کافی وقت باقی تھا اور وہ بے چینی سے اس دن کا انتظار کر رہا تھا۔ راکیل اس سے باتیں کرتے ہوئے بڑی رازداری کا مظاہرہ کرتی۔ وہ عموماً اپنی کرسی میں جھک کر اور ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ باتیں کیا کرتی۔ اس بار پیٹر کا فون آیا تو اس نے پہلا سوال جج کے بارے میں کیا۔

''کیا وہ دوبارہ کوشش کرے گا؟''

''تم نے کہاں سے سنا؟'' راکیل نے پوچھا۔

''ایسی جگہوں پر خبریں تیزی سے پھیلتی ہیں۔''

''حالانکہ میں نے صوفی کو منع کیا تھا کہ وہ اس بارے میں کسی سے کوئی بات نہیں کرے۔''

''وہ تو گزشتہ بار ہی اس عہدے کے لیے منتخب ہو جاتا۔ یہ میں اس لیے نہیں کہہ رہا کہ میں بھی اس کے ساتھ ہی دارالحکومت چلا جاتا۔ کیا کبھی اس نے اپنی دست برداری کی وجہ بتائی؟'' پیٹر نے پوچھا۔

''نہیں، کوئی بھی اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' راکیل نے جواب دیا۔

''میں بھی نہیں جانتا۔ شاید وقت آنے پر پتا چل جائے۔ اب اسے نئے سرے سے کوشش کرنا ہوگی۔''

''میں ہفتے کی شام فوکس کے ساتھ گئی تھی۔'' راکیل نے اسے بتانا ضروری سمجھا۔

یہ بات سن کر پیٹر خاموش ہوگیا پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔ ''کیا یہ محض تفریح تھی؟''

''نہیں۔ اس کے برعکس معاملہ کچھ اور تھا۔ وہ مجھے میکس کے اپارٹمنٹ پر لے گیا تھا۔ شاید تمہیں معلوم ہو کہ وہ اس کی موت کی تحقیقات کررہا ہے۔''

''کیوں..... اب اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟'' پیٹر نے تلخی سے پوچھا۔

راکیل اس سے زیادہ نہیں بتا سکتی تھی کیونکہ فوکس نے اس پر بھروسا کیا تھا اور وہ اس کے اعتماد کو نقصان پہنچانا نہیں چاہتی تھی تاہم اس نے پیٹر کو پیسوں سے بھرے ہوئے بکس

کے بارے میں بتادیا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میکس کے پاس اتنی رقم کہاں سے آئی ہوگی۔'' پیٹر نے جواب دیا۔ ''اب وہ اس دنیا میں نہیں رہا تو اس رقم کے بارے میں جاننا اور بھی مشکل ہوگیا ہے۔''

☆☆☆

ہفتے کے بقیہ دن اور اس سے اگلے ہفتے راکیل اور صوفی، جج کی درخواست پر کام کرتی رہیں۔ راکیل نے تمام عمومی سوالات کے جوابات دوبارہ ٹائپ کیے اور ان میں سے پیچیدہ سوالوں پر جج سے ڈکٹیشن بھی لی۔ صوفی نے جج کے مقدمات اور فیصلوں کے مختصر خلاصے لکھے۔ گو کہ اسے بہت کم فرصت ملتی تھی لیکن جب بھی وہ کسی کام سے باہر نکلتی تو اس کا سامنا فوکس سے ہوجاتا۔ کبھی کینڈی اسٹینڈ پر جہاں وہ کافی پینے جاتی تھی یا لائبریری میں جہاں وہ اپنے کاغذات کی فوٹو اسٹیٹ کروانے جاتی۔ یہاں تک کہ کبھی وہ عمارت کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوکر تازہ ہوا میں سانس لیتی تو وہ وہاں بھی موجود ہوتا۔ وہ سوچتی کہ یہ محض اتفاق ہے یا وہ جان بوجھ کر اس کے راستے میں آجاتا ہے۔

جمعرات درخواست جمع کروانے کا آخری دن تھا۔ ساڑھے چار بجے کے قریب ہی جج اور صوفی نے راکیل کی میز کے گرد منڈلانا شروع کردیا۔ راکیل نے ایک بار پھر درخواست کو چیک کیا۔ اس کے ساتھ منسلک دستاویزات کا معائنہ کیا اور انہیں ایک ایک کرکے کمپیوٹر میں ڈال دیا۔ جیسے ہی راکیل اس کام سے فارغ ہوئی، جج نے شیمپین کی بوتل کھولی اور تین گلاس بھرنے کے بعد بولا۔

''دارالحکومت کے نام۔''

دونوں خواتین نے اس کا ساتھ دیا۔ راکیل کچھ زیادہ ہی پُرجوش دکھائی دے رہی تھی لیکن راکیل کے لیے یہ منظر نیا نہیں تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی جج کی متوقع کامیابی کا جشن منا چکی تھی۔ یہ بات اور ہے کہ جج نے کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر درخواست واپس لے لی تھی۔ چند ہی منٹوں میں جج اور صوفی نے اپنے گلاس خالی کردیے اور دوسرے راؤنڈ کی تیاری کرنے لگے جبکہ راکیل کا گلاس کی بورڈ کے برابر میں رکھا ہوا تھا اور اس نے صرف ایک ہی گھونٹ لیا تھا۔ پانچ بجے جج اور صوفی آرام کرنے کی غرض سے دفتر میں چلے گئے۔ وہاں دیگر فرنیچر کے علاوہ ایک کاؤچ بھی تھا جس پر لیٹ کر جج فارغ وقت میں آرام کیا کرتا تھا۔ راکیل کے کانوں میں زور سے ہنسنے کی آوازیں آئیں۔ اس نے اپنی چیزیں سمیٹیں اور چیمبر کا دروازہ کھول کر راہداری میں آگئی۔

وہ لفٹ کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اگر جج کی ترقی ہوجائے اور وہ سب دارالحکومت چلے جائیں تو یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوگا۔ کم از کم وہ اس ماحول سے تو نکل سکے گی جہاں پیٹر کی غیر موجودگی میں پرانی یادیں اس کا پیچھا کرتی رہتی ہیں۔

اگلے روز صوفی کی چھٹی کی درخواست آگئی۔ وہ بیمار ہوگئی تھی۔ جج بھی کافی دیر سے آیا۔ اس وقت تک صفائی کرنے والی عورت اس کے کمرے سے شیمپین کی دو خالی بوتلیں اٹھا کر جاچکی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے کاؤچ پر بچھی ہوئی چادر اور کشن بھی ٹھیک کردیے تھے۔ جج نے راکیل کے پاس سے گزرتے ہوئے اپنے سر کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اس کا مطلب سمجھتی تھی۔ اس نے دراز میں سے تین اسپرین نکالیں اور پانی کا گلاس لے کر اس کے پاس چلی گئی۔

''راکیل..... راکیل..... راکیل۔'' جج نے اسپرین کی گولیاں نگلنے کے بعد اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا اور پھر آنکھیں موند لیں۔ راکیل اس کے جذباتی لہجے سے بالکل بھی متاثر نہیں ہوئی اور اپنی سیٹ پر واپس آکر کام میں مصروف ہوگئی۔

وہ جمعے کا دن تھا اس لیے راکیل نے دوپہر میں اپنا کام بند کیا اور جج کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ کورٹ روم میں جاچکا تھا۔ راکیل نے اس کی دراز سے وہ لفافہ نکالا جس میں پے چیک اور رقم جمع کرانے والی سلپ رکھی ہوئی تھی۔ وہ یہ لفافہ لے کر بینک کے لیے روانہ ہوگئی۔ اس نے باہر نکل کر دیکھا، فوکس کہیں نظر نہیں آیا۔ اس روز راکیل نے بینک جانے کے لیے اِدھر اُدھر گھومنے کے بجائے سیدھے راستے کا انتخاب کیا۔ جب وہ واپس آئی تو چیمبر میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے لفافہ دراز میں رکھا اور اپنی کرسی پر واپس جانے ہی والی تھی کہ اچانک اس کے دماغ میں ایک خیال آیا۔ ایسا نہیں تھا کہ فوکس نے اس سے کچھ کہا تھا یا اس کے اشاروں کو سمجھ کر وہ اس طرح سوچ رہی تھی۔ اس بات کا فوکس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کے بجائے اس کے دماغ میں میکس کے وہ الفاظ گونج رہے تھے۔ ''کچھ دن پہلے تم کانفرنس روم میں کیا کرنے گئی تھیں؟''

راکیل واپس جج کی میز پر گئی اور لفافہ نکال کر رقم گننے لگی پھر اس نے میز کی درمیانی دراز کھولی جس میں جج اپنا مکمل ریکارڈ رکھتا تھا۔ اس لیے اسے یہ دیکھ کر کوئی حیرت نہیں ہوئی کہ ایک فائل میں وہ تمام بینک سلپ رکھی ہوئی تھیں جن کے ذریعے رقم جمع کرائی گئی تھی۔ اس ریکارڈ کے مطابق بینک میں پیسے جمع کرانے اور نکالنے والی رقومات تقریباً ایک جیسی تھیں۔ البتہ ایک خاص مدت کے دوران ہر ہفتے بینک سے پانچ سو ڈالرز زائد نکالے گئے۔ یہ وہ عرصہ تھا جب جج نے پہلی بار اپیل کورٹ میں تعیناتی کے لیے درخواست دی تھی اور یہ سلسلہ میکس کی موت تک جاری رہا۔

راکیل کے گھٹنوں میں جان نہ رہی جب اس نے اس زائد رقم کا حساب لگایا۔ اتنے ہی پیسے اس نے میکس کے صندوق میں بھی دیکھے تھے۔ یقیناً یہ رقم میکس کو ہی دی گئی تھی..... مگر کیوں؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنا ابھی باقی تھا۔ اس نے جھنجلا کر میز پر ہاتھ مارا اور جج کی گھومنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا گلا صاف کیا۔ جج اس کے بالکل سامنے دروازے میں کھڑا ہوا تھا۔

''کیا کوئی خاص بات ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں..... میرا مطلب ہے نہیں۔'' وہ جلدی سے کرسی سے اٹھی اور آگے کی طرف اس طرح جھک گئی کہ پشت کے زور سے دراز بند ہوجائے۔ ''میرا مطلب ہے کہ میں درخواست کی نقل تلاش کر رہی تھی، میں اسے ایک دفعہ اور چیک کرنا چاہ رہی تھی۔''

''وہ نقل تمہارے پاس ہی ہوگی۔ فائل میں دیکھو۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی میز کی طرف بڑھا۔ راکیل دوسری طرف سے گھوم کر جانے لگی تو وہ بولا۔

''تم کچھ گھبرائی ہوئی ہو؟''

''نہیں۔''

''پھر میری دراز میں کیا تلاش کر رہی تھیں؟''

''کچھ نہیں۔''

''اگر یہ بات ہے تو بھاگ کیوں رہی ہو؟''

''میں بھاگ تو نہیں رہی۔'' راکیل نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

راکیل آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میز کی دوسری طرف آئی اور پھر اس نے تیزی سے دروازے کی طرف قدم بڑھانا شروع کردیے۔ وہ جلد سے جلد فوکس سے مل کر بتانا چاہتی تھی کہ اس نے کیا دیکھا ہے اچانک اس کا پاؤں قالین میں الجھا اور وہ گھٹنوں کے بل اوندھے منہ گری۔ اس کی کلائی میں درد شروع ہوگیا۔ جج فوراً ہی اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے جھک


خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

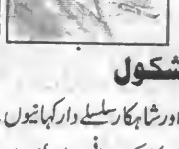



اگست 2011ء

کے شمارے میں شامل

تحاریر کی ایک جھلک

**کشکول**

آپ کے جانے پہچانے اور شاہکار سلسلے دار کہانیوں کے خالق **انوار صدیقی** کا ایک نیا فن پارہ' اسرار و تحیر کے پردے میں ملفوف ایک منفرد طویل سلسلہ

**فاتح کی شکست**

**ڈاکٹر ساجد امجد** کے قلم سے جاری تاریخ کے جھروکوں سے انتخاب' لازوال محبت کی عظیم نشانی تاج محل کے خالق شاہجہاں کی دلگداز داستان

**خانہ خراب**

دلوں میں چٹکی لیتی تحریر' ماہ اگست کے لیے **ملک صفدر حیات** کی ڈائری سے ایک کارنامہ

**حضرت یرمیاہ** علیہ السلام

بت پرستی کے اندھیروں میں گم بنی اسرائیل کی سرکشی اور انبیا کی جہد مسلسل کا احوال

**اس کے علاوہ**

واپسی، اناڑی، محفل شعر و سخن اور آپ کے خط

مزید

مختار آزاد، منظر امام، تنویر ریاض، سلیم انور، رضوانہ ساجد، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی، عمران درویش اور مریم کے خان کی منفرد تخلیقات

کر اسے اٹھایا اور صوفے پر بٹھا دیا۔ اس کی دونوں کلائیاں اپنے مضبوط ہاتھوں سے تھام لیں اور اس کے برابر میں بیٹھ کر انہیں سہلانے لگا۔ پھر اس کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔

''تم جاننا چاہتی ہو کہ میں نے گزشتہ بار اپنی درخواست کیوں واپس لی تھی؟ میں تمہیں بتاتا ہوں۔ جس روز سلیکشن کمیٹی نے مجھے پانچ امیدواروں میں سے منتخب کیا، اس کے دوسرے دن ہی میکس میرے دروازے پر آیا اور بولا کہ وہ مجھ سے ایک خاص معاملے پر بات کرنا چاہتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ میری وجہ سے ایک عورت حاملہ ہوگئی تھی۔ میں نے اسے ابارشن کے لیے پیسے دیے لیکن اس میں کچھ پیچیدگی ہوگئی اور اب وہ عورت کبھی ماں نہیں بن سکے گی۔ اس پر میں نے اسے جواب دیا کہ میں نے کوئی غیر قانونی کام نہیں کیا ہے، تب وہ بولا کہ کوئی بات نہیں۔ بہت سے اخبارات اور میگزین کے لیے یہ کہانی دلچسپی کا باعث ہوگی اور ایک بار یہ کہانی منظرِ عام پر آگئی تو میری ترقی نہیں ہوسکے گی..... اور عین ممکن ہے کہ مجھے ملازمت سے بھی ہاتھ دھونا پڑ جائیں۔ وہ اپنی زبان بند رکھنے کے لیے رقم کا مطالبہ کر رہا تھا۔ اسے یکمشت بڑی رقم نہیں چاہیے تھی بلکہ وہ چاہتا تھا کہ اسے ہر ہفتے ایک مخصوص رقم ادا کی جائے۔''

''اس کے باوجود تم نے اپنی درخواست واپس لے لی؟'' راکیل نے پوچھا۔

''میں ایسا کرنے پر مجبور تھا۔ اگر ایک بار میری اس عہدے پر تقرری ہو جاتی تو میں اس کی زبان بند رکھنے کے لیے ہمیشہ اسے پیسے دیتا رہتا۔ اس لیے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اس کے دباؤ سے نکلنے کے لیے کچھ وقت حاصل کروں اور دوسری بار اسامی کے مشتہر ہونے کا انتظار کروں۔''

اس کی کلائی کا درد کم ہوگیا تھا اور وہ خود کو پُرسکون محسوس کر رہی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو کاؤچ پر گرا لیا۔ جج نے بھی اس کی تقلید کی۔ اس کے جسم کا دباؤ محسوس ہوتے ہی راکیل کو کئی برس پہلے کی وہ گرم دوپہر یاد آگئی جب وہ خالی کانفرنس روم میں ایک ایسے ہی کاؤچ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ اس دفتر میں بالکل نئی تھی اور جج بھی ان دنوں کلرک کے طور پر کام کر رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں بڑے بڑے خواب سجے ہوئے تھے۔ جج کا ہاتھ اس کے بلاؤز کے بٹن تک پہنچ چکا تھا اور وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کی مزاحمت دم توڑ رہی ہے۔

''وہ شخص میرے لیے عذاب بن گیا تھا۔ اس نے رقم میں اضافے کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا۔ ایک دن میں نے غصے میں آکر اسے گردن سے پکڑا اور جب تک اس کا ہاتھ اپنی گن تک پہنچتا، میں اسے سیڑھیوں سے دھکا دے چکا تھا۔ وہ جس طرح نیچے جا کر گرا تھا، اس میں اس کے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔''

اس نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا۔ راکیل دم بخود اس کی باتیں سن رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کس طرح اس کی پیش قدمی سے اپنے آپ کو آزاد کروائے۔ کمرے میں گہری خاموشی طاری تھی۔ ایسے میں راکیل کو ہلکے سے کھٹکے کی آواز سنائی دی۔ وہ جج کا دھیان بٹانے کے لیے بولی۔

''لیکن میکس نے پیٹر کا نام کیوں لیا؟''

''وہ میرا نام نہیں لے سکتا تھا کیونکہ اس طرح خود بھی پھنس جاتا۔ پیٹر سے اس کی پرانی دشمنی تھی۔ لہٰذا اس نے بدلہ لینے کے لیے اس کی طرف اشارہ کر دیا۔ مجھے پیٹر پر ترس آتا ہے۔ اس بے چارے نے جیل جا کر میری خاطر قربانی دی۔''

جج اپنی دھن میں بولے جا رہا تھا۔ راکیل کی قربت نے اس پر نشہ سا طاری کر دیا تھا۔ وہ بھول گیا تھا کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ اب وہ اسے اپنے ساتھ دارالحکومت لے جانے کی بات کر رہا تھا۔ اس نے اسے وہ دوپہر بھی یاد دلائی جب ان دونوں نے کچھ وقت کانفرنس روم میں گزارا تھا۔ وہ اس عمل کو بار بار دُہرانا چاہتا تھا۔ اس نے راکیل کو اپنی جانب کھینچتے ہوئے کہا۔ ''تم ہمیشہ سے میرے دل میں بسی ہوئی ہو۔''

راکیل طنزیہ انداز میں مسکرائی اور بولی۔ ''صوفی کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''وہ ایک عارضی پڑاؤ تھا لیکن تم میری منزل ہو۔''

اس نے جیسے ہی اوپری بٹن کھولا، راکیل کے حلق سے چیخ نکلی۔ جج نے فوراً ہی اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ راکیل کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکی۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ فوکس کب ملحقہ غسل خانے سے نکل کر کمرے میں آگیا تھا۔ اس کے ساتھ دو پولیس والے بھی تھے۔ اس نے راکیل کو جج کی گرفت سے آزاد کرایا اور اپنے بازوؤں میں لے لیا لیکن راکیل اب بھی اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شاید اسے پیٹر کے علاوہ کسی مرد پر اعتبار نہیں رہا تھا۔

# احمق قاتل

جمال دستی

تخلیقی کام کرنے والے فنکار نہایت حساس ہوتے ہیں... کسی بھی منظر... اور حقیقت کو وہ اپنے خاص زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں... ان کی نگاہ کی خوبصورتی اور خیال کی نیرنگی کسی بھی شے کو نہایت خاص بنا دیتی ہے... رنگوں کی دنیا سے تعلق رکھنے والے آرٹسٹ کا ماجرا جسے اپنے نظریات کی نہایت بھاری قیمت ادا کرنا پڑی...

**ماضی کو فراموش کر کے مستقبل کو داؤ پر لگا دینے والے کوتاہ اندیش کا قصہ**

اس سردی... میں بیک شائر میں ہونے والے سالانہ آرٹ میلے میں کوئی خاص بات نہیں ہوئی، ماسوائے اس کے کہ ایک آرٹسٹ کا قتل ہوگیا تھا۔ ویسے، اس میلے کے دوران ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس لیے قتل اور وہ بھی مہمان آرٹسٹ کا، ایک غیر معمولی بات تھی۔ کم از کم میرے لیے کیونکہ یہ قتل میرے گھر کے گیسٹ ہاؤس کے احاطے میں ہوا تھا۔

ہوا یہ کہ جس شام مارٹی کا قتل ہوا... میں اور میری بیوی سینڈی ڈنر کے بعد پیدل ہی گھر کی طرف لوٹ رہے تھے۔ ہم نے سارا دن بہت مصروف گزارا تھا۔ اب ڈنر کے بعد گھر لوٹتے ہوئے ہم دونوں اسی حوالے سے باتیں کرتے ہوئے آرہے تھے۔ ہم جیسے ہی اس موڑ سے گزرے جس کے سامنے ہمارا گھر تھا تو دیکھا کہ پولیس کی کئی گاڑیاں، ایک



www.digest.com

ایمبولینس اور فائر بریگیڈ کا ٹرک ہمارے گھر کے باہر موجود ہیں۔ ان گاڑیوں پر لگی سرخ اور نیلے رنگ کی بتیاں جل بجھ رہی تھیں جو کہ خطرے کا اشارہ تھیں۔ ہم دونوں ہکا بکا رہ گئے۔ چند لمحوں تک ہم پر سکتہ طاری رہا۔ ہمیں سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ کیوں ہمارے گھر کے سامنے موجود ہیں۔ اس وقت تک ہم یہ بات نہیں جانتے تھے کہ پولیس کو گھر کے احاطے سے ایک لاش ملی ہے اور وہ بھی ہمارے مہمان مارٹی کی۔ ہم دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گھر کی طرف بڑھنے لگے۔ جیسے ہی ہم قریب پہنچے، ایک سادہ لباس پولیس والے نے ہمیں دیکھ لیا۔ وہ بھی تیزی سے ہمارے پاس آیا۔

''یہ آپ کا گھر ہے؟'' اس نے چھوٹتے ہی مجھ سے پوچھا۔ میں نے سر ہلا کر ہاں میں جواب دیا۔ سینڈی بدستور خاموش رہی۔

''میں پولیس سراغ رساں کیپٹن رومینو ہوں۔'' اس نے اپنا تعارف کروایا اور کہنے لگا۔ ''آپ کے گھر سے ایک لاش ملی ہے۔ میرے ساتھ آیئے۔ ہمیں لاش کی شناخت میں آپ کی مدد چاہیے۔''

''لاش؟'' سینڈی حیرت سے چلائی۔ لاش کا سنتے ہی میرے تو حواس گم ہو گئے۔

''وہ کس کی لاش ہے؟'' میں نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ پولیس کو دیکھ کر اور لاش کی دریافت کا سن کر میں سخت سردی کے باوجود پسینے میں نہا گیا۔۔۔ میرے اوسان خطا ہو چکے تھے۔

''آپ میرے ساتھ آیئے۔'' پولیس والے نے میری بات کا جواب دینے کے بجائے ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں لڑکھڑاتے قدموں سے گھر کی طرف چل دیا۔ سینڈی بھی میرا بازو تھامے ہوئے گھسٹتی ہوئی میرے ساتھ ساتھ چلی آرہی تھی۔ سراغ رساں ہمارے آگے آگے چل رہا تھا۔

چند لمحوں کے بعد میں اور سینڈی اپنے گھر کے عقبی حصے میں کھڑے ہوئے تھے۔ یہاں کئی اور پولیس والے بھی موجود تھے۔ لاش عقبی حصے میں زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ جہاں یہ لاش اس وقت موجود تھی، اس کے برابر میں میرا اسٹوڈیو اور گیسٹ ہاؤس بھی واقع تھا۔ دو کمروں پر مشتمل گیسٹ ہاؤس کے سامنے لان تھا۔ لاش اسی لان سے ملی تھی اور اب ہم دونوں لاش کے پاس کھڑے ہو کر اسے دیکھ رہے تھے۔ لاش دیکھ کر سینڈی کے چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔ وہ بالکل خاموش تھی۔ جب سے پولیس سراغ رساں نے ہمیں لاش شناخت کرنے کو کہا تھا، اس وقت سے سینڈی نے ایک لفظ بھی اپنے منہ سے نہیں ادا کیا تھا۔

میں سمجھ رہا تھا کہ اس ناگہانی آفت کے سبب وہ بری طرح سہمی ہوئی ہے۔ مجھے بھی کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیسے ہوا، کس نے کیا ہے۔

''اسے پہچانتے ہو؟'' ایک پولیس والے نے سراغ رساں کا اشارہ پاتے ہی لاش کے چہرے پر سے چادر ہٹاتے ہوئے کہا۔

''اوہ میرے خدا۔۔۔'' چہرہ دیکھتے ہی میں چلّا اٹھا۔ ''یہ کیسے ہوا؟'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ میری آنکھیں نم اور لہجہ روہانسا ہو رہا تھا۔ سینڈی بھی لاش کا چہرہ دیکھتے ہی دم بخود رہ گئی۔

''پہچانتے ہو اسے؟'' سراغ رساں نے سپاٹ لہجے میں ایک بار پھر سوال کیا۔ ''کیا نام ہے اس کا؟ کون تھا یہ؟'' اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

''ہاں۔۔۔ جانتا ہوں۔ یہ میرا دوست مارٹی لیوائن ہے۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''کیا یہ یہیں۔۔۔ رہتا تھا؟''

''یہ میلے میں شرکت کے لیے آیا تھا۔ دوست ہونے کی وجہ سے ہمارے ہاں ہی ٹھہرا ہوا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔ میں بدستور شدید صدمے سے دوچار تھا۔ میں نے آج سہ پہر ہی اس کے ساتھ بیٹھ کر کافی پی تھی۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ صرف چند گھنٹوں کے بعد مجھ سے اس کی لاش شناخت کرنے کے لیے کہا جائے گا۔

''بہت شکریہ اس بات کی تصدیق کرنے کا۔'' سراغ رساں نے کہا اور لاش پر دوبارہ چادر ڈال دی۔

یہ جنوری کا مہینا تھا۔ برف باری کا موسم تھا۔ اس وقت بھی ہلکی ہلکی برف پڑ رہی تھی۔ جب ہم نے لاش دیکھی تو مقتول کے جسم سے بہنے والا خون برف کی سفید چادر پر جم چکا تھا۔ زخم مارٹی کی پیشانی پر لگا تھا جس سے اب خون کا رساؤ تو مکمل طور پر رک چکا تھا البتہ پورا چہرہ خون آلود تھا۔

میرے لیے یہ بہت کٹھن لمحہ تھا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی کسی شخص کو نہ تو مرتے ہوئے دیکھا تھا اور جس حالت میں مارٹی لیوائن کا مردہ جسم میری نگاہوں کے سامنے تھا، نہ ہی اس حالت میں پہلے کوئی لاش دیکھی تھی۔ میرے لیے وہ لمحات نہایت تکلیف دہ تھے۔ اس وقت میری ذہنی حالت بہت بری تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں کوئی لاش دیکھ رہا تھا اور وہ بھی اتنے قریب سے۔ مارٹی کی آنکھیں بے نور تھیں۔ چہرے پر زردی چھا گئی تھی۔ لاش کے پاس ہی ایک پیزا



باکس پڑا ہوا تھا۔ پیزا، مُردہ لاش۔۔۔ یہ سب چیزیں زندگی کی بے ثباتی کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ میں بہت مشکل سے اپنے آنسوؤں کو بہنے سے روکے ہوئے تھا۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس وقت تم دونوں کہاں سے آرہے ہو؟'' سراغ رساں نے سوال کیا۔ جس وقت ہم لاش کی شناخت کر رہے تھے، اس وقت کئی اور۔۔۔ باوردی پولیس والے بھی آکر ہمارے گرد مستعدی سے کھڑے ہو چکے تھے۔

''ہم ڈنر پر گئے تھے، وہیں سے۔۔ آرہے ہیں۔'' میں بدستور خوف زدہ تھا۔ میرا دل لرز رہا تھا۔ سراغ رساں کا سوال سن کر میں نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔

''کس جگہ ڈنر کیا ہے؟''

''ریڈ ہاک اِن میں۔''

''کیا تمہارے پاس کسی قسم کا کوئی اسلحہ ہے؟'' سراغ رساں نے میرے چہرے کی طرف بغور دیکھتے ہوئے ایک بار پھر سوال کیا۔ اس کا چہرہ تاثرات سے عاری اور لہجہ سپاٹ تھا۔ ''میرا مطلب ہے کہ کوئی پستول، رائفل، شاٹ گن وغیرہ۔'' مجھے خاموش دیکھ کر اس نے وضاحت کی۔

''نہیں۔'' میں نے صرف ایک لفظ کہا اور پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہنا شروع کیا۔ ''میں ایک آرٹسٹ ہوں۔ مجھے کسی قسم کا اسلحہ رکھنے کی کوئی ضرورت کبھی پیش ہی نہیں آئی۔ میرا برش ہی میرا ہتھیار ہے۔''

''تم ریستوران میں کتنی دیر ٹھہرے تھے؟'' سراغ رساں نے سوال کیا۔ ''تم دونوں وہاں اکٹھے ہی گئے تھے؟'' اس نے ہم دونوں کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے یہ سوال کیا تھا۔

''جی ہاں۔۔۔ ہم دونوں وہیں تھے اور اکٹھے ہی گئے تھے اور اب اکٹھے ہی وہاں سے واپس لوٹ کر آرہے ہیں۔'' میں نے تفصیل سے بتانا شروع کیا۔ سراغ رساں رومینو نوٹ بک نکال کر پوائنٹس لکھنے لگا۔ ''ریستوران ہمارے گھر سے لگ بھگ ایک میل دور ہے۔ ہم مغرب سے کچھ پہلے گھر سے نکل کر پیدل وہاں پہنچے اور لگ بھگ ڈیڑھ دو گھنٹے وہیں رہے۔ اس کے بعد پیدل چلتے ہوئے گھر کو لوٹے تو آپ لوگوں کو یہاں پایا۔'' یہ کہہ کر میں خاموش ہو گیا اور سراغ رساں کا چہرہ تکنے لگا۔

''وہاں کوئی تمہیں پہچانتا ہے؟''

''ہم اکثر وہیں ڈنر کرتے ہیں۔ وہاں کا تقریباً سارا عملہ ہمیں اچھی طرح جانتا ہے۔ آپ چاہیں تو کسی سے بھی اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں۔''

''کیا ڈنر کے دوران میں تم دونوں میں سے کوئی وہاں سے اٹھ کر باہر گیا تھا؟'' اس نے سینڈی کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ بدستور خاموش تھی۔ خوف سے اس کا چہرہ سپید ہو چکا تھا۔ وہ اپنی اندرونی بے چینی کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ سراغ رساں کا سوال سن کر سینڈی اپنا نچلا ہونٹ چبانے لگی۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ سراغ رساں اس پر شک کر رہا ہے۔

''ہم ریستوران میں داخل ہونے کے بعد ڈنر کر کے ہی باہر نکلے تھے۔ وہ بھی ایک ساتھ۔'' سراغ رساں کے شک کو میں اچھی طرح محسوس کر چکا تھا اس لیے اپنے لہجے کو شائستہ رکھنے کے باوجود اس طرح لفظوں کو چبا چبا کر جواب دیا کہ وہ میری ناراضی کو بھی اچھی طرح محسوس کر لے۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا اور نوٹ بک پر کچھ لکھنے لگا۔ اتنی دیر میں مارٹی کی لاش کو ایمبولینس میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ پولیس نے جائے وقوعہ کے گرد فیتہ لگا کر اسے سیل کر دیا تھا۔

''جب تک تفتیش مکمل نہیں ہو جاتی، تم دونوں اس علاقے سے باہر کہیں نہیں جاؤ گے۔'' سراغ رساں نے اپنی نوٹ بک بند کر کے جیب میں رکھتے ہوئے تاکیدی لہجے کہا۔ ''ہمیں کسی بھی وقت تم دونوں سے مزید پوچھ گچھ کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔''

''بہت بہتر۔'' ہم دونوں نے اسے یقین دلایا۔ ''آپ کو جب بھی ہماری ضرورت محسوس ہو، ہمیں بلوا سکتے ہیں۔'' مجھے سراغ رساں کا حکم دینا قطعاً اچھا نہیں لگا۔ میں زندگی میں کبھی بھی پولیس کے چکر میں نہیں پھنسا تھا۔ اس کے باوجود ایک ذمے دار شہری ہونے کا بھرپور ثبوت دیتے ہوئے کہا۔

مارٹی میرا پرانا دوست تھا۔ میں اسے نیویارک میں رہائش کے زمانے سے جانتا تھا۔ جب سے میں کرافٹس بری منتقل ہوا تھا، وہ یہاں بھی کئی بار میرے گھر آچکا تھا۔ وہ جب بھی کرافٹس بری آتا، میرے ہاں ہی ٹھہرتا تھا۔

میرا گھر دو حصوں میں بنا ہوا تھا۔ ایک حصہ رہائش کے لیے مخصوص تھا۔ گھر کے عقبی حصے میں چھوٹا سا لان اور اس سے ملحق گیسٹ ہاؤس اور اسٹوڈیو تھا۔ مارٹی جب بھی میرے ہاں آیا، اصرار کے باوجود وہ رہائشی حصے میں کبھی نہیں ٹھہرا

حالانکہ گھر کے اندر کئی کمرے تھے اور اس کے رہنے سے ہمیں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوتی لیکن وہ اپنی مرضی کا مالک تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اسے گیسٹ ہاؤس میں رہنا اس لیے پسند ہے کہ کمرے کے باہر چھوٹا سا کھلا میدان ہے اور وہ کھلے ماحول میں بیٹھ کر سگریٹ پینے کا عادی ہے۔ اسے بند کمروں سے گھٹن محسوس ہوتی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ تنہائی پسند تھا۔ اسے گیسٹ ہاؤس میں رہنا شاید اس لیے پسند تھا کہ وہ جگہ گھر والوں کی ہر قسم کی مداخلت سے پاک تھی۔ گزشتہ تین سالوں سے جب بھی وہ ہمارے ہاں آیا، اس کی گرل فرینڈ رینی بھی اس کے ساتھ ہوتی تھی۔ اس بار بھی وہ آئی ہوئی تھی۔ اس نے ہی سب سے پہلے لاش دیکھی تھی اور پولیس کو اس قتل کی اطلاع دی تھی۔ ہم سے پہلے رینی پولیس کو سب کچھ بتا چکی تھی لیکن یہ گھر آخر کو ہمارا تھا اس لیے پولیس نے ہم سے بھی اس بیان کی تصدیق کرنا ضروری سمجھا۔

..... مارٹی بہت اچھا انسان تھا۔ وہ ہمیشہ خوش رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ اسے صرف ہم خیال لوگ پسند آتے تھے۔ وہ من موجی انسان تھا۔ اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں رہ رہا ہے البتہ رینی اس بات کا بہت خیال رکھتی تھی۔

ان دنوں بہت سخت سردی پڑ رہی تھی۔ دوسرے یہ کہ رینی کو سردی بھی بہت لگتی تھی لہٰذا اس بار جب وہ دونوں رہنے کے لیے آئے تو میں نے گیسٹ ہاؤس میں ہیٹر کا بھی بندوبست کر دیا مگر اس کے باوجود بھی رینی ہمیشہ سردی کی شکایت کرتی رہتی تھی۔ جب سے وہ یہاں آئے تھے، رینی اکثر ہمارے گھر ٹی وی دیکھنے کے لیے چلی آتی تھی۔ اسے اتنی سردی لگتی تھی کہ جب بھی وہ ہمارے ہاں آتی، کمبل میں لپٹی ہوتی تھی۔

مجھے یہ بات کبھی سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر رینی میں ایسی کون سی خاص بات تھی جو وہ مارٹی کے من کو بھا گئی۔ وہ پچیس سال کی تھی اور مارٹی عمر میں رینی سے اتنے ہی سال بڑا تھا۔ اس کے لمبے سیاہ بال تھے جنہیں وہ سلیقے سے باندھے رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ اسے نہ تو بات کرنے کا کوئی خاص سلیقہ تھا اور نہ ہی اس میں حسِ مزاح تھی۔ رینی کو دیکھ کر مجھے تو حیرت ہوتی تھی کہ اس فربہ لڑکی میں ایسی کیا خوبی تھی جو اس نے مارٹی جیسے آرٹسٹ کو اپنا اسیر بنالیا تھا؟ رینی کے پاس ایک موبائل فون بھی تھا۔ جس وقت وہ ایس ایم ایس نہیں کرتی تھی، اس وقت فون اس کے کانوں سے چپکا ہوتا تھا۔ میں نے جب بھی اسے باتیں کرتے دیکھا، وہ ہمیشہ کھانوں سے متعلق ہی بولتی ہوئی نظر آئی۔ اس کا لہجہ بھی امریکی نہیں تھا۔ جس لہجے میں وہ انگریزی بولتی تھی، اس سے لگتا ... کہ وہ کہیں اور سے ہجرت کر کے یہاں آئی تھی۔

جس شام مارٹی کی لاش دریافت ہوئی، وہ بدھ کا دن تھا۔ مجھے تو شبہ تھا کہ رینی نے اسے قتل کیا ہوگا۔ وجہ صاف ظاہر تھی، اس نے کھانے کے لیے باہر چلنے کی ضد کی ہوگی اور مارٹی کے انکار پر وہ اتنی بپھر گئی ہوگی کہ اس کا خون کر ڈالا۔ ویسے وہ مجھے لگتی بھی ایسی ہی تھی۔

مارٹی نے ہی رینی کی لاش دریافت کی تھی۔ مارٹی نے پولیس کو بتایا کہ واردات والی سہ پہر تک وہ میوزیم میں ہونے والے مباحثے میں مصروف تھے۔ اس کے بعد وہ مارٹی کے ہمراہ کہیں چائے پر گئے۔ جب وہ لوٹے تو اسے بھوک لگ رہی تھی جس پر مارٹی نے پیزا کا آرڈر نوٹ کروایا اور اسے پیزا لینے کے لیے بھیجا۔ مجھے رینی کے اس بیان پر حیرت تھی کہ مارٹی نے اُسے پیزا لینے کے لیے بھیجا۔ بہرحال، اس نے پولیس کو بتایا کہ جب وہ پیزا لے کر لوٹی تو اس نے گیسٹ ہاؤس کے چھوٹے سے برآمدے کے باہر سیڑھیوں کے قریب لان میں مارٹی کی لاش دیکھی۔ وہ جس حالت میں زمین پر پڑا ہوا تھا، اسے دیکھتے ہی وہ بدحواس ہوگئی اور اسی عالم میں گرتی پڑتی کمرے میں پہنچی اور پولیس کو فون کر دیا۔

جس وقت پولیس اور سراغ رساں جائے واردات پر ثبوت اکٹھے کرنے کی کوشش کر رہے تھے، رینی بھی برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی کانپ رہی تھی۔ وہ لوگ شاید اس کی کپکپاہٹ کو اس حادثے کا خوف سمجھ رہے ہوں مگر میں جانتا تھا کہ وہ سردی کی وجہ سے کپکپا رہی ہوگی۔

لاش کی منتقلی اور جائے واردات کے گرد فیتہ باندھنے کے بعد پولیس نے ہمیں گھر کے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ میں اور سینڈی رینی کو ساتھ لے کر اندر چلے آئے اور اسے اس کمرے میں لٹا دیا جہاں آتش دان کی وجہ سے درجۂ حرارت خاصا بہتر تھا۔ یہاں پہنچ کر سینڈی کی کپکپاہٹ ختم ہوئی اور اس نے بستر میں لیٹتے ہی خود کو سر تک کمبل میں ڈھانپ لیا۔ ہم اپنے کمرے میں آ گئے۔ نیند ہماری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ رینی کا تو پتا نہیں البتہ ہم میاں بیوی رات بھر انجانے خوف سے سو نہ سکے۔ پوری رات ہمارے گھر کے باہر ایک پولیس کار اور کچھ پولیس والے موجود رہے۔ میں بار بار باہر کھڑکی سے باہر کی طرف جھانک رہا



تھا۔ ہوسکتا ہے کہ ایسا نہ ہو لیکن مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ گیسٹ ہاؤس کی نگرانی کر رہے تھے۔

پولیس دوسرے دن دوپہر تک جائے واردات پر موجود رہی۔ ان کے.... جانے کے بعد ہم نے لنچ کیا اور پھر میں سینڈی اور رینی کو ساتھ لے کر میوزیم چلا آیا۔ سمپوزیم میں ایفل ٹاور سے متعلق پیش کردہ ایک دستاویز کا جائزہ لے کر اس پر ہمارا رائے دینا ضروری تھا، اس لیے ہمیں یہاں بادلِ ناخواستہ آنا پڑا۔ رینی ہمارے ساتھ جاتے ہوئے شاید اس لیے خوش تھی کہ وہاں کم سے کم کھانے پینے کا تو مسئلہ نہیں ہوتا۔ اُس دن کی ایک اور خاص بات بھی تھی۔ ''اکیسویں صدی میں جدید آرٹ'' کے موضوع پر مارٹی کے فن پاروں کی نمائش کا افتتاح ہونا تھا۔ اگرچہ سینڈی، رینی کو پسند تو نہیں کرتی تھی تاہم اس کا خیال تھا ایسے میں کہ جب مارٹی ناگہانی موت کا شکار ہو چکا ہے، اس کی نمائندگی کے لیے رینی سے بہتر کوئی اور شخص نہیں تھا۔ وہی اس کی قریبی ساتھی تھی جو موت سے کچھ دیر پہلے تک اس کے پاس تھی۔ یہ اور بات تھی کہ مارٹی کے قتل کا شبہ ہم دونوں اس پر ہی کر رہے تھے۔

فنی لحاظ سے مارٹی منفرد آرٹسٹ تھا۔ وہ ایسا آرٹسٹ تھا جس کے فن میں تخیل نظر آتا ہے۔ بظاہر اس کا کام ہر کسی کو متاثر نہیں کرتا تھا لیکن پھر بھی اس میں ایک خاص بات تھی اور وہ تھی تخلیقی صلاحیتوں اور فکر کا اظہار جو اس کے فن پاروں میں نمایاں نظر آتا۔

''کیسا لگا تمہیں مارٹی کا کام؟'' جب میں اور سینڈی مارٹی کے فن پاروں کو دیکھ رہے تھے تو مسز ڈولی برنچ میرے قریب آئیں اور مسکراتے ہوئے پوچھا۔ یہ سن کر میں خاموش رہا اور اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ ''ویسے کوئی غیر معمولی بات نہیں اس بار بھی۔ ایک بار پھر دیکھو، شاید تمہیں اس میں کچھ نیا پن نظر آ جائے۔'' ڈولی اس میوزیم کی کرتا دھرتا تھی اور اسی کی وجہ سے مارٹی کے فن پارے کرافٹس بری کی نمائش میں رکھے جاتے تھے ورنہ اگر ایگن سوئفٹ کا بس چلتا تو وہ اس بات کی اجازت ہی نہیں دیتی مگر وہ ڈولی کے سامنے من مانی کرنے سے قاصر تھی۔ ڈولی برنچ اس میوزیم کی ٹرسٹی بھی تھی اور علاقے کی بااثر عورت بھی۔ وہ مارٹی کے کام کو کیوں پسند کرتی تھی، یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ البتہ اسی کی وجہ سے مارٹی کو ہر سال میلے میں شرکت کا دعوت نامہ ضرور دیا جاتا تھا۔

''ایگن سوئفٹ نظر نہیں آ رہی ہیں۔'' میں نے ڈولی کی بات سن کر مارٹی کے ایک فن پارے پر نظریں گڑاتے ہوئے پوچھا۔

''بقول اُن کے وہ احمق نہیں ہیں جو اس احمقانہ کام پر اپنا وقت برباد کریں۔'' ڈولی برنچ نے مسکراتے ہوئے ایسے کہا جیسے وہ اس بات کی پروا نہیں کرتی کہ لوگ کیا کہتے ہیں... بالخصوص ایگن۔ ''ویسے اس وقت وہ کانفرنس روم میں نیویارک سے آئے ہوئے صحافیوں کے ساتھ مصروف ہیں۔''

''نیویارک سے آئے ہوئے...'' میں نے یہ سن کر حیرت سے کہا۔ ''اس سخت سرد موسم میں وہ کیوں چلے آئے یہاں؟''

''ایگن کی دعوت پر۔ تم تو جانتے ہو کہ اس نے خود کو دنیائے آرٹ کی کتنی بڑی شخصیت کے طور پر پیش کیا ہوا ہے۔'' ڈولی نے طنزاً کہا۔ اتنی دیر میں رینی بھی چلی آئی۔ اس کے ہاتھ میں کافی کا مگ تھا۔

''رینی مارٹی کی بیوی ہے؟'' ڈولی نے رینی کو آتا ہوا دیکھ کر سوال کیا۔

''نہیں... اُن دونوں نے کل شام تک تو شادی نہیں کی تھی۔'' سینڈی نے آہستہ سے جواب دیا۔

''اگر ایگن اسے دیکھ لے تو وہ یہی کہے گی کہ جیسے مارٹی کا کام سمجھ نہیں آتا، ویسے ہی اس کی پسند بھی سمجھ سے بالاتر ہے۔'' ڈولی نے سرگوشی کی تو سینڈی مسکرا دی۔

''بالکل ٹھیک کہا تم نے۔'' میں نے لقمہ دیا۔ ''مارٹی ایسا ہی آدمی تھا۔''

مسز ایگن طویل عرصے سے کرافٹس بری میں مقیم تھی۔ اس سے پہلے وہ نیویارک میں رہتی تھی۔ وہ بنیادی طور پر آرٹسٹ تھی لیکن اسے اپنے سوا دنیا میں کوئی اور معاصر آرٹسٹ بھاتا ہی نہیں تھا۔ اس نے نقاد، فنِ مصوری کے ماہر، فلسفی اور نہ جانے کن کن حیثیتوں سے خود کو مشہور کر رکھا تھا۔ وہ تعلقاتِ عامہ کی ماہر تھی۔ اس کے نیویارک کی اخباری دنیا میں کافی مراسم تھے اس لیے وہ کرافٹس بری کے میلے میں ہر سال چند مخصوص صحافیوں کو میوزیم کے خرچ پر بلوا لیتی تھی اور پھر انہیں اس طرح اپنے حصار میں قید کر لیتی تھی کہ اُن بے چاروں کو بھی ایگن کے سوا کوئی اور دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ جس وقت ہم مارٹی کے فن پارے دیکھ رہے تھے، اس وقت بھی وہ صحافیوں کو اپنے نرغے میں لیے..... بیٹھی تھی اور

آرٹ کے نام پر نہ جانے کیا کیا پٹی پڑھا..... رہی تھی ...
ویسے مارٹی سے اس کی بنتی بھی نہیں تھی۔ آرٹ کے حوالے سے دونوں کے خیالات میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ مارٹی کے نظریات کسی حد تک اس لائق ضرور ہوتے تھے کہ ان سے اتفاق کیا جائے لیکن ایگن کو اس کی ذات اور کام، دونوں سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ اگر کبھی مارٹی طلوعِ آفتاب کے وقت ایگن کے سامنے غلطی سے کہہ بیٹھے کہ سورج طلوع ہو رہا ہے تو وہ اس بات کو نہیں مانے گی بلکہ کہے گی کہ تم غلط ہو۔ سورج نکل رہا ہے۔ یہی نہیں اس بات پر بھی اصرار کرے گی کہ وہ اس کی رائے کو درست مانے۔ کل ہونے والے سمپوزیم میں بھی ایگن کا رویہ ایسا ہی تھا۔ اگرچہ آج مارٹی نہ تو نمائش میں موجود تھا اور نہ ہی اس دنیا میں مگر اس سے متعلق ایگن کا رویہ بدستور جارحانہ تھا۔ اسے کم از کم مرحوم مارٹی کے فن پاروں کی اس آخری نمائش کی افتتاحی تقریب میں تو شرکت کر لینی چاہیے تھی۔ مارٹی کی موت کے بعد ایگن کا اس سے روا رکھا جانے والا یہ مخاصمانہ رویہ مجھے قطعی اچھا نہیں لگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ صرف اسی خاطر چلی آتی کہ یہ ایک ایسے مرحوم آرٹسٹ کے فن پارے ہیں جو کل سہ پہر تک ہمارے درمیان موجود تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ ڈولی برچ کو بھی شاید اس بات پر افسوس تھا اسی لیے وہ بھی کوشش کر رہی تھی کہ ایگن کے ذکر سے اجتناب ہی برتا جائے۔

جتنی دیر تک ہم نمائش میں رہے، رینی بدستور کچھ نہ کچھ کھاتی پیتی رہی۔ اس کو دیکھ کر لگتا تھا کہ اسے مصوری کے ان نمونوں سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ وہ رسم نبھا رہی ہے۔ ہمیں حیرت تھی کہ مارٹی کی موت کے حوالے سے ایک وہ کے سوا، لوگوں نے ہم سے کوئی خاص بات نہیں کی۔ مجھے اس بات پر خوشی تو تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ حیرت بھی تھی کہ لوگ اس کی موت کو زیادہ اہمیت نہیں دے رہے تھے۔ انہیں اتنی بھی توفیق نہیں ہوئی کہ مارٹی کی ناگہانی موت پر صرف تعزیت کے دو الفاظ ہم سے یا رینی سے کہہ سکیں۔ اگرچہ میں اس بات کو سنجیدگی سے محسوس کر رہا تھا لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ ہوسکتا ہے کہ وہ ہم سے مارٹی کا تذکرہ کرتے ہوئے اس لیے بھی کترا رہے ہوں کہ وہ میرا دوست اور مہمان تھا۔ اوپر سے یہ کہ اس کا قتل بھی ہمارے ہی گھر پر ہوا تھا۔ پولیس تفتیش جاری تھی۔ جس کی وجہ سے میں اور سینڈی بھی ذہنی طور پر پریشانی میں مبتلا تھے۔ ایسے میں اس کی موت کے تذکرے سے ہماری پریشانیوں میں اضافہ ہوسکتا تھا۔ میں ہمیشہ تصویر کا مثبت پہلو دیکھنے کا عادی ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ جیسا میں سوچ رہا تھا ایسا نہ ہو مگر میں اپنی عادت سے مجبور تھا۔ مجھے ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا۔

تقریباً دو گھنٹے تک ... ہم نمائش میں رہے اور پھر شام ڈھلنے سے پہلے ہی گھر لوٹ آئے۔

☆☆☆

واردات کو چار دن گزر چکے تھے۔

''کیا مسٹر سائمن سے بات ہوسکتی ہے؟'' اس دن پیر تھا۔ میلہ بھی اپنے اختتام کے قریب تھا۔ رینی سو رہی تھی۔ میں اور سینڈی ناشتا کرنے کے بعد بیٹھے ہوئے تھے جب مجھے کیپٹن رومینو کا فون ملا۔

''جی کہیے... میں بول رہا ہوں۔''

''آپ کو پولیس اسٹیشن آنا ہوگا۔ ہمیں آپ سے کچھ پوچھ گچھ کرنی ہے۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں بات شروع کی۔ ''ارے ہاں... اپنی مسز کو بھی ساتھ لے کر آیئے گا۔ ہمیں ان سے بھی کچھ ضروری سوالات کرنے ہیں۔''

''میں انہیں بھی ساتھ لیتا آؤں گا۔ ویسے ہمیں کب پہنچنا ہوگا؟''

''جتنی جلدی ممکن ہوسکے۔''

''ٹھیک ہے۔ ہم گھنٹا بھر میں آپ کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔'' میں نے نرم لہجے میں جواب دیا۔

''تعاون کے لیے شکریہ۔'' اس نے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا اور بائے کہہ کر فون رکھ دیا۔

''کون تھا؟'' جب میں فون رکھ رہا تھا تو سینڈی نے تشویش سے میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیپٹن رومینو... کہہ رہا تھا کہ ہم دونوں پولیس اسٹیشن پہنچ جائیں۔ انہیں قتل کے حوالے سے پوچھ گچھ کرنی ہے۔ تمہارا بھی بطور خاص ذکر کیا ہے اس نے۔''

''کیا کہہ رہا تھا؟''

''بول رہا تھا کہ تمہیں بھی ساتھ لیتا آؤں۔ اسے تم سے بھی کچھ سوالات کرنے ہیں۔''

''او کے۔'' سینڈی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''انہوں نے ہمیں پولیس اسٹیشن بلایا ہے۔ ہمیں اپنے وکیل کو بھی ساتھ لے کر جانا چاہیے!'' سینڈی نے بلاوے کا سن کر مشورہ دیا۔



''معلوم نہیں۔'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔

''پولیس کی نظروں میں ہم مشتبہ ہیں۔ جب انہوں نے ہمیں تفتیش کے لیے بلایا ہے تو پھر لازم ہے کہ ہمارا وکیل بھی ساتھ جائے۔ ویسے بھی یہ قتل کا معاملہ ہے۔'' سینڈی نے دلیل دیتے ہوئے بات مکمل کی۔

''تمہاری یہ بات تو درست ہے۔'' سینڈی کی بات میں وزن تھا، میں نے اس کا اعتراف کیا۔ ''میں اپنے ایک وکیل دوست کو فون کرتا ہوں۔'' میں نے فون اٹھاتے ہوئے کہا۔

''کیا وہ ہمارے ساتھ چلنے پر تیار ہوجائے گا؟'' سینڈی نے پوچھا۔

''پتا نہیں۔ بات کر کے دیکھتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نمبر ملانے لگا۔

میں نے نکولسن کو فون کیا۔ وہ دھیمے مزاج کا مہذب آدمی تھا۔ وہ وکیل تھا اور جرائم کے مقدمات لڑا کرتا تھا۔ رسمی بات چیت کے بعد میں نے اسے ساری صورتِ حال بتائی تو اس نے سینڈی کے مشورے کی تائید کی۔

''تو پھر تم میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چل رہے ہو نا؟'' میں نے استفسار کیا۔

''کیوں نہیں۔'' نکولسن نے جواب دیا اور پوچھنے لگا۔ ''انہوں نے کب بلایا ہے؟''

''ابھی کچھ دیر پہلے ہی فون آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ جتنی جلدی ممکن ہو پہنچ جاؤ۔ ویسے میں نے اُس سے گھنٹا بھر میں پہنچنے کا کہا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ تم دونوں گھر سے نکلو، میں بھی وہیں آرہا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا۔

تقریباً دس منٹ کے بعد میں اور سینڈی پولیس اسٹیشن جانے کے لیے نکلے۔ ہمارے گھر سے پولیس اسٹیشن بیس منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔ جیسے ہی ہم باہر نکلے، ایک جھٹکا لگا۔ رینجرز کا ایک سپاہی ہمارے گھر کے باہر درخت سے ٹیک لگائے سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کا رخ ہمارے گھر کی جانب تھا۔ گاڑی دیکھتے ہی اس نے سگریٹ زمین پر پھینک کر جوتے سے مسلا اور آگے بڑھتے ہوئے ہمیں رکنے کا اشارہ کیا۔

''کہاں جارہے ہو؟'' گاڑی رکتے ہی وہ میری طرف آیا اور کھڑکی سے اندر کی طرف جھانکتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''پولیس اسٹیشن۔ ہمیں تفتیش کے لیے بلوایا گیا ہے۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ اسے دیکھ کر سینڈی کے چہرے پر شدید ناگواری کے اثرات نمودار ہو چکے تھے۔

''یہ تو ہمیں ہی قاتل سمجھ رہے ہیں۔'' جب میں اس سے بات کر رہا تھا تو سینڈی نے آہستہ سے کہا۔ میں اس کے لہجے کی برہمی کو صاف پہچان گیا۔

''معاف کیجیے گا، میں وہ نہیں ہوں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔'' اس نے بھی شاید یہ بات سن لی تھی اس لیے فوراً کہنے لگا۔ ''سر! آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں رینجر ہوں اور ذاتی کام سے آپ کے پاس آیا ہوں۔''

''کہو کیا بات ہے؟'' میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''میں آپ سے گزشتہ سال ایڈورڈ آئی لینڈ میں ملا تھا۔ یاد ہے آپ کو؟'' اس نے کہا اور خاموشی سے میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

یہ بات درست ہے کہ میں گزشتہ سال ایک نمائش کے سلسلے میں ایڈورڈ آئی لینڈ گیا تھا لیکن وہاں بہت سارے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ ہوسکتا ہے ان میں سے یہ بھی ایک ہو مگر مجھے یاد نہیں آرہا تھا کہ میں اس سے کب ملا تھا۔

''کہو کیا بات ہے؟''

''میں یہاں میلے میں آیا تھا۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔ ''مجھے کالج کے ہاسٹل میں ٹھہرایا گیا ہے۔ میں کچھ کام کرنا چاہتا ہوں مگر وہاں جگہ ناکافی ہے۔ مجھے ہاسٹل کے وارڈن نے بتایا ہے کہ آپ نے شوقین مصوروں کے لیے ایک اسٹوڈیو بنایا ہوا ہے۔ بس وہاں کام کرنے کی اجازت کے لیے حاضر ہوا ہوں۔'' اس نے اپنی بات مکمل کی۔

''اوہ...'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ تم میرے گھر کے باہر برآمدے میں بیٹھ کر انتظار کرو۔ میں آتا ہوں پھر تمہیں اسٹوڈیو کھول دوں گا۔'' مجھے یاد آگیا تھا کہ میں نے اسے تین دن پہلے اس سمپوزیم میں مہمانوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھا تھا جہاں مارٹی، ایگن، میں اور کئی دوسرے آرٹسٹ موجود تھے۔ میں نے بغور جائزہ لیا تو اس کے ہاتھ میں ایک بیگ بھی تھا۔ صورتِ حال جان کر سینڈی کے چہرے پر چھایا ہوا تناؤ بھی کم ہوگیا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟'' سینڈی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''میرا نام بہت مشکل ہے۔ سب مجھے رینجر کہتے ہیں۔ آپ بھی اسی نام سے پکاریں۔'' اس نے چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔ وہ رینجرز کی وردی میں ملبوس تھا لیکن وردی کے سوا اور کوئی ایسی نشانی نہیں تھی جس سے محسوس ہوسکے کہ یہ حقیقت میں بھی رینجرز کا سپاہی ہے۔

''تم رینجرز کے سپاہی نہیں ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''نہیں... مجھے بچپن سے ہی لوگ آوارہ گردی کی وجہ سے رینجر کہنے لگے تھے، سو میں نے رینجرز کی وردی پہننا شروع کر دی۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اسے برآمدے کی طرف جانے کا اشارہ کیا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

میں نے پہلے کہا تھا نا کہ اُس دن پیر تھا۔ پیر کو ویسے بھی تمام آرٹ گیلریاں بند ہوتی ہیں۔ آج میلے میں بھی وقفے کا دن تھا۔ تمام شرکا کو آرام اور تفریح کے لیے ایک دن کا وقت دیا گیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ بھی فرصت کے دن کو کام میں لانے کی خاطر اِدھر آنکلا ہے۔ ویسے بھی میں نے شوقین نوجوان مصوروں کے لیے گھر کے پچھلے حصے میں جو اسٹوڈیو بنایا ہوا ہے، وہ خاصا مشہور ہے اور اکثر لڑکے لڑکیاں وہاں آکر کام کرتے ہیں۔ اس لیے اُسے دیکھ کر چند منٹ پہلے مجھے جو تشویش لاحق ہوئی تھی، وہ رفع ہوگئی۔ میں نے گاڑی پولیس اسٹیشن کی طرف بڑھا دی۔

☆☆☆

''آپ مارٹی لیوائن کو کب سے جانتے تھے؟'' تقریباً آدھا گھنٹے بعد میں، سینڈی اور نکولسن پولیس اسٹیشن میں سراغ رساں کیپٹن رومینو کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے یہ سوال ہم دونوں سے کیا تھا۔

''مارٹی میرا بہترین دوست تھا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''میں اسے کافی عرصے سے جانتا ہوں۔ وہ اکثر میرے پاس آجاتا تھا۔ اس بار بھی جب وہ میلے میں شرکت کے لیے آیا تو اس نے منتظمین کی طرف سے دی گئی رہائش کے بجائے میرے گھر پر ہی ٹھہرنا پسند کیا۔'' یہ کہہ کر میں خاموش ہوگیا۔

''تمہاری اس سے پہلی ملاقات کب ہوئی تھی؟'' اس نے سوال کیا۔

''کئی سال پہلے نیویارک میں۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیسے؟'' اس نے وضاحت طلب کی۔

''ویسے ہی، جیسے میری اور آپ کی پہلی ملاقات اتفاقیہ ہوئی تھی اور اس وقت ہماری یہ دوسری ملاقات ہے اور ہم بیٹھے ہوئے بات کر رہے ہیں۔ اسی طرح مارٹی سے بھی میری پہلی ملاقات اتفاقی طور پر ایک نمائش میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد دوسری، تیسری اور پھر کئی ملاقاتیں ہوئیں۔'' میں نے تسلی بخش جواب دینے کی کوشش کی۔

''آپ نیویارک میں کب رہتے تھے؟'' رومینو نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔

''چار پانچ سال پہلے تک۔''

''وہاں بھی مارٹی آیا جایا کرتا تھا؟''

''ہاں... وہ اکثر ہمارے گھر آتا تھا لیکن جب سے ہم کرافٹ بری منتقل ہوئے ہیں، اس کا آنا جانا کچھ کم ہوگیا تھا۔ ویسے وہ یہاں جب بھی آیا یا تو میلے میں شرکت کے لیے یا پھر تصویری نمائش کی وجہ سے اس کا آنا ہوا۔ بلا وجہ وہ کبھی یہاں نہیں آیا۔'' میں نے کیپٹن رومینو کو مطمئن کرنے کی خاطر تفصیلی جواب دینے کی کوشش کی۔

''اور آپ...'' سراغ رساں نے سینڈی کی طرف اشارہ کیا۔ ''آپ کی اس سے پہلی ملاقات کب ہوئی تھی؟'' اس کا اشارہ سینڈی کی طرف تھا۔

''نیویارک میں، وہ بھی ان کے ساتھ۔'' سینڈی نے انگلی سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میری اس سے کوئی خاص بے تکلفی نہیں تھی۔ بس یونہی سرسری سی ملاقاتیں رہی ہیں۔'' سینڈی کا لہجہ دھیما اور سپاٹ تھا۔ ''یہاں وہ جب بھی آیا گیسٹ روم میں ہی ٹھہرا۔ اسے ہمارے رہائشی حصے سے کوئی سروکار نہیں تھا اور نہ ہی مجھے اس سے ملنے میں کوئی خاص دلچسپی تھی۔'' اس نے رومینو کی بات کا سیدھا سا جواب دیا۔

''کوئی رومانس... میرا مطلب ہے کہ رومینٹک تعلقات وغیرہ؟'' سراغ رساں رومینو نے دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے سینڈی سے سوال کیا۔

''رومینٹک تعلقات اور وہ بھی مارٹی لیوائن سے؟'' سینڈی نے اس کی بات سن کر ایسے کہا جیسے اسے شدید جھٹکا لگا ہو۔ ''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔ کیا مذاق کر رہے ہو؟'' اس بار اس کے لہجے میں ناراضی کو صاف محسوس کیا جاسکتا تھا۔

''اوکے...'' سراغ رساں نے سینڈی کے لہجے میں پوشیدہ تلخی کو محسوس کر لیا... وہ معذرت خواہانہ انداز میں گویا ہوا۔ ''میں صرف حقائق جاننے کی کوشش کر رہا ہوں تاکہ مجرم تک پہنچا جاسکے۔'' اس نے وضاحت کی تو سینڈی کے چہرے پر چھا جانے والا تناؤ کچھ کم ہوا۔ ''میری بات سے اگر آپ کو تکلیف پہنچی ہے تو معذرت چاہتا ہوں۔''

''اوکے۔'' سینڈی نے مختصر جواب دیا۔ ''کچھ اور بھی پوچھنا ہے تو پوچھ لیں۔'' اس نے طنزیہ انداز میں رومینو کو

مخاطب کر کے کہا۔

''آپ دونوں کسی ایسے شخص کو جانتے ہیں جو مارٹی سے ناراض ہو یا ان دونوں کے درمیان کسی قسم کی کشیدگی ہو؟'' سوال کرتے ہوئے اس کی نظریں ہم دونوں کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ نکولسن خاموش بیٹھا ہوا صرف سُن رہا تھا۔ جب سے سوال جواب کا یہ سلسلہ شروع ہوا تھا، اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ وہ خاموش بیٹھا ہر چیز کا بغور مشاہدہ کیے جا رہا تھا۔

''نہیں...'' میں نے قطعی لہجے میں جواب دینا شروع کیا۔ ''جتنا میں مارٹی کو جانتا ہوں، اس بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ کبھی بھی دوسروں کے بارے میں باتیں کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ میں نے اس سے اشارتاً بھی کبھی کوئی ایسی بات نہیں سنی جس سے شک ہو کہ کوئی شخص اس سے اتنی نفرت کرتا ہے کہ اس کی جان کے درپے ہو جائے۔'' یہ کہہ کر میں سانس لینے کے لیے رکا۔ ''وہ تو اتنی اچھی عادت کا مالک تھا کہ ان کے ساتھ بھی رواداری سے پیش آتا جو اس کے منہ پر ہی کھل کر اختلافِ رائے کیا کرتے تھے مگر اس کے باوجود اس کی پیشانی پر ایک شکن بھی نہیں آتی تھی۔'' یہ کہہ کر میں خاموش ہوا اور ایک گہری سانس لی۔ ''وہ بہت محبت کرنے والا انسان تھا۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آتا کہ وہ آج ہم میں نہیں ہے۔''

''مجھے افسوس ہے کہ میری باتوں سے آپ کو جذباتی صدمہ پہنچا... مگر مجبوری ہے۔'' رومینو نے جب مجھے افسردہ ہوتے ہوئے دیکھا تو ہمدردی سے کہنے لگا۔

''ہاں، ایک بات تھی اس میں۔ جو بھی اس کے خیالات سے اتفاق نہیں کرتا تھا، وہ اس سے دور ہو جاتا تھا۔ جس سے وہ دور ہوتا سمجھ لو کہ وہ شخص اس کے خیالات سے متفق نہیں۔'' میں اپنی دھن میں کہے جا رہا تھا۔ میں نے یہ بھی محسوس نہیں کیا کہ میری یہ بات سُن کر وہ چونک اٹھا ہے۔

''برک شائر میں کوئی ایسا فرد یا افراد جو مارٹی لیوائن سے اتفاق نہیں کرتے تھے یا خود مارٹی اُن سے دور رہتا تھا؟'' میرے خاموش ہوتے ہی رومینو نے سوال کیا۔

''ایک تو اس کی سابقہ بیوی ایگن سوئفٹ ہے۔ مارٹی اس سے کیا اتفاق کرتا، محترمہ خود اس کی ہر بات میں کیڑے نکال دیتی تھیں۔'' میں نے جواب دینا شروع کیا۔ ''اس کے علاوہ شاید کچھ اور لوگ بھی ہو سکتے ہیں لیکن میں ان کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''ایگن سوئفٹ اور مارٹی کے درمیان کب شادی اور طلاق ہوئی تھی؟'' رومینو نے حیرت سے پوچھا۔

''بہت برسوں پہلے عالمِ شباب میں ان دونوں نے نیویارک میں شادی کی تھی اور چند برس بعد وہیں طلاق ہو گئی تھی۔'' میں نے بتایا۔ ''ویسے میں نے ان کی شادی میں شرکت نہیں کی تھی۔ ایک دن مارٹی نے تذکرہ کیا تھا، تبھی یہ بات میرے علم میں آئی تھی۔''

''..... مارٹی اور دوسرے لوگوں میں اختلافِ رائے کی وجہ کیا ہوتی تھی؟'' رومینو اب کرید کرید کر مجھ سے حقائق معلوم کر رہا تھا۔

''مارٹی نہ صرف ایک آرٹسٹ تھا بلکہ فنونِ لطیفہ کی اس اہم صنف کے بارے میں اس کے اپنے ہی خیالات اور نظریات تھے، جن کا وہ برملا اظہار بھی کرتا تھا۔'' میں نے بات شروع کی۔ رومینو کی مکمل توجہ میری طرف تھی۔ ''اب یہی دیکھ لیں۔ کچھ عرصے قبل مارٹی جب یہاں ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے آیا تو موسم بہت اچھا تھا۔ اسی وجہ سے دُور دُور سے لوگ شرکت کے لیے یہاں پہنچے تھے۔ بس وہ موسم کا مخالف ہو گیا۔ اس مرتبہ سخت سردی کی وجہ سے تھوڑے لوگ آئے تو اس کی رائے تھی کہ اتنے تھوڑے سے لوگوں کے درمیان کسی آرٹسٹ کے کام کی پذیرائی کیسے ممکن ہو سکتی ہے۔ وہ معمولی سی بات پر بھی خاص نکتۂ نظر اختیار کر لیتا تھا اور پھر اس کا اظہار بھی کرتا رہتا تھا۔'' میں نے مارٹی کی شخصیت کے بارے میں اسے تفصیل سے بتایا تاکہ وہ اس کے اندازِ فکر کو سمجھ سکے جس کے باعث یا تو وہ خود دوسروں سے الگ ہو جاتا یا پھر دوسرے اس سے اختلاف کرتے ہوئے کنارہ کش ہو جاتے تھے۔

''..... ایگن کے متعلق کیا رائے تھی اس کی؟''

''وہ اسے اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ چھ سات ماہ پہلے کی بات ہے۔ وہ کرافٹس بری آیا ہوا تھا۔ ہم دونوں ڈرنک کر رہے تھے تب اس نے اچانک اسے بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔'' میں نے ایک واقعے کا تذکرہ کرنا مناسب سمجھا۔ میرا خیال تھا کہ اس سے رومینو کو اپنے سوال کا جواب مل سکتا ہے۔ ابھی میں نے بات شروع ہی کی تھی کہ رومینو نے مداخلت کی۔

''کیا کہہ رہا تھا وہ؟''

''اس کا خیال تھا کہ ایگن جیسے لوگوں نے آرٹ کو اُن کی اپنی نظر سے دیکھنے کی روایت ڈالی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں بے نقاب کرنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ وہ لوگ جو آرٹ کے شیدائی ہیں مگر اس کی باریکیوں کو نہیں سمجھتے... اگر ایگن جیسے لوگوں کو بے نقاب نہ کیا گیا تو وہ ناسمجھ گمراہ ہو جائیں گے۔ اس طرح تخلیقی آرٹ پر کام کرنے والوں کو بہت نقصان ہوگا۔'' میں نے بات مکمل کی۔

''وہ ایگن یا اس جیسے لوگوں کو کیوں ذمّے دار سمجھتا تھا اور وہ کیسے انہیں بے نقاب کر سکتا تھا؟'' رومینو نے پوچھا۔

''مارٹی کا خیال تھا کہ کرافٹس بری میں ایگن نے قبضہ کر رکھا ہے۔ وہ آرٹ کے موضوع پر شائع ہونے والے رسالوں اور اس موضوع پر کام کرنے والے صحافیوں کی مافیا بنا چکی ہے۔ میں اس بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ اب میں ایک تفصیلی مضمون لکھوں گا جس میں ثبوت کے ساتھ ان سب کو بے نقاب کر دوں گا۔''

''اوہ... اور کیا کہہ رہا تھا وہ؟''

''بس یہی کچھ۔ ویسے اس کے پاس ایک لیپ ٹاپ بھی ہوتا تھا۔ ممکن ہے، اس میں کچھ مواد ہو اس مضمون سے متعلق۔ باقی تو میں کچھ نہیں جانتا۔'' میں نے جواب دیا۔

''اس کے پاس لیپ ٹاپ بھی تھا؟'' یہ سن کر سراغ رساں رومینو نے ایسے کہا کہ جیسے اسے یہ بات سن کر شدید حیرت ہوئی ہو۔ ''ہمیں تو گیسٹ ہاؤس والے کمرے میں اس کے سامان سے کوئی لیپ ٹاپ نہیں ملا۔''

''یہ تو ممکن نہیں۔ وہ ہمیشہ اپنے ساتھ لیپ ٹاپ رکھتا تھا۔'' میں نے یہ سن کر کہا۔

''تمہارے بیان کی روشنی میں ایک بار پھر نئے سرے سے تفتیش کرنی ہو گی۔'' رومینو نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ''اس واردات کے بعد تمہارے گھر سے تو کوئی چیز چوری نہیں ہوئی... ذرا سوچ کر بتاؤ؟''

''نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے سینڈی کی طرف دیکھا۔

''ہمیں نہیں لگتا۔'' اس نے بھی نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے یہ سن کر سر ہلایا۔ ''ہمیں ایک بار پھر جائے وقوعہ کا تفصیلی معائنہ کرنا ہوگا۔''

''آپ جب بھی چاہیں، وہاں آ سکتے ہیں۔'' میں نے پیش کش کی۔

''مارٹی کی گرل فرینڈ کیا اب تک اسی کمرے میں رہ رہی ہے؟''

''نہیں... جس شام کو حادثہ ہوا تھا، اس کے بعد سے رینی ہمارے گھر میں رہ رہی ہے۔ اسے اس جگہ سے خاصا خوف آتا ہے۔''

''اور وہ کمرا جس میں مارٹی رہ رہا تھا؟'' رومینو نے یہ بات سُن کر سوال کیا۔

''اسی دن سے بند ہی پڑا ہے۔ آپ جب چاہیں آ کر جائزہ لے لیں۔'' میں نے اسے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔

''ویسے، اس کی تدفین کا کیا ہوگا؟'' میں نے سوال کیا۔

''فی الحال تو اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ آ گئی ہے۔ اب میرے خیال میں ایک دو دن میں اس کی لاش لواحقین کے سپرد کر دی جائے گی... مگر اس کا وارث کون ہے؟''

''یہ تو میں نہیں جانتا لیکن اگر آپ چاہیں تو اس کی لاش کو رینی کے حوالے کر سکتے ہیں۔ باقی تدفین کے اخراجات میں خود برداشت کر لوں گا۔ آخر کو وہ میرا دوست تھا۔''

''تمہارا جذبہ قابلِ تعریف ہے۔ ایک دو روز رک جاؤ۔ جیسے ہی ہم یہ طے کر لیتے ہیں کہ تفتیش میں لاش کی ضرورت باقی نہیں رہی تو پھر میت کو رینی کے ہی حوالے کر دیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا اور پھر چونکتے ہوئے پوچھا۔ ''اس کو زخم کس چیز کا لگا تھا؟''

''گولی کا... نائن ایم ایم کی پستول سے گولی چلائی گئی تھی۔ ایک ہی گولی چلائی گئی جو پیشانی میں پیوست ہوئی اور اس کا کام تمام کر گئی۔''

''اوہ...'' میں نے افسردگی سے کہا۔ ''اور کوئی خاص بات؟''

''فی الوقت میں کچھ نہیں بتا سکتا۔''

''جیسے آپ کی مرضی۔'' میں نے رومینو کی بات سن کر کہا۔

''اب آپ لوگ جا سکتے ہیں۔ اگر کوئی خاص بات ہوئی میں تو فون پر رابطہ کر لوں گا۔'' اُس نے خوش دلی سے کہا تو ہم تینوں اٹھ کر باہر گاڑی کی طرف چلے آئے۔

''میرا خیال نہیں کہ وہ تم دونوں کو اس معاملے میں ملوث کر رہا ہے۔'' باہر آتے ہوئے نکولسن نے جواب دیا۔ ''میرا مشورہ ہے کہ تم لوگ اس سے تعاون کرو۔ مجھے یقین ہے کہ اس کیس میں تمہیں میری ضرورت نہیں پڑے گی۔ معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹ جائے گا۔''

''اگر تم یہ سمجھتے ہو تو پھر ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔'' سینڈی

نے جواب دیا۔

گھر آتے ہوئے ہم راستے میں سپر اسٹور پر رکے۔ سینڈی نے گھر کے لیے کچھ ضروری سامان خریدا۔ پھر ہم نے ایک کیفے میں بیٹھ کر کافی پی۔ نکولسن کی بات سے سینڈی پر کافی اچھا اثر پڑا تھا۔ صبح تک وہ خاصی گھبرا رہی تھی مگر اب وہ مطمئن لگ رہی تھی۔ ویسے بھی سینڈی لکھنے پڑھنے والی عورت تھی۔ اسے اس طرح کی باتوں سے سخت کوفت ہوتی تھی۔

ہم گھر پہنچے تو رینی دھوپ تاپ رہی تھی۔ موسم خاصا خوشگوار تھا۔ دھوپ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ کئی دنوں کے بعد سورج نکلا تھا اس لیے ٹھنڈ بھی کچھ کم ہوگئی تھی۔

''ہائے رینی!''

''ہائے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''تم نے ناشتا کرلیا؟'' سینڈی نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' سینڈی نے اس کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''بالکل ٹھیک۔'' اس نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگ کہاں گئے تھے؟'' اس نے پوچھا۔

''پولیس اسٹیشن۔''

''قاتل کا کچھ پتا چلا؟''

''نہیں۔''

''وہ لاش کب تک ہمارے حوالے کردیں گے؟'' یہ کہتے ہوئے رینی کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے۔ اس نے اپنی شال کے پلو سے پلکیں صاف کیں اور ہماری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ''میں چاہتی ہوں کہ اس کی تدفین خود کروں۔ اس کے بعد یہاں سے چلی جاؤں گی۔''

''تم جب تک چاہو، یہاں رہ سکتی ہو۔'' سینڈی نے اٹھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ ایک عورت تھی اور رینی کا دکھ اچھی طرح سمجھ سکتی تھی۔ ''مارٹی ہمارا بھی دوست تھا۔ ہم سب مل کر اس کی آخری رسومات ادا کریں گے۔ تم تنہا نہیں ہو۔'' میں پہلی بار سینڈی کو رینی سے اس طرح ہمدردانہ لہجے میں گفتگو کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کی بات سن کر رینی کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مارٹی کی موت کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میں رینی کو اس طرح شدت کے ساتھ روتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ سینڈی نے اسے گلے سے لگایا، تسلیاں دیں اور پھر ہم تینوں اندر چلے آئے۔

☆☆☆

آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں ایک آرٹسٹ ہوں اور کرافٹس بری میں ایک آرٹ گیلری چلاتا ہوں۔ میری گیلری کی وجہ شہرت نوجوان آرٹسٹوں کی حوصلہ افزائی کے حوالے سے ہے۔ میری گیلری میں زیادہ تر کام نوجوان اور شوقیہ آرٹسٹوں کا رکھا ہوتا ہے۔ ویسے کاروبار کے لحاظ سے بھی میری گیلری کی شہرت بہت اچھی ہے۔ مالی لحاظ سے بھی مجھے اچھا خاصا منافع ہوجاتا ہے۔ سینڈی کو آرکیٹکچر میں دلچسپی ہے۔ وہ اس موضوع پر اتھارٹی سمجھی جاتی ہے۔ گزشتہ چوبیس برس کی شادی شدہ زندگی کے باوجود ہم دونوں ہی اولاد کی نعمت سے محروم ہیں جس کی وجہ اوپر والے کو ہی معلوم ہے۔

گیسٹ ہاؤس کے برابر میں میرا اسٹوڈیو نوجوان آرٹسٹوں کا ٹھکانا ہے۔ جب جس کا دل چاہے، آئے اور کام کرے۔ میری گیلری ان کے فن پاروں کے لیے ہمیشہ کھلی رہتی ہے۔ پیر کے دن چونکہ تمام آرٹ گیلریاں ہفتہ وار تعطیل کرتی ہیں، لہٰذا آج میری بھی گیلری بند تھی۔ اس لیے جب ہم واپس پہنچے تو میں اسٹوڈیو کی طرف چلا گیا تاکہ دیکھ سکوں کہ رنجر کیا کر رہا ہے۔

میں گھر کے پچھلے حصے پہنچا تو رنجر بیٹھا ہوا پیپر شیٹ پر کچھ لکیریں کھینچ رہا تھا۔ ''ہائے!'' وہ مجھے دیکھتے ہی بول اٹھا۔

''کیا حال ہیں؟'' میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔ ''کیا بنا رہے ہو، ذرا دکھاؤ تو سہی۔'' میں نے اس کے ہاتھ سے پیپر شیٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''بہت خوب۔'' اس کے ہاتھ میں صفائی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اگر اس کی حوصلہ افزائی کی جائے اور مواقع ملیں تو یہ آگے جاسکتا ہے۔

''سر! ابھی یہ ابتدا ہے۔'' اس نے میرے انہماک کو دیکھتے ہوئے کہا۔ شاید وہ اپنے بارے میں میری رائے جاننے کا منتظر تھا۔

''تم کب سے پینٹنگ کر رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''بچپن سے۔'' اس نے نہایت معصومیت سے کہا۔

''تمہارا ہاتھ اچھا ہے۔ اگر توجہ اور لگن سے کام کرو تو آگے جاسکتے ہو۔'' میں نے سچے دل سے اس کی تعریف کی۔

''یہ آپ کی مہربانی ہے لیکن ایک بے گھر آدمی اپنے کام پر کیسے بھرپور توجہ دے سکتا ہے۔'' رنجر کے لہجے میں افسردگی تھی۔

''کوئی بات نہیں۔ تم میرے اسٹوڈیو میں کام کرو اور سامنے گیسٹ ہاؤس میں ایک کمرا خالی ہے، ادھر رہ لو۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارا کام آرام سے بک سکتا ہے اگر تم چاہو تو...'' جب میں کہہ رہا تھا تو وہ پوری توجہ سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''شکریہ...'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''ٹھیک ہے، تم اپنا سامان اٹھاؤ اور سامنے والے اُس کمرے میں چلے جاؤ۔'' میں نے خالی کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اِس طرف اسٹوڈیو ہے۔ یہاں تم کام کرسکتے ہو۔''

''ٹھیک ہے۔ میں سامان رکھ دوں، پھر اسٹوڈیو میں جاتا ہوں۔'' اس نے اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''دوپہر کا کھانا آج تم ہمارے ساتھ کھانا۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ڈیڑھ بجے گھر پہنچ جانا۔''

''پہنچ جاؤں گا۔'' وہ گیسٹ ہاؤس کی طرف جا رہا تھا۔

دوپہر کے کھانے پر رینی بھی موجود تھی اور رنجر بھی۔ رنجر مجھے شریف آدمی لگا۔ رینی بھی اس سے مل کر خوش ہوئی۔ کھانے کے بعد رینی اس کے ساتھ ہی باہر کی طرف چلی گئی۔ میں خوش تھا کہ چلو رنجر کی وجہ سے اس کی تنہائی کچھ تو کم ہوگی۔ سینڈی بھی رنجر سے مل کر خوش ہوئی تھی۔ ''اچھا نوجوان ہے۔'' اس نے اُس کے جانے کے بعد کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ اسے پذیرائی ملے تو وہ زیادہ اچھا کام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔'' رنجر آتے ہوئے ایک چھوٹی سی پینٹنگ ساتھ لایا تھا۔ سینڈی اس کے کام سے متاثر ہوئی تھی۔ ویسے مجھے بھی اس کی عادت اچھی لگی۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' میں نے سینڈی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

☆☆☆

دو دن گزر گئے۔ اس دوران میں کوئی خاص بات نہیں۔ رنجر بدستور کام میں مصروف تھا۔ وہ خاصا محنتی شخص تھا۔ رینی کی بھی اس سے خوب ہم آہنگی ہوگئی تھی۔ اب رینی بھی دن کا زیادہ تر حصہ اس کے ساتھ اسٹوڈیو میں گزارنے لگی تھی۔

دوسرے دن ہم ڈنر سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ پولیس اسٹیشن سے رومینو کا فون آگیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ مجھے کو مارٹی کی لاش رینی کے حوالے کردی جائے گی۔ اس کی تدفین کے لیے جو تیاریاں کرنی ہیں، وہ کرلی جائیں۔ میں نے رینی کو اس بات سے آگاہ کردیا اور یہ بھی بتادیا کہ تمام تر اخراجات میں کروں گا، اسے فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

جمعے کی شام کو مقامی قبرستان میں مارٹی کی تدفین کی تیاریاں مکمل تھیں۔ مارٹی کے جنازے میں کرافٹس بری کے مقامی آرٹسٹوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ ایگن سوفٹ بھی آئی تھی۔ اس کی آمد پر ڈولی بریچ کو خاصی حیرت تھی تاہم تھوڑی ہی دیر میں یہ بات صاف ہوگئی کہ وہاں اخبار نویس بھی موجود تھے اس لیے ایگن نے اپنا امیج بنانے کے لیے اس موقع کو ہاتھ سے جانے دینا مناسب نہیں سمجھا ہوگا۔ اسی لیے وہ اخبار نویسوں کو مارٹی کے بارے میں اپنے رسمی تاثرات بتانے کے کچھ دیر بعد ہی وہاں سے کھسک لی تھی۔ ویسے میرا خیال تھا کہ وہاں جتنے لوگ موجود تھے، اُن میں سے شاید ہی کوئی یہ بات جانتا ہو کہ ایگن سوفٹ مارٹی کی سابقہ بیوی ہے۔ تدفین کے موقع پر رینی نہایت دل گرفتہ تھی۔ روتے روتے اس کی آنکھیں سوج چکی تھیں۔ اس موقع پر رنجر بدستور اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ وہ مسلسل اسے حوصلہ دے رہا تھا۔ یہ دیکھ کر نہ جانے مجھے کیوں لگا کہ رینی کی زندگی میں اگر رنجر آجائے تو بہت ہی اچھا ہوگا۔

جب سے مارٹی کا قتل ہوا تھا، اس کے بارے میں روزانہ مقامی اخبارات میں تفصیل سے رپورٹیں شائع ہو رہی تھیں۔ تدفین والے دن بھی یہ خبر نمایاں طور پر شائع ہوئی کہ ہفتہ بھر سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود پولیس اب تک قاتل کا سراغ نہیں لگا پائی ہے۔ تدفین میں سراغ رساں کیپٹن رومینو بھی آیا تھا۔ قبرستان سے واپس جاتے ہوئے وہ میرے برابر برابر چل رہا تھا۔ ''بات آگے بڑھی؟'' میں نے آہستہ آواز میں سوال کیا۔

''فی الوقت نہیں۔ ویسے آج رات ہم گیسٹ ہاؤس کی تلاشی لینا چاہیں گے۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔

''ٹھیک ہے مگر اس کے لیپ ٹاپ کا پتا چلا؟''

''ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا مگر امید ہے کہ دو تین دن میں یہ سارا معاملہ حل ہوجائے گا۔''

رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ پولیس گیسٹ ہاؤس کے اس کمرے کی تلاشی لے رہی تھی جہاں قتل سے پہلے مارٹی اور رینی رہ رہے تھے۔ رنجر ہمارے گھر میں موجود تھا۔ رینی کی حالت بدستور خراب تھی۔ وہ اس کی دل جوئی کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔

کوئی نو بجے کا وقت ہوگا جب رومینو نے مجھے باہر بلایا۔

''خیریت ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہیں ایک دو دن ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں کمرے کی تلاشی کے دوران نہ تو کوئی لیپ ٹاپ ملا اور نہ ہی کوئی ایسی شے جس سے امکان ہو کہ مارٹی کے پاس لیپ ٹاپ تھا۔ میرا خیال ہے کہ لیپ ٹاپ کی گمشدگی اور مارٹی کے قتل کے بیچ کوئی اہم تعلق ہے۔'' اس نے سرگوشی میں مجھے مطلع کیا۔

''کیا ہمیں کوئی خطرہ لاحق ہے؟'' میں نے اس کی بات سن کر تشویش سے کہا۔

''تمہیں ایک دو دن ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔'' اس نے اپنی بات دہرادی۔ ''ہم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ مقتول آپ کا دوست تھا۔ ہوسکتا ہے کہ قاتل کو اس کے سامان سے کسی خاص چیز کی تلاش ہو جو اسے نہ مل سکی ہو۔ اس لیے ممکن ہے کہ وہ آپ کے گھر میں گھسنے کی کوشش کرے۔'' اس نے مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ''ویسے بھی یہ ایک امکان ہے مگر پھر بھی...'' اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ ''مجھے یقین ہے کہ آپ نے میری بات سمجھ لی ہے۔'' مختصر سے وقفے کے بعد اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں کوشش کروں گا کہ محتاط رہوں۔''

اگلا دن خیریت سے گزر گیا۔ شام کو ہم چاروں نے گھر پر ہی ڈنر کیا۔ ڈنر کے بعد رینی رنجیر کے ساتھ اس کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ میں اور سینڈی بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ ہمارا موضوع رینی تھی۔

''میرے خیال میں دو چار دن میں وہ نارمل ہو جائے گی۔'' سینڈی نے کہا۔ ''میں دیکھ رہی ہوں کہ وہ دونوں ایک دوسرے میں خاصی دلچسپی لینے لگے ہیں۔'' اس کا اشارہ رنجیر اور رینی کی طرف تھا۔

''ہاں... اس بے چاری کے لیے یہ صدمہ تو کافی اندوہناک تھا۔'' میں نے تائید کی۔ ''میرا خیال ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے اچھے ساتھی ثابت ہوں گے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اگر رنجیر نہ ملتا تو بے چاری بالکل ہی تنہا رہ جاتی۔'' سینڈی کے لہجے سے ہمدردی جھلک رہی تھی۔ اسی دوران میں گھر کے داخلی دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ دروازہ کھولنے کے لیے اٹھ گئی۔ چند لمحوں کے بعد ایک چیخ بلند ہوئی۔ یہ سینڈی کی آواز تھی۔ میں گھبرا کر اٹھنے لگا۔ مجھے رومینو کی ہدایت یاد آگئی مگر اس سے پہلے کہ میں اپنی جگہ سے اٹھ پاتا، سینڈی میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس کے پیچھے کوئی نقاب پوش شخص تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس نے اپنا داہنا بازو سینڈی کی گردن میں ڈال کر اسے دبوچ رکھا تھا۔ پستول کی نال اس کی کنپٹی سے لگی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ میں ششدر رہ گیا۔ مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ نقاب پوش کون ہے اور ہم سے کیا چاہتا ہے؟ میں اپنی جگہ پر ساکت ہو چکا تھا۔

''تمہارا کمپیوٹر کہاں ہے؟'' نقاب پوش شخص نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ میں گنگ ہو چکا تھا۔ میرے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ پھر بولا۔ ''جلدی بتاؤ، ورنہ اس کا حشر بھی مارٹی سے مختلف نہیں ہوگا۔'' اس کی آواز عجیب سی تھی۔ مجھے لگا کہ یا تو وہ آواز بدل بولنے کی کوشش کر رہا ہے یا اس کے منہ میں کچھ شے ہے جس کی وجہ سے اس کی آواز صاف نہیں نکل پا رہی ہے۔

''میرے گھر پر کمپیوٹر نہیں ہے۔'' میں نے جھوٹ بولا حالانکہ گھر پر ایک کمپیوٹر تھا لیکن وہ سینڈی کا تھا۔ مجھے لگا کہ کہیں یہ شخص اس کے کمپیوٹر کو نقصان نہ پہنچائے۔ اگر ایسا ہوتا تو سینڈی کا بہت سارا تحقیقی کام ضائع ہوسکتا تھا۔ اس لیے میں نے اپنے اندر ساری ہمت جمع کر کے اس سے کہا۔

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' یہ کہہ کر اس نے میرے اوپر گولی چلادی۔ گولی میرے بائیں کندھے کے اوپر سے گزر گئی۔ ''جلدی بتاؤ ورنہ اگلی گولی تمہارے سر میں لگے گی۔''

گولی چلنے کے بعد میں بالکل ہی ہمت کھو بیٹھا تھا۔ میرے منہ سے الفاظ نہیں نکل پا رہے تھے۔

''کمپیوٹر وہاں ہے اسٹڈی میں۔'' مجھے خاموش دیکھ کر سینڈی نے جواب دیا۔ اس کی آواز خوف سے لرز رہی تھی۔ اس نے شاید میری جان بچانے کے لیے اسے کمپیوٹر کے بارے میں بتادیا۔ ویسے میں ڈر گیا تھا۔ یہ شخص مجھے ایسا جنونی لگ رہا تھا جو اپنی بات پر عمل بھی کرسکتا تھا۔

''اسٹڈی میں چلو۔'' اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ اس نے بدستور سینڈی کو دبوچ رکھا تھا۔

''چلو۔'' یہ کہہ کر میں آگے بڑھا۔ وہ بدستور سینڈی کو دبوچے ہوئے فاصلہ رکھ کر میرے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

''ہارڈ ڈسک نکالو۔'' اسٹڈی میں پہنچ کر اس نے حکم دیا۔ میں سی پی یو کو باہر نکال کر اس کے نٹ کھولنے لگا۔

''جلدی کرو۔'' میرے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ اس وجہ سے پیچ کس ٹھیک سے نہیں چلا پا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر نقاب پوش نے درشت لہجے میں حکم دیا۔ میں گھبرا گیا اور جلدی جلدی نٹ کھولنے لگا۔ کچھ دیر بعد میں نے ہارڈ ڈسک باہر نکال لی۔

''اسے میز پر رکھ دو۔'' میرے ہاتھ میں ہارڈ ڈسک دیکھ کر نقاب پوش نے حکم دیا۔ میں نے ہارڈ ڈسک میز پر رکھتے ہوئے سینڈی پر نظر ڈالی۔ خوف کے باعث اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی لگ رہی تھیں۔ اس کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا۔

''اب پیچھے ہٹ جاؤ۔'' میں نے جیسے ہی ہارڈ ڈسک میز پر رکھی اس نے حکم دیا۔ میں اُلٹے قدموں میز کے پاس سے پیچھے ہٹنے لگا۔ وہ بدستور سینڈی کو دبوچے ہوئے آگے کی طرف بڑھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کس طرح اس پر قابو پا سکتا ہوں لیکن مجھے ایسا کوئی موقع نہیں مل رہا تھا کہ اس پر حملہ کرسکوں۔

آگے بڑھ کر نقاب پوش نے ہارڈ ڈسک اٹھائی اور پستول کی نال سے مجھے آگے آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ میں بری طرح گھبرایا ہوا تھا اور اس پر قابو پانے کی ترکیب سوچ رہا تھا مگر کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میں اور سینڈی، دونوں بیک وقت اس کی پستول کی زد میں تھے۔ میں اس لیے بھی بہت زیادہ خوف زدہ تھا کہ کچھ دیر پہلے اس نے مجھ پر گولی چلا کر یہ باور کروادیا تھا کہ اگر مجھے اپنی اور بیوی کی زندگی عزیز ہے تو کسی بھی قسم کی احمقانہ حرکت سے گریز کروں ورنہ انجام کیا ہوسکتا ہے، یہ میں جان چکا تھا۔

ہم دونوں کو پستول کی زد پر لے کر وہ مرکزی دروازے تک پہنچ گیا اور پھر اس نے سینڈی کو دھکا دیا اور دروازے کی طرف بھاگا۔ سینڈی اس کی قید سے آزاد ہو چکی تھی۔ اسی لمحے میں نے حملہ کرنے کا فیصلہ کرلیا اور ایک دم اس کی طرف لپکا لیکن اس میں غضب کی پھرتی تھی۔ وہ مڑا اور اس سے پہلے کہ میں اسے دبوچتا، اس نے گولی چلادی۔ گولی چلتے ہی میرے بازو میں آگ سی بھر گئی اور میں چیخ مارتا ہوا گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ فرار ہو چکا تھا۔

میں درد سے کراہ رہا تھا۔ گولی میرے بازو میں لگی تھی۔ میرا لباس خون میں تر ہو رہا تھا۔ یہ دیکھتے ہی سینڈی فوراً فون کی طرف لپکی۔ وہ ایمبولینس بلوانا چاہتی تھی۔ ابھی وہ نمبر ملا ہی رہی تھی کہ ایک بار پھر گولی چلنے کی آواز آئی۔ ہم دونوں کے چہروں سے شدید خوف جھلک رہا تھا۔ سینڈی نے اس وقت بہت ہمت دکھائی اور بدستور نمبر ملاتی رہی۔ جیسے ہی اس نے فون رکھا، دو بارہ گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی پولیس کار کے سائرن بھی گونجنے لگے۔ میرے بازو سے تیزی سے خون بہہ رہا تھا۔ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ اسی دوران میں رینی بھی چلاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی لیکن اس نے جو کچھ اندر دیکھا، اس نے اسے مزید بدحواس کردیا۔

''رنجیر کو گولی لگ گئی ہے۔'' اس نے ہسٹریائی انداز میں چلاتے ہوئے کہا۔ اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

''اوہ میرے خدا...'' میرے منہ سے نکلا۔ مجھے ایمبولینس کا سائرن بھی سنائی دینے لگا تھا۔ کچھ ہی دیر میں تین باوردی پولیس والے، سراغ رساں کیپٹن رومینو اور ایمبولینس کا عملہ گھر کے اندر داخل ہو چکا تھا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا اور نہ ہی میں یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ رومینو اور پولیس اتنی جلدی کیسے پہنچ گئے اور رنجیر کو کس نے گولی ماری اور اب وہ کیسا ہے، کہاں ہے۔ میرا خون بدستور بہہ رہا تھا اور مجھ پر غنودگی طاری ہو چکی تھی۔ میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور میں زمین پر ڈھے گیا۔

☆☆☆

آنکھ کھلی تو کمرے میں سورج کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ سینڈی بیڈ کے برابر کرسی پر بیٹھی تھی۔ مجھے آنکھیں کھولتا دیکھ کر وہ مسکرائی۔ ''خدا کا شکر ہے تمہیں ہوش آگیا۔''

''میں زندہ ہوں۔'' میرے لہجے میں حیرت پنہاں تھی۔

''سو فیصد... ویسے بھی گولی بازو میں لگی تھی۔ اس سے انسان نہیں مرتا۔'' سینڈی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مگر خون زیادہ بہنے سے تو مرسکتا ہے۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔ تمہارا کافی خون بہہ گیا تھا۔ اسی لیے تم رات بھر بے ہوش رہے ہو۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ویسے ڈاکٹروں نے آپریشن کر کے گولی نکال دی ہے۔''

''آہ...'' سینڈی کی بات سن کر میں نے بازو کی طرف گردن گھمائی تو اچانک درد کی لہر پورے جسم میں دوڑ گئی اور میرے منہ سے بے اختیار کراہ نکل گئی۔ میری کراہ کو سنتے ہی سینڈی میری طرف جھک گئی اور میرا سر سہلانے لگی۔

''ارے...'' درد کی شدت میں کچھ کمی آئی تو مجھے رنجیر یاد آگیا۔ ''اس کا کیا ہوا؟''

''اس کی پنڈلی میں گولی لگی ہے۔ وہ بھی برابر والے کمرے میں ہے۔''

''کیسا ہے وہ؟'' میں نے گھبرا کر کہا۔

''ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ اس کی حالت بھی خطرے سے باہر ہے۔'' سینڈی نے بتایا۔

''خدا کا شکر ہے۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''اور رینی کہاں ہے؟''

''رینجر کے پاس۔اس کی دیکھ بھال کررہی ہے۔ویسے خاصی پریشان ہے وہ بھی۔'' سینڈی نے بتایا۔

''کیوں نہ پریشان ہو۔مارٹی کے بعد اسے ایک دوست ملا لیکن کوئی اس کی جان کے بھی درپے ہو چکا ہے۔'' میں نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''ویسے کچھ پتا چلا کہ معاملہ کیا ہے؟'' میں نے سینڈی سے پوچھا۔

''کچھ معلوم نہیں۔''

اتنے میں ڈاکٹر اور نرس کمرے میں داخل ہو گئے۔ڈاکٹر نے میرا تفصیلی معائنہ کیا اور نرس نے انجکشن لگا دیا۔انجکشن سے مجھے درد میں خاصا افاقہ محسوس ہوا۔

''میں پولیس کو اطلاع کرتا ہوں۔اب تمہاری حالت بہتر ہے۔تم بیان دے سکتے ہو۔'' ڈاکٹر نے میرے بیڈ کے سرہانے سے فائل اٹھا کر اس پر کچھ لکھتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں، میں بیان دے سکتا ہوں۔'' میں نے بھی تائید کی۔

تقریباً آدھا گھنٹا ہی گزرا ہوگا کہ رومینو پہنچ گیا۔اس کے ساتھ ایک باوردی پولیس والا بھی تھا۔میں نے انہیں تفصیل سے کل رات والے واقعے سے متعلق اپنا بیان لکھوایا۔''یہ سب چکر کیا تھا؟'' جب وہ فارغ ہو گئے تو میں نے رومینو سے پوچھا۔

''فکر مت کرو۔سب ٹھیک ہو گیا ہے۔''

''حملہ آور پکڑا گیا؟'' میں نے پوچھا۔

''تم پر حملہ کرنے والا اور مارٹی کا قاتل، دونوں پکڑے گئے ہیں۔'' اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔''ارے ہاں سینڈی! وہ تمہارے کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک پولیس کی تحویل میں ہے۔عدالت میں پیش کرنے کے بعد ہم اسے تمہارے حوالے کر دیں گے۔''

''شکر ہے خدا کا۔اس میں میرا بہت قیمتی ڈیٹا موجود ہے۔'' رومینو کی بات سنتے ہی وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔

''وہ قاتل اور حملہ آور کون ہے؟'' میں نے رومینو سے پوچھا۔

''سب کچھ پتا چل جائے گا۔تھوڑا سا اور صبر کرلو۔''

''اور اس نے رینجر پر کیوں گولی چلائی تھی؟'' میں نے ایک بار پھر رومینو سے سوال کیا۔

''اس لیے کہ اس نے حملہ آور کو پکڑنے کی کوشش کی تھی۔ویسے بڑا ہی بہادر آدمی ہے وہ۔''

''ہاں... کل رات جو کچھ ہوا، اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔اب میں اجازت چاہتا ہوں۔ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ تمہیں اور رینجر کو آج شام تک اسپتال سے فارغ کر دیا جائے گا۔امید ہے کہ کل صبح تم لوگ پولیس اسٹیشن پہنچ جاؤ تاکہ ملزم کو بھی دیکھ سکو اور ساری حقیقت جان سکو۔'' رومینو کہا اور پھر کمرے سے باہر چلا گیا۔

شام ڈھلنے سے پہلے ہی رینجر اور مجھے اسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔سینڈی نے اس کے رہنے کے لیے گھر کے اندر انتظام کر دیا تھا۔رینی نہایت تن دہی سے اس کی دیکھ بھال کررہی تھی۔

''ویسے تم کیسے باہر نکل آئے تھے؟'' ڈنر کرنے کے بعد ہم کافی پی رہے تھے، تب میں نے رینجر سے سوال کیا۔

''میں سگریٹ پینے کے لیے کمرے سے باہر نکلا تھا۔سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا سگریٹ پی رہا تھا، جب میں نے گھر کے اندر گولی چلنے اور پھر کسی شخص کو وہاں سے بھاگ کر باہر نکلتے دیکھا۔میں سمجھ گیا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔'' رینجر نے مزے لے لے کر واقعہ بیان کرنا شروع کیا۔''میں اس کے پیچھے بھاگا۔اسی میں اسے دبوچنے ہی والا تھا کہ اس نے گولی چلا دی۔میں نے بچاؤ کی کوشش کی لیکن پھر بھی گولی پنڈلی میں جا دھنسی مگر اس کے باوجود بھی میں نے اسے چھوڑا نہیں، چھلانگ مار کر دبوچ ہی لیا۔''

''واقعی... تم بہت بہادر آدمی ہو۔'' میں نے دل سے اس کا ممنون تھا۔''پھر کیا ہوا؟''

''بس! پھر کیا ہونا تھا۔میں نے اسے دبوچا ہی تھا کہ پولیس بھی پہنچ گئی اور پھر ہم اسپتال میں آ گئے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے بات ختم کی۔وہ خاصا زندہ دل نوجوان تھا۔

☆☆☆

دوسرے دن میں، سینڈی، رینی اور رینجر پولیس اسٹیشن پہنچے تو رومینو ہمارا منتظر تھا۔رینجر گاڑی سے اتر کر بیساکھی کی مدد سے عمارت کے اندر پہنچا تھا۔کمرے میں ٹی وی، ڈی وی ڈی پلیئر بھی رکھا ہوا تھا۔کچھ دیر بعد رومینو ایک ڈی وی ڈی پلیئر پر لوڈ کرنے لگا۔رینی چپس کھا رہی تھی۔رینجر کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اسے کسی بات کو جاننے کا تجسس ہی نہیں ہے۔البتہ میں اور سینڈی یہ جاننے کے لیے پریشان تھے کہ رومینو ہمیں کیا دکھانے جا رہا ہے۔

جیسے ہی پلیئر چلا اور ٹی وی پر پہلا منظر آیا، میں اور سینڈی چونک گئے۔''یہ کیا؟'' ہم دونوں نے حیرت سے کہا۔



''یہی ہے مارٹی کا قاتل اور حملہ آور۔'' رومینو نے مسکرا کر کہا۔''ہم نے اس کا ویڈیو بیان ریکارڈ کرلیا ہے۔تم بھی سارا ماجرا اس کی زبانی۔''

ہم ٹی وی کی طرف دیکھنے لگے۔ایگن سوئفٹ اپنا بیان ریکارڈ کروا رہی تھی۔اس کا لہجہ شکستہ تھا۔چہرے پر ندامت اور نظریں نیچی تھیں۔

''افسوس... اس عورت نے آرٹ کے شعبے میں اپنا مقام بنانے کے کتنے اُلٹے سیدھے کام کیے لیکن آج قاتل کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آئی ہے۔'' سینڈی نے اس کا بیان سنتے ہوئے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔''کیا ملا اسے یہ سب کچھ کر کے۔'' اس کی آنکھوں میں نمی اُتر آئی تھی۔

ایگن نے اپنے بیان میں انکشاف کیا کہ آرٹ کی دنیا میں سرگرم کچھ کاروباری شخصیت نے ایک گروہ بنایا ہوا ہے۔ایگن بھی اس کا ہی ایک حصہ ہے۔یہ لوگ کچھ خاص مصوروں کو پہلے تو شہرت بخشتے ہیں اور پھر ان کے کام کو سستے داموں خرید کر بڑی بڑی آرٹ گیلریوں کے ذریعے مہنگے داموں فروخت کر کے بھاری منافع کماتے ہیں۔اس کام میں آرٹ کے موضوع پر رسالے شائع کرنے والے بعض اشاعتی اداروں کے ایسے مالکان بھی شریک ہیں جن کی نیویارک، لندن، پیرس، بون اور یورپ کے کئی دوسرے بڑے شہروں میں اپنی بڑی بڑی آرٹ گیلریاں بھی موجود ہیں۔

مارٹی یہ بات جانتا تھا اور وہ اس کا شدید مخالف تھا۔کچھ عرصے قبل اس نے نیویارک سے شائع ہونے والے ایک رسالے کو خط لکھ کر اس واقعے کے بارے میں بتایا۔اس رسالے کا ایڈیٹر بھی مارٹی کا ہم خیال نکلا۔اس نے مارٹی کو قائل کرلیا تھا کہ وہ اس موضوع پر تفصیلی مضمون لکھے لیکن کئی ماہ گزر جانے کے باوجود وہ یہ مضمون نہ لکھ سکا۔اسی دوران میں یہ بات کسی نہ کسی طرح یہ صحافتی حلقوں میں پہنچ گئی اور پھر فیسٹیول کے موقع پر نیویارک سے آئے ہوئے آرٹ کے ایک معروف صحافی نے اس کا تذکرہ ایگن سے کر دیا۔

جس شام مارٹی کا قتل ہوا، ایگن اس کے پاس پہنچی۔جب وہ گیسٹ ہاؤس کے قریب تھی تو اس نے رینی کو باہر جاتے دیکھ لیا تھا۔جب وہ گیسٹ ہاؤس ... پہنچی تو حسبِ عادت مارٹی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔اس نے مارٹی کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ کسی طرح اپنے اس اقدام سے باز آجائے مگر وہ نہ مانا۔آخر مشتعل ہو کر ایگن نے مارٹی کو دھمکانے کے لیے اپنا پستول نکالا لیکن وہ اس کی دھمکی میں نہ آیا اور اپنی بات پر قائم رہا۔آخر وہ مشتعل ہو گئی اور اس نے گولی چلا دی۔گولی مارٹی کی پیشانی پر لگی اور وہ کوئی آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔اس کے بعد وہ کمرے میں داخل ہوئی۔لیپ ٹاپ میز پر ہی رکھا تھا۔اس نے وہ لیا اور خاموشی سے چلی گئی۔اسے نہ تو کسی نے آتے دیکھا اور نہ ہی جاتے ہوئے۔

ایگن کا کہنا تھا کہ اسے لیپ ٹاپ میں اُس مضمون کے حوالے سے کوئی مواد نہیں ملا جس پر اسے شک گزرا کہ اس نے کہیں یہ مضمون لکھ کر سینڈی کو ایڈٹ کرنے کو تو نہیں دے دیا۔بس اسی وجہ سے وہ سینڈی کے گھر پہنچ گئی۔

ابھی ایگن نے یہی کچھ بتایا تھا کہ رومینو نے ٹی وی اور پلیئر بند کر دیا۔''اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ تم سب ہی جانتے ہو۔'' رومینو نے کہا۔''ویسے سینڈی! تمہارے لکھنے کی صلاحیت کی تو ایگن بھی معترف نکلی۔''

''ہاں... اسی لیے وہ پھنس گئی۔'' سینڈی نے مسکرا کر جواب دیا تو ہم سب ہنسنے لگے۔

کچھ دیر بعد رومینو پارکنگ میں کھڑا ہمیں رخصت کر رہا تھا۔''ارے، ایک بات تو سنو...'' اس سے پہلے کہ سینڈی گاڑی اسٹارٹ کرتی، رومینو میری طرف آ کر کہنے لگا۔''رینجر کا خاص خیال رکھنا۔یہ چند روز تک آپ کا مہمان رہے گا۔''

''یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔'' مجھ سے پہلے سینڈی بول اٹھی۔

''ضرورت ہے۔سینڈی ہماری فورس کا آدمی ہے۔یہ ایف بی آئی کا اسپیشل ایجنٹ ہے۔''

''کیا؟'' میں یہ سُن کر چونک گیا۔سینڈی کا بھی منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''جی ہاں۔'' رومینو نے کہنا شروع کیا۔''اسے مصوری سے خاصا لگاؤ ہے۔'' اسی لیے وہ میلے میں شرکت کرنے کے لیے کرافٹس بری آیا تھا لیکن جب مارٹی کا قتل ہوا تو ہماری خاص درخواست پر اس کی ڈیوٹی تمہارے ساتھ لگا دی گئی۔یہ تمہارے گھر کی نہ صرف نگرانی کر رہا تھا بلکہ اسی کی اطلاع پر ہی پولیس پہنچی اور ایگن کو رنگے ہاتھوں گرفتار کیا۔ویسے ایگن کے گھر سے مارٹی کا مسروقہ لیپ ٹاپ بھی برآمد کرلیا گیا ہے۔''

رومینو نے جب یہ بتایا تو ہم دونوں حیرت زدہ رہ گئے۔

''بڑے چھپے رستم نکلے تم تو۔'' میں نے گردن موڑ کر پچھلی نشست پر بیٹھے رینجر کو دیکھ کر کہا تو وہ مسکرا دیا۔

☆☆☆

ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ہماری زندگی معمول پر لوٹ آئی

تھی۔ زخم بھی کسی حد تک بھر چکے تھے۔ اس دوران میں قتل کے جرم میں ایگن کی گرفتاری، اخبارات اور آرٹ کے رسالوں کے مضامین کا اہم موضوع بنا رہا۔ رینجر ہمارے ہی گھر پر رہ رہا تھا۔ رینی بھی بہت خوش رہنے لگی تھی۔ لگتا تھا کہ مارٹی کی جدائی کا جو صدمہ اسے پہنچا تھا، وہ زخم اب مندمل ہونے لگے تھے۔ میں نے اپنی آرٹ گیلری جانا شروع کر دیا تھا۔ سینڈی بھی دن بھر لکھنے پڑھنے اور گھر داری کے کاموں میں مصروف رہتی تھی۔ رینجر اور رینی گیسٹ ہاؤس کے بجائے ہمارے گھر پر ہی رہ رہے تھے۔ سینڈی ان دونوں کا بہت خیال رکھتی تھی۔

اس دن بھی پیر تھا۔ حسب معمول آرٹ گیلری بند تھی اس لیے میری تو چھٹی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد ہم سب بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے، تب رینی نے کہا۔ ''ہم کل جا رہے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' سینڈی نے چونک کر کہا۔ ''اور یہ ہم سے کیا مراد ہے؟''

''ہم سے مراد رینجر اور میں ہوں۔'' رینی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم دونوں کل ایڈورڈ آئی لینڈ جا رہے ہیں۔''

''ہم نے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔'' رینجر نے رینی کی بات کاٹتے ہوئے وضاحت کی۔

''بہت خوب۔'' میں مسکرا دیا۔ ''کب کر رہے ہو شادی؟'' ہمارے لیے رینجر کی بات نہ تو انکشاف تھی اور نہ ہی اس میں حیرت پوشیدہ تھی۔ میں اور سینڈی تو دل سے یہی چاہتے تھے کہ ان دونوں کا ساتھ اب کبھی نہ ٹوٹے۔

''اگلے اتوار کو ایڈورڈ آئی لینڈ سینٹرل چرچ میں۔'' رینجر نے کہنا شروع کیا۔ اس وقت رینی کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ ''آپ دونوں کو بطور خاص آنا ہوگا۔'' رینجر نے اپنائیت سے کہا۔

''کیوں نہیں۔'' سینڈی نے جواب دیا۔ ''تم دونوں ہمارے خاص مہمان ہو۔ شادی کے بعد ہنی مون کے لیے یہیں آ جانا۔''

''میں گیسٹ ہاؤس تمہارے حوالے کر دوں گا۔'' میں نے لقمہ دیا۔

''صرف ہنی مون کے لیے ہی کیوں؟ اب تو ہم جب بھی یہاں آئیں گے، تمہارے ہی گھر پر ٹھہریں گے۔'' رینجر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ویسے بھی مجھے تمہارا اسٹوڈیو اچھا لگا۔''

''وہ بھی تمہارا ہے، آخر کو رینی کی وجہ سے اب یہ تمہارا سسرال ہوا نا۔ سسرال پر تو داماد کا حق ہوتا ہی ہے۔'' سینڈی کی بات سن کر رینی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

☆☆☆

رینجر اور رینی کی شادی میں شرکت سے واپس آئے ہوئے تیسرا دن تھا۔ ہم ڈنر کے بعد آتش دان کے سامنے بیٹھے ہوئے کافی پی رہے تھے کہ اچانک ایگن کا ذکر چل نکلا۔

''بڑی ہی احمق عورت تھی وہ۔'' سینڈی نے کہا۔ ''خوامخواہ اس بڑھاپے میں جیل جا پہنچی۔ کیا ہو جاتا اگر مارٹی کا مضمون چھپ جاتا۔ کون سی آفت کا پہاڑ اس پر گر پڑتا۔''

''بات تو ٹھیک کہی ہے تم نے۔'' میں نے تائید کی۔ ''ویسے وہ مارٹی کے ساتھ اپنی شادی شدہ زندگی کے کئی برس گزارنے کے باوجود بھی اسے سمجھ نہیں پائی۔ بڑی ہی احمق نکلی وہ۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''وہ اس لیے کہ مارٹی کو لکھنے سے سخت چڑ تھی۔ اسی وجہ سے وہ اسکول سے بھاگ گیا تھا۔ حتیٰ کہ وہ اپنا چیک بھی بینک کے کلرک سے بھروا تا تھا۔ وہ تو لکھنے کا چور تھا۔ وہ کہاں مضمون لکھ پاتا۔''

''مگر وہ لیپ ٹاپ؟'' سینڈی نے سوال کیا۔

''وہ تو صرف فوٹو شاپ کی وجہ سے استعمال کرتا تھا، لکھنے کے لیے نہیں۔''

''کیا کہہ رہے ہو تم؟ مجھے یقین نہیں آتا۔ اگر وہ لکھنے کا اتنا ہی چور تھا تو پھر ایڈیٹر کو اس نے جو خط لکھا تھا؟''

''وہ میں نے لکھا تھا... بلکہ یوں کہہ لو کہ پچھلی بار جب وہ یہاں آیا تھا، تب اس نے مجھ سے لکھوایا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ یہ خط ہی ایگن اور اس جیسے لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے کافی ہوگا۔''

''اوہ میرے خدا...'' سینڈی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

''میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔'' میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اگر ایگن مارٹی کو سمجھتی تو کبھی یہ احمقانہ حرکت نہ کرتی مگر وہ سمجھتی ہی کیوں۔ اس نے تو اس بے چارے کو اس وقت بھی سمجھنے کی کوشش نہیں کی جب وہ اس کی بیوی تھی۔''

''مارٹی کا خط ویسے کام تو دکھا گیا۔'' سینڈی نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں... مگر ..... اپنی جان کی قیمت پر۔''



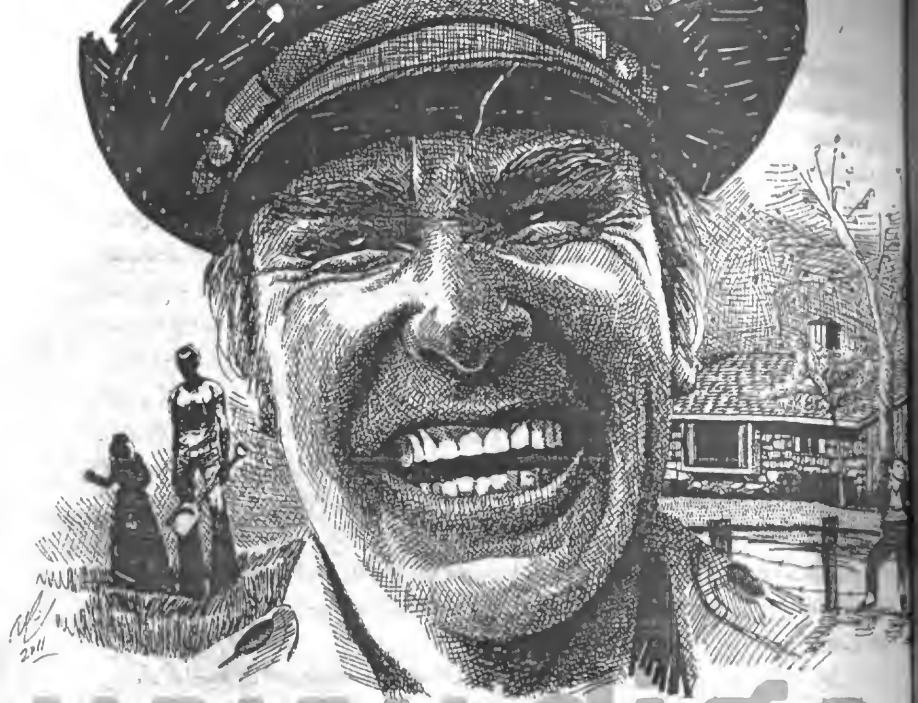

# زندہ درگور

مختار آزاد

دنیا میں شاید ہی کوئی انسان ایسا ہوگا جسے کسی محرومی کا سامنا نہ کرنا پڑا ہو مگر وہ لوگ جو محرومی کو اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں... کبھی بھی سچی خوشی حاصل نہیں کر پاتے۔ اسے ماں نے بچپن میں ہی دھتکار دیا، باپ چھوڑ کر چلا گیا اور... وقت نے اسے بااختیار بنا دیا... دولت اس کی زندگی کا محور اور مجبوروں سے کھیلنا اس کے جذبۂ انتقام کی تسکین کا ذریعہ بن گیا۔

**اُس پولیس افسر کا فسانہ عبرت..... جس کا سامنا اچانک روز سزا سے ہو گیا**

پولیس آفیسر باب ریان اپنی سرکاری پک اپ روک کر باہر نکلا اور یونیفارم درست کرتا ہوا پچھلے حصے پر چڑھ گیا۔ وہ اپنے فارم ہاؤس سے کچے راستے پر گاڑی چلاتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔ اُس وقت ہر طرف تاریکی کا راج تھا۔ وہ چاروں طرف نظریں گھمانے لگا۔ وہ یہ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس وقت اطراف میں کوئی شخص موجود ہے یا نہیں مگر اس وقت ہر سُو تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اِردگرد کی عمارتوں کی بند کھڑکیوں سے جھلکنے والی ہلکی روشنی اس بات کا پتا دے رہی تھی کہ پورا شہر سویا ہوا ہے۔ صرف وہ جاگ رہا ہے۔ اگر اس وقت کوئی اسے دیکھ بھی رہا ہوتا تو وہ اس کی پروا نہیں کرتا بلکہ خوش ہی ہوتا۔ یہ اس کا علاقہ تھا اور یہاں اس کا ہی راج چلتا تھا۔ اس کا جو جی چاہتا، وہ کرتا تھا۔ اسے روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں تھا۔

”اوکے سیلی باہر نکلو۔“ اس نے وہیں سے آواز لگائی۔

باب ریان کی آواز سن کر ایک عورت گاڑی کی پچھلی نشست سے باہر نکلی۔ پہلی نظر میں وہ ادھیڑ عمر کی عورت لگتی تھی حالانکہ ایسا تھا نہیں۔ وہ صرف ستائیس سال کی تھی لیکن حالات کی ستم ظریفی نے اسے وقت سے پہلے ہی بوڑھا کر دیا تھا۔ کبھی وہ خاصی خوش شکل رہی تھی لیکن باب کے ظلم و ستم اور اس مکروہ دھندے نے سیلی کی ساری جسمانی تازگی کو نچوڑ لیا تھا۔ اس کی سیاہ بڑی بڑی روشن آنکھیں اپنی چمک کھو چکی تھیں۔ اس کی جسمانی شادابی کا سارا رس باب کی ہوسِ زر نے لوٹ لیا تھا۔ عمر سے پہلے ہی اس کے چہرے اور گردن پر جھریاں پڑ چکی تھیں۔ ہاتھوں پر نیلی نیلی نسیں ابھر آئی تھیں۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ چکے تھے۔ گال پچک گئے تھے۔ اس نے چہرے کی جھریوں کو چھپانے کے لیے میک اپ کی بھاری تہ جما رکھی تھی لیکن یہ بھی بڑھاپے کے اثرات کو پوری طرح چھپانے میں ناکام محسوس ہو رہا تھا۔ شوخ رنگوں والا بھڑکیلا اور مختصر لباس دور سے دیکھنے والوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کروا لیتا تھا لیکن اگر کوئی اسے سادہ سے لباس اور بنا میک اپ دیکھتا تو شاید دوسری نظر بھی اس پر ڈالنا گوارا نہیں کرتا۔

سیلی بھی ایک عام سی بھولی بھالی، سادہ سی شریف لڑکی تھی لیکن باب نے اسے سڑکوں کی زینت بنا دیا تھا۔ وہ تاریک راتوں میں ہائی وے پر اپنے جسم کا سودا کرتی تھی۔ اِرد گرد کئی موٹیل تھے۔ ہر رات وہ کسی نہ کسی ٹرک ڈرائیور کے ساتھ موٹیل میں موجود ہوتی تھی۔

باب کی ہوس اور مجبوری نے اسے جسم کا سوداگر بنا دیا تھا۔ وہ کافی عرصے سے اس جگہ پر دھندا کر رہی تھی جہاں کچھ دیر پہلے اسے باب نے اُتارا تھا۔ زندگی گزارنے کے لیے وہ بہت کچھ کرنے کی خواہاں تھی لیکن باب کے چنگل میں پھنسی تو اس نے مجبوری کے عالم میں اپنے جسم کو ہی معاشی سہارا بنا لیا تھا۔ وہ گزشتہ کئی سالوں سے اس دھندے میں ملوث تھی۔ اب اس کا جسم اس لباس کی طرح ہو چکا تھا جسے بار بار دھونے اور لگاتار پہنتے رہنے کے باعث اس کا اصلی رنگ کب کا اُڑ چکا ہوتا ہے۔

یہ بات اس کے لیے بہت پریشان کُن تھی۔ جس پیشے میں وہ تھی، اس میں عشوہ طرازی اور چہرے کی دلکشی ہی سب کچھ ہوتی ہے مگر اب اس کی ظاہری رونق ماند پڑتی جا رہی تھی۔ ایسے میں اس کے لیے میک اپ ہی واحد سہارا تھا۔ جب باب نے گاڑی روکی، اس وقت بھی وہ چہرے پر فیس پوڈر لگا رہی تھی۔

”بڑے کمینے ہو تم۔“ سیلی نے گاڑی سے باہر آتے ہوئے کہا۔ ”اتنی بے ترتیب گاڑی چلا رہے تھے کہ میرا میک اپ ہی خراب ہو گیا، اوپر سے تیز ہوا۔“ اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”آج تو میرا میک اپ کا سامان اتنا زیادہ خرچ ہوا ہے جو کہ پورے ہفتے کے لیے کافی ہوتا۔“ اس نے اپنا بڑا سا ہینڈ بیگ کندھے پر لٹکاتے ہوئے کہا۔

”احتیاط کا تقاضا تھا میری جان۔“ اس نے بازاری انداز میں کہا۔ ”ویسے بھی ہر کاروبار میں کچھ خطرات ہوتے ہیں۔ اچھا کاروباری ہمیشہ خطرے کو احتیاط سے شکست دیتا ہے۔“

”کیسا خطرہ؟“

”ضروری نہیں کہ ہر بات تمہیں بتائی جائے۔“ باب نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

”لعنت ہو اس خطرے پر۔“ سیلی نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”اور تم پر بھی۔“ یہ بات اس نے اپنے دل میں کہی۔

”اچھا اچھا... اب زیادہ بکواس مت کرو۔ جاؤ، جا کر کام کرو۔“ اس نے سیلی کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”میں چلتا ہوں، اپنے آخری راؤنڈ پر اِدھر ہی آؤں گا۔ اسی جگہ ملنا، سمجھ گئیں۔“ وہ نیچے اتر آیا تھا۔ سیلی کو ہدایت دے کر، جواب کا انتظار کیے بغیر وہ واپس ڈرائیونگ سیٹ والے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

”سنو باب...“ سیلی نے اسے پکارا۔ ”کیا یہ بات جانتے ہو کہ تم واقعی بہت کمینے شخص ہو۔“ سیلی نے کٹیلے لہجے میں پوچھا۔

”بہت اچھی طرح۔“ سیلی کی بات سن کر وہ پلٹا اور آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا اس کے قریب آیا۔ ”مجھے اکثر لوگ یہ بات بتاتے رہتے ہیں۔ تم نے بھی بتا دی، اس کے لیے تمہارا بہت بہت شکریہ۔“ وہ مسکراتا ہوا کہہ رہا تھا۔ باب کو آگے بڑھتا دیکھ کر وہ سہم کر پیچھے ہٹی لیکن وہ جلد ہی اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے تیزی سے اس کی کلائی پکڑی اور بازو کو موڑتا ہوا کمر کے پیچھے اس طرح لے گیا جیسے پولیس والے ملزم کو دبوچتے ہیں۔ سیلی کے منہ سے درد کے مارے کراہ نکلی۔ ”مجھے اخلاقیات کا سبق پڑھانے کے بجائے پیسے پر توجہ دو۔“ وہ دانت کچکچاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے صرف پیسہ چاہیے اور تمہیں اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ جب میں لوٹ کر آؤں تو پیسے تمہارے پرس میں ہوں۔“ اس نے ایک بار پھر اس کے بازو کو زور سے مروڑا۔

”چھوڑو ذلیل انسان...“ سیلی نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔ وہ کمزور عورت تھی اور باب سانڈ جیسا طاقت ور پولیس والا۔ اس کے مضبوط پنجے نے جس طرح اُس کے بازو کو مروڑا تھا، وہ درد کی شدت سے بلبلا اٹھی تھی اور اب رونے کے قریب تھی لیکن باب کو اس کی ذرا پروا نہیں تھی وہ بدستور بازو موڑے اسے دھمکا رہا تھا۔

”چھوڑو مجھے، درد ہو رہا ہے۔“ اس کی آنکھ سے موٹے موٹے آنسو نکل گئے۔ وہ چلانا چاہتی تھی لیکن چاہنے کے باوجود بھی وہ ایسا نہ کر سکی۔ اس کا منہ درد کی شدت کے باعث کھلا ہوا تھا۔ وہ چاہتی تو چلا سکتی تھی لیکن اسے معلوم تھا کہ کوئی اس کی مدد کو نہیں آئے گا۔ ویسے بھی اس جیسی عورتوں سے کوئی بھی شخص ہمدردی ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ وہ ان سے تعلق رکھنا چاہتے ہیں مگر تنہائی اور تاریکی میں، وہ بھی کچھ دیر کے لیے۔ اس کے بعد تو کون اور میں کون۔ بھرے مجمع میں ان کی طرف ہمدردی کا ہاتھ بڑھاتے ہوئے لوگوں کو اپنی پارسائی کے لباس پر داغ لگ جانے کا خدشہ ہوتا ہے۔

”اوہ میرے خدا...“ باب نے ایک بار پھر اس کے بازو کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ اسے شدت کا درد محسوس ہوا اور وہ رو پڑی۔

”مجھے لگتا ہے اب بات تمہاری سمجھ میں اچھی طرح آچکی ہو گی۔“ باب نے بازو کو ایک بار پھر زور سے موڑا اور جھٹکے سے چھوڑ دیا۔

”بڑے گھٹیا انسان ہو تم۔“ وہ روتے ہوئے بولی اور دوسرے ہاتھ سے اپنا بازو دبانے لگی۔ ”تمہیں پیسے چاہئیں، وہ میں تمہیں دوں گی مگر مجھے اس طرح تو نہ مارو۔“ اس کے لہجے سے بے بسی اور لاچارگی ظاہر ہو رہی تھی۔

”پیسے تو تم مجھے دو گی اور ضرور دو گی۔“ باب اپنے چہرے پر خباثت بھری مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ ”البتہ یہ بات ذہن نشین رہے کہ مجھے اچھے اچھے القابات سے نوازنے والوں کا میں شکریہ اسی طرح ادا کرتا ہوں اس لیے آئندہ اپنی زبان بند رکھنا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھا۔

”باب... کسی دن تمہیں اپنے کرتوتوں کی سزا ضرور ملے گی۔“ سیلی نے روہانسے لہجے میں بددعا دیتے ہوئے کہا۔ وہ بدستور اپنا بازو دبائے جا رہی تھی۔ لگ رہا تھا کہ اسے اب بھی کافی درد ہو رہا ہے۔

”یقیناً...“ اس نے مڑے بغیر نہایت کمینگی سے کہا اور ہنستا ہوا گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس نے گاڑی گیئر میں ڈالی اور ریورس کرتے ہوئے سڑک سے باہر نکالا اور چلا دیا۔ ”جاؤ اور جا کر کام کرو۔“

”کمبخت اب کسی نئے شکار کے پیچھے جا رہا ہے۔“ سیلی، باب کا حکم سنتے ہی آگے بڑھ گئی۔ اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو رک چکے تھے۔ وہ سامنے والے لیمپ پوسٹ کی طرف بڑھ رہی تھی تاکہ اپنا میک اپ درست کر سکے۔ آخر روتے منہ بسورتے چہرے کی طرف دیکھتا ہی کون ہے۔ اس کے عقب میں باب کی گاڑی واپس جا رہی تھی۔

☆☆☆

باب ریان سان فرانسسکو ریاست کے ایک چھوٹے سے شہر ایلے کا پولیس افسر تھا۔ وہ نہایت بدنام تھا۔ مار دھاڑ، رشوت، بھتہ وصولی اس کی سرشت میں شامل تھا۔ معاملہ چاہے کچھ بھی ہو، اسے سب سے پہلی فکر یہ لاحق ہوتی تھی کہ اُسے کیا ملے گا۔ شہر بھر کے جرائم پیشہ افراد سے اس کے تعلقات تھے۔ وہ اُن کے ہر جرم کی خبر رکھتا اور جیسے ہی کوئی واردات ہوتی، وہ مجرم کے سر پر پہنچ جاتا۔ انہیں گرفتار کرنے کے لیے نہیں بلکہ اپنے حصے کی وصولی کے لیے۔ امریکی پولیس کی شہرت نہایت نیک ہے لیکن اس دور دراز شہر میں باب نے اپنے کالے کرتوتوں کا جو بازار گرم کر رکھا تھا، اس کی خبر لینے والا شاید کوئی نہیں تھا۔ اس کی ایک وجہ بھی تھی اور وہ ہے شہر کا دور دراز واقع ہونا۔ باب پہلے سان فرانسسکو شہر میں تعینات تھا لیکن اس کی خراب عادتوں اور بُرے رویے کی وجہ سے کئی سال پہلے اس کا تبادلہ بطور سزا ایلے میں کر دیا گیا تھا لیکن یہاں پہنچ کر اس کی صلاحیتیں اور کھلیں۔ اسے یہ جگہ اتنی پسند آئی کہ اس نے واپسی کا خیال ہی دل سے نکال دیا۔ گزشتہ دس برسوں میں اس نے اچھا خاصا مال جمع کر لیا تھا۔

اگرچہ باب کے ایک دو ساتھی پولیس افسران اس سے نفرت کرتے تھے لیکن وہ اس کے خلاف کچھ کرنے سے قاصر تھے۔ ایک تو وہ اُن کا افسر تھا، دوسرے یہ کہ زیادہ تر پولیس والے اس کے ہمنوا تھے۔ وہ کبھی کبھار نہ صرف اُنہیں بھی اپنی لوٹ مار میں سے تھوڑا سا حصہ دے دیا کرتا تھا بلکہ انہیں بھی اجازت تھی کہ وہ اس کے مستقل شکار کو چھوڑ کر اگر اپنے طور پر کچھ کما سکتے ہیں تو موقع سے بھرپور فائدہ اٹھائیں۔ گنگا بہہ رہی تھی اس لیے ایک دو کو چھوڑ کر سب اس میں ہاتھ دھو رہے تھے۔

یہ سرحدی علاقہ تھا۔ اسمگلنگ اور غیر قانونی تارکینِ وطن اس علاقے کے ذریعے امریکا میں داخل ہوتے تھے۔ اکثر اسمگلر اسے پیسے دے کر ہی آگے بڑھتے تھے لیکن جو اسے رشوت نہیں دیتا تھا، اس کے لیے یہ راستہ بند ہو جاتا تھا۔ باب کو پیسے کمانے کا جنون تھا۔ اس چکر میں وہ بُرے بھلے کا فرق ہی

www.digestpk.com

بھول چکا تھا۔ گزشتہ کئی سالوں کے دوران میں اس نے مختلف علاقوں سے امریکا میں داخل ہونے والے کئی تارکینِ وطن کو پکڑا تھا۔ جس نے اسے پیسے دے دیے، وہ نکل گیا لیکن جو مرد کنگال ہوتا، وہ سیدھا جیل جاتا اور جو عورت خالی ہاتھ ہوتی، یہ اُسے دھندے میں ڈال دیتا تھا جب وہ اس کی طلب کے مطابق پیسے جمع کر کے اسے ادا کر دیتی، وہ بھی نکل جاتی۔

باب نے شہر سے بہت دور ایک ویران جگہ پر بڑا سا فارم ہاؤس بنا رکھا تھا۔ وہ اپنی شکار عورتوں کو وہیں رکھتا تھا۔

سیلی اُن بدقسمت عورتوں میں سے ایک تھی جو غیر قانونی طور پر امریکا میں داخل ہوئی اور پھر باب کے ہتھے چڑھ گئی۔ اس نے عالمِ شباب میں اپنے آبائی وطن کولمبیا کو چھوڑا تھا۔ اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ ماں باپ کی موت کے بعد اُسے لگا کہ اگر وہ کسی طرح امریکا پہنچ گئی تو اس کی قسمت بدل سکتی ہے۔ اس نے انسانی اسمگلروں کے ایک ایجنٹ سے رابطہ قائم کیا اور اپنا آبائی گھر بیچ کر اسے رقم ادا کی اور امریکا کے لیے چل دی۔ مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے وہ اسمگلر جونہی امریکی سرحد میں داخل ہوا، باب ریان کے ہاتھوں پکڑا گیا۔ وہ اور اس کے ساتھ آنے والے تارکینِ وطن تو رشوت دے کر نکل گئے لیکن سیلی پھنس گئی۔ نہ تو اس کے حصے کی رقم ادا کرنے پر کوئی تیار تھا اور نہ ہی باب رشوت لیے بغیر اُسے چھوڑنے پر رضامند... آخر وہ اس کے فارم ہاؤس پہنچ گئی۔

امریکا آنے سے پہلے اُس کا دل خواہشوں سے بھرا ہوا تھا اور آنکھوں میں مستقبل کے سہانے سپنے تھے۔ وہ یہاں پیسے کما کر کسی خوبصورت سی جگہ پر چھوٹا سا کاٹیج خرید کر زندگی گزارنے کے سپنے دیکھا کرتی تھی لیکن خوابوں کی سرزمین پر اس کے قدم پڑتے ہی آنکھ کھل گئی۔ سپنے ٹوٹ گئے اور اسے اپنے خوابوں کی بڑی بھیانک تعبیر اُسے ملی۔

سیلی پچھلے کئی برسوں سے باب کے لیے جسم فروشی کر رہی تھی مگر دو وقت کی روٹی کے سوا وہ کچھ حاصل نہیں کر پائی تھی۔ حد تو یہ تھی کہ وہ روزانہ جتنا کماتی تھی، وہ ساری رقم باب چھین لیتا تھا۔ یہی نہیں، مہینے کے آخر میں وہ اسے اخراجات کی ایک فہرست تھما دیتا۔ جس کے مطابق اُس نے جتنا کمایا تھا، اس کا بڑا حصہ باب رہائش، کھانے پینے، گھر کا کرایہ، میک اپ کے اخراجات اور کپڑے لتے کی مد میں کاٹ لیتا تھا۔

کئی بار اس نے کوشش کی تھی کہ وہ باب سے اس بات کا حساب لے کہ کیا اتنے برسوں میں بھی اس کی رشوت کی رقم پوری نہیں ہوئی۔ اس نے تین چار بار اس سے یہ سوال پوچھنے کی کوشش بھی کی مگر جواب میں ہمیشہ اسے لاتیں، گھونسے ہی ملے۔ باب دھمکی دیتا تھا کہ وہ غیر قانونی تارکِ وطن ہے۔ اس کے پاس امریکی شہریت نہیں۔ اگر اس نے زیادہ زبان چلانے کی کوشش کی تو وہ قانونی طور پر اسے گرفتار کر لے گا اور یوں وہ باقی زندگی جیل میں گزار دے گی اور جب باہر آئے گی تو بھیک مانگنے کے سوا اُس کے پاس کوئی راستہ نہیں ہوگا۔ البتہ کبھی کبھار جب وہ اُس کے پہلو میں ہوتی تو وہ نشے میں چُور اُسے یہ دلاسا ضرور دیتا کہ وہ جلد ہی اسے چھوڑ دے گا مگر ایسا کب ہوگا، یہ بات نہ تو کبھی باب نے کہی اور نہ ہی سیلی جانتی تھی۔ وہ امریکا کی روشنیوں کے چکر میں بُری طرح خوار ہو چکی تھی۔ کم خوراکی، ذہنی تناؤ، جسمانی مشقت اور سب سے بڑھ کر وہ کام جو باب زبردستی اس سے کروا رہا تھا، ان سب نے مل کر اسے وقت سے پہلے ہی بوڑھا کر دیا تھا۔ اس کے چہرے کی دلکشی کھو چکی تھی۔ اب وہ زندہ لاش کی طرح صرف اس امید کے سہارے زندگی کے دن گزار رہی تھی کہ وہ وقت کب آئے گا جب باب اپنی قید سے اسے بخوشی آزاد کر دے گا۔

باب ہر روز رات کو اسے فارم ہاؤس سے لے کر یہاں پہنچتا اور چوراہے پر چھوڑ کر چل دیتا تھا اور پھر علی الصبح یہیں سے اسے پک کر کے واپس لے جاتا تھا۔ اس نے کئی بار سوچا کہ وہ فرار ہو جائے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو اس کا خالی ہاتھ ہونا اور غیر قانونی طور پر امریکا میں رہائش تھی۔ تو دوسری وجہ یہ تھی کہ اس نے بھاگنے والی دو لڑکیوں کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔

وہ دونوں انیتا اور برتھا تھیں۔ وہ بمشکل بیس سال کی تھیں۔ وہ اپنے بوائے فرینڈز کے ساتھ غیر قانونی طور پر امریکا میں داخل ہوئیں اور باب کے ہاتھوں پکڑی گئیں۔ وہ دونوں بھی کولمبیا کی رہنے والی تھیں۔ اُن دونوں کے بوائے فرینڈز نے بُرے وقت میں ساتھ چھوڑ دیا۔ اُن کے پاس جتنی رقم تھی، وہ باب کو دے کر اپنی جان تو چھڑا لی لیکن اُن دونوں کو چھوڑ گئے۔ باب نے انہیں بھی مکروہ دھندے میں لگا دیا لیکن وہ اس بات کو قبول نہیں کر سکیں اور بہت جلد ایک رات جب باب انہیں دھندے پر چھوڑ کر آیا، انہوں نے موقع غنیمت سمجھا اور فرار ہو گئیں لیکن وہ بے چاریاں یہ بات نہیں جانتی تھیں کہ باب کے چُنگل سے بھاگ کر وہ کہیں نہیں جا سکتیں۔ دونوں اُسی رات پکڑی گئیں۔ باب انہیں لے کر فارم ہاؤس لوٹ آیا اور ایک ہفتے تک انہیں بھوکا پیاسا رکھ کر بدترین تشدد کا نشانہ بناتا رہا۔ ایک دن جب وہ قریب المرگ تھیں، اس نے قبر کھود کر



دونوں کو اس میں ڈالا اور زندہ دفن کر دیا۔ جب وہ ان بدنصیب لڑکیوں کو زندہ درگور کر رہا تھا، اُس وقت اس نے بطورِ خاص سیلی کو اپنے برابر میں کھڑا کیے رکھا۔ اس واقعے کے بعد اس نے اپنے دل سے فرار کا خیال ہی نکال دیا۔ بس ایک موہوم سی امید باقی تھی اور وہ یہ کہ باب کسی دن اسے خود اپنی خوشی سے جانے کی اجازت دے دے گا۔ اسی امید کے سہارے وہ دن گزار رہی تھی۔

پچھلے ایک ہفتے سے اس کی طبیعت خراب تھی۔ آج جونہی اس کی طبیعت کچھ سنبھلی، وہ اسے لے کر کام پر پہنچ گیا۔ راستے بھر وہ اسے دھمکاتا ہوا آیا تھا کہ مہینہ ختم ہونے والا ہے اور اب تک مہینے بھر کا خرچ پورا نہیں ہوا ہے۔ اس لیے جتنا جلد ممکن ہو سکے، وہ چھٹیوں کے باعث ہونے والا نقصان بھی پورا کرنے کی کوشش کرے ورنہ وہ بہت برا سلوک کرے گا۔ اس کی دھمکیاں سُن سُن کر اس کا دل بری طرح دہل چکا تھا۔

باب کے خوف سے رونے والی سیلی تنہا نہیں تھی۔ شہر میں سڑک کے کنارے رات کو دھندا کرنے والی کئی لڑکیاں ایسی تھیں جو اس کے خوف سے تھر تھر کانپتی تھیں۔ اپنا کام کرنے کے لیے وہ اسے باقاعدگی سے حصہ ادا کرتی تھیں۔ ایسی کوئی لڑکی یا چوراچکا نہیں تھا جو اسے حصہ دیے بغیر کام دھندا کرنے کا سوچ بھی سکتا ہو۔ اُن میں سے کئی... کو تو خود سیلی بھی پہچانتی تھی۔ کیتھو، شارٹ سسٹر، ایوا، چیک، ٹام اور جان سمیت کئی لوگ تھے جو اپنے حلق پر ہر وقت باب کے انگوٹھے کا دباؤ محسوس کرتے ہوئے جی رہے تھے لیکن بے بس اور مجبور تھے۔ وہ صرف اس کے مرنے کی دعا کر سکتے تھے اور یہ کام سیلی سمیت اُس کا ہر شکار خشوع و خضوع سے کر رہا تھا۔

☆☆☆

باب ہائی وے پر شہر کی طرف جا رہا تھا۔ تھوڑا آگے جانے پر اسے سڑک کے کنارے چند لوگوں کا چھوٹا سا مجمع نظر آیا۔ یہ دیکھتے ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے گاڑی کا ہُوٹر اور نیلی و سرخ بتیاں آن کر دیں۔ چند لمحے بعد وہ جائے وقوع پر کھڑا تھا۔ ایک تیز رفتار کار ڈرائیور کے قابو سے باہر ہو کر اُلٹ گئی تھی۔ جب وہ موقع پر پہنچا تو اس کا ایک ماتحت جونیئر آفیسر کاغذی کارروائی میں مصروف تھا۔ باب کو دیکھتے ہی اس نے سیلوٹ کیا۔ اس نے حادثے سے متعلق معلومات حاصل کیں۔ گاڑی چلانے والا شخص نشے میں تھا لیکن خوش قسمتی سے اسے خراش تک نہیں آئی تھی۔ اسے اُلٹی ہوئی گاڑی سے باہر نکال لیا گیا تھا۔ جُرم قابلِ سزا تھا۔ ملزم کو قید، لائسنس کی معطلی اور جرمانے کی سزائیں مل سکتی تھیں۔ وہ شخص بھی یہ بات جانتا تھا۔ جب باب پہنچا، تب تک گاڑی چلانے والے کا سارا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ اُس نے ماتحت افسر کو کارروائی سے روک دیا اور واپس جانے کا حکم دیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد باب ہائی وے کے ایک ریستوران میں اُس 'ملزم' کے ساتھ بیٹھا ڈنر کر رہا تھا۔ اس نے پیٹ بھر کر من پسند کھانا کھایا اور جب وہ شخص یہاں سے واپس گیا تو چلتے چلتے اپنا پورا بٹوا اُس کی جیب میں اُنڈیل گیا۔ باب کے ہاتھوں رہا ہونے والا ملزم جان چھوٹنے پر بہت خوش تھا اور باب بھی۔ اس کی جیب خاصی بھاری ہو چکی تھی۔

”اس بار تو میں تمہیں صرف تنبیہ کر کے چھوڑ رہا ہوں مگر آئندہ کے لیے خیال رکھنا، قانون بھی آخر کوئی چیز ہے۔“ باب نے نہایت خوشدلی سے اسے ٹیکسی میں بٹھا کر گھر کے لیے رخصت کرتے ہوئے کہا۔

ڈنر اور شکار، دونوں سے فارغ ہونے کے بعد باب سٹی سینٹر کی طرف چل دیا۔ وہ سست روی سے گاڑی چلاتا ہوا شہر کی مرکزی سڑک پر جا رہا تھا۔ ذرا ہی دیر بعد وہ دائیں ہاتھ کی چھوٹی سڑک پر مُڑا۔ اُس نے گاڑی تھوڑا ہی آگے بڑھائی تھی کہ اسے ایک اشارے پر نہایت سست روی سے آگے بڑھتی ہوئی ایک کار نظر آئی۔ اس وقت سڑک بالکل سنسان تھی مگر اشارہ سرخ تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ کار والا اشارہ سبز ہونے کا انتظار کرتا لیکن وہ نہایت ہی سست روی سے کار آگے بڑھاتا ہوا زیبرا کراسنگ تک لے آیا۔ باب کی عقابی نظروں نے شکار کو بھانپ لیا۔ اس نے گاڑی کا ہُوٹر اور بتیاں آن کیں اور اُسے گاڑی کنارے پر کھڑی کرنے کا اشارہ کیا۔ اگلے ہی لمحے وہ اُس کے سر پر کھڑا تھا۔ ”لائسنس اور رجسٹریشن کاغذات پلیز۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص سے کہا۔

”پلیز...“ اُس نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

”سوری... لائسنس، رجسٹریشن کے کاغذات۔“ باب نے کار والے کی بات کاٹتے ہوئے ایک بار پھر سپاٹ لیکن قدرے درشت لہجے میں کہا۔

”وہ میں نے اشارہ تو نہیں توڑا...“ گاڑی والا جان بچانے کے لیے تاویل پیش کر رہا تھا۔

”آپ نے سگنل سرخ ہونے کے باوجود گاڑی آگے بڑھائی اور زیبرا کراسنگ پر آ گئے، حالانکہ آپ کو مکمل طور پر رُک جانا چاہیے تھا لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔“ باب نے بے رخی سے کہا۔ ”لائسنس پلیز...“

''میں معذرت چاہتا ہوں، غلطی ہوگئی۔'' ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص کی عمر پچاس کے قریب ہوگی اور چہرے مہرے سے وہ معزز لگ رہا تھا۔ ''یہ لیجیے۔'' اس نے بٹوا نکالا اور بیس ڈالر اس کی طرف بڑھائے۔ ''آئندہ خیال رکھوں گا پلیز...''

''خبردار جو تم نے مجھے رشوت دینے کی کوشش کی۔ میں بے ایمان پولیس افسر نہیں ہوں۔'' نوٹ دیکھتے ہی وہ بپھر گیا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے۔ یہ ڈالر مجھے یاد دلائے گا کہ مجھ سے غلطی ہوئی تھی۔'' اس نے شائستہ لہجے میں بات بنائی۔ ''اس نے بٹوے سے بیس ڈالر کا ایک اور نوٹ نکال کر اس میں شامل کر دیا۔ اب اس کے ہاتھ میں چالیس ڈالر تھے جو وہ اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔ ''کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ آپ کسی اچھی جگہ بیٹھ کر ڈنر کریں اور مجھے وارننگ دے کر چھوڑ دیں۔''

''ڈنر کرنے ہی تو جا رہا تھا۔'' یہ سنتے ہی باب نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''کیا کریں پولیس کی نوکری میں تو وقت پر کھانا بھی نصیب نہیں ہوتا۔'' اس نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''تو یہ لیجیے اور جا کر ڈنر کریں۔'' کار والے نے نوٹ والا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ وہ اس کا نرم لہجہ محسوس کر کے خوش ہو گیا تھا۔

''لیکن میں آئندہ ڈنر نہیں کرتا۔ یہ میری عادت ہے۔'' اس نے نوٹ کی طرف ہاتھ بڑھانے کے بجائے سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بہت اچھی عادت ہے۔'' کار والے نے ایک بار پھر اپنا بٹوا کھولا اور بیس ڈالر کا ایک اور نوٹ نکال کر ان میں شامل کر دیا۔ ''یہ لیجیے... آپ کا اور آپ کے ساتھی کا میری طرف سے ڈنر۔''

''میں کھانے کے بعد بھاری ٹپ بھی دیتا ہوں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر بندھے رکھے تھے اور کار والا بدستور نوٹ اس کی طرف بڑھائے ہوئے تھا۔

''یہ لیجیے بھاری ٹپ بھی آ گئی۔'' کار والے نے بٹوے سے بیس ڈالر کا ایک اور نوٹ نکال کر ان میں شامل کرتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا۔

''میری ہدایت پر عمل کریں۔ ہمیشہ گاڑی قانون کے مطابق چلائیں۔'' باب کن انکھیوں سے نوٹوں کی تعداد کا برابر حساب کیے جا رہا تھا۔ اسے لگا کہ جو سنگین جرم اس سے سرزد ہوا تھا، اس کے لیے یہ سزا کافی ہے۔ اس لیے اس نے ہاتھ بڑھا کر نوٹ لے لیے لیکن ساتھ ہی اسے ہدایت نامہ بھی سنا دیا۔

''جی میں خیال رکھوں گا۔'' اس نے جان چھوٹنے کی خوشی میں جلدی سے جواب دیا۔

''مجھے امید ہے آپ میرے مشورے پر سچے دل سے عمل کریں گے۔'' باب نے اپنے شکار کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

تقریباً دس منٹ بعد باب سٹی سینٹر پہنچا۔ ابھی وہ اپنی گاڑی پارک کر کے باہر نکلا ہی تھا کہ اسے ٹامی نظر آ گیا۔ وہ شکن آلود سوٹ میں ملبوس ایک کھمبے سے ٹیک لگائے سگریٹ پی رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی باب کا خون کھول اٹھا۔ وہ اس کی طرف بڑھ گیا۔ اسی دوران ٹامی کی نظر بھی اس جانب پڑ گئی۔ اُسے اپنی طرف آتا ہوا دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ اس نے جلدی سے سگریٹ زمین پر پھینکی اور باب سے بچنے کے لیے، چھپنے کی جگہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا لیکن اسے فرار کا موقع نہیں مل سکا۔ اسی دوران باب بھی اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔

''ہائے باب...'' جب ٹامی نے جان لیا کہ وہ اب اس سے بچ نہیں سکتا تو اس نے پینترا بدل لیا۔ ''کہاں ہو، کئی روز کے بعد نظر آئے ہو۔'' اس نے اس طرح یہ بات کہی کہ جیسے اسے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا ہے۔ یہ اور بات تھی کہ وہ دل ہی دل میں اسے گالیاں دیے جا رہا تھا۔

''میرے پیسے کہاں ہیں ٹامی؟'' باب اس کے سر پر پہنچ گیا اور بنا تمہید کے غصے سے پوچھا۔ ''فوراً میری رقم نکالو ورنہ میں مار مار کر تمہارا بھرکس نکال دوں گا۔'' اس نے نہایت سفاک لہجے میں کہا۔

''ارے بھئی تمہارے پیسے ہیں، انکار کس کو ہے۔'' ٹامی نے بات بناتے ہوئے کہا اور بے تکلفی ظاہر کرتے ہوئے اس کی قمیص کا کالر ٹھیک کرنے لگا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اب فرار تو ممکن نہیں البتہ مار سے بچنے کے لیے اس کے پاس واحد راستہ خوشامد کا بچا تھا، سو وہ اس پر چلنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔

''میرے پیسے ہیں تو پھر دو مجھے اسی وقت۔'' اس نے ٹامی کی بات سن کر پھر اپنا مطالبہ دُہرا دیا۔

''آج کل دھندا بہت مندا ہے لیکن یقین کرو میں بہت جلد دے دوں گا۔'' ٹامی نے جواب دیا۔ یہ سنتے ہی اس کا خون کھول اٹھا۔ اس نے دُبلے پتلے ٹامی کا ہاتھ پکڑا اور اور اسے کھینچتے ہوئے سامنے واقع پارک کی طرف بڑھنے لگا۔ وہیں اس نے اپنی پک اپ کھڑی کی ہوئی تھی۔ ٹامی سمجھ گیا کہ اب اس کی دھنائی ہونے والی ہے۔

ٹامی ایک جوکی تھا اور شہر کی گھڑ دوڑ میں گھوڑے دوڑایا



کرتا تھا۔ جُوئے کے طور پر وہ کچھ رقم ریس پر فرضی نام سے لگا لیتا تھا۔ قواعد کے مطابق جوکی ریس پر شرط نہیں لگا سکتا تھا۔ ایک دن یہ بات باب کے علم میں بھی آ گئی۔ اسے تو کمائی کا ایک اور ذریعہ مل گیا۔ بس پھر کیا تھا، وہ اس کے پیچھے لگ گیا۔ آخر باب نے ایک دن ٹامی کو اُس وقت رنگے ہاتھوں پکڑ لیا جب وہ جیت کی رقم وصول کر رہا تھا۔ اُس دن کے بعد سے وہ اُس کا ساجھے دار بن گیا۔ جیت کی آدھی رقم اس کی جیب میں ہوتی تھی۔ دو ہفتے پہلے ٹامی نے سو ڈالر جیتے لیکن اتفاق سے رقم کی وصولی کے وقت باب نہ پہنچ سکا۔ اُسے بھی پیسے کی سخت ضرورت تھی۔ جب باب اس تک پہنچا، وہ ساری رقم خرچ کر چکا تھا۔ اس نے رقم ہفتہ بھر بعد دینے کا وعدہ کر لیا۔ ہفتے بھر بعد بھی اس کا ہاتھ خالی تھا۔ باب نے ایک ہفتے کی اور مہلت دے دی لیکن پچاس ڈالر پر روزانہ ایک ڈالر سُود بھی لگا دیا۔ یہ وقت بھی گزر گیا۔ اتفاق سے آج اسے باب کو پیسے دینے تھے لیکن وہ بالکل قلاش تھا۔ اسے بدقسمتی کہیں کہ لاکھ کوشش کے باوجود وہ پکڑا گیا۔ سب جانتے تھے کہ باب سخت اذیت پسند اور ہاتھ چھوٹ ہے۔ جب وہ اسے اندھیرے کی طرف گھسیٹتا ہوا لے کر جا رہا تھا، تو وہ یہ سوچ سوچ کر پتے کی طرح لرز رہا تھا کہ نجانے اب اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

جیسے ہی وہ دونوں اندھیرے میں پہنچے، باب نے اس کا ہاتھ چھوڑا اور پوری طاقت سے اس کے جبڑے پر زوردار مکا رسید کیا۔ مکا لگتے ہی دھان پان سا ٹامی گھوم گیا اور لڑکھڑا کر نیچے گرنے لگا لیکن اس سے پہلے ہی باب نے اسے کوٹ کے کالر سے پکڑ لیا۔ وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ پڑ چکا تھا۔

''تم کیا چیز ہو، میں تو تمہارے اچھے اچھوں سے پیسے نکلوا لوں گا۔'' اس نے ٹامی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''میں نے تمہیں ایک ہفتے کی مہلت کیا دی کہ تم نے سمجھ لیا کہ مجھے بے وقوف بنا لو گے۔'' باب نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

''نہیں، ایسی بات نہیں تھی۔'' اس نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

''نہیں تو پھر غائب کہاں ہو گیا تھا؟'' وہ غصے سے کہنے لگا۔ ''میں آج سارا دن تجھے ڈھونڈتا پھرا ہوں سرکاری پیٹرول اور سرکاری گاڑی چلاتے ہوئے۔ کیا سمجھتا ہے سرکار تیرے باپ کی غلام ہے جو تجھے ڈھونڈنے پر اپنا پیسا خرچ کرے گی۔''

''یہیں تھا میں...'' اس نے منمناتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن باب نے اس کی پوری بات سُنے بغیر ایک بار پھر اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور اس سے پہلے کہ ٹامی سنبھلتا، اس کا دوسرا رخسار بھی زوردار تھپڑ سے سرخ ہو گیا۔

''خدا کی قسم میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اس نے اپنے کوٹ کی جیبیں اُلٹتے ہوئے کہا۔ ''پچھلے ہفتے ایک ٹکے کی آمدنی نہیں ہوئی ہے۔'' اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے تھے۔

''تو پھر میں کیا کروں؟'' باب نے درشتگی سے کہا۔ ''مجھے تو میرے پیسے چاہئیں بس... ابھی اور اسی وقت۔''

''مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تمہیں پچاس ڈالر...''

''پچاس نہیں، ستاون ڈالر دینے ہیں تجھے۔'' باب نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''سُود کیا تیرا باپ دے گا۔''

''خدا کے لیے مارو مت۔'' باب نے ایک بار پھر اسے مارنے کے لیے ہاتھ اوپر اٹھایا تو وہ اس کے پیروں پر گر گیا۔ ''مارنے سے کیا تمہیں پیسے مل جائیں گے۔ بس! مجھے ایک مہلت اور دے دو؟''

''اب مہلت کا وقت نہیں ہے۔'' باب نے اسے کالر سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''میں مفت میں مہلت نہیں مانگ رہا۔ اس کے بدلے تمہیں کچھ دوں گا۔'' وہ کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

''کیا دے گا؟'' باب کی آنکھوں میں یہ سنتے ہی چمک آ گئی۔

''ایک اطلاع...''

''کیسی اطلاع؟'' باب ٹامی کی بات سُن کر چونک گیا۔

''ایسی کون سی بات ہے جو مجھے پتا نہیں اور تو مجھے بتائے گا۔''

''ہے ایک بات ایسی۔'' ٹامی نے کہا۔

''اچھا چل ذرا جلدی سے بتا۔ اس کے بعد سوچوں گا کہ تجھے مہلت دوں یا نہیں۔'' باب نے اس کا کالر چھوڑتے ہوئے کہا۔

''ٹاؤن میں ایک نئی لڑکی آئی ہے اور وہ یہاں دھندا کر رہی ہے۔'' ٹامی سمجھ گیا کہ اس کا تیر ٹھیک نشانے پر لگا ہے۔ وہ اس کی لالچی فطرت سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ اسے یقین تھا کہ اب اس کا ہاتھ نہیں اٹھے گا۔

''کب سے کام کر رہی ہے؟'' یہ سنتے ہی باب نے فوراً رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

''دو ہفتے ہو گئے ہیں۔''

''اور تو مجھے اب بتا رہا ہے کمینے، ذلیل۔'' اس نے غصے سے کہا۔



www.paksociety.com

''مجھے بھی کل رات ہی پتا چلا ہے۔'' ٹامی نے کہا۔ یہ اور بات ہے کہ اس طرح کی اکثر اطلاعات باب کے شکار اپنے پاس محفوظ رکھتے تھے تاکہ بُرے وقت میں اسے بتا کر اطلاع دینے کا کچھ فائدہ اٹھا سکیں۔ ٹامی بھی یہی کر رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اب باب اسے نہیں مارے گا۔ ''میں نے تو سُنا ہے کہ وہ کئی لوگوں کو یہ بات کہہ چکی ہے کہ وہ کسی بھی پولیس والے کو ایک پیسا بھی نہیں دے گی۔'' ٹامی نے اس کے کان کی طرف منہ کرتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ وہ اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

''اُس نے کہا ہے؟'' باب نے سوال کیا۔

''اصل بات تو خدا جانے پر میں نے یہی کچھ سُنا ہے۔'' ٹامی نے عیاری سے کہا۔

''اوکے...'' یہ سن کر باب نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''تم جھوٹ تو نہیں بول رہے؟'' اس نے ٹامی کو گھورتے ہوئے کہا۔

''خدا کی قسم بالکل سچ ہے یہ۔'' اس نے گھبرا کر جواب دیا۔

''اس وقت کہاں ملے گی وہ؟'' باب نے پوچھا۔

''اب یہ تو مجھے نہیں معلوم۔'' اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''خیر کوئی بات نہیں۔ میں اسے ڈھونڈ لوں گا۔ کہاں جائے گی مجھ سے بچ کر۔'' اس کی آنکھوں میں ایسے بھوکے بھیڑیے کی چمک دَر آئی تھی، جسے کئی روز بھوکا رہنے کے بعد شکار ملا ہو۔

''میں اس کے گھر کا پتا جانتا ہوں لوگ کہتے ہیں کہ وہ وہیں...''

''جلدی سے بتا۔'' یہ سنتے ہی باب نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ وہ جلدی جلدی اس لڑکی کے گھر کا پتا بتانے لگا۔

''مگر میرے پیسے؟'' پتا جان لینے کے بعد ایک بار پھر وہ اپنے مطالبے پر لوٹ آیا۔

''اگلے ہفتے تک لوٹا دوں گا سُود کے ساتھ۔''

''ٹھیک ہے۔ تم نے مجھے اطلاع دی ہے اس لیے چھوڑ رہا ہوں۔ کوشش کرنا کہ اگلے ہفتے خود ہی رقم پہنچا دو ورنہ...'' اس نے ٹامی کو دھمکانے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔

''نہیں نہیں... میں خود ہی پہنچ جاؤں گا۔''

''اچھی بات ہے، ورنہ مجھے تو تم جانتے ہی ہو۔'' باب نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''اب اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔'' اس نے نہایت خوشامدی لہجے میں کہا۔

''اوکے...'' یہ کہتے ہوئے باب اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

ٹامی پورے شہر میں صرف ایک عورت کو ہی اس کے نام سے پہچانتا تھا اور وہ تھی ایلس۔ وہ رچرڈ پلے ہاؤس لاؤنج کے عقب میں واقع ہیون اپارٹمنٹس کے سیکنڈ فلور پر رہتی تھی۔ وہ حال ہی میں اس شہر میں آئی تھی۔ جہاں اس کا فلیٹ تھا، وہ علاقہ شہر کا اہم ترین تجارتی مرکز تھا۔ وہاں کئی نائٹس کلب اور بار بنے ہوئے تھے۔ ایلس جس پیشے سے وابستہ تھی، وہ اس کام کے لیے نہایت موزوں جگہ تھی۔ یہاں گاہک کو سڑک کنارے کھڑے رہ کر ڈھونڈنے کے بجائے بار یا کلب میں بیٹھ کر ملاقات کرنا زیادہ آسان کام تھا۔ ایلس یہی کچھ کر رہی تھی۔ دس بارہ روز پہلے ہی ٹامی اس سے ملا تھا۔ اس دوران میں وہ اس کے بہت قریب آ گئی تھی۔ ٹامی نے باب کو اس کا ہی پتا بتایا تھا۔

ٹامی کی اطلاع پر باب سیدھا اُس کے فلیٹ پر پہنچا۔ اس نے ڈور بیل بجانے کے بجائے دروازے پر ہاتھ سے زور زور سے دستک دی۔

''کون ہے؟'' چند لمحوں کے بعد ایک دلکش نسوانی آواز نے دروازہ کھولے بغیر دریافت کیا۔

''پولیس...'' باب نے بھاری آواز میں کہا۔ ''ایلس دروازہ کھولو۔''

تھوڑی دیر بعد نہایت آہستگی سے دروازہ کھلا۔ دروازے کے پیچھے کوئی عورت موجود تھی۔ اس نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر یہ دیکھنے کے لیے باہر جھانکا کہ دروازے پر واقعی پولیس ہے یا کوئی اور۔ اس سے پہلے کہ وہ سر باہر نکال کر جھانکتی، باب نے دروازے پر ہاتھ رکھ کر زور سے پیچھے دھکیلا۔ دروازہ کھل گیا اور وہ اُس عورت سے بنا کچھ کہے اندر گھستا چلا آیا۔ اندر پہنچتے ہی اس نے پلٹ کر دروازہ بند کیا اور لاک لگا دیا۔

''یہ کیا حرکت ہے؟'' عورت نے حیرت سے کہا۔ وہ تیس پینتیس برس کی ایک دلکش عورت تھی۔ اس کے سیاہ لمبے بال تھے۔ رنگت ہلکی سانولی تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ تھیں۔ جسم دُبلا پتلا لیکن چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔ اس نے جینز اور سرخ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کا چہرہ میک اپ سے عاری تھا۔ کچھ دیر تک وہ اس کے سراپا کا جائزہ لیتا رہا۔ اسے یقین تھا



کہ یہ عورت امریکی نہیں ہو سکتی، ممکن ہے اس کے والدین کسی لاطینی ملک سے تعلق رکھتے ہوں۔ وہ عورت بدستور خاموش تھی۔ باب سمجھ گیا کہ وہ تنہا ہے مگر پھر بھی اس نے تصدیق چاہی۔

''اس وقت تمہارے ساتھ یہاں اور کون کون ہے؟'' اس کا لہجہ سخت تھا۔

''صرف تم۔'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''لیکن تم تو پولیس والے ہو۔ اگر گاہک ہوتے تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔''

''بکواس بند کرو۔'' وہ دھاڑا اور اس کا بازو پکڑ کر گھسیٹتا۔ یہ ایک کمرے کا فلیٹ تھا۔ لیونگ روم اور کچن ایک ہی جگہ تھا۔ اس وقت وہ لیونگ روم میں تھے۔ ایلس کو گھسیٹتا ہوا وہ لیونگ روم کے وسط میں پہنچ گیا۔ باب نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ یہاں صرف ایک بڑا ٹی وی اور ایک صوفہ رکھا ہوا تھا۔ ایلس بدستور خاموش تھی۔ وہ اس کا بازو پکڑے پکڑے بیڈروم میں پہنچ گیا۔ یہاں ایک عمدہ بیڈ، دو کرسیاں اور ایک میز رکھی ہوئی تھی دیوار کے ساتھ ایک الماری تھی۔

''لگتا تو نہیں کہ تم یہاں رہتی ہو؟'' اس نے چاروں طرف گول گول دیدے گھماتے ہوئے کہا۔

''تمہیں نہ لگے تو مجھے کیا؟'' اس نے بے نیازی سے کہا۔ ''ویسے سچ یہ ہے کہ میں یہیں رہ رہی ہوں اور کب تک رہتی ہوں... اب یہ تم پر منحصر ہے۔'' اس نے لگاوٹ سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ اسے دیکھ کر یہ نہیں لگتا تھا کہ وہ باب سے ذرّہ برابر بھی خوفزدہ ہوئی ہے۔ باب نے بھی یہ بات محسوس کر لی تھی۔ اس نے اُسے زور سے بیڈ پر دھکیلا۔ وہ چت گر گئی اور کچھ دیر تک بدستور اسی طرح لیٹی رہی اور پھر سیدھی ہو گئی اور لیٹے لیٹے باب کو دیکھنے لگی۔

''بڑے غصے میں ہو۔'' چند لمحوں تک وہ باب کے بولنے کا انتظار کرتی رہی لیکن وہ خاموشی سے اسے گھورے جا رہا تھا۔ آخر اس نے خود ہی خاموشی توڑی۔

''تم یہاں اپنا کام کر رہی ہو؟'' باب نے بدستور گھورتے ہوئے غصیلے لہجے میں سوال کیا۔

''تم تو جانتے ہی ہو۔'' اس نے شانِ بے نیازی سے کہا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اب وہ بیڈ پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی تھی۔

''یہاں دھندا کرنے والی پر لازم ہے کہ پہلے مجھ سے اجازت لے۔''

''کیوں اجازت لی جائے تم سے۔ کیا میرا جسم تمہاری جاگیر ہے جو تمہاری اجازت ضروری ہے۔'' اس نے بھی دو ٹوک انداز میں جواب دیا۔

''تم جانتی ہو، میں کون ہوں اور یہاں کس لیے آیا ہوں؟'' اس نے چڑ کر سوال کیا۔ ویسے بھی باب کو زبان دراز عورتیں زہر لگتی تھیں۔

''جانتی ہوں...'' اس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔ ''وردی سے پولیس والے لگتے ہو اور رہا تمہارا نام تو وہ بہت ہی بدنام ہے۔ اب یہ سوال کہ تم یہاں کیوں آئے ہو تو یہ بات میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ تم میرے لیے نہیں میرے جسم کی کمائی سے خیرات لینے آئے ہو۔'' وہ کہے جا رہی تھی اور باب غصے سے اس کی بات سُن رہا تھا۔ جب وہ خاموش ہو گئی تو باب چند لمحوں تک اسے خاموشی سے گھورتا اور پھر زور زور سے ہنسنے لگا۔

''بڑی کمینی خصلت پائی ہے تم نے۔''

''تم جیسے لوگوں سے نمٹنے کے لیے۔'' اس نے بھی مسکرا کر فوراً جواب دیا۔

''بہت اچھی بات کہی ہے تم نے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھا اور اس کے قریب پہنچ کر اس کے گال پر زوردار تھپڑ رسید کیا۔ اُس کا منہ پھر گیا۔

''یہ کس وجہ سے تھا؟'' چند لمحوں کے بعد اس نے اپنا گال سہلاتے ہوئے پوچھا۔

''بغیر اجازت دھندا کرنے کے جرم میں۔'' اس نے درشتگی سے کہا۔ ''نکالو ایک ہزار ڈالر۔'' اس نے اپنی ہتھیلی ایلس کے سامنے پھیلاتے ہوئے اس طرح کہا جیسے اپنا ادھار واپس مانگ رہا ہو۔

''کس خوشی میں؟'' اس نے بھی یہ سن کر تیوری پر بل ڈالتے ہوئے پوچھ لیا۔

''یہاں تمہیں کتنے ہفتے ہو گئے ہیں؟'' باب نے جواب دینے کے بجائے اُلٹا سوال کر ڈالا۔

''یہ تیسرا ہفتہ ہے۔''

''جو کہ آج ختم ہونے والا ہے۔'' باب نے فوراً کہا۔

''اوکے...'' یہ بتاؤ، ایک ہزار ڈالر کس لیے تمہیں دوں؟'' ایلس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش کرواتے ہوئے کہا۔

''میں ہر دھندے والی سے تین سو روپے ہفتہ لیتا ہوں۔ تین ہفتوں کے بنے نو سو ڈالر اور پچھلے دو ہفتوں کے چھ سو ڈالر، جن پر ایک سو ڈالر سُود کے۔'' اس نے تفصیل سے ایک ہزار ڈالر کا حساب بتایا اور گہری سانس لے کر دوبارہ گویا ہوا۔ ''اب



www.digestpk.com

تسلی ہوگئی کہ ایک ہزار ڈالر کس لیے۔'' اس نے ایلس کے چہرے پر نظریں گڑاتے ہوئے کہا۔

''اوہ...'' اس نے ہونٹوں کو گول کرتے ہوئے چہرے پر حیرت کے تاثرات سجا کے کہا۔ ''تم خیرات پر سُود بھی وصول کرتے ہو۔''

''جی ہاں...'' وہ مسکرایا۔ ''بہت کمینہ ہوں نا میں۔'' اس نے لہک کر کہا۔

''اب اس بارے میں مجھے کوئی شک نہیں رہا۔'' ایلس نے نرم لہجے میں کہا۔ ''مان گئی، تم واقعی گھٹیا انسان ہو۔''

''اچھا ہوا تم نے اتنی جلدی مجھے سمجھ لیا۔'' یہ سن کر اس نے مسکراتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''عقلمند لگتی ہو۔ مجھ سے ہاتھ ملاؤ اور کام کرتی جاؤ، فائدے میں رہوگی۔''

''تمہارے مشورے پر سوچوں گی۔'' وہ بستر سے اٹھتے ہوئے بولی۔

''کہاں جارہی ہو؟'' وہ تشویش سے بولا۔

''تمہارے واسطے کچھ لانا چاہتی ہوں۔''

''کیا...'' اس نے سوالیہ نظروں اسے دیکھا۔ ''مجھے اس وقت اپنے ایک ہزار ڈالر چاہئیں۔''

''میں تمہارے پینے کے لیے کچھ لینے کے لیے اٹھی ہوں۔''

''مجھے پہلے رقم چاہیے۔'' اس نے ایک بار پھر ہتھیلی آگے بڑھائی۔

''اگر میں کہوں کہ میرے پاس تمہیں ایک ہزار ڈالر ادا کرنے کے لیے نہیں ہیں تو...'' اس نے اپنے گال پر شہادت کی اُنگلی گڑاتے ہوئے کہا۔

''تو پھر یہ...'' ایلس کی بات سنتے ہی باب تیزی سے آگے بڑھا اور اس کے چہرے پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ وہ گھوم گئی اور لڑکھڑاتی ہوئی بستر پر جا گری۔ کچھ دیر تک وہ بیڈ پر اوندھی پڑی رہی۔ جب وہ اٹھی تو اس کے نچلے ہونٹ سے خون کی ایک باریک لکیر نیچے کی طرف بہتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

''خدا کے لیے مجھے اور مت مارو۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے گڑگڑاتے ہوئے اس کی منت سماجت کی۔ باب مکا تانے اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''میں ہر حال میں اپنا پیسا وصول کرنا جانتا ہوں۔'' وہ آگے بڑھا۔

''ایک منٹ ٹھہرو۔'' وہ چلائی۔

''بکو... اب کیا بکواس سنانا چاہتی ہو۔'' باب نے کہا۔

اس کے قدم جہاں تھے، وہیں رک گئے۔

''اگر تم پچھلے دو ہفتوں کے چھ سو ڈالر اور سو ڈالر سُود کے چھوڑ دو تو میں تمہیں اس ہفتے کے تین سو ڈالر ابھی ادا کردیتی ہوں اور پھر ہر ہفتے کے آخر میں اتنی ہی رقم...'' ایلس نے اسے پیشکش کی۔

''مجھ سے سودے بازی مت کرو۔'' وہ غرایا۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میرے پاس رقم نہیں ہے۔ اب تک جو کچھ کمایا تھا، وہ ان چیزوں کی خریداری پر خرچ کرچکی ہوں۔'' اس نے ہاتھ سے گھریلو سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم کوئی ڈراما تو نہیں کررہی ہو۔'' اس کی بات سُن کر وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔

''بالکل نہیں...'' وہ جلدی سے بولی۔ ''میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''میں پچھلے دو ہفتے کا مال چھوڑ رہا ہوں لیکن اس رعایت کے بدلے ہر ہفتے چار سو ڈالر لوں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے ایلس کی طرف دیکھا۔ ''کہو منظور ہے؟''

''منظور ہے۔'' وہ جلدی سے بول اٹھی۔ یہ سن کر باب آگے بڑھا اور اپنا داہنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ اس کے ہاتھ کا سہارا لیتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔ ''اپنے بال ٹھیک کرو اور منہ صاف کرلو۔'' اس نے اپنی جیب سے رومال نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ ''اگر پہلے ہی کام کی بات کرلیتیں تو یہ حشر تو نہ ہوتا۔'' وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ جو کچھ ہوا، اس پر اسے افسوس ہے، حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ اسے دیکھ کر لوگوں کی آنکھوں میں خوف اتر آتا ہے لیکن اس کی آنکھوں میں خوف تو نہیں البتہ کوئی اور بات ضرور پوشیدہ تھی۔ وہ کیا بات تھی، باب اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔ ''وہ تم میرے پینے کے لیے کچھ لینے جارہی تھیں۔''

''اوہاں...'' اس نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''میں نے شام کو اپنے ایک خاص مہمان کے لیے خاص بوتل خریدی تھی مگر اس کا پروگرام کینسل ہوگیا، سوچا تھا تمہیں پلادوں مگر...'' اس نے اپنے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے روٹھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تو پھر دیر کس بات کی ہے، جاؤ لے کر آؤ۔''

''اچھا...'' ایلس نے بے دلی سے کہا اور لیونگ روم کی



طرف بڑھی۔ باب کا ہاتھ ہولسٹر پر تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جب وہ پلٹی اور اس کے ہاتھ میں بوتل کے سوا ہتھیار ہوا تو وہ اس صورتِ حال سے کیسے نمٹے گا۔ یہ خیال آتے ہی اس کی آنکھوں میں بھیڑیے جیسی چمک آگئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ پلٹی تو اس کے ہاتھوں میں کوئی ہتھیار نہیں، واقعی بوتل اور ایک گلاس تھا۔ باب نے حریصانہ نظر بوتل پر ڈالی۔ ''یہ تو میرا پسندیدہ برانڈ ہے۔'' اس کا چہرہ کھل گیا۔

''واقعی...'' ایلس نے نہایت حیرت سے کہا۔ ''اب سمجھی، وہ خاص مہمان پھر تم ہی تھے۔ تقدیر بھی عجیب شے ہے۔ خریدی تھی کسی کے لیے، نصیب میں ہے کس کے۔'' ایلس نے اس انداز میں یہ بات کہی کہ جیسے اسے اس اتفاق پر حیرت ہورہی ہو۔ ''یہ لو۔'' اس نے بوتل کی سیل توڑ کر کاک کھولا اور گلاس اس کی طرف بڑھادیا۔

باب نے اگلے ہی لمحے پورا گلاس اپنے معدے میں اُنڈیل لیا اور خالی گلاس پھر اس کی طرف بڑھایا۔ ''آج صبح سے ایک بُوند بھی حلق میں نہیں اُتری تھی، مزہ آگیا۔'' ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے زمانے بھر کی خوشی مل گئی ہو۔

''یہ پوری بوتل تمہاری ہے۔ اچھی طرح مزہ لے لو۔'' ایلس نے انداز دلربائی سے کہا۔ چند لمحوں کے اندر وہ دوسرا گلاس بھی وہ اپنے معدے میں اُنڈیل گیا تھا۔ تیسری بار پھر اس نے خالی گلاس آگے بڑھایا۔ اس نے پھر گلاس بھر دیا۔ اس بار وہ گھونٹ گھونٹ پی رہا تھا۔

''کیسا لگا تمہیں میرا یہ تحفہ۔'' ایلس نے لگاوٹ سے پوچھا۔

''بہت شاندار۔'' اس نے نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''مگر مجھے تمہارا تحفہ قطعی اچھا نہیں لگا۔'' اس نے اپنے ہونٹوں پر اُنگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

''سوری... مگر غلطی تمہاری ہی تھی۔'' باب نے ہٹ دھرمی دکھائی۔

''خیر... جس کی غلطی ہو، اُسے سزا تو ملتی ہے۔'' ایلس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''یہ بات بالکل درست کہی ہے تم نے۔ اب سمجھیں کہ تمہیں کیوں تھپڑ پڑے تھے۔'' باب نے لہک کر کہا۔ گلاس بدستور اس کے ہاتھ میں تھا۔

''غلطیاں تو تم نے بھی بہت کی ہیں، کبھی سزا ملی ان غلطیوں پر۔'' ایلس نے یہ سن کر کہا۔

''کیا بک رہی ہو؟'' یہ سنتے ہی اس کی چھٹی حس بیدار ہوگئی۔

''میں نے تو ویسے ہی ایک بات کہی تھی۔'' ایلس نے گھبراہٹ ظاہر کرتے ہوئے کہا اور فوراً اٹھ کر الماری کی طرف بڑھی۔

''کہاں جارہی ہو؟'' باب نے سوالیہ نگاہوں سے اسے گھورا۔

''تمہاری دعوت کے لیے کچھ اور سامان لانے۔''

''اوہ...'' اس نے گلاس سے گھونٹ بھرا لیکن اگلے ہی لمحے اسے محسوس ہوا جیسے کہ اس کا ہاتھ بے جان ہوگیا ہو۔ گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا اور فرش پر گر کر ٹوٹ گیا۔ چھناکے کی آواز پیدا ہوئی لیکن ایلس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ باب کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اسے محسوس ہوا کہ وہ کوشش کے باوجود اٹھ نہیں پارہا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے کرسی کا ہتھا پکڑنا چاہا لیکن اسے محسوس ہوا کہ ہاتھ نہیں اٹھ رہا ہے۔ جب تک ایلس پلٹتی، اس کا سارا جسم مفلوج ہوچکا تھا۔ وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں نائیلون کی ڈوری کا ایک گچھا تھا۔ وہ باب کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ ''غلطی کی سزا تو ملنی ہی چاہیے... کیوں مسٹر باب ریان ٹھیک کہا ہے نا۔''

''تم کون ہو؟'' اس نے لرزتی ہوئی زبان سے اٹکتے ہوئے پوچھا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ عورت وہ نہیں جو نظر آتی ہے۔ وہ اس سے خوفزدہ ہوچکا تھا۔

''تم کچھ دیر تک اپنی زندگی کے آخری الفاظ بول سکتے ہو۔ اس لیے جو بولنا چاہو، بولو۔ آدھا گھنٹے بعد تمہاری بولتی بھی بند ہوجائے گی۔'' ایلس نے بے نیازی سے کہا۔ ''لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں۔''

''تم کون...؟'' اس نے ایک بار پھر بدقتِ تمام پوچھا۔

''میرا وعدہ ہے کہ تمہیں زندہ دفن کرنے سے پہلے ساری حقیقت تمہیں بتادوں گی مگر ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے۔'' اس نے بیڈ پر سے موبائل فون اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''جلدی پہنچو اور اسے بھی لیتے آؤ۔ کام ہوگیا ہے۔'' اس نے نمبر ملا کر کسی کا نام لیے بغیر کہا اور پھر فوراً فون بند کردیا۔

''تم کون...'' اس نے ایک بار پھر اپنی ساری جسمانی قوت مجتمع کرتے ہوئے پوچھا۔

''مسٹر باب ریان...'' ایلس نے اسے مخاطب کیا۔

''بے چین مت ہو۔ تمہاری تدفین میں دو تین گھنٹے ہی باقی رہ گئے ہیں اور میرا وعدہ ہے کہ تمہیں زندہ دفن کرنے سے پہلے سب کچھ سچ سچ بتادوں گی۔'' ایلس نے اٹھلاتے ہوئے بات مکمل کی۔ ''ویسے بھی زندہ دفن کرنے کا تو تمہیں بہت ہی شوق ہے۔ اسی لیے میں نے سوچا کہ کیوں نہ تمہیں بھی اسی طرح سپردِ خاک کیا جائے۔'' یہ کہہ کر اس نے باب کی آنکھوں میں جھانکا۔ خوف سے اس کی آنکھوں کی پتلیاں سکڑ گئی تھیں۔ گردن کرسی کی پشت پر ڈھلکی ہوئی تھی۔ ''ویسے یہ بتادیتی ہوں کہ میں تمہارے پسندیدہ مشروب کے بارے میں جانتی تھی۔ اسی لیے میں نے اس بوتل میں جسم کو مفلوج کرنے والا نہایت مہلک اور سریع الاثر زہر ملا دیا تھا۔ اس زہر کا اثر آٹھ سے دس گھنٹوں تک رہتا ہے لیکن افسوس یہ اثر ختم ہونے سے پہلے ہی تم ختم ہوجاؤ گے۔'' وہ اپنا چہرہ اس کے چہرے کے بالکل قریب لاکر سرگوشی میں کہنے لگی۔ باب نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن اس کی زبان نے ساتھ نہیں دیا۔

کچھ دیر بعد ایلس نے باب کو فرش پر لٹا کر اس کے ہاتھ پاؤں اچھی طرح باندھ دیے۔ ویسے بھی اب وہ ہلنے جلنے کے قابل ہی کہاں رہا تھا مگر ایلس بہت احتیاط پسند تھی۔

ایلس کو فون کیے تقریباً آدھا گھنٹا گزرا ہوگا جب ڈور بیل بجی۔ اس نے دروازہ کھولا اور آنے والوں کو اندر آنے کے لیے کہا۔ باب کی نگاہیں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کا جسم مفلوج تھا مگر دماغ پوری طرح کام کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ ایلس پیچھے ہٹی تو ٹامی اور اس کے پیچھے پیچھے سیلی اندر داخل ہوئی۔ سیلی سہمی ہوئی لگ رہی تھی۔ ایلس ان دونوں کے ہاتھ تھام کر باب کے پاس پہنچی۔ وہ تینوں گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھ گئے۔

''ہائے باب... خدا نے میری سُن لی۔'' سیلی نے کہا۔ وہ جس کے خوف کے سبب گزشتہ کئی برسوں سے مر مر کر جی رہی تھی، وہ کبھی اس کے سامنے یوں بے بس پڑا ہوا زندگی کی آخری گھڑیاں جی رہا ہوگا، یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔

''تمہارا شکریہ سیلی...'' ایلس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر نہایت اپنائیت سے کہا اور ''تمہارا بھی۔'' وہ ٹامی کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔

''شکریہ تو ہم ادا کرتے ہیں۔ اس کمبخت نے تو پورے شہر کا جینا حرام کر رکھا تھا۔'' ٹامی نے تیزی سے کہا۔ اچانک اسے کچھ دیر پہلے باب کے ہاتھوں لگنے والی پٹائی یاد آگئی اور اس نے نفرت سے اس پر تھوک دیا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، میں نے تمہاری مار کے ڈر سے ایلس کا پتا بتایا تھا۔ ارے میں تو جان بوجھ کر وہاں کھڑا تھا۔ جانتا تھا کہ تم وہیں آؤ گے۔'' اس نے باب کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہم سب کا منصوبہ تھا۔'' یہ کہہ کر وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

رات کافی بیت چکی تھی جب وہ تینوں باب کو اس کی سرکاری گاڑی میں لاد کر سنسان راستے سے اس کے فارم ہاؤس پر جارہے تھے۔ وہ مُردوں کی طرح پچھلی سیٹ پر پڑا ہوا تھا۔ ایلس گاڑی چلا رہی تھی۔ ٹامی اور سیلی، دونوں اگلی سیٹ پر اس کے برابر بیٹھے ہوئے تھے۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ فارم ہاؤس پہنچ گئے۔

فارم پر پہنچتے ہی ایلس اور ٹامی نے اسے گھسیٹ کر گاڑی سے باہر نکالا اور کچھ دور لے جا کر اسے زمین پر لٹا دیا۔ سیلی نے ہی اس جگہ کی نشاندہی کی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ایلس اور ٹامی قبر کھود رہے تھے۔ جہاں باب کی قبر کھودی جارہی تھی، اس کے برابر انتیا اور مارتھا کو باب نے زندہ دفن کیا تھا اور اب وہ کھلی آنکھوں سے اپنی قبر کھدتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی زندہ درگور ہونے والا تھا۔ اس کا دماغ اب بھی کام کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ زندگی واقعی ایک پل میں اپنا طویل سفر طے کر کے موت کی منزل تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کی پوری زندگی اُس کی آنکھوں میں ایک فلم کی طرح چل رہی تھی۔

☆☆☆

باب ریان کا باپ اس کی پیدائش سے کئی ماہ پہلے اس کی ماں کو تنہا چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ اس کی ماں نے اُس کی پیدائش کے بعد زندگی گزارنے کے لیے جسم فروشی کو اپنا لیا۔ جب یہ تھوڑا بڑا ہوا تو وہ اسے اپنے دھندے کے بیچ رکاوٹ محسوس کرنے لگی۔ وہ عیش و عشرت کی دلدادہ تھی۔ اس نے باب کو یتیم خانے میں داخل کروا کر اپنی راہ کا یہ کانٹا نکال دیا۔ جب باب بڑا ہوا تو اس کے ذہن میں شدت کے ساتھ ماں باپ کے پیار کی محرومی اور خاندان کے نہ ہونے کا احساس زور پکڑتا گیا۔ اسے یہ علم ہوگیا تھا کہ اس کی ماں خود اسے یتیم خانے میں چھوڑ کر ایسی گئی کہ پھر پلٹ کر نہ آئی۔ وہ یہ بات بھی جان گیا تھا کہ وہ جسم فروشی کرتی تھی۔ اس بات نے لڑکپن سے ہی اسے عورتوں بالخصوص طوائف کا دشمن بنا دیا۔ وہ شدید احساسِ کمتری کا شکار تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر اس کی ماں کے پاس پیسا ہوتا تو شاید وہ اسے یوں لاوارث



چھوڑ کر نہ جاتی۔ اس لیے جب اس نے پولیس کی ملازمت اختیار کی تو اسے ناجائز کمائی کا ذریعہ بنالیا۔ ایلے شہر میں اسے کھل کر کھیلنے کا زیادہ موقع ملا۔ اس نے جی بھر کر لوگوں کو لوٹا۔ وہ سیلی کو بھی اس لیے نہیں چھوڑ رہا تھا کہ لاشعوری طور پر وہ اس سے اپنی ماں کی زیادتیوں کا بدلہ لے رہا تھا۔ سیلی پر تشدد کر کے وہ اس طرح کا سکون محسوس کرتا کہ جیسے اپنی ماں سے اُس کی زیادتیوں کا بدلا لے رہا ہو۔

☆☆☆

''چلو اٹھاؤ اسے۔'' اچانک ایلس کی آواز سے باب کے خیالوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ اُس کی پلکوں پر دو آنسو ڈھلک آئے۔ اس کی قبر تیار ہوچکی تھی۔ ایلس اور ٹامی نے مل کر اسے نہایت پیار سے قبر میں لٹا دیا۔ اس رات چودھویں کا چاند آسمان پر چمک رہا تھا۔

''ہاں مسٹر باب ریان...'' ایلس قبر میں اتری اور اس کے سینے پر بیٹھ گئی۔ ''میں نے وعدہ کیا تھا نا کہ دفن کرنے سے پہلے تمہارے سب سوالوں کے جواب دوں گی تو سنو...'' باب کا دماغ اب بھی کام کر رہا تھا۔ ''تمہیں انیتا تو یاد ہوگی۔'' ایلس نے کہنا شروع کیا۔ ''وہ میری سب سے چھوٹی بہن تھی۔ وہ نادان تھی۔ اگر وہ بتادیتی تو میں اسے قانونی طور پر امریکا بلوالیتی۔'' یہ کہہ کر وہ جھکی اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''حیرت ہوئی نا یہ سن کر۔''

''خیر چھوڑو۔ میں تمہیں شروع سے ساری کہانی سناتی ہوں۔'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ ''میں پانچ سال کی تھی جب کولمبیا میں تفریح کے لیے آنے والے ایک بے اولاد امریکی جوڑے نے مجھے گود لے لیا اور یوں میں امریکا چلی آئی۔ یہیں پلی اور بڑھی۔ تین سال قبل جب میں کولمبیا گئی تو انیتا نے یہاں آنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اس طرح چلی آئے گی۔'' یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ اداس ہوگیا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''خیر...'' کچھ دیر بعد اس نے دوبارہ اپنی بات شروع کی۔ ''انیتا نے مرنے سے دو دن پہلے سیلی کو میرا نمبر دے کر مجھے اطلاع کرنے کا کہا تھا لیکن جب تک سیلی کو فون کرنے کا موقع ملتا، تم اُسے زمین میں زندہ گاڑ چکے تھے۔ پھر بھی اس نے مجھے فون کیا اور اس کے انجام سے باخبر کیا۔ میں تمہاری غیر موجودگی میں یہاں آئی، سیلی سے ملاقات کی، تمہارے بارے میں تمام تر معلومات حاصل کیں اور پھر آخر کار ٹامی اور سیلی کے ساتھ مل کر یہ منصوبہ بنایا۔'' یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر رک گئی۔ اس نے اپنی جینز کی جیب میں ہاتھ ڈال کر بٹوا باہر نکالا اور اس میں سے ایک کارڈ نکال کر اسے باب کی نظروں کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ''تم میرا پورا نام نہیں جانتے تھے۔ اس کارڈ پر پڑھ لو... ایلس تھامسن اسپیشل ایجنٹ ایف بی آئی۔ اٹلانٹی ٹیررسٹ یونٹ، نیویارک۔'' باب کی آنکھوں کی پتلیاں اچانک پھیل گئیں۔

''گڈ بائے مسٹر باب... خدا تمہیں ہمیشہ جہنم کی آگ میں جلائے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ باہر نکلی اور پھر تینوں مل کر اس پر مٹی ڈالنے لگے۔ کچھ دیر بعد زمین بالکل ہموار ہوچکی تھی۔

''چلو...'' ایلس نے کام ختم ہوتے کہا۔

گھنٹا بھر بعد وہ تینوں باب کی پک اپ میں سوار اس طرف جارہے تھے جہاں آج شام درختوں کی اوٹ میں ٹامی نے ایلس کی کار کھڑی کی تھی۔ وہاں پہنچ کر تینوں کار میں سوار ہوگئے۔ انہوں نے سٹی سینٹر پر ٹامی کو اتارا۔ ایلس نے اسے ایک لاکھ ڈالر دیے۔ ''مجھے امید ہے کہ اس رقم سے تم اب شریفانہ زندگی گزار سکتے ہو اور چاہو تو یہ شہر چھوڑ کر کہیں بھی جا کر رہ سکتے ہو۔''

''شکریہ۔'' ٹامی نے رقم لیتے ہوئے کہا اور ایلس نے کار آگے بڑھادی۔ اگلے ہی لمحے ان کی کارہائی وے پر دوڑے جارہی تھی۔

باب کو دفن کرنے کے بعد انہوں نے اس کے بیڈروم کی تلاشی لی تو خفیہ تجوری سے ساڑھے بارہ لاکھ ڈالر کی رقم برآمد ہوئی۔ یہ اس کی زندگی بھر کی حرام کی کمائی تھی لیکن اس کے کسی کام نہ آسکی۔ ایلس نے ساری رقم سیلی کو دے دی۔ اس کی خواہش پر ہی ٹامی کو ایک لاکھ روپے دیے تھے۔

''اب تم امریکا میں اپنے سارے خواب پورے کرسکتی ہو۔'' سیلی نے ہائی وے پر گاڑی چڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تم نے جتنے دکھ اٹھائے ہیں، یہ رقم اس کا کفارہ ہے۔'' ایلس نے سیٹ پر رکھے ہوئے رقم سے بھرے بیگ کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ سیلی مسکرادی۔ آج کئی برسوں بعد وہ دل کی گہرائیوں سے مسکرائی تھی۔

جب وہ ایلے شہر کی حدود سے باہر نکلے تو سیلی نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ آسمان پر نئے دن کا سورج طلوع ہورہا تھا۔

ان عاشق پروانوں کا ماجرائے خاص جو للکار سننے اور للکارنے کے دھنی تھے

# للکار

طاہر جاوید مغل

زمانۂ قدیم سے عاشق وہ غبارِ خاک ہے جو یہاں سے وہاں اڑتا پھرتا ہے۔ خود داری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار کے طواف میں محو رہتا ہے ...... مگر آج عشق کی اقدار میں تبدیلی ...... وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے ...... جس نے عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے ...... کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی ہے ...... سر پھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ دیگر فرائض و منصب کو بھی پیشِ نظر رکھتا ہے ...... ایسے ہی عاشقوں کے گرد گھومتی داستانِ محبت جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے ...... عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے ...... جبکہ دوسرے عاشق کا مطمحِ نظر مختلف ہے۔ زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر ...... عقل و شعور اور جذبِ عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے ...... کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیشِ نظر ...... ایک للکار ہے۔

قسط: 19

## گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ایک شرمیلا اور کم گو نوجوان تھا۔ ثروت میری محبت اور منگیتر تھی۔ ہم اپنی شادی کا انتظار گھڑیاں گن گن کر کر رہے تھے لیکن پھر ایک طوفان آ گیا۔ سیٹھ سراج کے اوباش بیٹے واجد عرف واجی نے ایک چھوٹی سی بات سے مشتعل ہو کر ثروت کو اغوا کرلیا۔ ثروت بخیریت گھر واپس تو آ گئی لیکن اس کے ماتھے پر ایک ایسا داغ لگ گیا جس نے نہ صرف اس کے والدین کی جان لی بلکہ اسے اور اس کے گھر والوں کو خاموشی سے ملک چھوڑنے پر بھی مجبور کر دیا۔ پھر سیٹھ سراج نے مجھے زدوکوب کیا اور میں خودکشی کا سوچنے لگا لیکن پھر میری ملاقات ایک خوش باش ہمہ صفت شخص عمران دانش سے ہوئی۔ میرا اور ثروت کا بدلہ چکانے کے لیے عمران ہاتھ دھو کر سیٹھ سراج کے پیچھے پڑ گیا... جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سیٹھ سراج لال کوٹھیوں میں رہنے والی ایک دبنگ عورت میڈم صفورا کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ لوگ ٹیکسلا، ہڑپہ وغیرہ سے نوادرات حاصل کرتے تھے۔ میڈم صفورا کی چھوٹی بہن نادیہ عمران پر بُری طرح فریفتہ ہو گئی۔ نادیہ نے عمران کی سرد مہری کا انتقام لینے کے لیے ہمارے ایک دوست سلیم کو بے دردی سے مار دیا۔ سلیم کی موت کا بدلہ لینے کے لیے عمران نے نادیہ کو گولی مار دی۔ میڈم کے ہرکارے ہمارے پیچھے لگ گئے۔ اس خوفناک تعاقب کے نتیجے میں عمران کے سینے پر رائفل کا پورا برسٹ لگا اور وہ ایک ڈیک نالے کے تاریک پانیوں میں اوجھل ہو گیا۔ اس کے بعد وہ میرے اہلِ خانہ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے اپنی بہن فرح اور بھائی عاطف کو موقع سے بھگا دیا۔ سفاک سیٹھ سراج اور شیرے نے میری والدہ کو مجبور کر دیا کہ وہ موت کو گلے لگا لیں۔ ماں کی اندوہناک موت نے میرے ہوش و حواس چھین لیے۔ میں ماں کے جسدِ خاکی تک پہنچنے کے لیے چلاتا ہوا سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ گر گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پایا۔ یہاں مجھے ایک راجپوت لڑکی سلطانہ ملی۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ وہ میری بیوی ہے اور ہمارا ایک بچہ بھی ہے۔ پھر مجھ پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ میں پاکستان میں نہیں بلکہ انڈیا میں اتر پردیش کی ایک دور دراز ریاست میں ہوں اور آج میں کچھ گھنٹوں یا دنوں کے بعد نہیں، دو برسوں کے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں جس جگہ موجود تھا اسے بھانڈیل اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ یہاں دو بڑی آبادیاں ہیں زرگاں اور تل پانی۔ زرگاں میں حکم جی کا اختیار چلتا ہے۔ حکم جی ایک عیاش اور بے انصاف شخص ہے۔ سلطانہ اس کی دستبرد سے بچنے کے لیے اسٹیٹ کی دوسری بڑی آبادی تل پانی میں آ گئی۔ یہاں حکم جی کا چھوٹا بھائی کارمختار تھا۔ اسے چھوٹے سرکار کہا جاتا تھا۔ بعدازاں مجھے زرگاں میں بگوڈا پہنچایا گیا جبکہ سلطانہ کو بھی الگ کر دیا گیا۔ یہاں میری میڈم صفورا سے ملاقات ہوئی۔ پھر مجھے بگوڈا سے نکال کر جارج کی رہائش گاہ پہنچا دیا گیا۔ مجھ پر تشدد کر کے سلطانہ کو مجبور کیا گیا اور اس نے جارج کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ پھر میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور بھاگتے بھاگتے ایک غار میں پہنچ گیا۔ وہاں مجھے چوہان اور دیگر لوگ مل گئے جو وہاں چھپے ہوئے تھے۔ انہوں نے جارج گورا کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ سلطانہ بھی یہیں تھی۔ میں وہاں کے تین افراد کے ساتھ خاموشی سے جارج کو قتل کرنے کے ارادے سے نکل پڑا مگر جارج نے اپنا راستہ بدل دیا۔ پھر ہم نے جارج کی سوتیلی بہن ماریا کو اغوا کرلیا۔ ہم ماریا کو لے کر وہاں سے نکلے۔ ہم نے ایک نہر کے پاس پہنچ کر کشتی میں سفر کیا۔ اس کشتی میں ہمیں ایک عجیب الخلقت آدمی ملا جس کا ایک ہاتھ اور ٹانگ کٹی ہوئی تھی اور وہ نشے میں تھا۔ ہم اسے بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ بعدازاں ہمیں پتا چلا کہ وہ جوڈو کراٹے کا نامور چیمپئن ہے۔ ہم واپس غار میں پہنچ گئے۔ ماریا کے اغوا کا مقصد اپنی بہت ساری باتیں منوانا تھا۔ پھر چوہان اور میں نے یہ پتا لگا لیا کہ میرے جسم میں چپ نصب کی گئی ہے۔ ماریا کے وارثوں کو دی گئی مہلت ختم ہو چکی تھی۔ انہوں نے ہمارے بہت سے مطالبات مان لیے۔ ہمارے سات افراد کو رہا بھی کیا گیا۔ ہمیں غار سے نکلنے کا راستہ دیا گیا مگر غار سے نکلنے سے پہلے جیکی وہاں سے غائب ہو گیا۔ سفر کے دوران ہم ایک چوکی میں ٹھہر گئے۔ وہاں ہمارے ایک ساتھی کی غداری کی وجہ سے ماریا ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ ہم چوکی سے نکلے لیکن اس کوشش میں احمد اور مہیش سمیت ہمارے چار ساتھی مارے گئے۔ ہم بھاگتے رہے۔ میں ساتھیوں سے الگ ہو گیا اور باروندا جیکی تک جا پہنچا۔ پھر دشمن یہاں بھی پہنچ گئے اور انہوں نے ہمیں گھیر لیا۔ وہاں مقابلہ شروع ہو گیا۔ دشمن کو وہاں سے مار بھگایا گیا۔ مجھے اور جیکی کو تل پانی چھوٹے سرکار کے دیوان میں پہنچا دیا گیا۔ سلطانہ کی ذہنی حالت خراب تھی۔ ایک دن وہ خاموشی سے دیوان سے نکل گئی۔ مجھے پتا چلا تھا کہ تل پانی پہنچنے والوں میں شکنتلا بھی شامل ہے۔ سلطانہ کے غیاب کے بعد اس کی تلاش جاری تھی۔ اسی تلاش کے دوران ہم سلطانہ کے دھوکے میں شکنتلا تک پہنچ گئے۔ شکنتلا کو دیوان لے آیا گیا۔ میں نے شکنتلا کو جیکی کے بارے میں نہیں بتایا مگر ایک رات شکنتلا جیکی کے کمرے میں پہنچ گئی۔ جیکی کی حالت خراب تھی۔ جیکی نے دم توڑ دیا۔ ادھر زرگاں میں تین بندے قتل ہونے پر سلطانہ کو پکڑ لیا گیا۔ میں ایک روز اچانک اپنی نگرانی پر مامور لوگوں کو چکمہ دے کر دیوان سے نکل پڑا۔ میں ایک ہندو فیملی کے گھر پہنچ گیا۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ سلطانہ کو اپنے طور پر سزا دینا چاہتے تھے لیکن ان کے پنڈت کے مطابق وہ سزا ایک خاص آدمی دیتا جو وہ مجھے سمجھ رہے تھے۔ رام پرشاد کے بیٹے ستیش کا تعلق انتہا پسند ہندو تنظیم سے تھا۔ پھر ایک روز ستیش نے بتایا کہ انہوں نے سلطانہ کو جارج اور حکم جی کے لوگوں سے چھڑا کر اپنے ٹھکانے پر پہنچا دیا ہے اور اسے سزا دینے کا وقت آن پہنچا ہے۔ وہ مجھے آنکھوں پر پٹی باندھ کر اپنے خفیہ ٹھکانے پر لے گیا۔ ستیش کے مطابق سلطانہ کو زندہ جلایا جانا تھا اور اس کی چتا کو میں آگ دیتا۔ میرے ہاتھ میں مشعل نما لکڑی تھما دی گئی۔ پھر ایک نوجوان اس پر تیل ڈالنے آیا۔ اس نے چہرے پر بھبوت مل رکھا تھا۔ اس نے عمران کا ذکر کیا تو میں ساکت رہ گیا۔ وہ عمران تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے کہا کہ ہم سلطانہ کو وہاں سے نکال لیں گے۔ گرو نے سلطانہ کی سزا تین دن کے لیے ملتوی کر دی۔ عمران اکیلا نہیں تھا بلکہ اقبال بھی اس کے ساتھ تھا۔ پھر عمران نے مہا گرو کے ذریعے تاڑی میں دھتورا ملا دیا اور وہاں موجود تمام پہرے دار بے ہوش ہو گئے۔ ہم ایک سکھ سردار کی گھوڑا گاڑی میں وہاں سے فرار ہوئے اور ایک چھوٹی سی بستی میں پہنچے۔ وہاں ہم نے تاؤ افضل نامی شخص کے مکان میں قیام کیا۔ گرو سوبھاش وہاں سے بھاگ نکلا۔ ہم نے تاؤ افضل کا گھر چھوڑ دیا اور جنگل میں سفر کرنے لگے۔ تاؤ افضل اور اس کی بیٹیاں بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ جنگل میں ہمیں ڈاکوؤں نے گھیر لیا۔ میں نے ایک ڈاکو سے دوبدو مقابلہ کیا۔ مجھے کئی چوٹیں آئیں مگر میں نے اپنے مدِمقابل کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ ہم واپس بستی میں آئے مگر ہم نے ایک مندر کے تہ خانے میں قیام کیا۔ رات کو ہمارا مددگار آفتاب باہر سے کوئی بری خبر لایا۔ اس نے بتایا کہ حالات ٹھیک نہیں۔ وہاں کافی ہندو جمع تھے۔ ہم نے ہوادان سے مندر کا منظر دیکھا۔ جنوبی ہندوؤں نے گرو سوبھاش کا سر کاٹ دیا تھا اور پوجا پاٹ کر رہے تھے۔ گرو سوبھاش کی موت کے بعد جنوبی ہندوؤں کے دو گروہ بن گئے تھے اور ان میں کسی بھی وقت لڑائی چھڑ سکتی تھی۔ کلثوم کے فرار کے بعد مہندر نے اس کا الزام رام پرشاد کی بہو پر لگایا۔ فیصلہ ہوا کہ رام پرشاد جلتے تیل میں ہاتھ ڈال کر پرکھشا دے گا۔ پھر پرکھشا کا وقت آ گیا اور رام پرشاد نے جلتے تیل میں ہاتھ ڈال دیے۔ اس کے ہاتھ جل گئے پھر جنوبی ہندوؤں نے رام پرشاد کو ہلاک کر دیا اور مالا کو پکڑ لائے۔ اب اسے جلتے تیل میں پھینکا جانے والا تھا۔ پھر عمران نے کچھ کرنے کا کہا اور گولی چلا دی۔ مہندر مارا گیا۔ ستیش کے آدمیوں نے بھی گولیاں چلا دیں اور وہ لوگ مالا کو نکال لے گئے۔ ہم واپس تہ خانے میں آ گئے۔ میری گردن کے زخم سے خون کا رساؤ پھر شروع ہو گیا تھا اور تکلیف بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں درد سے لڑتا رہا۔ عمران ڈاکٹر لی وان کو گن پوائنٹ پر اپنے ساتھ لے آیا اور اسے میرا آپریشن کرنے پر مجبور کیا۔ اس میں میری جان بھی جا سکتی تھی۔ خیر میرا آپریشن ہو گیا اور میری گردن سے وہ منحوس چپ نکال دی گئی۔ دس روز بعد میں پوری طرح صحت یاب ہو گیا تھا۔ میں اور عمران راج بھون پہنچ گئے۔ ہم وہاں پہرے داروں کو پچھاڑ کر اندر داخل ہوئے۔ وہاں حکم جی کے بیٹے کی پیدائش پر جشن منایا جا رہا تھا۔ ہم نے فائرنگ کر دی۔ ڈاکٹر اسٹیل کا بھائی اس فائرنگ میں مارا گیا۔ ایک دو بندے زخمی ہوئے۔ پانڈے نے ہمارا پیچھا کیا مگر وہ بھی میرے ہاتھوں مارا گیا۔ ہم ایک ہندو فیملی کے گھر میں گھس گئے۔ وہاں ونتی نامی لڑکی کی زبانی ہمیں پتا چلا کہ اسحاق کو سزائے موت دی جا رہی ہے۔ ہم اسحاق کے لیے کچھ نہ کر پائے۔ اسے بے انتہا اذیت دے کر موت کی نیند سلا دیا گیا۔ ہم وہاں سے نکل رہے تھے کہ ایک گلی میں سپاہیوں کا ناکا نظر آیا۔ میرے سامنے رنجیت پانڈے کھڑا تھا۔ وہ زندہ تھا۔ جو مارا گیا تھا، وہ اس کا چچازاد گرومیت پانڈے تھا۔ پھر میں عمران کو ایک قہوہ خانے میں چھوڑ کر میڈم صفورا کے پاس چلا گیا۔ اس کی سزا معاف ہو گئی تھی اور وہ لال بھون پہنچ گئی تھی۔ پھر عمران بھی وہاں پہنچ گیا مگر میڈم نے ہمیں دھوکا دیا اور کھانے میں بے ہوشی کی دوا ملا دی۔ وہ اپنی بہن کی موت کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ وہاں میڈم کے گارڈ اور اس کے ساتھ لڑائی ہوئی تاہم اس دوران میں میڈم کو سانپ نے کاٹ لیا۔ عمران نے میڈم صفورا کی جان بچا لی۔ میڈم کا رویہ فی الحال ہمارے ساتھ ٹھیک ہو گیا۔ پھر میں ایک رات خاموشی سے نکل کر راج بھون پہنچ گیا اور جارج گورا کو سامبر کا چیلنج کر ڈالا۔ مجھے ایک مہمان کے طور پر واپس میڈم صفورا کے پاس بھیج دیا گیا۔ ایک رات میں اور عمران سو رہے تھے کہ میری آنکھ عمران کے جگانے پر کھلی۔ ہم غسل خانے کی طرف رینگ گئے۔ یہی وقت تھا جب کھڑکی کے پاس کسی سائے کی حرکت محسوس ہوئی۔ یہ کوئی محافظ تھا۔ اس نے ہمارے بستروں کی طرف رخ کر کے فائرنگ کی۔ ہم نے اسے پکڑ لیا۔ ہماری سیکیورٹی سخت کر دی گئی۔ ادھر اسٹیل نے مجھے بتایا کہ جارج نے سامبر کا چیلنج قبول کر لیا ہے۔ راج بھون سے ہمارا بلاوا آ گیا۔ وہاں رام پرشاد کی ماں موجود تھی۔ اس نے حکم سے کہا کہ سامبر کا چیلنج ختم کر کے مجھے سزا دی جائے تاہم عمران کے دلائل نے سب کو خاموش کرا دیا۔ سامبر کی تاریخ دے دی گئی۔ ایک بار پھر ہمیں مارنے کا منصوبہ بنایا گیا تاہم وہ بھی ناکام رہا۔ میں اور عمران بیٹھے تھے کہ باتوں باتوں میں، میں نے اسے اپنی کہانی سنانے کو کہا۔ پہلے تو وہ منع کرتا رہا پھر اپنی کہانی سنانے لگا۔ عمران شمالی پنجاب کے ایک گاؤں میں اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ گاؤں کا چودھری عمران عرف عمو کو دور دراز گاؤں کے ایک مزار پر ایک سال خدمت کرنے کے لیے بھیج دیتا ہے۔ عمران وہاں جا کر بہت روتا ہے تاہم اسے ایک سال تک وہاں رہنا تھا۔ عمو وہاں صبح سویرے سے رات تک صفائی کرتا۔ ایک روز عمو پیر صادق شاہ کے حجرے سے دسترخوان اٹھانے گیا۔ وہاں کچھ مہمان تھے۔ ان میں ایک عورت ماجھاں تھی۔ اس نے عمو کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ عمو کو نہیں پتا تھا کہ اسے یہاں کیوں لایا گیا ہے۔ ماجھاں نامی عورت ایک ڈاکو کی بہن تھی۔ ایک روز اس نے عمو کو اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ عمو سے تعلق قائم کرنا چاہتی تھی تاہم عمو کو اس سے گھن محسوس ہوئی۔ اپنی مرضی پوری نہ ہونے پر اس نے عمو کو خوب مارا۔ ایک روز عمو ماجھاں کے پاس تھا کہ باہر احاطے میں ہلچل محسوس ہوئی۔ ایک تازی گھوڑا سرپٹ بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا۔ رکاب میں کسی شخص کا پاؤں پھنسا تھا اور وہ اس کے ساتھ گھسٹتا چلا جا رہا تھا۔ کئی لوگوں نے گھوڑے کو پکڑنا چاہا مگر ناکام رہے۔ ایک شخص نے گھوڑے پر رائفل تانی مگر ماجھاں نے دہاڑ کر گولی نہ چلانے کا حکم دیا اور گھوڑے کی طرف بڑھی۔

### اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ماجھاں نے گھوڑے کو اس کے نام سے پکارا۔

”ہیرے... ہیرے۔“ پھر وہ ایک دم چکما دے کر دائیں طرف سے آگے بڑھی۔ وہ گھوڑے کی لگام تھامنا چاہتی تھی لیکن گھوڑا تو چھلاوا بنا ہوا تھا۔ وہ ہنہناتا ہوا اپنے پچھلے پاؤں پر کھڑا ہوا اور تقریباً الف ہو کر واپس پلٹا۔ واپس پلٹنے کی وجہ سے اس کا رخ سیدھا عمو کی طرف ہو گیا۔ پانی کے دو بڑے مٹکوں کو توڑتا اور ایک چارپائی الٹتا ہوا وہ عمو کی طرف آیا۔ عمو اس اچانک افتاد سے گھبرا گیا۔ اس نے تیزی سے اپنی جگہ چھوڑنے کی کوشش کی مگر دیر ہو چکی تھی۔ سرکش گھوڑا اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے بے اختیار اندھا دھند اپنا ہاتھ گھمایا۔ اس دوران میں اس کی آنکھیں بے ساختہ بند ہو چکی تھیں۔ عمو کے ہاتھ میں گھوڑے کی لگام آ گئی۔ اس کے بازو کو شدید جھٹکا لگا۔ وہ بُری طرح ڈگمگایا مگر گرنے سے بچ گیا۔ یہی لمحے تھے جب تنومند ماجھاں گھوڑے پر جھپٹی۔ لگام عمو کے ہاتھ میں آنے کے بعد گھوڑا چند لمحوں کے لیے سکتہ زدہ سا ہو گیا۔ شاید یہ صورتِ حال اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی یا وہ پھر سے دیوانہ وار اچھل کود شروع کرنے کے لیے پینترا بدل رہا تھا۔ ماجھاں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنے پورے وزن کے ساتھ گھوڑے کی گردن پر جا پڑی۔ گردن کو اپنے بازوؤں میں لے کر اس نے کچھ اس طرح زور لگایا کہ گھوڑا زمین پر آ رہا۔ اس کے گرنے کی دیر تھی کہ موقع پر موجود افراد چیونٹیوں کی طرح اس سے چمٹ گئے۔ جس کے ہاتھ میں گھوڑے کے جسم کا جو حصہ آیا، اس نے جکڑ لیا۔ دو تین افراد گرے ہوئے گھوڑے کے اوپر ہی چڑھ بیٹھے۔ اس کی چرمی لگام ابھی تک عمو کے ہاتھ میں تھی۔ عمو نے ایسا منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہکا بکا کھڑا رہا۔ سائیس نما شخص نے ایک دوسرے ملازم کے ساتھ مل کر تیزی سے گھوڑے کی ٹانگیں باندھنا شروع کیں۔ دو تین منٹ کے اندر سرکش تازی گھوڑا پوری طرح بے بس ہو

چکا تھا۔

گھوڑے کو سنبھالنے اور گرانے میں زیادہ کردار ماجھاں ہی کا تھا۔ بہرطور اس میں کچھ نہ کچھ حصہ عمو کا بھی تھا۔ لگام عمو کے ہاتھ میں آنے کے بعد ہی گھوڑے کی غیر معمولی سرکشی میں کمی واقع ہوئی تھی۔ اس کوشش میں عمو کی ایک کہنی بُری طرح چھل گئی اور اس سے خون رسنے لگا۔ دو تین مزید افراد کو بھی چوٹیں آئیں۔ بہرحال، سب سے خوفناک منظر اس لاش کا تھا جو سرکش گھوڑے کے ساتھ گھسٹتی ہوئی حویلی کے احاطے میں پہنچی تھی۔ یہ لاش ایک چالیس بیالیس سالہ شخص کی تھی۔ اس کے جسم پر عام سا لباس تھا۔ اس کی پگڑی اور جوتے وغیرہ اتر چکے تھے۔ سارا جسم زخموں اور خراشوں سے بھرا ہوا تھا۔ سر کی چوٹ سب سے مہلک تھی۔ کھوپڑی تربوز کی طرح پھٹ کر کھل چکی تھی۔ لاش پر فوراً چادر ڈال دی گئی۔

تھوڑی ہی دیر میں احاطے کے اندر بہت سے افراد جمع ہو گئے۔ مرنے والے کا نام فاضل تھا۔ وہ حویلی کے ''کاموں'' میں سے تھا۔ مشتعل گھوڑا اسے قریباً دو کلومیٹر سے گھسیٹتا ہوا حویلی تک لایا تھا۔ اچانک عمو کو ایک روتی پیٹتی لڑکی نظر آئی۔ وہ ڈگمگاتی ہوئی لاش کی طرف بڑھی۔ ''ہائے اباجی... ہائے اباجی۔'' وہ پکار رہی تھی۔

عمو نے پہچان لیا۔ یہ وہی پندرہ سولہ سالہ معصوم صورت لڑکی تھی جسے اس نے کل ماجھاں کے سرہانے کھڑا دیکھا تھا، وہ اسے مسلسل پنکھا جھل رہی تھی۔

لڑکی نے لاش کے چہرے پر سے چادر ہٹائی اور پھر اس سے لپٹ گئی۔ اس کی گریہ زاری دل دوز تھی۔ ''ہائے اباجی! آپ کو کیا ہو گیا... آپ بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ ہائے اللہ! اب میں کیا کروں گی۔ مجھے بھی موت آجائے... یا اللہ! مجھے بھی موت آجائے۔''

لاش کے مسخ چہرے پر دوبارہ کپڑا ڈال دیا گیا۔ ماجھاں کے اشارے پر حویلی کی ملازماؤں نے لڑکی کو بہ مشکل سنبھالا اور اسے لاش سے دور لے گئیں۔ عمو بھی حویلی کے اس حصے میں واپس آگیا جسے ڈیرا کہا جاتا تھا۔ اس کے زخمی بازو کی بھی مرہم پٹی کر دی گئی۔

☆☆☆

روتی چلّاتی لڑکی کا نام شبانہ تھا۔ وہ گھوڑے سے گر کر مرنے والے فاضل کی بیٹی تھی اور باپ کے ساتھ ہی یہاں حویلی میں رہتی تھی۔ اس کی والدہ اور دو چھوٹے بھائی ایک قریبی موضع کے رہنے والے تھے۔ وہ لاش لے کر اپنے علاقے کی طرف چلے گئے تھے۔

عمو کی کہنی پر اچھا خاصا زخم آیا تھا۔ تیسرے روز ماجھاں نے اسے حویلی میں بلایا اور اس کا حال چال پوچھا۔ عمو کو ہلکا سا بخار بھی تھا۔ ماجھاں نے ملازمہ شہناز سے کہا۔ ''جب تک اس منڈے کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوتی، یہ حویلی میں ہی رہے گا۔ اسے ایک کمرا دے دو اور ذرا اچھی طرح کھلاؤ پلاؤ اسے۔ دیکھو کس طرح ہڈیاں نکلی ہوئی ہیں خبیث کی۔''

''مم... میں اُدھر ہی ٹھیک ہوں جی... ہلکا سا بخار ہے، کل تک ٹھیک ہو جائے گا۔'' عمو منمنایا۔

''تو زیادہ ڈاکٹر نہ بن۔ جو کہہ رہی ہوں وہ کر۔'' ماجھاں رعب سے بولی اور شہناز کو اشارہ کیا کہ وہ عمو کو لے جائے۔

شہناز نے عمو کو لیا اور احاطے کے اندر ہی ایک ہوادار کمرے میں لے آئی۔ یہاں تین طرف سلاخ دار کھڑکیاں تھیں۔ ویسے بھی یہ کمرا نیم کے درخت کی گھنی چھاؤں میں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہاں گرمی کا گزر ہی نہیں۔ ایک پلنگ، ایک الماری اور ضرورت کی دیگر چیزیں اس کچے کمرے میں موجود تھیں۔ شہناز نے مسکراتی ہوئی معنی خیز نظروں سے عمو کو دیکھا اور بولی۔ ''تمہاری تو لاٹری نکلی ہوئی ہے۔ کھاؤ پیو اور آرام کرو۔ کام شام کرنے کے لیے ہم غریب غربا جو ہیں۔''

عمو جل کر بولا۔ ''میری جگہ تم آجاؤ۔ میں تمہارے کام شام کر لیتا ہوں۔''

وہ ہنس ہنس کر دُہری ہونے لگی۔ ''تمہاری جگہ میں کیسے لے سکتی ہوں۔ تمہاری جگہ تم ہی لے سکتے ہو۔''

اس کے جانے کے بعد عمو پلنگ پر چت لیٹ گیا اور اپنے حالات پر غور کرنے لگا۔ اس کا دل غم واندوہ سے بھر گیا۔ ماں کے چاندی بال اس کی نگاہوں میں چمکنے لگے اور اس کی تھکی تھکی ویران آنکھوں کا تصور عمو کی آنکھوں میں نمی جگانے لگا۔

اس کمرے میں اسے واقعی ہر طرح کا آرام ملا۔ بہترین کھانا، نئے ریشمی کپڑے، اس کے علاوہ آرام دہ بستر، نہ مکھی نہ مچھر۔ دو دن بعد ایک دو بار ماجھاں کی جھلک بھی نظر آئی۔ اس کا رویّہ اب بہتر نظر آتا تھا۔ اس کے کہنے پر اس کا ملازمِ خاص ماکھا عمو کو گاؤں کے حکیم کے پاس بھی لے کر گیا اور اس کے بازو کی مرہم پٹی کرا کے لایا۔ لیکن چوتھے روز وہی ہوا جس کا عمو کو ڈر تھا۔ وہ بالائی دار دودھ کا بڑا گلاس پی کر بستر پر سونے کے لیے لیٹا ہی تھا کہ شہناز آ گئی اور سپاٹ لہجے میں عمو سے بولی کہ اسے مالکن یاد کر رہی ہے۔ یہ ایک اندھیری رات

تھی۔ حویلی میں کہیں کہیں چراغوں کی مدھم روشنی تھی۔ عمو دھڑکتے دل کے ساتھ حویلی کے وسیع صحن میں سے گزرا۔ ماکھا اور حویلی کے دیگر مسلح ملازم ایک طرف چارپائیوں پر بیٹھے شراب پی رہے تھے اور تاش کھیل رہے تھے۔ ان کے قریب ہی ایک بڑی لالٹین روشن تھی۔ اس روشنی میں رکھوالی کے تین بڑے کتے بھی اپنے کھونٹوں سے بندھے نظر آرہے تھے۔

عمو کو اندرونی حصے کی طرف جاتے دیکھ کر ماکھے نے نشیلی آواز میں ہانک لگائی۔ ''دو پُتر اتاراں دے۔ تیرا حسن دیکھیا تے، کھوتے نس گئے کمہاراں دے...''

ملازمہ شہناز، عمو کو ماجھاں کے کمرے میں چھوڑ کر واپس چلی گئی۔ عمو کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ ماجھاں موڑھے پر پھیل کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ آج پھر تمتما رہا تھا اور سانسوں سے بُو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ تپائی پر شراب کی آدھی بوتل پڑی تھی۔ وہ عجیب انداز سے عمران عرف عمو کو دیکھتی رہی پھر نرمی سے بولی۔ ''چل وہ دروازہ بند کر دے۔''

عمو لڑکھڑاتے قدموں سے دروازے تک گیا اور اسے بند کر دیا۔ ''اوئے نامعقولا! کنڈی بھی لگا نا۔'' وہ ذرا درشتی سے بولی۔

عمو نے کنڈی بھی چڑھا دی۔ ''چل بیٹھ جا ادھر میرے پاس۔'' اس نے اپنے پہلو کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی موٹی کلائی میں ایک چمک دار دھاتی کڑا نمایاں نظر آتا تھا۔

یہ دو نشستوں والا موڑھا تھا۔ عمو پھنس کر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا وزنی بازو عمو کے کندھے پر ڈالا اور بھرّائی ہوئی پاٹ دار آواز میں بولی۔ ''دیکھ، مجھ سے ڈرنے کی لوڑ نہیں۔ بڑے آرام سے بیٹھ... سمجھ اپنے گھر میں بیٹھا ہوا ہے۔''

عمو نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ اس سے پوچھنے لگی کہ وہ کس طرح شہنشاہ پیر کے مزار تک آیا تھا... اور اس قسم کی دوسری باتیں۔ تاہم ان باتوں کے ساتھ ساتھ وہ اس کے قریب بھی آتی جا رہی تھی۔ اب اس کا بازو ہی عمو کے کندھوں پر نہیں تھا، وہ خود بھی اس پر لدی گئی تھی۔ عمو کے اندر وہی سات دن پہلے والی کراہت جاگ گئی۔ وہ کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا مگر اس کا دم گھٹنے لگا۔ ماجھاں کا انداز بتدریج جارحانہ ہوتا چلا گیا۔ اس نے اس کی قمیص اتار پھینکی اور اس کی بدبودار سانسیں عمو کے چہرے سے ٹکرانے لگیں۔

کچھ دیر بعد اس نے لالٹین کی لَو دوبارہ اونچی کر دی۔ وہ خفا نظر آرہی تھی۔ تاہم اس خفگی کا کھلا اظہار اس نے عمو پر نہیں کیا۔ کچھ دیر اسے گھورتی رہی پھر سگریٹ کے چند طویل کش لے کر بولی۔ ''پانی پیے گا؟''

عمو کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ماجھاں نے شیشے کا گلاس تپائی پر رکھنے کے بعد پانی کے بجائے ''کالے پانی'' کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے گلاس میں تھوڑی سی شراب انڈیلی پھر اس میں ٹھنڈا پانی ملایا اور بولی۔ ''لے تھوڑا سا پی لے۔ ایک دم بھلا چنگا ہو جائے گا۔''

''نہیں... نہیں... اس میں سے بُو آتی ہے۔''

''اوئے باندر! یہی بُو تو بندے کو شیر بناتی ہے۔ چل پی لے تھوڑا سا۔ چل شاباش۔'' اس نے گلاس پکڑ کر عمو کے ہونٹوں سے لگایا۔

عمو نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بند کر لیے۔ اس کے کانوں میں ماں کی آواز گونجنے لگی۔ اس نے عمو کو بتایا تھا، شراب بہت بُری چیز ہے۔ کبھی بھول کر بھی اس کے پاس نہیں جانا۔ یہ انسان کو جانور بنا دیتی ہے بلکہ اس سے بھی بدتر کر دیتی ہے... اور اس نے عمو کو منع کیا تھا کہ وہ ایسے بندوں کے پاس بھی نہیں بیٹھے گا جو نشہ کرتے ہیں۔

اس نے اپنے ہونٹ بند رکھے اور منہ پھیر کر کراہت کا اظہار کرتا رہا۔ دوسری طرف ماجھاں کا اصرار بڑھتا گیا۔ وہ اب اس سے باقاعدہ زبردستی کر رہی تھی۔ ''دو گھونٹ پی لے۔ مر نہیں جائے گا۔ میرے کہنے پر پی لے...'' اس نے انگلیوں کا بے رحم دباؤ ڈال کر عمو کا منہ کھولنا چاہا۔ شراب کا تلخ ذائقہ عمو کی زبان پر آیا۔ اسے ابکائی سی آگئی۔ اس نے ہاتھ جھٹکا۔ گلاس ماجھاں کے تنومند ہاتھ سے نکل کر کچے فرش پر گرا۔ ماجھاں کا پارا ایک دم ساتویں آسمان پر چلا گیا۔ وہ دو سیکنڈ کے لیے سکتہ زدہ رہی، تب یکا یک عمو پر پل پڑی۔ ''اوئے، کتّے دے پتر! تیری یہ جرأت؟ تیری یہ جرأت؟'' اس نے عمران عمو پر گالیوں کے ساتھ ہی تھپڑوں اور ٹھوکروں کی بھی بارش کر دی۔ اس کے اندر حیوانی قوت تھی۔ وہ واقعی ایسی عورت تھی جس سے خوف کھایا جانا چاہیے تھا۔ اس نے عمو کو اٹھا اٹھا کر دیواروں سے پٹخا پھر وہی چرمی جوتا پکڑ لیا جس نے سات دن پہلے عمو کی چمڑی ادھیڑی تھی۔ ایک بار پھر عمو زبردست چھتر دل کی زد میں آگیا۔ اس کے پنڈے اور ٹانگوں پر انگارے سے دہکنے لگے۔ اس کے زخمی بازو سے درد کی لہریں ابھریں اور پورے جسم میں پھیل گئیں۔ مارنے کے ساتھ ساتھ وہ عمو کو غلیظ ترین گالیاں دے رہی تھی۔ عمو کے لیے ان میں سب سے اذیت ناک وہ گالیاں تھیں جن میں اس کی ماں کا ذکر ہو رہا تھا۔ وہ ہانپ گئی تو اس نے پہلے دن کی طرح ایک بار پھر اسے

لات مار کر کمرے سے باہر پھینک دیا۔ ''تاجو... تاجو۔'' اس نے ملازمہ شہناز کو آوازیں دیں، وہ ڈری ہوئی سی سامنے آئی۔ ماجھاں، عمو کی طرف اشارہ کر کے پھنکاری۔ ''لے جاؤ اس کتے کو اور ماکھے سے کہو سراں میں رکھ کر اس کا دماغ ٹھیک کرے۔''

شہناز نے اثبات میں سر ہلایا اور عمو کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ ماجھاں نے کمرے کا دروازہ بند کیا لیکن پھر فوراً ہی کھول دیا۔ شہناز سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''... اور اس اچھو کو بھیج دے میرے پاس۔''

عمو آنسو بہاتا ہوا شہناز کے ساتھ باہر صحن میں آیا۔ ماکھا ابھی تک اپنی ٹولی میں بیٹھا ہوا تھا۔ شہناز نے اس کے پاس جا کر کچھ کھسر پھسر کی۔ ماکھے نے اثبات میں سر ہلایا اور عمو کو گدی سے دبوچ کر بیرونی دروازے کی طرف چل دیا۔ عمو کا جسم جوتوں کی مار سے سلگ رہا تھا۔ اس نے بس ایک شلوار پہن رکھی تھی۔ ماکھے کی ٹولی کے افراد نے عمو کو تمسخر آمیز نظروں سے دیکھا۔

جب عمو حویلی کے احاطے سے باہر نکل رہا تھا، اس نے انیس بیس سال کے گورے چٹے لڑکے اچھو کو دیکھا۔ وہ شہناز کے ساتھ اندرونی حصے کی طرف جا رہا تھا۔ غالباً آج رات اسے عمو کی جگہ پُر کرنا تھی۔

خضاب لگے سر والا لمبا تڑنگا ماکھا عمو کو لے کر ڈیرے کے پچھواڑے سراں میں آ گیا۔ یہ دراصل وہی مکان تھا جس میں جوئے کی بہت بڑی بیٹھک بھی تھی اور شام کو یہاں خوب گہما گہمی ہوتی تھی۔ حقے گڑگڑاتے تھے، شراب کی بو پھیلتی تھی اور تاش کے پتے بکھرتے تھے۔ ماکھے نے عمو کو ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ اس کی دیواریں کچی لیکن بہت موٹی تھیں۔ کوٹھڑی میں بس ایک دروازہ اور ایک سلاخ دار کھڑکی تھی۔ کچا فرش گیلا اور بدبودار تھا۔ اس بُو سے عمو کو اندازہ ہوا کہ یہاں شاید کتے بھی باندھے جاتے ہوں گے۔ عمو کا یہ اندازہ بالکل درست نکلا۔ صبح سویرے دو دیوہیکل بلڈاگ بھی عمو کے ساتھ ہی اس کوٹھڑی میں باندھ دیے گئے۔ انہیں مضبوط کھونٹوں سے باندھا گیا لیکن پھر بھی ان کی قربت کی دہشت عمو کے اعصاب چٹخانے لگی۔ کوٹھڑی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ اسے خود کو ایک گوشے تک محدود کرنا پڑا۔

وہ بالکل بھوکا پیاسا اڑتالیس گھنٹے تک اس کوٹھڑی میں بند رہا۔ سارا دن دونوں کتے اس کے ساتھ بندھے رہتے تھے، رات کو انہیں نکال لیا جاتا تھا۔ ان کے فضلے اور پیشاب کی بُو نے شروع میں تو عمو کو بے حد پریشان کیا لیکن پھر بتدریج

اس کی حس شامہ کند سی ہو گئی۔ تیسرے دن دوپہر کو جب وہ بھوک پیاس کی وجہ سے قریب المرگ محسوس کر رہا تھا، سلاخ دار کھڑکی کی طرف تھوڑی سی آہٹ ہوئی۔ اس نے سر گھما کر دیکھا، وہی پندرہ سولہ برس کی معصوم صورت لڑکی کھڑکی کے سامنے تھی جو چند دن پہلے اپنے باپ کی ناگہانی موت پر زار و قطار روئی تھی۔ غالباً وہ اپنے باپ کی تجہیز و تکفین کے بعد حویلی واپس آ چکی تھی۔ اس کے سر پر روٹیوں والی بڑی چنگیر تھی اور ہاتھ میں لسی کا ڈول تھا۔ اس نے محتاط نظروں سے دائیں بائیں دیکھا۔ شکر ہے دوپہر میں آس پاس کوئی نہیں تھا۔ اس نے نمکین لسی کا گلاس بھر کر عمو کی طرف بڑھایا جسے وہ غٹاغٹ پی گیا۔ لڑکی نے ایک تہ کی ہوئی روٹی بھی عمو کی طرف بڑھائی۔ اس کے اندر سالن بھی تھا۔ وہ سرگوشی میں بولی۔ ''چھپا کر کھانا۔ نہیں تو بھا ماکھا تمہاری جان کو آ جائے گا اور میری بھی شامت آئے گی۔''

پھر وہ جلدی سے آگے بڑھ گئی۔ عمو کو اس لڑکی کا نام شبانہ معلوم ہوا تھا... وہ اچھے خدوخال کی تھی اور اس کے چہرے پر خصوصیت اس کی آنکھیں تھیں جن میں معصومیت اور محبت سچے موتیوں کی طرح کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

رات کو ماکھا عمو کے لیے تھوڑا سا بدمزہ کھانا اور پانی لے کر آیا۔ شاید اسے ڈر تھا کہ عمو کو آج بھی کچھ نہ دیا گیا تو صبح تک کوٹھڑی میں اس کی لاش سے ''ملاقات'' بھی ہو سکتی ہے۔

جب عمو روکھی سوکھی روٹی، نیم ٹھنڈے پانی کے ذریعے گلے سے اتارنے کی کوشش کر رہا تھا، ماکھے نے اس کی ٹھوڑی کو اپنے پنجے میں دبوچ کر اس کے سر کو زور سے دائیں بائیں ہلایا اور پھنکارا۔ ''اڑیل ٹٹو نہ بن بے وقوفا... جندڑی برباد ہو جائے گی تیری... مالکن کا دل تیرے اوپر آیا ہوا ہے۔ اسے خوش رکھ، وہ تجھے خوش رکھے گی۔''

عمو خاموش رہا۔

ماکھے نے زور سے اس کے بازو پر ٹھوکا دیا۔ ''اوئے بولتا کیوں نہیں... ابھی تو نے مالکن کے غصے کی چھوٹی سی جھلکی دیکھی ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں، فلم کا ٹیلر دیکھا ہے، فلم نہیں دیکھی ابھی۔ اس نے ابھی تو تجھے صرف کتوں کے ساتھ بندھوایا ہے پھر کتا بھی بنا دے گی۔ اور صرف کتا ہی نہیں بنائے گی، تجھے اپنے پاؤں چاٹنے پر بھی مجبور کرے گی۔ کرنا تو تجھے وہی پڑے گا جو مالکن چاہے گی لیکن جو کام پیار محبت سے ہو جائے وہی چنگا ہوتا ہے۔''

''پپ... پر... یہ تو گناہ ہے۔ بہت بڑا گناہ ہے۔''

''اوئے... اوئے مولوی ثنااللہ... زیادہ فتوے



بازی نہ کر۔ یہاں گناہ ثواب کا مطلب کچھ اور ہے۔ گناہ وہی ہے جو مالکن کو پسند نہ ہو... اور اپنے گناہ گاروں کے لیے مالکن کے پاس دوزخ بھی اپنا ہی ہے۔ دو چار دن میں تجھے اٹھا کر پھینک دے گی اس میں۔''

عمو کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اپنی ماں کی دور افتادہ آواز کسی مقدس سرگوشی کی طرح اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

ماکھے نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''اگر تو تیار ہے تو میں جا کر مالکن سے بات کروں؟''

عمو کا دل ایک بار پھر کراہت سے بھر گیا۔ ایک بدبودار بوجھ کے تصور سے اس کا دم گھٹنے لگا۔ ماکھے نے اپنا سوال دُہرایا تو عمو نے نفی میں سر ہلا دیا اور دائیں ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو پونچھنے لگا۔

ماکھے نے اسے ایک گالی دی اور بولا۔ ''لگتا ہے تیری تقدیر ہی خراب ہے۔'' پھر وہ اس کے ہاتھ سے سالن والی پلیٹ چھینتا ہوا باہر چلا گیا۔

اگلے چھ سات روز عمو کے لیے بہت اذیت ناک تھے۔ اس کے جسم پر فقط ایک شلوار تھی۔ اس کے ننگے پنڈے پر ساری رات مچھر کاٹتے تھے اور دن کے وقت مکھیاں ستاتی تھیں۔ کوٹھڑی کی صفائی بس ایک دو بار ہی کی گئی تھی۔ بُو سے اس کے حواس مختل رہتے تھے۔ دن کے وقت اسے کتوں کے ساتھ رہنا پڑتا تھا۔ یہ بڑے خوں خوار قسم کے کتے تھے تاہم غیر متوقع طور پر عمو کے ساتھ ان کا رویّہ نرم ہی تھا یا انہوں نے مجبوری کے تحت اسے نظر انداز کر دیا تھا۔

عمو کو بس ایک وقت روکھی سوکھی روٹی بچے کھچے سالن یا دہی وغیرہ کے ساتھ دی جاتی تھی۔ وہ اس کی جسمانی ضروریات کے لیے بالکل ناکافی تھی۔ اگر اسے شبانہ کا چوری چھپے کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو شاید وہ بالکل نیم جان ہو جاتا۔ شبانہ دراصل سراں میں ''کاموں'' کو کھانا وغیرہ پہنچانے آتی تھی۔ واپسی پر وہ عمو والی کوٹھڑی کے سامنے سے گزرتی تھی۔ رات کے وقت عموماً اس طرف گہرا اندھیرا ہوتا تھا۔ وہ نظر بچا کر کچھ کھانا کھڑکی میں سے اندر ''پاس'' کر دیتی تھی۔ کبھی روٹی جس پر بھنے ہوئے مرغ کا پیس رکھا ہوتا تھا، کبھی سموسے یا جلیبی وغیرہ، کبھی کوئی پھل۔ وہ اسے عمو بھائی کہہ کر بلاتی تھی اور اس سے بہت ہمدردی رکھتی تھی۔

ایک رات وہ آئی تو عمو نے کہا۔ ''تُو ایسا نہ کیا کر شبانہ! کسی نے دیکھ لیا تو تیرے لیے مصیبت ہو جائے گی۔''

''کوئی بات نہیں عمو بھائی۔ کوئی ایسی بات ہوئی تو میں سنبھال لوں گی۔'' وہ جلترنگ بجاتی ہوئی آواز میں بولی۔

''کیسے سنبھال لو گی؟'' عمو نے سرگوشی میں پوچھا۔

''بس کچھ نہ کچھ کر لوں گی۔ تم فکر نہ کیا کرو۔'' وہ تہ شدہ روٹی کھڑکی میں سے عمو کو تھماتے ہوئے بولی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی چوڑیاں چھنکیں اور اس کے ملائم ہاتھوں کا لمس عمو کے سراپا میں بجلی دوڑا گیا۔ یہ روٹی کے بجائے دیسی گھی میں پکا ہوا پراٹھا تھا اور اس پر آلو کی بھجیا رکھی تھی۔

عمو نے کہا۔ ''شبانہ! مجھے تیرے ابّاجی کی موت کا بڑا دکھ ہے۔ اتنے دن گزر گئے، اب بھی کبھی آنکھیں بند کرتا ہوں تو تیرے ابّاجی کا لہولہان چہرہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔''

''بس عمو بھائی! ان کی موت ایسے ہی لکھی تھی۔ وہ ہر طرح کے گھوڑوں، گھوڑیوں کو سدھا لیتے تھے، پر اس منحوس گھوڑے پر کاٹھی ڈالتے ہوئے ان کو بھی ڈر لگتا تھا۔ انہوں نے مالکن سے کہا بھی تھا کہ اس گھوڑے کو گولی مار دیں یا پھر کہیں بکتا ہے تو بیچ دیں لیکن مالکن اڑ گئی۔ اس نے کہا کہ یہ گھوڑا یہیں حویلی میں رہے گا اور تم اس کو سدھاؤ گے بھی۔ میرے ابّاجی سمجھ گئے کہ اگر اب انہوں نے انکار کیا تو نوکری تو جائے گی ہی، اوپر سے کوئی سخت مصیبت بھی آ جائے گی۔ گھر میں پہلے ہی بیماری اور بھوک تھی۔ وہ کیا کرتے۔ مالکن کے کہے پر عمل کیا...'' شبانہ کی آواز بھرّا گئی اور وہ آنسو پونچھنے لگی۔

عمو نے سوچا، اس نے خوامخواہ اس کے ابّا کی موت کا ذکر چھیڑ کر اسے دکھی کر دیا ہے۔ اس نے موضوع بدلنے کے لیے کہا۔ ''اب تو اکیلی ہی نوکری کرتی ہے یہاں؟''

''ہاں عمو بھائی، ماں بیمار ہے۔ کسی طرح گھر تو چلانا ہے نا لیکن پانچ چھ مہینے بعد جب چلی جاؤں گی تو پھر شاید ماں کو ہی یہاں آنا پڑے۔''

''کہاں چلی جاؤ گی؟''

''میری شادی ہے نا۔'' وہ جیسے روانی میں کہہ گئی۔ تاہم کہنے کے بعد ایک دم شرمندہ سی ہو گئی۔

اچانک عمو کو لگا جیسے اس کے بدن میں سرد لہر دوڑ گئی ہے اور سینے کے اندر کچھ ٹوٹ کر بکھر گیا ہے۔ شبانہ کی شادی کا سن کر اسے شاک لگا تھا ایسا کیوں ہوا تھا؟ اس کے ساتھ کیا تعلق تھا عمو کا؟ ابھی چند روز پہلے ہی تو وہ ایک دوسرے سے آشنا ہوئے تھے... اور وہ اسے عمو بھائی کہہ کر بلاتی تھی۔ چند بار کسی کی سانسوں کی مہکار محسوس کر لینے سے اور چوڑیوں کی چھنکار سن لینے سے اور ہاتھوں کا لمس لینے سے... کسی سے کوئی

تعلق تو نہیں بن جاتا... پھر عمو کو تعلق ٹوٹنے کا جھٹکا کیوں محسوس ہوا تھا؟

وہ اسے غور سے دیکھنے لگی۔ ''عمو بھائی! کیا بات ہے۔ تم چپ کیوں ہو گئے؟''

''کچھ نہیں... بس یونہی سوچ رہا ہوں... ابھی تو... میرا مطلب ہے، ابھی تو تمہاری عمر چھوٹی ہے؟'' وہ ہکلایا۔

''ہمارے میں شادیاں چھوٹی عمر میں ہی ہوتی ہیں۔ میری بہن کی شادی صرف چودہ سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ میں تو پھر بھی اس سے ڈیڑھ دو سال بڑی ہوں۔''

رات گہری ہو چکی تھی۔ سراں میں دیے جل چکے تھے مگر کوٹھری کے پچھواڑے جہاں شبانہ کھڑی تھی، مکمل اندھیرا تھا۔ عمو جانتا تھا کہ وہ اس سے پہلے بھی اس کھڑکی کے پاس کھڑی ہو کر کتوں کو بچا کھچا گوشت اور روٹی وغیرہ ڈالتی تھی۔ اب بھی اگر کوئی اتفاقاً ادھر آ جاتا تو وہ کوئی معقول بہانہ بنا سکتی تھی۔

عمو نے ہمت کر کے پوچھا۔ ''شبانہ! کہاں ہو رہی ہے تیری شادی؟''

''میرے چاچے کا پُتر ہے اشرف۔ شہر میں ویلڈنگ کا کام کرتا ہے۔'' شبانہ نے کہا۔

شبانہ نے یہ فقرہ عام سے لہجے میں کہا تھا مگر یہ فقرہ کہتے ہوئے اس کے انداز میں ایک ایسی اداسی اتر آئی جسے عمو نے بہت واضح محسوس کیا۔

وہ کچھ اور بھی پوچھنا چاہتا تھا لیکن اسی دوران میں کسی گھڑسوار کی نخ نخ سنائی دی اور شبانہ اپنی اوڑھنی سنبھالتی ہوئی جلدی سے آگے بڑھ گئی۔

یہ سلسلہ پندرہ بیس دن مزید جاری رہا۔ مالکن ماجھاں اسے کتوں کے ساتھ بند کروا کے جیسے بھول ہی گئی تھی۔ پھر عمو کو شبانہ کی زبانی پتا چلا کہ وہ کسی کام سے گاؤں سے باہر ہے۔ شبانہ موقع دیکھتے ہی اس کی کوٹھری کے پچھواڑے کھڑکی پر آ جاتی تھی۔ اس بدبودار کوٹھری میں وہ عمو کے لیے تازہ ہوا کا واحد جھونکا تھی۔ وہ اس کا انتظار کرتا تھا۔ اگر کسی دن وہ نہ آ پاتی تو وہ اداس ہو جاتا۔ لگتا کہ کوئی قیمتی شے کھو گئی ہے۔ اسے خلا محسوس ہوتا، قدموں کی مدھم چاپ کا، چوڑیوں کی چھنکار کا اور بدن کی خوشبو کا۔ اور کبھی کبھی تو اسے لگتا تھا کہ شبانہ بھی اس سے نہ مل کر بے قرار ہو جاتی ہے۔ ایسا کیوں تھا؟ وہ تو اسے عمو بھائی کہتی تھی اور اس کی شادی ہونے والی تھی۔ اس کی باتوں سے عمو کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ اپنے ہونے والے شوہر میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتی... مگر چونکہ یہ بچپن کا بندھن تھا اور ماں باپ کا دیا ہوا قول نبھانا تھا، اس لیے وہ آمادہ تھی۔

گرم بے چین راتوں کی تنہائی میں عمو اپنا سر گھٹنوں میں دے لیتا اور خوب روتا۔ اسے ماں ٹوٹ کر یاد آتی۔ وہ سوچتا ماں کتنے انتظار کے بعد اس سے ملنے شہنشاہ پیر کے مزار پر آئی ہو گی اور پھر اسے وہاں نہ پا کر اس پر کیا گزری ہو گی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ فربہ اندام... صادق شاہ نے اور اس کے مریدوں نے اس کی ماں کے سامنے کیا بہانہ بنایا ہو گا... ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اس کی ماں کو یہ بتایا ہو کہ اس کا بیٹا یہاں سے بھاگ گیا ہے... اور کچھ چرا کر بھی لے گیا ہے... یا اس طرح کی کوئی اور کہانی سنا دی ہو۔ یہ بات تو عمو کی سمجھ میں اچھی طرح آ چکی تھی کہ اس کی جان جلد ہی یہاں سے چھوٹنے والی نہیں ہے۔ وہ کچھ خطرناک لوگوں میں آن پھنسا تھا اور ان میں سب سے خطرناک خود ماجھاں تھی۔ وہ بدنام ڈکیت تاجے کی بہن تھی۔ اس کی بدمعاشیاں عروج پر پہنچی ہوئی تھیں۔ کوئی آٹھ دس سال پہلے اس کی شادی ہوئی تھی اور کہا جاتا تھا کہ اس نے اپنی ساس اور اپنے شوہر کو خود اپنے ہاتھوں سے کلہاڑیوں کے وار کر کے ہلاک کیا تھا۔ اب وہ چاروں شرعی عیبوں کے ساتھ اس گاؤں کی مختار کل تھی۔ وہ شراب بیچتی تھی اور شراب کا کاروبار بھی کرتی تھی۔ اس کی جوئے کی بیٹھک پورے علاقے میں مشہور تھی اور بڑے دھڑلے والے لوگ یہاں آتے تھے۔ ماجھاں نے کھلم کھلا ناجائز تعلقات بھی قائم کر رکھے تھے۔ سب سے پہلے وہ جنوبی پنجاب سے ابرار نامی ایک کشمیری لڑکے کو اغوا کر کے یہاں لائی تھی اور اسے حویلی میں اپنے ساتھ رکھا تھا۔ چند مہینوں بعد اس لڑکے نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی۔ وہ ایک کماد میں چھپ گیا۔ وہاں جنگلی سور بھی چھپے ہوئے تھے۔ انہوں نے اسے مار ڈالا... ماجھاں اس کے مرنے کا افسوس ہوا لیکن پھر اس کے بعد یہ سلسلہ مزید دراز ہو گیا۔ اب کئی لڑکے اس کی حویلی میں اور ڈیرے پر موجود تھے۔ ان میں نیا اضافہ خود عمو تھا۔

ماجھاں اپنے کام سے فارغ ہو کر گاؤں واپس آ گئی تو ایک بار پھر ماکھے نے عمو سے بات کی۔ وہ ایک بڑے بیاہ میں اس کے لیے دودھ جلیبیاں لے کر آیا۔ ساتھ میں آٹے والے کرارے نان اور دہی کا رائتا تھا۔ انہوں نے ساتھ والے کمرے میں بیٹھ کر یہ کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد ماکھا بولا۔ ''مالکن تجھ سے بہت ناراض ہے۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے کہ کسی وقت وہ تیرا کوئی ہتھ پیر ہی نہ توڑ ڈالے۔ اس کا غصہ بڑا بُرا ہے۔ مجھے تجھ پر بڑا ترس آتا ہے۔ ابھی تیری عمر ہی کیا ہے۔ اگر تُو کہے تو میں مالکن سے تیری مافی کی بات کر کے دیکھوں؟''



''مافی... سے کیا مطلب.... ہے؟'' عمو نے لڑکھڑاتے ہوئے پوچھا۔

''مافی سے مطلب یہی ہے کہ تجھے مالکن کا غصہ دور کرنا ہو گا۔ اس کے کہنے پر چلنا ہو گا جس طرح اچھو چلتا ہے، مقبول چلتا ہے اور دوسرے چلتے ہیں...''

عمو نے نفی میں سر ہلایا... اس کے ساتھ ہی وہ کچھ کہنا بھی چاہتا تھا مگر ماکھے نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ ''نہیں نہیں، اتنی جلدی جواب نہ دے۔ اک آدھ دن اور چنگی طرح سوچ لے۔ میں پرسوں پھر تجھ سے بات کروں گا۔''

عمو اس سے کہنا چاہتا تھا کہ اس کا جواب دو دن بعد بھی یہی ہو گا اور دو سال بعد بھی لیکن آواز اس کے گلے میں اٹک کر رہ گئی۔ وہ دوبارہ کتوں والی کھولی میں کتوں کے ساتھ بند ہو گیا۔ اس کے اندر آہستہ آہستہ بغاوت پروان چڑھ رہی تھی۔ گاہے بگاہے ایک طیش سا اس کے اندر سے ابھرنے لگتا تھا۔ گرد و جانتا نہیں تھا کہ یہ طیش آمیز بغاوت بہت جلد دم توڑنے والی ہے۔

یہ اگلے روز شام کے بعد کی بات ہے۔ کتے اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے لیے کوٹھری سے باہر جا چکے تھے۔ شبانہ پورے تین روز سے دکھائی نہیں دی تھی۔ عمو اس کے لیے بہت بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ کئی طرح کی فکروں نے بھی اسے گھیرا ہوا تھا۔ وہ کیوں نہیں آئی؟ حالانکہ وہ جانتی بھی تھی کہ وہ ایک ایک پل گن گن کر گزار رہا ہے۔ اندھیرا ذرا گہرا ہو گیا تو کھڑکی کے پاس کھٹ پٹ سنائی دی۔ ساتھ ہی مرغ پلاؤ کی مدھم خوشبو بھی اس کے نتھنوں تک پہنچی۔ یہ شبانہ ہی تھی۔ اس نے محتاط انداز میں چاولوں والا شاپر سلاخوں میں سے عمو تک پہنچایا۔ عمو نے بے چین لہجے میں کہا۔ ''تم کہاں چلی گئی تھیں؟''

''کہیں نہیں، ماں آئی ہوئی تھی۔ آج ہی واپس گئی ہے۔ پیسے لینے آئی تھی۔ وہ بہت پریشان ہے۔ میرا ہونے والا، گھر والا نگ کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ مجھے پندرہ ہزار روپیا چاہیے... میں نے شہر میں کرائے پر دکان لینی ہے۔ پہلے بھی اسی طرح دس پندرہ ہزار لے کر جا چکا ہے۔ پر کیا کرایا کچھ بھی نہیں... خیر چھوڑ ان باتوں کو۔ تم ٹھیک تو ہو نا عمو بھائی؟''

''ٹھیک ہوں... پر تمہاری وجہ سے بہت پریشان رہا۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی پھر ہولے سے بولی۔ ''پریشان نہ ہوا کرو۔ مجھے تو ایک دو مہینے میں چلے جانا ہے۔ پھر کیا کرو گے؟''

''پھر میں بھی چلا جاؤں گا۔''

''کہاں؟''

''یہ تو پتا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں سے نکل جاؤں اور پھر واپس جا کر کسی دور کے رشتے دار کے گھر چھپ جاؤں... اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں سے نکلنے سے پہلے ہی یہ لوگ مجھے گولی مار دیں اور میں اوپر ہی چلا جاؤں۔ پھر میری لاش بھی ابرار کی طرح کماد کے کسی کھیت میں دبا دی جائے۔''

شبانہ نے بے چین ہو کر عمو کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''شام و یلے ایسی باتیں نہیں کرتے۔ میں نے پہلے بھی تم سے کہا تھا۔'' وہ داناؤں کی طرح بولی۔

عمو نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی نرم کلائیوں میں کانچ کی چوڑیاں تھیں۔ اس کے ہاتھ کے لمس نے عمو کے بدن میں برق سی دوڑا دی۔ پھر پتا نہیں یہ کیسے ہوا؟ اس نے بے ساختہ اس کا ہاتھ چوم لیا۔

اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ ''شبانہ!'' عمو نے کہا لیکن وہ تیزی سے گھوم کر واپس چلی گئی۔

عمو ایک دم پسینے میں نہا گیا۔ اسے لگا کہ اس نے سنگین غلطی کر دی ہے۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اسے خود پر غصہ آنے لگا۔ اس نے خود کو لعنت ملامت کی۔ چاول کھانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن یہ مجبوری تھی۔ وہ انہیں کھڑکی سے باہر نہیں پھینک سکتا تھا۔ اگر کوٹھری میں رکھتا تو صبح ماکھا اس سے پوچھ سکتا تھا کہ یہ کہاں سے آئے ہیں۔ کتے بھی رکھوالی کے لیے جا چکے تھے ورنہ وہ ان کے آگے ہی ڈال دیتا۔ اس نے نم آنکھوں کے ساتھ جیسے تیسے چاول گلے سے نیچے اتارے اور بے دم سا ہو کر لیٹ گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ شبانہ کے حوالے سے تمام غلط خیالات اپنے دماغ سے نکال دے گا۔ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا اور اگر وہ کسی وقت کھڑکی پر آئے بھی تو اسے منع کر دے گا۔

اگلے روز دوپہر کے بعد اس نے کھڑکی ویسے ہی بند کر دی۔ پھر شام ہو گئی۔ اس نے کوٹھری میں لالٹین روشن کر دی۔ کتے رکھوالی کے لیے چلے گئے۔ آج کوٹھری کی صفائی ہوئی تھی۔ بُو قدرے کم محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کچی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ رات گہری ہو گئی، اسے بند کھڑکی کی دوسری جانب مدھم آہٹ سنائی دی۔ پھر کسی نے کھڑکی پر دباؤ ڈال کر اسے کھولنے کی کوشش کی۔ وہ نہیں کھلی۔ تب مدھم دستک دی گئی۔ اس دستک کے ساتھ چوڑیوں کی ہلکی سی چھن چھن بھی شامل تھی۔ عمو کا دل بے طرح دھڑک اٹھا۔ اس نے کھڑکی کھولی

اور ڈرتے ڈرتے شبانہ کی طرف دیکھا۔ اسے لگا کہ وہ کوئی سخت بات کہہ دے گی مگر جب اس کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مدھم مسکراہٹ دیکھی تو اس کی جان میں جان آئی۔

''کھڑکی کیوں بند کی؟'' اس نے پوچھا۔

''ب... بس یونہی... مچھر آرہے تھے۔''

''ناراض تو نہیں ہو؟''

''کس بات پر؟'' عمو کے سینے میں جلترنگ سے بج اٹھے۔

''کل میں جلدی سے چلی گئی تھی۔ تمہارے بلانے پر بھی رکی نہیں۔''

عمو خاموش رہا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ یہ بڑی حوصلہ افزا دھڑکنیں تھیں۔ شبانہ نے کل والی ''بے ساختہ حرکت'' کا بُرا نہیں مانا تھا۔

''شبانہ! میں... ہر وقت... تمہارے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔'' وہ عجیب لرزتے لہجے میں بولا۔

''کیوں؟'' وہ سر جھکا کر بولی۔

''پتا نہیں۔''

''ایسا نہ کیا کرو عمو... بھائی۔'' اس نے آخری لفظ ذرا اٹک کر ادا کیا۔ ''یہ ٹھیک نہیں ہے... تم... جانتے ہو میری شادی ہونے والی ہے۔''

''مجھے سب پتا ہے شبانہ... پھر بھی...''

''پھر بھی کیا؟'' اس کا سر بدستور جھکا ہوا تھا۔

''تم سب کچھ مجھ سے ہی پوچھتی جاتی ہو، اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتی ہو۔ کیا... تم بھی... میرا مطلب ہے، تم بھی میرے بارے میں سوچتی ہو؟''

اس نے شرما کر عمو کی طرف دیکھا اور پھر عجب دل رُبا انداز میں نفی میں سر ہلایا۔ اس کے ساتھ ہی وہ واپس جانے کے لیے مڑی لیکن ٹھٹک گئی۔ دوبارہ پلٹ کر اس نے ہاتھ میں تہ کی ہوئی روٹی عمو کی طرف بڑھائی۔ اس پر شکر اور مکھن لگا ہوا تھا۔ وہ لجائے ہوئے انداز میں عمو کو روٹی تھما کر واپس ہو جانا چاہتی تھی مگر عمو نے ہولے سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ چوڑیوں کی کھن کھن، کلائی کا نرم لمس... عمو کے سینے میں ترنگ سی دوڑ گئی۔

''مجھے زیادہ انتظار نہ کرایا کرو شبانہ... میں، بس شام کے انتظار میں ہی سارا دن کاٹتا ہوں۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا پھر بولی۔ ''ہاتھ چھوڑ دعمو بھائی... کوئی آجائے گا۔''

عمو کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ہاتھ کو پھر چوم لے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک گرج دار آواز سنائی دی۔ ''اچھا... تو یہاں یہ چکر چل رہے ہیں۔''

شبانہ نے بدک کر اپنا ہاتھ عمو کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔ عمو بھی سکتہ زدہ رہ گیا تھا۔ حویلی کا خطرناک صورت ملازم کالیا اور اس کا ایک ساتھی کھڑکی کے سامنے تھے۔ کالیے نے شبانہ کو چوٹی سے پکڑا اور آگے پیچھے زوردار جھٹکے دیے۔ شبانہ کی اوڑھنی اتر کر دور جا گری۔ کالیے نے زوردار آوازیں دیں۔ ''ماکھے بھائی... شوکے... صوفی۔''

یکایک اردگرد ہلچل نظر آنے لگی۔ چند سیکنڈ کے اندر کھڑکی سے باہر کافی افراد جمع ہو چکے تھے۔ ماکھا بھی پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر کالیا پھنکارا۔ ''یہاں عشق مشوقی کا چکر چل رہا ہے ماکھا بھائی۔ یہ دو چھٹانک کی کڑی خیر سے ہیر بنی ہوئی ہے اور یہ اندر رانجھا کھڑا ہے۔ یہ اس کے لیے چُوریاں لے کر آرہی ہے۔ ہم پچھلے تین دن سے سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے ایک تھپڑ شبانہ کو مارا۔

وہ چھریرے جسم کی تھی، لڑکھڑا کر دیوار سے جا ٹکرائی۔ ماکھا بھی آگ بگولا نظر آنے لگا۔ اس نے کوٹھڑی کا دروازہ کھولا اور دندناتا ہوا اندر آگیا۔ عمو کو گریبان سے پکڑ کر اس نے زوردار جھٹکا دیا اور باہر گھاس پر پھینک دیا۔ چند ہی لمحے میں عمو کا جسم تھپڑوں اور ٹھوکروں کی زد میں آگیا۔ اسے گالیوں سے بھی نوازا جا رہا تھا۔ دوسری طرف شبانہ کی مرمت بھی ہو رہی تھی۔ اس کے چلّانے کی آوازیں عمو کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ ان اذیت ناک لمحوں میں اس نے سوچا، ان کا قصور تو اتنا بڑا نہیں ہے جتنی بڑی انہیں سزا دی جا رہی ہے۔

تھوڑی دیر بعد ماجھاں بھی وہاں آن موجود ہوئی۔ اس کو ساری بات معلوم ہو چکی تھی۔ اس نے بھی شبانہ کو دو تین تھپڑ مارے پھر عمو کو شلوار کے نیفے سے پکڑ کر کھینچتی ہوئی اپنے کمرے میں لے آئی۔ وہ پہلے ہی نشے میں دھت تھی۔ اس کے منہ میں الائچی سپاری پان دبا ہوا تھا۔ ''اچھا تو یارانے پالے جا رہے ہیں یہاں؟'' اس نے عمو کے گال کو چٹکی میں دبایا اور بے دردی سے آگے پیچھے جھلایا۔

عمو کے ہونٹوں سے خون رس رہا تھا۔ نمکین ذائقہ اس کے منہ میں پھیلا ہوا تھا۔ وہ کراہنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکا۔

''کتنی دیر سے یہ عشقیہ فلم چل رہی تھی رانجھا صاحب؟'' اسے گریبان سے دبوچ کر بولی۔

''ایسا کچھ نہیں تھا جی... وہ تو بس ترس کھا کر کسی وقت مجھے روٹی دینے آجاتی تھی۔''

''روٹی نہیں مکھن والی چُوری۔ پھر تو عشق کی بات بجا ہوگا اور وہ تیرے صدقے واری جاتی ہوگی۔ میری واری موت پڑتی تھی تجھے... موت پڑتی تھی؟''

''آپ کو... غلطی لگ رہی ہے جی...''

اس نے عمو کے گریبان کو اندھا دھند جھٹکے دیے اور اسے پھاڑ کر رکھ دیا۔ وہ زہرناک انداز میں پھنکاری۔ ''مجھے غلطی لگ رہی ہے نا... پر اب تو غلطی نہ کرنا۔ جو کچھ کیا ہے، سب کو صاف صاف بتا دینا۔ وہ کتنی واری تیری کوٹھڑی کے اندر آئی تھی؟ اور اس کے علاوہ کیا کیا کرتے رہے ہو تم؟ یہاں سے بھاگ جانے کا پروگرام تو ضرور بہ ضرور بنایا ہوگا تم نے؟ میں پھر کہہ رہی ہوں، جھوٹ بولنے کی غلطی نہ کرنا ورنہ بہت بُرا ہوگا۔''

ماجھاں کا انداز عمو کو بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔ وہ اب اس پر پوری طرح حاوی ہونے کا سوچ رہی تھی۔ لیکن وہ بھی دل میں پوری طرح ٹھان چکا تھا کہ ماجھاں کی کسی من مانی کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے گا۔ زیادہ سے زیادہ وہ اس کی ہڈیاں ہی توڑ ڈالے گی نا۔ اس کو جان سے ہی مار دے گی نا۔ کچھ عرصہ پہلے اس کے اندر پیدا ہونے والی بغاوت اب کچھ قد نکال چکی تھی۔

ماجھاں کا کراہت آمیز وجود ایک ''دھمکی'' کی طرح اس کے سامنے تھا اور وہ اپنا دم گھٹتا محسوس کر رہا تھا۔

ماجھاں سرسراتی آواز میں بولی۔ ''دیکھ منڈیا! اگر تو سچ نہ بتائے گا تو پھر میں اس نمک حرامن سے پوچھوں گی اور وہ جھوٹ نہیں بول سکے گی۔ میرے پوچھنے کا طریقہ ہی ایسا ہو گا۔ میں اس شتونگڑی کو دو تین گھنٹے کے لیے کالیے کے حوالے کر دوں گی اور کالیا ابھی جیل سے چھوٹ کر آیا ہے۔ ڈھائی سال سے اس نے زنانی کی شکل نہیں دیکھی۔''

ایک دم عمو کو بے پناہ کمزوری محسوس ہوئی۔ اسے لگا اس کے اندر کا سارا دم خم مسمار ہو رہا ہے۔ وہ اس پھٹی پرانی اوڑھنی والی، معصوم صورت لڑکی سے محبت کرنے لگا تھا۔ اسے ہرگز ہرگز گوارا نہیں تھا کہ اس کی وجہ سے اس لڑکی پر کوئی آفت آئے۔ وہ ٹوٹ کر رہ گیا۔

شاید زمانہ ساز ماجھاں نے بھی اس کے چہرے کی بدلی ہوئی رنگت دیکھ لی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ اس کے فقرے بڑے کارگر رہے ہیں اور جب وہ ایک بار سمجھ گئی تو پھر عمو کے پاس ہار ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔ اس نے اپنے اندر کی کراہتوں کی طرف سے آنکھیں بند کر کے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا...

☆☆☆


MoB: 0300-2219514,0344-2609828
Tel: 021-34519074
بذریعہ ڈاک
معقول فیس میں ہنرمند بنیں
موبائل سے SMS کرتے وقت اپنا مکمل نام پتہ کورس کا نام ضرور لکھیے
صبح 9 بجے تا شام 5 بجے
ہنر سیکھیے روزگار لیجیے
Registered with CBR
Govt. of Pakistan
اگر آپ مندرجہ ذیل کورسز کے علاوہ کسی بھی فیلڈ میں تجربہ رکھتے ہوں اور اس کا سرٹیفکیٹ آپ کے پاس موجود نہیں ہے سرٹیفکیٹ نہ ہونے کی وجہ سے آپکی ترقی کی راہ میں یا ملازمت میں رکاوٹ ہو رہی ہے۔ ہم آپکا ٹیسٹ لے کر سرٹیفکیٹ جاری کرینگے نیچے دیے ہوئے ایڈریس پر خط لکھ کر تفصیلات منگائیں
ڈینٹل ٹیکنیشن | لیبارٹری ٹیکنیشن | کشیدہ کاری | لیڈیز ٹیلرنگ | حکمت | ڈسپنسر | ایکوپنکچر | نرس میل فی میل | جینٹس ٹیلرنگ | میڈیکل اسسٹنٹ | ای سی جی ٹیکنیشن | U.P.S ٹیکنیشن
علاج نبوی | ڈریس ڈیزائنر | میکنو تھراپی | مڈوائفری | معالج حیوانات | بیوٹی سلمنگ | فیملی پلاننگ | کیمیکل | عینک سازی | شمسی توانائی | [illegible] | بزنس مینجمنٹ
یوگا | انٹیریر ڈیکوریشن | [illegible] میک اپ | ایریبک | بیوٹی پارلر | ائیر ٹکٹنگ | مہر سازی | کوکنگ بیکنگ | [illegible] | سروئیر | کمپیوٹر | کمپیوٹر ہارڈویئر
میٹل ورکر | ابتدائی طبی امداد | ہوٹل مینجمنٹ | [illegible] سسٹم | امپورٹ ایکسپورٹ | جینٹس بیوٹی سیلون | آٹو الیکٹریشن | شارٹ ہینڈ | [illegible] | ڈیجیٹل کیمرہ مرمت | جنریٹر میکینک | اردو عربی خطاطی
فارمیسی | ہومیو پیتھک کورس | [illegible] ٹیکنیشن | آیورویدک علاج | [illegible] مشین ٹیکنیشن | انگلش لینگویج | ٹیکسٹائل ڈیزائننگ | فلاور میکنگ | ویلڈنگ | الٹرا ساؤنڈ | فن مصوری | میجک
[illegible] ٹیکنیشن | فزیوتھراپی | [illegible] پلمبنگ | آٹو سروسنگ | کچن کیبنٹ بلڈنگ | جیولری میکنگ | بلڈنگ سپروائزر | فش فارمنگ | کورین لینگویج | پائپ فٹنگ سپروائزر | موبائل فون ریپئرنگ | فائر فائٹنگ
باڈی بلڈنگ | [illegible] کا ہنر | اسٹیل فکسنگ | جدید مرغبانی | باغبانی | سیٹ ڈیزائنر | نیٹ ورکنگ | مونٹیسوری ٹیچنگ | موٹر سائیکل ریپئرنگ | چائلڈ کیئر کورس | ٹیلی کمیونیکیشن | [illegible]
دی انسٹی ٹیوٹ
پوسٹ بکس نمبر 3349 ملیر سعود آباد کراچی 75080

...اور اب عمو کی حیثیت ماجھاں کے زر خرید غلام کی سی تھی۔ وہ جب چاہتی، اسے اپنی خلوت میں بلا لیتی۔ بعض دفعہ نشے میں دھت ہو کر اس سے توہین آمیز سلوک بھی کرتی۔ اس کے علاوہ بھی اسے ماجھاں کی خدمات انجام دینا پڑتیں۔ وہ اس کا حقہ تازہ کرتا، اس کو پنکھا جھلتا، اس کے پاؤں دباتا۔ جب وہ قدرے مہربان ہوتی تو اسے اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا بھی کھلاتی لیکن جب موڈ آف ہوتا تو ذرا ذرا سی بات پر اسے ڈانٹتی اور گالیاں دیتی۔ اب عمو کو اچھا کھانا اور اچھا لباس مل رہا تھا۔ بس ماجھاں کی منحوس قربت کے سوا اسے کوئی تکلیف نہیں تھی اور یہ تکلیف اسے اکثر تنہائی میں خون کے آنسو رلاتی تھی۔ وہ یہ سب کچھ شبانہ کے لیے برداشت کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جہاں اس نے سرکشی دکھائی، شبانہ پر عرصۂ حیات تنگ ہونا شروع ہو جائے گا۔ شبانہ سے ملاقات کا موقع اسے کم ہی ملتا تھا۔ وہ بس دور ہی سے ایک دوسرے کو دیکھ لیتے تھے۔ شبانہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کی خاطر عمو کس طرح کے امتحان سے گزر رہا ہے۔

ایک شام کسی زمین کی ملکیت پر ایک زوردار جھگڑا ہوا۔ ماجھاں کا ایک کارندہ صوفی شدید زخمی ہو کر گاؤں آیا۔ اس کے ساتھ ہی ماجھاں اور اس کے درجنوں ساتھیوں نے گھوڑوں پر کاٹھیاں ڈالیں اور اسلحہ لہراتے ہوئے گاؤں سے نکل گئے۔ حویلی میں بس اکا دکا افراد ہی تھے۔ ہیڈ ملازمہ شہناز عرف ناجو بیمار تھی اور چھت پر جا کر لیٹی ہوئی تھی۔ شبانہ اور عمو کو بات کرنے کا موقع مل گیا۔ ان کی یہ ملاقات قریباً تین مہینے بعد ہوئی تھی۔ یہ بھوسے والی کوٹھڑی تھی۔ یہاں مکمل تاریکی تھی۔ شبانہ یہاں بھوسہ لینے آئی تھی۔ عمو نے اسے دیکھ لیا تھا اور ہمت کر کے وہ بھی کوٹھڑی میں چلا گیا تھا۔

''شبانہ۔'' عمو نے اسے ہولے سے پکارا۔

شبانہ نے اسے پہچان لیا اور پھر وحشی ہرنی کی طرح آدھ کھلے دروازے سے باہر دیکھا۔

''گھبراؤ نہیں شبانہ! یہاں کوئی نہیں۔ شہناز اور زینب بھی اوپر چھت پر ہیں۔''

عمو کے اس فقرے نے شبانہ کی گھبراہٹ ذرا کم کی۔ وہ دوپٹا منہ پر رکھ کر سسکنے لگی۔

عمو نے دل گیر لہجے میں کہا۔ ''شبانہ! تم نے تو یہاں سے چلے جانا تھا۔ تم گئی کیوں نہیں ہو؟''

''مالکن جانے دے تب نا۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''وہ جان گئی ہے کہ میں جب تک یہاں ہوں، تم بھی اس کا کہا ماننے پر مجبور ہو۔ وہ اب مجھے بالکل نہیں جانے دے گی۔''

''اور تمہاری شادی؟''

''اللہ جانے۔'' شبانہ مختصر جواب دے کر خاموش ہو گئی۔

''شبانہ! تم یہاں سے چلی جاؤ۔ یہاں تمہاری عزت ہر وقت خطرے میں ہے۔ یہاں شرابی ڈشکرے ہیں۔ کوئی کسی بھی وقت تم پر ہتھ ڈال سکتا ہے۔''

''یہ بڑی بُری عورت ہے عمو... بھائی۔ آسے پاسے کے سارے پنڈوں میں اس کے بندے ہیں۔ اس کی مرضی کے بغیر چڑی بھی پر نہیں مار سکتی۔ تمہیں شاید پتا نہ ہو، پچھلے مہینے دینے مسلی کے پتر سلیم نے مالکن سے اجازت لیے بغیر یہاں سے جانے کی کوشش کی تھی۔ مالکن نے اسے پکڑ کر پھر پلس کے حوالے کر دیا ہے۔ پچھلی بار اس پر چوری کا الزام تھا، اس بار ایک کڑی سے زبردستی کا الزام لگا ہے۔ پتا نہیں کیا ہوتا ہے اس وچارے کے ساتھ۔''

''پر اس طرح کب تک چلے گا شبانہ؟ مجھے ہر وقت تمہارے بارے میں ڈر لگتا رہتا ہے۔ میں تمہارے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔''

''میرے بارے میں نہ سوچا کرو۔'' وہ عجیب لہجے میں بولی۔

''کیوں؟''

''بس نہ سوچا کرو... تمہیں پتا ہی ہے۔''

عمو نے گہری سانس لی۔ آدھ کھلے دروازے میں سے خالی تاریک برآمدہ دور تک دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بولا۔ ''شبانہ! سچ بتاؤ، کیا تم اس لڑکے سے شادی کرنا چاہتی ہو؟''

''میں وہی کروں گی جو میرے وڈے کہیں گے۔'' وہ اداس لہجے میں بولی۔

تاریکی اور تنہائی عمو کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔ اس نے شبانہ کا نرم ہاتھ ہولے سے تھام لیا اور بولا۔ ''ایک بات بالکل ٹھیک ٹھیک بتانا شبانہ... میں تو ہر وقت تمہارے بارے میں سوچتا رہتا ہوں، کیا کبھی تم بھی میرے بارے میں سوچتی ہو؟''

''کبھی کبھی۔'' وہ ذرا شرما کر لیکن اداس لہجے میں بولی۔

''کیا سوچتی ہو؟''

''وہی کھڑکی والی ساری باتیں یاد آتی ہیں جب میں تمہیں کھانے کی چیزیں دینے آتی تھی۔'' اس نے کہا اور ہاتھ چھڑانے کی ہلکی سی کوشش کی۔

عمو کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ بولا۔ ''کھڑکی والی ساری باتوں میں ایک خاص بات بھی تھی۔ تمہیں یاد ہے؟''

''کک... کیا؟'' وہ ذرا چونک کر بولی۔

''مم... میں نے... تمہارا ہتھ چوما تھا۔'' عمو کی آواز میں لرزش تھی۔

''اچھا... مجھے جانے دو۔'' وہ جلدی سے بولی اور ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

''ایک بار اور ایسا کرنے دو شبانہ۔'' عمو نے التجا کی۔

''عمو بھائی! ایسی باتیں نہ کرو مجھ سے۔'' وہ بدک کر بولی اور اپنا ہاتھ چھڑا لیا... پھر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ عمو اپنی جگہ ہکا بکا اور خجل کھڑا رہ گیا۔ اس پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ وہیں تاریکی میں پرالی کے گٹھوں پر بیٹھ گیا۔ اس کا دل غم اور ندامت سے بھر گیا تھا۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دے لیا۔ آتشیں آنسو اس کی آنکھوں سے رسنے لگے۔ پھر ان کا بہاؤ تیز ہوتا گیا۔ اس کے گھٹنے آنسوؤں سے تر ہو گئے۔

کچھ دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ حویلی کے رہے سہے مرد ملازم بھی گھوڑوں پر سوار ہو کر اور کلہاڑیاں وغیرہ لہراتے ہوئے حویلی سے نکل گئے ہیں۔ شاید پنڈ سے باہر کہیں ہونے والی لڑائی شدت اختیار کر گئی تھی۔ اب حویلی میں بس چند پہرے دار اور رکھوالی کے کتے تھے۔

آدھ پون گھنٹے بعد شبانہ پھر بھوسے والی کوٹھڑی کے دروازے پر نظر آئی۔ وہ کچھ دیر دہلیز پر کھڑی عمو کو دیکھتی رہی، پھر اندر آ گئی۔ اس کی چوڑیاں عمو کے کان کے بالکل قریب چھن چھنائیں۔ اس کی نرم گرفت عمو نے اپنے پسینے سے بھیگے ہوئے بازو پر محسوس کی۔ وہ سرگوشی میں بولی۔ ''اب اٹھ جاؤ یہاں سے۔ وہ لوگ واپس آنے ہی والے ہوں گے۔ تم ابھی ڈیرے سے دودھ بھی لے کر نہیں آئے... چلو اٹھو...''

عمو اسی طرح بیٹھا رہا۔ آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

اس نے ذرا زور لگا کر اسے اٹھانا چاہا اور بولی۔ ''دیکھو ایسا مت کرو عمو... بھائی! نہیں تو میں بھی رونا شروع کر دوں گی...''

''تم جاؤ، میں آ جاتا ہوں۔'' عمو نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

''غصے ہو گئے ہو نا؟''

''ہاں... لیکن اب کبھی نہیں ہوں گا۔ تم سے پکّا وعدہ کرتا ہوں۔'' عمو کی آواز آتشیں آنسوؤں سے بوجھل تھی۔

''اس کا مطلب ہے، بہت زیادہ غصے میں ہو۔''

عمو چپ رہا۔ وہ بھی چپ رہی۔ ایک سنسناتی خاموشی کوٹھڑی کی تاریکی میں لہریں لے رہی تھی۔ ''...اچھا... یہ لو...'' اچانک اس نے اپنے نرم ہاتھ کی پشت عمو کے ہونٹوں سے لگا دی۔

یکا یک عمو کی رگوں میں جوش آمیز محبت کے بہاؤ نے دھوم مچا دی۔ شبانہ کا الٹا ہاتھ عمو کے ہونٹوں پر دھرا تھا۔ اس نے چاہت بھری وارفتگی سے اس ہاتھ کو چوما... پھر بازو کو... پھر اس نے اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔ اس نے معمولی گریز دکھانے کے سوا اور کچھ نہیں کیا... اس کے گلے سے لگ گئی۔ عمو کے رخساروں پر تازہ آنسو بہنے لگے۔ ''مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا شبو! میں تجھ سے پیار کرنے لگا ہوں۔ بہت زیادہ... بہت زیادہ۔'' وہ چومتا چلا گیا، اس کے بالوں کو، پیشانی کو، رخساروں کو۔

کوئی موم کی زنجیر تھی جو پگھل گئی... کوئی ریت کی دیوار تھی جو بہہ گئی۔ وہ گم گشتہ آواز میں بولی۔ ''عمو... تم یہاں سے چلے جاؤ... کسی طرح نکل جاؤ یہاں سے۔ یہ بہت بُرے لوگ ہیں۔''

''میں اکیلا نہیں، تم بھی میرے ساتھ جاؤ گی۔ ہم دونوں نکلیں گے۔''

''لیکن کیسے عمو؟ تم تو... تم تو لڑکے ہو۔ بھاگ دوڑ کر جان بچا سکتے ہو... میں تمہارے ساتھ ہوں گی تو تم جلدی پکڑے جاؤ گے۔''

''نہیں شبو! جائیں گے تو دونوں، نہیں تو دونوں یہیں رہیں گے۔'' اس نے چند لمحے توقف کیا پھر بولا۔ ''میں تو ایک اور بات کہتا ہوں شبو۔ یہ بڑا چنگا ویلا ہے۔ وہ سور دی بچی حویلی سے باہر گئی ہوئی ہے۔ بہت سے بندے بھی باہر ہیں۔ کیوں نہ ابھی یہاں سے نکل چلیں؟''

وہ لرز سی گئی۔ اس سے علیحدہ ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی مگر کوٹھڑی کی گہری تاریکی میں وہ ایک دوجے کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ بس محسوس کر سکتے تھے۔ ان کی سانسیں تیزی سے چل رہی تھیں۔ ان کی دھڑکنیں کانوں میں گونج رہی تھیں۔ وہ نوجوان اور ناتجربہ کار تھے لیکن ان کا جذبہ ان کی طاقت بن گیا تھا۔ ان کے خون کی حرارت ان کی راہنمائی کر رہی تھی... یہ عجیب انقلاب تھا۔ اب سے صرف دس پندرہ منٹ پہلے وہ کچھ اور تھے، اب کچھ اور بن گئے تھے۔ پندرہ منٹ پہلے وہ اپنی بے بسی پر اشک بہا رہے تھے، اپنی لاچاریوں کو ناقابلِ شکست سمجھ رہے تھے۔ اب وہ یہاں سے بھاگ نکلنے کے لیے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ رہے تھے۔ ایک ہی جست میں انہوں نے اظہار سے اقرار تک اور اقرار سے منزل کی جستجو تک بہت سے مرحلے طے کر لیے تھے۔

اور پھر وہ نوخیز جوڑا محبت کا ہاتھ تھام کر مالکن ماجھاں کی حویلی سے بھاگنے کو تیار ہو گیا۔ شبانہ نے ٹوپی والا دیسی برقع پہن لیا۔ عمو نے سر پر ایک صافہ سا ڈال لیا۔ دونوں حویلی کے پچھلے احاطے میں پہنچے۔ یہاں رکھوالی کا ایک بڑا کتا چکرا رہا تھا۔ عمو اور شبانہ کو دیکھ کر اس نے اپنے کان کھڑے کیے اور دُم کو تیزی سے گردش دینے لگا۔ عمو نے اسے پچکارا اور اس کے سامنے کچے گوشت کا ایک چھوٹا ٹکڑا پھینکا۔ غیر متوقع طور پر خطرناک کتے نے ان دونوں کے ساتھ اپنا زوید جارحانہ نہیں رکھا۔ وہ چھوٹے عقبی دروازے کے پاس پہنچ گئے۔ یہاں پہرے دار سالار خاں موجود تھا۔ وہ اس کے اِدھر اُدھر ہٹنے کا انتظار کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد سالار خاں نے اپنا ازار بند کھولا اور ایک درخت کے تنے کے پاس بیٹھ گیا۔ یہ سنہری موقع تھا، وہ دونوں نکلے اور تیزی سے تاریکی میں اوجھل ہو گئے۔ اب وہ گاؤں کی گلیوں میں تھے۔ اِکا دُکا لوگوں سے ان کا سامنا ہوا مگر کوئی بھی ان کی طرف سے شک میں نہیں پڑا۔ جلد ہی وہ گاؤں سے باہر تھے۔ جوار کے اونچے کھیتوں میں چلتے ہوئے وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔

''ہائے میں مرگئی۔'' شبانہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور وہ ٹھٹک کر عمو کے بازو سے لگ گئی۔

ان کے عین سامنے سے گھوڑے دوڑتے ہوئے آرہے تھے۔ یہ ماجھاں اور اس کے ساتھی تھے۔ لگتا تھا کہ وہ کامیاب لوٹے ہیں۔ وہ اونچی آواز میں باتیں کر رہے تھے اور گالیاں بک رہے تھے۔ عمو اور شبانہ سہمے ہوئے خرگوشوں کی طرح ایک طرف جھاڑیوں میں دبک گئے۔ تنومند ماجھاں نے مردوں کی طرح ڈھاٹا باندھ رکھا تھا اور اس کے کندھے پر رائفل تھی۔ یہ لوگ ان کے قریب سے گزرے اور گاؤں کی طرف چلے گئے۔

عمو نے سرگوشی میں کہا۔ ''شبّو! اب یہ لوگ ہمارے پیچھے آنے میں زیادہ دیر نہیں کریں گے۔ ہمیں جلدی کرنی پڑے گی۔''

شبّو نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اونچے کھیتوں کے درمیان پگڈنڈیوں اور دھول سے اٹے ہوئے کچے راستوں پر تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ ان کی سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں اور دھڑکنیں کانوں میں گونج رہی تھیں۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر ان کے اندیشے درست ثابت ہو گئے۔ انہیں دور اپنے عقب میں لالٹینوں کی متحرک روشنیاں دکھائی دیں۔ یہ روشنیاں گاؤں کی جانب سے بتدریج ان کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

شبانہ نے اب اپنا دیسی برقع اتار پھینکا تھا۔ تیز ہوا میں اس کے بال اڑ رہے تھے۔ وہ ہانپی ہوئی آواز میں بولی۔ ''عمو! اب مجھ سے نہیں چلا جاتا۔ میری ٹانگوں میں جان نہیں رہی۔'' وہ بے دم سی ہو کر ایک درخت کے گرے ہوئے تنے پر بیٹھ گئی۔

''نہیں شبّو! ہمیں ہمت کرنی پڑے گی۔ دریا زیادہ دور نہیں ہے۔ کسی طرح ہم پار کر گئے تو پھر پکڑے نہیں جائیں گے۔''

شبّو ہمت کر کے دوبارہ اٹھی۔ اس کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ پاؤں اور پنڈلیوں میں کانٹے چبھے ہوئے تھے۔ عمو کا حال بھی کچھ مختلف نہیں تھا۔ اگلے بیس تیس منٹ میں انہیں اندازہ ہو گیا کہ وہ دریا تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ گھڑسوار تیزی سے ان کے قریب پہنچ رہے تھے۔ وہ پھیل کر آگے بڑھ رہے تھے۔ اب عمو اور شبانہ کو پناہ کی تلاش ہوئی۔ جلد ہی انہیں ایک چھوٹا سا ڈھارا نظر آیا۔ اس کی چھت نہیں تھی اور دیواریں بھی ٹوٹی پھوٹی تھیں۔ اس میں بہت ساری پرانی پرالی پڑی تھی۔ وہ اس پرالی کے اندر گھس گئے اور اپنے اوپر بھی بہت سی پرالی ڈال لی۔ عام حالات میں وہ اس سڑاند ماری پھپھوندی زدہ پرالی میں گھسنے کی ہمت بھی نہ کرتے۔ یہاں کیڑے مکوڑے حتیٰ کہ سانپ بھی ہو سکتے تھے۔ مگر اب بیرونی خطرے نے انہیں پرالی کے اندرونی خطروں سے بے نیاز کر دیا تھا۔

یہ جگہ ان کے لیے ایک اچھی پناہ گاہ ثابت ہوئی... ان کے پیچھے آنے والے بس پانچ دس منٹ میں ہی ان کے سر پر پہنچ گئے تھے۔ ان کے گھوڑوں کی آوازیں، ان کی باتیں سب کچھ عمو اور شبانہ کے کانوں تک پہنچیں۔ انہوں نے ماجھاں کی للکارتی ہوئی آواز بھی صاف پہچانی۔ یہ لوگ ان کے قریب سے ہو کر تیزی سے دریا کی طرف بڑھ گئے... چوڑے پاٹ والا دریائے چناب وہاں سے بس دو تین فرلانگ کی دوری پر ہی تھا۔ یقیناً ماجھاں اور اس کے ساتھیوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ وہ دونوں دریا کی طرف گئے ہیں۔ راستے میں ملنے والے... راہگیروں اور کسانوں نے انہیں اس بارے میں اشارہ دیا ہوگا۔

قریباً ایک گھنٹا اسی طرح دل کی دھڑکنیں گنتے ہوئے گزر گیا۔ تب عمو اور شبانہ کو اندازہ ہوا کہ وہ لوگ دریا سے واپس آرہے ہیں۔ اب ان کا رخ گاؤں کی طرف تھا۔ لیکن اگر عمو اور شبانہ یہ سمجھ لیتے کہ یہ لوگ واپس گاؤں پہنچ جائیں گے اور پھر ٹھنڈی ہوا میں لمبی تان کر سو جائیں گے تو یہ ان کی بہت بڑی غلطی ہوتی۔ عمو جانتا تھا کہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ رات

بھر دریا کے آس پاس اور قریبی بستیوں میں ان کی تلاش جاری رہے گی۔

رات آہستہ آہستہ آگے کو سرکتی رہی۔ وہ پسینے میں شرابور پھپھوندی زدہ پرالی میں لیٹے رہے۔ آثار گواہی دے رہے تھے کہ وہ لوگ ان کے آس پاس ہی کہیں موجود ہیں۔ کبھی کسی گھوڑے کی ٹاپ سنائی دے جاتی، کبھی کوئی بلند آواز تیز ہوا کے دوش پر تیرکران تک پہنچتی۔

وہ اسی طرح ایک دوسرے کے پہلو میں دراز رہے۔ تاہم تازہ ہوا میں سانس لینے کے لیے انہوں نے پرالی میں تھوڑا سا خلا پیدا کرلیا۔ خطرے کا احساس قدرے کم ہونے لگا تو انہوں نے ایک دوسرے کے جسم کا لمس محسوس کیا۔ شبانہ ہولے سے ایک طرف کھسک گئی۔ لیکن وہ کتنا بھی کھسکتی، وہ لیٹے تو پہلو بہ پہلو تھے۔ عمو کے بازو نے شبانہ کے سر کے نیچے تکیہ بنا رکھا تھا۔ عمو کو اندازہ ہوا کہ وہ رو رہی ہے۔ اس کی آنکھوں سے خاموش آنسو بہہ رہے تھے۔ عمو نے اس کے آنسو پونچھے اور اسے اپنے قریب کرتے ہوئے بولا۔

''پریشان نہ ہو شبو! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہاں دریا میں بہت سی کشتیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔ ہم دریا کے ساتھ ساتھ چلتے جائیں گے اور پھر کہیں آگے جاکر کسی کشتی والے کو پندرہ بیس روپے دیں گے اور دریا پار کر جائیں گے۔ وہاں پکی سڑک ہے اور بسیں چلتی ہیں۔ ہم ایک بار بس پر بیٹھ گئے تو پھر ان کے ہتھ نہیں آئیں گے۔''

وہ آزردہ آواز میں منمنائی۔ ''یہاں سے نکلنا مشکل ہے عمو۔ لیکن اگر نکل بھی گئے تو جائیں گے کہاں؟''

عمو نے ایک گہری سانس لی اور اس کی آنکھوں میں اپنی چاندی بالوں والی ماں کا مقدس چہرہ گھوم گیا۔ وہ بولا۔ ''شبو! میں اور تم ایک بار امی تک پہنچ گئے تو پھر کوئی ڈر نہیں رہے گا۔ میری امی کے پاس ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے۔ وہ یہ حل بھی نکال لے گی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ہم دونوں کو لے کر کسی دور کے رشتے دار کے پاس چلی جائے یا پھر ملتان لے جائے۔ وہاں امی کی ایک بڑی پکی سہیلی رہتی ہے۔ بچپن سے اس کی بہن بنی ہوئی ہے۔''

''لگتا ہے اپنی امی پر بڑا بھروسا ہے تمہیں؟'' شبانہ نے کہا۔

''ہاں شبو! بڑا بھروسا ہے۔'' وہ اس کے سوا کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

اس کے پاس وہ الفاظ ہی نہیں تھے کہ وہ اپنی ماں کے حوالے سے اپنی کیفیت کا اظہار کرسکتا۔ وہ اس کے نزدیک دنیا کی سب سے زیادہ محبت کرنے والی، سب سے بڑھ کر مہربان اور چارہ گر عورت تھی... اور اگر وہ ایسا سوچتا تھا تو کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ عمو کو اپنی سولہ سترہ سالہ زندگی کا ایک ایک دن، ایک ایک لمحہ اپنی ماں کی محبت میں بھیگا ہوا نظر آتا تھا۔ اپنی ماں سے بچھڑنے کے بعد وہ ہر پل اس کی یاد میں تڑپتا رہا تھا۔ اب بھی وہ اس تک پہنچنے کے لیے بے تاب تھا۔ جلد سے جلد اس کی گود میں سر رکھ کر آنکھیں بند کرلینا چاہتا تھا۔

وہ اسی طرح پرالی کے اندر دم سادھے لیٹے رہے... سہمے ہوئے خرگوشوں کی طرح... نصف شب کے قریب انہیں بوگیر کتوں کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ لیکن شکر کا مقام تھا کہ یہ آوازیں شمال کی طرف سے آرہی تھیں اور ہوا جنوب سے شمال کی طرف چل رہی تھی۔ عمو کو پتا تھا کہ اگر ہوا الٹی سمت میں چل رہی ہو تو بوگیر کتے اپنے شکار کی بُو پانے میں ناکام رہتے ہیں۔ آدھ پونے گھنٹے بعد کتوں کی آوازیں معدوم ہوگئیں وہ کسی اور طرف چلے گئے۔

عمو اور شبانہ کے جسموں پر چھوٹے موٹے کیڑے رینگ رہے تھے۔ کسی وقت انہیں اپنے آس پاس چوہے یا چھپکلی وغیرہ کا احساس بھی ہوتا تھا مگر وہ یہ سب کچھ برداشت کرنے پر مجبور تھے۔

عمو نے شبانہ کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ صبح روشنی ہونے سے پہلے پہلے ہم یہاں سے نکل کر دریا کی طرف چل پڑیں۔ اب ہم یہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتے۔''

''وہ کیوں؟''

''اس لیے کہ ایک تو دن کے وقت یہاں اتنی گرمی ہو جائے گی کہ ہمارے کباب بن جائیں گے... دوسرے دن کے وقت یہ لوگ پکی زمین سے ہمارا کھرا اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ وہ ہمارے پیروں کے نشان ڈھونڈتے ہوئے اس پرالی تک پہنچ سکتے ہیں۔''

عمو کی بات شبانہ کی سمجھ میں آگئی لیکن وہ ڈری ہوئی بھی تھی۔

جب چڑیوں کی آوازیں آنی شروع ہوئیں تو وہ دونوں اس پرانی پرالی سے نکلے اور جھاڑیوں کے اندر چلتے ہوئے دریا کی طرف بڑھنے لگے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے انہیں بتا رہے تھے کہ دریا زیادہ دور نہیں ہے۔ پھر انہیں پانی کی جھلک دکھائی دینے لگے۔ وہ دریا کے کنارے چلتے چلے گئے اور ڈیڑھ دو میل آگے نکل گئے۔ یہاں انہیں ایک پرانی کشتی نظر آئی۔ اس میں چپو بھی پڑے تھے... اردگرد کوئی دکھائی نہیں



دے رہا تھا۔ عمو نے بڑی احتیاط سے کشتی کا رسّا کھولا۔ پھر وہ دونوں اس میں بیٹھ گئے اور عمو اسے دوسرے کنارے کی طرف کھینے لگا۔ اچانک کنارے کے سرکنڈوں میں ایک ٹارچ کی روشنی چمکی۔ کسی نے پکار کر کہا۔ ''اوئے کون ہے؟''

عمو کی رگوں میں خون اچھل کر رہ گیا۔ جواب دینے کے بجائے اس نے تیزی سے چپو چلانے شروع کردیے۔

دیکھتے ہی دیکھتے کنارے پر کئی افراد کے ہیولے نظر آنے لگے۔ تب تک عمو اور شبانہ دریا کے وسط تک پہنچ چکے تھے اور تیزی سے دوسرے کنارے کی طرف بڑھ رہے تھے...

''رک جاؤ... نہیں تو گولی ماردیں گے۔'' ایک پکارتی ہوئی آواز آئی۔

اب شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ یہ ماجھاں ہی کے لوگ تھے۔ وہ کنارے پر موجود تھے اور انہوں نے گھات لگا رکھی تھی۔ یہ کشتی بھی انہوں نے غالباً پھندے کے طور پر ہی یہاں باندھی ہوئی تھی۔

''ہائے اللہ! اب کیا ہوگا؟'' شبانہ نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

عمو کیا کہتا۔ وہ تو خود سرتاپا پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اور تیزی سے چپو چلانا شروع کردیتا۔ کنارہ زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ کوشش کرتے تو اس تک پہنچ سکتے تھے۔ پھر فائرنگ کی آواز گونجی۔ چند لمحے کے لیے تو عمو اور شبانہ کو لگا کہ آخری وقت آگیا ہے تاہم یہ ہوائی فائرنگ تھی۔ انہوں نے فضا میں بلند ہوتی چنگاریاں صاف دیکھیں اور تب ان پر ایک اور انکشاف ہوا... دریا کے دوسرے کنارے پر بھی ماجھاں کے کارندے موجود تھے۔ یہ ہوائی فائرنگ انہیں ہوشیار کرنے کے لیے کی گئی تھی۔

چند ہی سیکنڈ بعد دوسرے کنارے پر بھی ایک دو ٹارچیں چمکنے لگیں اور ہیولے دکھائی دینے لگے...

شبانہ روتے ہوئے بولی۔ ''میں نے تم سے کہا تھا نا عمو! یہ لوگ ہمیں نکلنے نہیں دیں گے۔ اب... پتا نہیں کیا ہوگا ہمارے ساتھ۔''

عمو کے ہاتھ پاؤں سے بھی جیسے جان نکل چکی تھی۔ اس نے بے دم سا ہو کر چپو کشتی میں گرادیے اور خالی نظروں سے شبانہ کو دیکھنے لگا۔ ان کے سر پر نیم تاریک آسمان تھا اور صبح کے چند آخری تارے چمک رہے تھے۔ ان دونوں کے ذہنوں میں ایک جیسا خیال ہی کوندرہا تھا۔ کیا وہ خود کو چناب کے اس رواں پانی میں ڈبو کر اپنی زندگیوں کا خاتمہ کرلیں... یہ چناب شاید ہمیشہ سے ایسا ہی مزاج رکھتا تھا۔ یہ ''محبت'' کو ہوا دیتا تھا، اس کی پرورش کرتا تھا لیکن پھر محبت کرنے والوں کو نگل بھی لیتا تھا۔ کچے گھڑے ٹوٹ جاتے تھے اور لہریں سوہنیوں کو اپنے اندر چھپا لیتی تھیں۔

لیکن یہ کہانی نہیں تھی۔ یہ ایک زندہ حقیقت تھی۔ وہ نیالے رنگ کی ٹوٹی پھوٹی کشتی میں سکڑے سمٹے بیٹھے تھے... اپنی جان دینے کا سوچ رہے تھے... اور حقیقت کی دنیا میں جان دینا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ سوچتے رہے اور کشتی دھیرے دھیرے بہتی رہی۔ بہنے کے ساتھ وہ بتدریج کنارے کی طرف بھی کھسک رہی تھی۔ کنارہ... جہاں کوئی ایک درجن مسلح افراد ان دونوں کے استقبال کے لیے تیار تھے۔ کنارے تک رسائی پانا، خوشی کا استعارہ ہے مگر آج اس استعارے نے اپنا مفہوم بدل لیا تھا۔

☆☆☆

اور اب وہ دونوں پھر سے حویلی میں تھے۔ بہت بڑے چہرے اور سرخ آنکھوں والی ماجھاں سرتاپا قہر نظر آرہی تھی۔ اس نے پہلے تو شبانہ کو بُری طرح مارا اور اس کے ناک منہ سے خون چھڑا دیا پھر وہ عمو پر پل پڑی۔ اس کے جسم میں مردوں سے بڑھ کر طاقت تھی۔ اس نے عمو پر تھپڑوں اور ٹھڈوں کی بارش کردی۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور گاہے بگاہے وہ اسے پستول کا دستہ بھی مار رہی تھی۔ وہ اسے بالوں سے گھسیٹ کر صحن کے درمیان لے آئی اور غلیظ گالی دے کر بولی... ''چل مرغا بن... مرغا بن یہاں۔''

عمو کے اندر بغاوت جنم لے رہی تھی۔ گاہے بگاہے اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس خبیث عورت پر جھپٹ پڑے۔ اسے دھکا دے کر دور گرائے اور نتائج سے بے پروا ہو کر یہاں سے بھاگ نکلے... لیکن ہر بار اس کے سامنے شبانہ کا چہرہ آجاتا تھا۔ وہ اسے یہاں چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا... وہ ابھی ہر ستم برداشت کرنے پر مجبور تھا۔

''سنا نہیں بچے! مالکن کیا کہہ رہی ہے۔'' ماکھے نے کہا پھر اس کا سر پکڑ کر زبردستی اس کے گھٹنوں میں گھسا دیا اور بازو ٹانگوں کے نیچے سے گزارے۔ وہ سخت دھوپ میں مرغا بنا کھڑا رہا۔ اسے مزید اذیت پہنچانے کے لیے اس کی کمر پر چند کچی اینٹیں رکھ دی گئیں۔ اس کی ناک سے پسینے اور خون کے قطرے ایک ساتھ گر رہے تھے اور یہ سب کچھ شبانہ کے سامنے ہو رہا تھا۔

ماجھاں نے گاؤں کے حجام کو بلانے کا حکم دیا۔ تھوڑی

ہی دیر بعد روتی سسکتی زخمی شبانہ کا سر استرے سے مونڈ دیا گیا اور پھر اس کی بھویں بھی صاف کر دی گئیں۔

بے بسی کے آنسو تواتر کے ساتھ عمو کی آنکھوں سے گرنے لگے۔ کتنی تیزی سے تبدیل ہوا تھا سب کچھ۔ تین چار گھنٹے پہلے تک وہ اپنی ماں سے ملنے کے لیے اور اس کی گود میں سر رکھنے کے لیے پُرامید تھا اور اب گاؤں والوں کے سامنے ایک تماشا بنا ہوا تھا۔ جب کمر پر رکھا ہوا بوجھ اس کی برداشت سے باہر ہو گیا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے جسم سے پسینا باقاعدہ دھاروں کی صورت بہہ رہا تھا۔ خون کے دباؤ سے چہرہ بگڑ گیا تھا۔ ماجھاں ایک بار پھر اس پر پل پڑی اور ایک سوٹے سے اس کی کھال ادھیڑ کر رکھ دی۔ جب وہ نیم جان ہو گیا تو اسے اٹھا کر کتوں والی کوٹھڑی میں پھینک دیا گیا۔

وہ سارا دن اور رات گئے تک درد سے سسکتا اور کراہتا رہا۔ کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے پھر اسے بھی نیند آگئی۔ اگلے روز شدید گرمی کی وجہ سے آنکھ کھلی تو ذہن میں پہلا خیال شبانہ کا ہی آیا۔ پتا نہیں کہ اس کے ساتھ کیا بیتی تھی؟ وہ کس حال میں تھی؟ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کی وجہ وہ خود ہی تھا۔ وہی اسے لے کر یہاں سے نکلا تھا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت اسے پھر ماجھاں کی منحوس شکل نظر آئی۔ اسے شدید اذیت اور ذلت سے دوچار کرنے کے باوجود ابھی اس کا غصہ پوری طرح اترا نہیں تھا۔ وہ نشے میں دھت تھی اور اس کی آنکھوں میں خباثت کا دریا بہہ رہا تھا۔ جب وہ کچھ بدتر کرنے کے موڈ میں ہوتی تھی تو اس کی ناک کچھ اور بھی چپٹی اور سیاہ دکھائی دینے لگتی تھی۔ اب بھی کچھ یہی کیفیت تھی۔

وہ پھنکاری۔ ”تجھے کہا تھا نا کہ یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔ بہت بُری طرح پیش آؤں گی... اور ایک وار نہیں دس وار کہا تھا۔ بول کہا تھا نا؟“ اس نے جوتے کی نوک سے عمو کا جھکا ہوا چہرہ اوپر اٹھانے کی کوشش کی۔

عمو کچھ نہیں بولا۔

”حرامزادے! اب منہ میں گھنگنیاں کیوں ڈال لی ہیں؟ اس کمینی کے لیے سب کچھ کیا ہے نا تو نے۔ اسی کتی کے عشق کا بخار چڑھا ہوا تھا نا تجھے؟“

عمو نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز گلے میں اٹک کر رہ گئی۔ منہ بالکل خشک ہو چکا تھا۔

ماجھاں نے اپنی ویل کی سفید قمیص سامنے سے اوپر اٹھائی اور اپنے سیاہ تہ بند کی ڈب میں سے پستول نکال لیا۔ شراب ایک زہر کی طرح اس کے آتشیں دماغ کو چڑھی ہوئی تھی۔ ”اوئے! کسی گونگے کے تخم... بولتا کیوں نہیں؟ بولتا ہے یا پھر ٹپکاؤں تیرے اندر گولیاں؟“

عمو کو لگا کہ وہ چاہے بھی تو نہیں بول سکے گا۔ وہ بس سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔ ”اچھا نہیں بولے گا تُو... نہیں بولے گا تو؟“ وہ بہکی ہوئی خطرناک آواز میں بولی۔ اس نے پستول کا حفاظتی کھٹکا ہٹایا۔ اسے عمو کی طرف سیدھا کیا اور جنونی لہجے میں دہاڑی۔ ”... نہیں بولے گا تو... نہیں بولے گا؟“

اس کے ساتھ ہی اس نے عمو پر فائرنگ کر دی۔ عمو چلاّ اٹھا۔ ماجھاں نے پستول کی چھ کی چھ گولیاں عمو پر چلا دیں۔ آخری وقت میں عمو نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور زمین پر گر گیا تھا۔ اسے لگا کہ شاید وہ مرنے والا ہے۔ لیکن پھر یکایک اسے احساس ہوا کہ گولیاں اس کے جسم پر نہیں لگیں۔ اس کے بالکل آس پاس کچی زمین میں لگی ہیں۔

وہ جیسے موت کو چھو کر واپس آگیا تھا۔ ماجھاں اس کی بے بسی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ وہ بڑی بے رحم تھی۔ کئی گولیاں عمو کے جسم کو جیسے چھو کر گزری تھیں۔ ایک طرح سے اس نے اپنے بہترین نشانے کا مظاہرہ بھی کیا تھا۔

وہ عمو کی ٹانگ پر پاؤں رکھتے ہوئے بولی۔ ”ایک دن تُو نے تاجو کو بتایا تھا نا کہ مالکن کے پنڈے سے تمباکو کی بُو آتی ہے۔ بتایا تھا نا؟“

عمو چپ رہا۔ اسے یاد آیا کہ شاید کچھ دن پہلے اس نے بے دھیانی میں کوئی ایسی بات کہی تھی۔ وہ پھنکاری۔ ”تیری یہ ناک بڑی تیز ہے۔ اس کی تیزی مارنے کے لیے کچھ کرنا پڑے گا۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے کالیے کو آوازیں دیں۔

کالیا بھاگتا ہوا آیا۔ وہ ایک صافہ اس کی طرف پھینکتے ہوئے بولی۔ ”اس میں تھوڑا سا گوبر لا اور ساتھ میں ایک رسی بھی۔“

کالیا جیسے پہلے سے جانتا تھا کہ مالکن کیا کرنا چاہتی ہے۔ وہ ”جی اچھا“ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ ذرا ہی دیر بعد وہ مطلوبہ چیزوں کے ساتھ حاضر تھا۔ وہ ساتھ میں لمبے تڑنگے ماکھے کو بھی لایا تھا۔ دونوں نے مل کر عمو کو زبردستی الٹا کیا اور اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔ پھر اس کے پاؤں بھی رسی کی بے رحم گرفت میں جکڑ دیے گئے۔ تب نیلے رنگ کا صافہ جس میں گوبر تھا، عمو کے منہ پر باندھ کر سر کے پیچھے مضبوط گرہ لگا دی گئی۔

وہ عمو کے لیے زندگی کی اذیت ناک ترین گھڑیاں تھیں۔ ماں اس کے سر میں چنبیلی کا خوشبودار تیل لگاتی تھی



اور جب وہ اسکول جاتا تھا تو اس کے بستے میں گلاب کے پھول رکھ دیا کرتی تھی۔ وہ کہتی تھی، گلاب کی خوشبو بندے کو شاہ دماغ بناتی ہے۔ آج اس کے منہ پر تعفن زدہ گوبر بندھا ہوا تھا اور اس کا دم سینے میں گھٹ رہا تھا۔ وہ لوگ اسے بند کر کے چلے گئے اور وہ مچھلی کی طرح تڑپتا رہا۔ وہ صافے کو اپنے منہ سے ہٹانا چاہ رہا تھا لیکن ایسا کر نہیں پا رہا تھا۔ اسے مسلسل ابکائیاں آرہی تھیں۔ پیٹ پرسوں شام سے خالی تھا، ورنہ اس کی مصیبت اور بڑھ جاتی۔ بالآخر وہ نیم بے ہوش ہو گیا۔ شاید گوبر کی بُو نے بھی دھیرے دھیرے اثر کھونا شروع کر دیا تھا۔

☆☆☆

اس دن کے بعد حویلی میں عمران عرف عمو کے لیے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس سے ساری سہولتیں چھین لی گئیں۔ عام ”کاموں“ کی طرح اسے گھٹیا لباس پہنایا گیا اور مویشی خانے میں کام پر لگا دیا گیا۔ مویشی خانے کا نگراں وہی کالیا نامی کرخت شخص تھا۔ وہ کام لینے کے معاملے میں بہت سخت بلکہ سفاک تھا۔ عمو کے پاؤں میں باقاعدہ ایک زنگ آلود بیڑی ڈالی گئی تھی۔ اسے اس بیڑی سمیت صبح منہ اندھیرے سے شام تک مختلف کام کرنا پڑتے تھے۔ ان میں سے سخت ترین کام دستی ٹوکے پر چارا کاٹنا تھا۔ ہر روز کم از کم چھ گھنٹے کے لیے عمو کو ایک دوسرے لڑکے مولے کے ساتھ مل کر چارا کترنا پڑتا تھا۔ وہ پسینے میں نہا جاتے تھے اور دم جیسے آنکھوں میں آجاتا تھا مگر کالیے کی بے رحم نگاہوں کا خوف انہیں ہاتھ چلائے رکھنے پر مجبور کرتا تھا۔ سستی کی صورت میں کالیا نہ صرف غلیظ گالیاں دیتا بلکہ بے دریغ مار پیٹ بھی کرتا تھا۔

مویشی خانے میں کُل پانچ ملازم تھے۔ ان میں سے صرف عمو اور مولے کو یہ ”امتیاز“ حاصل تھا کہ انہیں بیڑیاں لگائی گئی تھیں۔ بیڑی کی وجہ سے وہ دونوں شلوار نہیں پہن سکتے تھے۔ انہیں اپنا جسم صرف لنگوٹی یا دھوتی سے ڈھانپنا ہوتا تھا۔

قریباً دو مہینے بعد مولے کی بیڑی تو اتار دی گئی مگر عمو کی بدستور رہی اور اس کے ٹخنوں کو مسلسل زخمی کرتی رہی۔ ماجھاں کی منحوس شکل اب اسے کم ہی نظر آتی تھی۔ اسے پتا چلا تھا کہ آج کل دینے مسلی کا پڑھا لکھا بیٹا باؤ سلیم ماجھاں کی زد میں ہے۔ ماجھاں نے اسے پتا نہیں کن کن چکروں میں پھنسایا تھا کہ وہ بے چارہ حویلی کا چاکر بننے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس کے ذمے ”منشی“ کا کام لگایا گیا تھا۔ وہ گھنگرالے بالوں والا بائیس تئیس سال کا قبول صورت لڑکا تھا۔ شلوار قمیص پہنتا تھا۔ عمو نے اکثر اسے ایک بوسیدہ سے رجسٹر کے ساتھ حویلی میں آتے جاتے دیکھا۔

ایک دن جب عمو چارے کا وزنی گٹھر کندھے پر اٹھائے حویلی کے مین دروازے کے سامنے سے گزر رہا تھا، اسے ماجھاں کے گرجنے برسنے کی آواز آئی۔ اَدھ کھلے پھاٹک سے اس نے ماجھاں کی بس ایک جھلک دیکھی... اور بھونچکا رہ گیا۔ ماجھاں باؤ سلیم پر برس رہی تھی۔ باؤ سلیم کے گلے میں ایک رسی تھی۔ اس رسی کا دوسرا سرا ماجھاں کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اسے کسی جانور کی طرح برآمدے کی طرف کھینچ رہی تھی۔ باؤ سلیم کے چہرے پر چوٹوں کے نشان تھے۔ وہ جب کسی کو تھپڑ وغیرہ مارتی تھی تو اس کی کلائی کا وزنی کڑا بھی اس ”کارِ خیر“ میں شریک ہو جاتا تھا اور مضروب کے چہرے پر نشان چھوڑ جاتا تھا... ماکھا اور کالیا وغیرہ قریب ہی کھڑے مضحکہ خیز انداز میں باؤ سلیم کی یہ درگت دیکھ رہے تھے۔

ماجھاں کے لیے ایک عجیب سی نفرت عمو کے رگ و پے میں دوڑنے لگی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ وہ اس عورت کو چیر کر دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتا اور دیوہیکل بوہلی کتوں کے آگے ڈال دیتا۔

رات کو اس نے مولے سے ذکر کیا۔ مولا بولا۔ ”باؤ سلیم نے وہی غلطی کی تھی جو اس جیسے پڑھے لکھے لوگ عام طور پر کرتے ہیں۔ اس نے پنڈ میں پانچویں تک کا اسکول کھولنے کی کوشش کی تھی۔ بس اسی بات پر چودھرانی ماجھاں سے اس کی نسل ہو گئی۔ چودھرانی سے ٹکر لے کر بھلا اس علاقے میں کوئی رہ سکتا ہے۔ یہ تو بندے کو اپنے پاؤں چٹنے پر مجبور کر دیتی ہے۔“

”کوئی اس کا کچھ کر نہیں سکتا؟“ عمو نے دکھی لہجے میں کہا۔

”تُو نے کیا کر لیا ہے؟“ مولے نے الٹا اس سے سوال کیا۔

اس سوال نے عمو کو چپ کرا دیا۔ مولا بولا۔ ”یہ بڑی دراچھی زنانی ہے۔ اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا... اور سچی گل پوچھتا ہے نا تو مجھے تو اس کُڑی شبو کی طرف سے بھی خطرہ ہی رہتا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ عمو نے چونک کر پوچھا۔

”وہ بگیاڑوں کے اندر بکری کے بچے کی طرح ہے۔ اس کے ساتھ کسی ویلے بھی کچھ ہو سکتا ہے۔“

مولے کی بات نے عمو کے اندر دبے ہوئے سارے اندیشے ایک دم ابھار دیے۔ اس کے سینے میں کچھ سلگنے لگا۔ پچھلے دو ڈھائی مہینے میں بس دو چار بار ہی وہ شبو کو دیکھ سکا تھا۔

اس کے سر پر اب چھوٹے چھوٹے بال آگئے تھے۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد نظر آتا تھا۔ سخت گیر شہناز کی زیرِ نگرانی وہ حویلی کے کام کاج کرتی دکھائی دیتی تھی۔ شاید مولا سچ ہی کہہ رہا تھا۔ ماکھے، کالیے اور صوفی جیسے بگیاڑوں کے درمیان وہ ایک کمزور بکری ہی تو تھی۔

مولے کی آواز نے اسے چونکایا۔ ”مجھے تو ایک اور شک ہو رہا ہے عمو۔ سنا ہے کہ چودھرانی کا ڈکیت بھائی ناجا ڈیڑھ دو مہینے تک حویلی واپس آرہا ہے۔ وہ پھر حویلی میں ہی رہے گا۔ کہتے ہیں کہ علاقے کی پُلس کے ساتھ اس کا لمبا چوڑا ٹنک مُکا ہو گیا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ چودھرانی نے شبو جیسی چل کڑی کو اپنے بھائی کی دل پشوری کے لیے ہی بچا کر رکھا ہوا ہے۔“

مولے کے بات کرنے کے انداز سے عمو بھنّا گیا۔ ”مولے! اس کے بارے میں تمیز سے بات کر۔“

”یار تو تو ایسے کہہ رہا ہے جیسے وہ معشوق نہیں، زنانی ہے تیری۔“

عمو اندر سے کھول کر رہ گیا۔ وہ منہ پھیر کر اٹھا اور دوسری طرف چلا گیا۔ مویشی خانے کی تاریکی اور بُو میں وہ رات دیر تک جاگتا رہا اور بان کی چارپائی پر پہلو بدلتا رہا... مولے کی باتوں نے شبو کے حوالے سے اس کے بدترین اندیشوں کو ہوا دی تھی اور اب وہ بُری طرح بے قرار تھا۔ ہو سکتا تھا کہ مولے نے ماجھاں کے ڈکیت بھائی کے حوالے سے جو اندیشہ بیان کیا تھا، وہ پوری طرح درست نہ ہو لیکن یہ بات تو ٹھوس حقیقت تھی کہ اس حویلی میں لاچار شبو کے ساتھ کسی بھی وقت کوئی ”معاملہ“ ہو سکتا ہے۔

صرف تین چار روز بعد ایک اور واقعہ ہوا۔ پتا چلا کہ حویلی میں دو تین بندے زخمی ہو گئے ہیں۔ ان میں دینے مسلی کا بیٹا باؤ سلیم بھی شامل تھا۔ باؤ کو شدید چوٹ آئی تھی۔ پتا چلا کہ اس کی دو پسلیاں ٹوٹ کر اس کے پھیپھڑے میں جا گھسی ہیں اور اسے زخمی حالت میں تحصیل اسپتال پہنچایا گیا ہے۔ یہ حادثہ گھوڑوں اور گھوڑیوں کو نمبر لگانے کے دوران میں پیش آیا۔ نمبر لگانے کے لیے جانوروں کو داغا جاتا ہے۔ جب ماجھاں کے لاڈلے تازی گھوڑے کو داغا جانے لگا تو وہ اپنی روایتی سرکشی پر اتر آیا۔ اس نے مختصر سے طویلے میں زبردست اودھم مچایا۔ باؤ سلیم جو منشی کے طور پر وہاں موجود تھا اور نمبر لگوا رہا تھا، وہ بھی گھوڑے کی زد میں آیا اور اس کی دولتی سے شدید زخمی ہوا۔ یہ وہی منہ زور گھوڑا تھا جو اس سے پہلے بھی سائیس اور اس کے ساتھی کو زخمی کر چکا تھا۔

باؤ سلیم گھائل ہو کر اسپتال پہنچ گیا اور اس کے آٹھ دس روز بعد ہی ماجھاں کی ”نظرِ کرم“ ایک بار پھر عمو پر پڑ گئی۔ وہ اپنی بدعادات سے مجبور تھی۔ عمو کو کسی بھولی ہوئی ملکیتی شے کی طرح مویشی خانے کے ”اسٹور روم“ سے نکالا گیا اور جما پونچھ کر پھر اپنے عشرت کدے میں سجایا گیا... وہی نیم تاریک کمرا، وہی کراہت، وہی بدبودار بوجھ، وہی غلیظ سانسیں۔ وہ اب پہلے سے دگنا کالا پانی یعنی شراب پیتی تھی اور اس کی خباثت میں بھی اسی شرح سے اضافہ ہوا تھا۔ وہ عمو کی دکھتی رگ جان چکی تھی۔ اس نے شبانہ کا ذکر بھی کیا اور کہا کہ وہ لڑکی یہاں اسی وقت تک خیریت سے ہے جب تک عمو سیدھا سیدھا چلتا رہے گا۔

... اب وہ عمو کو گاہے بگاہے حویلی میں بلانے لگی۔ تاہم عمو کی وہ سہولتیں بحال نہیں ہوئیں جو شروع میں اسے حاصل تھیں۔ وہ بدستور مویشی خانے میں قیام پذیر تھا اور سارا دن جانور کی طرح مشقت کرتا تھا۔ اس کا کھانا پینا بھی حویلی کے ادنیٰ کارندوں کے ساتھ تھا۔ صرف اتنا فرق پڑا کہ اس کی بیڑی اتار لی گئی۔

وہ بڑے تکلیف دہ شب و روز تھے۔ سردیوں کے بعد بہار شروع ہو رہی تھی۔ نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں، مست ہوا چلتی تھی لیکن عمو کے اندر کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی... وہ ہر وقت معصوم چہرہ شبانہ کی سلامتی کے بارے میں سوچتا رہتا اور اس فکر میں رہتا کہ وہ کسی طرح اس مہلک جال میں سے نکل جائے۔ عمو کو معلوم ہو چکا تھا کہ شبانہ کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے اور وہ ایک ناپسندیدہ شوہر کے پلّے بندھنے سے بچ گئی ہے مگر اس کے ساتھ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والی بات ہوئی تھی۔ وہ اب ماجھاں کے پاس تھی۔ بظاہر تو اس کی حیثیت ملازمہ کی تھی۔ اس کے رشتے داروں کو حویلی میں آکر اس سے ملنے کی اجازت بھی تھی لیکن حقیقت میں وہ قیدی تھی۔ اس کے گرد ایک نادیدہ پنجرہ تھا۔

عمو پچھلے ایک ڈیڑھ سال میں پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گیا تھا۔ اس کا تھوڑا سا مزید قد بھی نکلا تھا اور اس کے شانوں کی چوڑائی بڑھی تھی۔ اس کے اندر بغاوت کسی انگارے کی طرح سلگتی رہتی لیکن اس انگارے کو شعلہ بننے کا موقع دور دور نظر نہیں آتا تھا... ہاں، وہ بہار کے دن تھے۔ بہار کی ہوا میں نمو کی تاثیر ہوتی ہے۔ اس ہوا میں زردی کے اندر سے سبز پھوٹتا ہے... بیجوں سے کونپلیں بنتی ہیں اور کبھی کبھی جذبوں کے انگارے بھی شعلوں میں بدل جاتے ہیں۔ ان دنوں حویلی میں راجا نام کا ایک نوجوان بطور مہمان ٹھہرا ہوا تھا۔ راجا کے



پاس ایک بہت کھٹارا لوڈر تھا۔ اس پر اردو میں ”پاٹے خاں“ لکھا ہوا تھا۔ یہ دراصل اس لوڈر کا نام تھا۔ راجا اس لوڈر میں دو تین پنجرے رکھ کر لایا تھا... ان میں چار پانچ شکاری کتے تھے۔ عمو کو معلوم ہوا تھا کہ یہ بندہ شکاری کتوں کو سدھاتا ہے اور پھر انہیں فروخت کرتا ہے۔ اس دن عمو بہت اداس بیٹھا تھا۔ اتنے میں کالیا آگیا۔ اس نے عمو سے کہا کہ وہ بھوری بھینس کا دودھ دھووے۔ بھوری کبھی کبھی اڑ جاتی تھی اور اسے ٹیکا لگا کر دودھ دھونا پڑتا تھا مگر عمو ایسے موقعوں پر بغیر ٹیکے کے ہی اسے رام کر لیتا تھا۔

وہ اسٹیل کی بڑی بالٹی لے کر بھوری کے پاس آیا۔ اس کے چمکیلے پنڈے پر ہاتھ پھیر پھیر کر اور اس کے تھنوں کو سہلا سہلا کر اسے تیار کرتا رہا۔ پھر بالٹی اپنے دونوں گھٹنوں میں دبائی اور بھوری کے نیچے بیٹھ گیا۔

یہ مویشی خانے کا ایک چھوٹا سا احاطہ تھا جس میں صرف دو بھینسیں اور بندھی ہوئی تھیں۔ اچانک بھگدڑ کی آوازیں آئیں۔ ایک زوردار کڑاکا سنائی دیا اور احاطے کا لکڑی کا دروازہ ٹوٹ کر دور جا گرا۔ ایک گھوڑا اپنے گھڑ سوار سمیت تیزی سے اندر داخل ہوا۔ عمو نے فوراً پہچان لیا۔ یہ ماجھاں کا وہی سرکش گھوڑا تھا جس نے دہشت پھیلا رکھی تھی۔ عمو نے اس کے سوار سالار خاں کو اچھل کر ہوا میں تیرتے اور پھر بھینسوں کی کھرلی کے پاس گرتے دیکھا۔ گرتے ہوئے اس کا سر کھرلی سے ٹکرایا تھا اور وہ بے سدھ ہو گیا تھا۔ گھوڑے کی ٹانگ لگنے سے عمو بھی دور لڑھک گیا اور دودھ والی بالٹی ہوا میں اڑتی نظر آئی۔ گھوڑا بلند آواز میں ہنہنا رہا تھا اور چاروں طرف ٹانگیں چلا رہا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اگر سالار خاں چند سیکنڈ بھی اپنی جگہ پڑا رہا تو وحشی گھوڑا اسے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا دے گا۔ یہی وقت تھا جب عمو اپنی جگہ سے حرکت میں آیا اور نتائج سے بے پروا ہو کر گھوڑے پر جا پڑا۔ گھوڑے نے گردن کے زوردار ہلارے سے عمو کو ضرب لگائی اور چارے کے گٹھوں پر گرا دیا۔ عمو ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پھر اٹھا اور گھوڑے پر جھپٹا۔ اس مرتبہ گھوڑے کی لگام عمو کے ہاتھ میں آگئی۔ اس نے لگام کو دو تین جھٹکے دیے۔ یکا یک اسے لگا کہ گھوڑا غیر متوقع طور پر شانت ہو رہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی غیر معمولی مستی کافور ہو گئی۔ عمو نے اس کے ساتھ بھاگتے بھاگتے احاطے کا ایک چکر لگایا۔ لگام بدستور اس کے ہاتھ میں تھی۔ پھر اس نے ہمت کی اور جست لگا کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ یہ غیر معمولی اقدام تھا۔ اس وقت ماجھاں سمیت حویلی میں موجود کوئی بھی شخص ایسی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ عمو نے گھوڑے کو سنبھالتے ہوئے گھڑ سواری کا انداز اختیار کیا۔ وہ اس کی اچھل کود کو بتدریج کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد وہ اسے بڑے احاطے میں لے آیا اور بڑے اعتماد سے اسے اِدھر اُدھر دوڑانے لگا۔ ماجھاں اس وقت حویلی میں نہیں تھی لیکن جو لوگ اسے دیکھ رہے تھے، وہ یقیناً حیرت زدہ تھے۔ اس سرکش گھوڑے پر اتنی کامیابی سے ابھی تک کوئی نہیں بیٹھا تھا۔

ان دیکھنے والوں میں ماجھاں کا مہمان راجا بھی تھا۔ کچھ دیر بعد جب عمو گھوڑے سے اترا اور اس کی گردن پر تھپکیاں دینے کے بعد اسے ایک کھونٹے سے باندھ دیا تو راجا دھیمے قدموں سے چلتا ہوا اس کے پاس آیا۔ راجا چھریرے بدن کا تھا، اس کے بال لمبے تھے۔ آنکھیں چمکیلی اور نقوش تیز تھے۔ وہ عام سی شلوار قمیص پہنے ہوئے تھا۔ اس نے عمو کا کندھا تھپکایا اور بولا۔ ”کیا نام ہے تمہارا؟“

”عمران... ویسے عمو کہتے ہیں۔“

”لگتا ہے گھوڑوں کے بارے میں کافی کچھ جانتے ہو... اور گھڑ سواری میں بھی ماہر ہو۔“

”نہیں، بہت کم گھوڑے پر بیٹھا ہوں۔ یہاں حویلی میں آکر تو تین چار بار سے زیادہ نہیں بیٹھا۔“

”یا تم جھوٹ بول رہے ہو... یا پھر...“ وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

بے ہوش سالار خاں کو اٹھا کر باہر لایا جا رہا تھا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور مرہم پٹی کی ضرورت تھی۔ راجا نے دیگر ملازموں سے بھی پوچھا۔ انہوں نے بھی اس بات کی تصدیق کی کہ عمو کبھی کبھار ہی گھوڑے پر بیٹھتا ہے۔ وہ کوئی ماہر گھڑ سوار نہیں۔

راجا، عمو کو لے کر حویلی کے اس حصے میں آگیا جہاں مہمان وغیرہ ٹھہرتے تھے۔ یہ دراصل ڈیرے ہی کے تین چار کمرے تھے۔ یہاں بڑی بڑی دو چارپائیاں اور تازہ حقے پڑے رہتے تھے... یہیں پر ایک طرف نیم کے درختوں کے نیچے وہ آہنی پنجرے پڑے تھے جنہیں راجا کسی جگہ لے کر جا رہا تھا۔ ان میں کتے تھے۔ ایک کتا مسلسل شور مچا رہا تھا۔ راجا نے اپنے کان کی چھوٹی سی طلائی بالی کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ”تیرے اندر فن ہے بھائی! میں خود بھی گھوڑے سدھاتا ہوں۔ میں نے کبھی کسی ایسے گھوڑے کو اتنی آسانی سے رام ہوتے نہیں دیکھا۔“

”میں سچ کہتا ہوں۔ میں نے پہلے کبھی کسی ایسے گھوڑے پر سواری نہیں کی۔“ عمو سادگی سے بولا۔

''اچھا اس گھوڑے سے پہلے بھی کبھی تمہارا آمنا سامنا ہوا ہے؟''

''بس دو چار بار ہی ہوا ہے۔''

''کبھی ایسی حالت میں بھی سامنا ہوا ہے جب یہ اسی طرح مستا (بپھرا) ہوا تھا؟''

عمو نے ذہن پر زور دیا اور بولا۔ ''ہاں، جب میں شروع شروع میں یہاں آیا تو ایک دن اس گھوڑے نے بڑا اودھم مچایا تھا۔ وہ ایک سوار کو اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا یہاں لایا تھا اور وہ بے چارہ مر چکا تھا۔''

راجا بڑے دھیان سے عمو کی بات سن رہا تھا۔ وہ بولا۔ ''اس وقت گھوڑے سے تمہارا سامنا ہوا؟''

اچانک اس وقت کے مناظر عمو کی نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ گھوڑے نے سائیس کو گرایا تھا پھر ماجھاں اسے چکما دے کر اس کی لگام تھامنے کے لیے آگے بڑھی تھی لیکن وہ تو چھلاوا بنا ہوا تھا۔ ایک دم الف ہو گیا اور گھوم کر سیدھا عمو کی طرف آیا۔ عمو نے حفاظت خود اختیاری کے طور پر اندھا دھند اپنا ہاتھ گھمایا تھا۔ عمو کے ہاتھ میں گھوڑے کی لگام آ گئی تھی۔ عمو کے بازو کو شدید جھٹکا لگا۔ لگام عمو کے ہاتھ میں آنے کے بعد گھوڑا چند لمحوں کے لیے سکتہ زدہ سا ہو گیا تھا۔ ماجھاں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنے تنومند جسم کی پوری طاقت کے ساتھ گھوڑے کی گردن سے لپٹ گئی تھی۔

''کس خیال میں کھو گئے؟'' راجا کی آواز نے اسے چونکایا۔

''ہاں، اس وقت بھی پانچ دس سیکنڈ کے لیے اس سے میرا سامنا ہوا تھا۔'' عمو نے راجا کے سوال کے جواب میں کہا۔

راجا نے عمو سے چند مزید سوال پوچھے۔ اس کے لب و لہجے میں حیرت بدستور موجود تھی۔

اسی دوران میں اندرونی کمرے سے زرق برق کپڑوں والی ایک لڑکی نے راجا کو پکارا۔ راجا اس کی بات سننے کے لیے کمرے میں چلا گیا۔ عمو کتوں کو دیکھنے کے لیے پنجرے کی طرف آ گیا۔ ایک کتا مسلسل شور مچا رہا تھا۔ اس کی آوازیں کل رات بھی مسلسل حویلی کے مکینوں کو بے آرام کرتی رہی تھیں۔ یہ پتلی کمر اور لمبی تھوتھنی والا ہاؤنڈ کتا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور تیور خطرناک تھے لیکن اب پچھلے دس پندرہ منٹ سے وہ قدرے خاموش نظر آ رہا تھا۔ اس کتے کو علیحدہ پنجرے میں بند کیا گیا تھا۔ عمو کتے کے نزدیک پہنچا تو وہ دُم کو ہولے ہولے گردش دینے لگا اور اس نے اپنی تھوتھنی پنجرے کی سلاخوں سے لگا دی۔ کتے عام طور پر عمو سے جلد ہی مانوس ہو جاتے تھے۔ ماجھاں نے اپنے طیش کے دور میں عمو کو کئی ماہ تک ''بلی ڈاگز'' کے ساتھ ایک بدبودار کوٹھڑی میں بند رکھا تھا۔ ان کتوں سے شروع میں عمو کو خطرہ محسوس ہوا لیکن پھر بڑی تیزی سے یہ خطرہ کم ہوتا چلا گیا تھا۔

ہاؤنڈ کتے نے اپنی پتلی تھوتھنی کا ایک تہائی حصہ تنگ سلاخوں کے خلا سے باہر نکال لیا تھا۔ عمو نے اپنی انگلی سے تھوتھنی کے بالائی حصے کو ہولے ہولے سہلایا۔ کتے کی دُم کی بے ساختہ گردش تیز ہو گئی۔ اسی دوران میں راجا واپس آ گیا۔ وہ عمو کو کتے کے پاس دیکھ کر حیران ہوا۔ اس نے عمو کو کتے سے پیچھے ہٹایا اور بولا۔ ''زیادہ بہادری نہ دکھاؤ یارا... یہ کسی بھی ویلے حملہ کر سکتا ہے۔''

عمو اور راجا دوبارہ جہازی سائز چارپائی پر آ بیٹھے اور باتیں کرنے لگے۔ راجا، عمو سے پوچھنے لگا کہ وہ یہاں کیسے اور کیونکر آیا۔ یہاں ہر کسی کو عمو کی کہانی معلوم تھی۔ عمو نے راجا کو بھی یہ سب کچھ بتانے میں عار نہیں سمجھا۔ اس نے اسے بتا دیا کہ کیسے وہ ایک چودھری کے پتر کو آسمانی بجلی والی محوست سے بچانے کے لیے شہنشاہ نامی پیر کے مزار پر پہنچا اور کیسے یہاں ٹیکراں گاؤں تک آیا... اس گفتگو کے دوران میں ہی راجا تھوڑا سا چونکا۔ ہاؤنڈ کتے نے اب پھر پنجرے میں چکرانا اور شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ راجا کچھ دیر تک پُرسوچ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اٹھ کر اس کے قریب گیا۔ اس نے عمو کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ عمو پنجرے کے سامنے پہنچا تو کتے کی بے قراری کم ہو گئی۔ اس کا شور بھی تقریباً معدوم ہو گیا۔ وہ اپنی تھوتھنی سلاخوں سے رگڑ رہا تھا۔

کچھ دیر تک کتے کے پاس رک کر عمو اور راجا پھر چارپائی پر جا بیٹھے۔ ایک ملازمہ ان دونوں کے لیے لسی والی میٹھی لسی لے آئی۔ کتا اب پھر حسبِ معمول پنجرے میں چکرا رہا تھا اور شور مچا رہا تھا۔

لسی پینے کے بعد راجا نے اپنی تیکھی مونچھیں صاف کیں اور ایک زوردار ڈکار لینے کے بعد کھوئی کھوئی نظروں سے عمو کو دیکھنے لگا... کچھ دیر بعد بولا۔ ''میرے استاد، اللہ بخشے بابا مہر مشتاق کہا کرتے تھے، کچھ بندوں کے ساتھ پالتو جانور خاص طور سے کتے اور گھوڑے وغیرہ بڑی جلدی ہل جاتے (مانوس ہو جاتے) ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ تم بھی ان لوگوں میں سے ایک ہو۔ کوئی خاص بات ہے تمہارے اندر... یا پھر ہو سکتا ہے کہ آہستہ آہستہ پیدا ہو رہی ہو۔''

''مم... میں سمجھا نہیں بھا راجے؟''



''شاید میں تمہیں سمجھا نہ سکوں۔ استاد جی کی ساری باتیں تو میری کھوپڑی میں بھی نہیں آتی تھیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ... ہر بندے کے اندر سے کچھ لہریں نکلتی ہیں۔ یہ لہریں اس بندے کے آس پاس کے سارے جی جناوروں پر اثر ڈالتی ہیں... یہ لہریں ان جی جناوروں کو بتاتی ہیں کہ یہ بندہ چنگا ہے، بُرا ہے، یا بہت چنگا ہے یا بہت بُرا ہے۔ بس اس طرح کی بات کہا کرتے تھے استاد جی۔ اگر یہ باتیں صحیح ہیں تو پھر مجھے لگتا ہے کہ تیری لہریں بھی بڑی ٹیٹ قسم کی ہیں۔''

''یہ ٹیٹ کیا ہوتا ہے؟''

''یار! انگریزی کا لفظ ہے۔ مطلب ہے تگڑی مضبوط۔''

عمو سمجھ گیا کہ وہ ''ٹائٹ'' کو ٹیٹ کہہ رہا ہے۔

رات کو عمو سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ راجا کی کہی ہوئی ساری باتیں اس کے ذہن سے نکل چکی تھیں۔ وہ بس ایک ہی بات سوچ رہا تھا۔ وہ شبانہ کو اس خطرناک حویلی سے کیسے نکال کر لے جا سکتا تھا؟ وہ اس کے لیے بہت اہم ہو چکی تھی۔ اس کی رگ جاں میں بس گئی تھی اور خون بن کر اس کی شریانوں میں دوڑتی رہتی تھی۔ وہ اس سے عشق کرنے لگا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اپنے عشق کو بچانے کے لیے اس کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ شبانہ کی ماں اور دیگر رشتے داروں میں تو اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ شبانہ کو ماجھاں کے چنگل سے نکال کر لے جا سکتے۔ ایسا کرنے والوں کا حشر یہاں دینے مسکی کے بیٹے باؤ سلیم جیسا ہی ہوتا تھا۔

ایک دن بعد راجا سے پھر عمو کی ملاقات ہوئی۔ وہ اسے بڑی محبت سے ملا۔ دونوں مہمان خانے میں بیٹھے تربوز کھاتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ راجا کا ہر دم شور مچانے والا..... خوفناک کتا آج پھر پہلے دن والے رویے کا مظاہرہ... کر رہا تھا۔ وہ قدرے پُرسکون نظر آ رہا تھا... اس نے حیران کن طور پر عمو کو اپنے ہنڈے پر ہاتھ لگانے کی اجازت بھی دی تھی۔ تربوز کھانے کے دوران میں عمو نے راجا سے پوچھا۔ ''وہ رنگ برنگے کپڑوں والی کڑی کہاں گئی؟''

''واپس چلی گئی ہو گی اپنے کوٹھے پر۔'' راجا نے بیڑی سلگا کر کہا۔

''کیا مطلب؟ وہ طوائف تھی؟''

''اوئے کھوتے، آہستہ بول۔ آپاں ماجھاں نے سن لیا تو غصہ کرے گی۔ تجھے پتا ہی ہے، سچی بات اسے کتنی کڑوی لگتی ہے۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں بھا راجے۔''

وہ آواز دبا کر بولا۔ ''آپاں ماجھاں نے یہ کڑی مجھے ذرا موج میلے کے لیے دی تھی۔ کہتی تھی گھریلو کڑی ہے۔ بڑی مشکل سے پھنسا کر لائی ہوں۔ وہ بھی بات بات پر ہائے اللہ، توبہ اللہ، نہیں جی، نہ جی کہتی تھی۔ پر یارا! ہم نے بھی تھاں تھاں کا پانی پیا ہے۔ زنانی کی آواز سن کر بتا دیتے ہیں کہ یہ کس کھیت کی مولی ہے۔ بازاری کڑی تھی خانہ خراب... میں نے بھی سوچا چلو وقت ہی پاس کرنا ہے نا۔''

''تو اس میں اصل قصور تو مالکن ماجھاں کا ہوا نا۔'' عمو نے کہا۔

''یہ تیری مالکن ماجھاں بڑی کتی شے ہے عمو... میں اس کے ساتھ بھی کبھی کاروبار کرتا ہوں اس لیے مجبوراً اسے آپاں کہنا پڑتا ہے۔ ایسا کہتے ہوئے جو میرے دل پر گزرتی ہے، میں ہی جانتا ہوں لیکن میں اس کی کسر ''ماجھاں'' کہتے ہوئے نکال دیتا ہوں۔ شاید تو نے غور نہیں کیا۔ میں اسے ماجھاں کے بجائے ماچاں کہتا ہوں۔''

''ماچاں کا کیا مطلب؟''

''بڑا کرارا مطلب ہے۔ ایک دم ٹیٹ۔'' وہ سرگوشی میں بولا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ عمو کے استفسار پر اس نے بتایا۔ ''ماچاں، پوٹھوہار کے خانہ بدوشوں کی بولی کا لفظ ہے۔ اس کا مطلب ہے جنگلی سور کی مادہ جس کے پیٹ میں بچے ہو...'' بات کرتے کرتے راجا ایک دم ٹھٹک گیا۔ اپنی شریر مسکراہٹ سمیٹ کر بولا۔ ''لو آ گئی آپاں ماچاں۔''

ماجھاں اپنے تنومند جسم کو ہلکورے دیتی ہوئی وہاں پہنچی۔ اس کے منہ میں تمباکو والا پان تھا۔ ایک نگاہ غلط انداز عمو پر ڈالنے کے بعد وہ راجا سے مخاطب ہوئی۔ ''ہاں بھئی راجے... کیسی تھی کڑی؟''

''ایک دم ٹیٹ... آپاں ماچاں۔'' وہ آنکھ دبا کر بولا۔

''ویسے راجے! تو ہے بڑا کمینہ۔ اسے دو چار سو روپیا ہی دے دیتا۔''

''کیسی بات کرتی ہو آپاں! وہ گھریلو کڑی تھی۔ غصہ کر جاتی تو پھر؟ اگلی بار آؤں گا تو کوئی تحفہ شحفہ لاؤں گا۔''

''تو بہت وڈا کھوچل ہے۔'' ماجھاں نے تیوری چڑھا کر کہا۔ پھر بولی۔ ''اچھا وہ انگریزی بوتل کہاں ہے جس کا کہہ رہا تھا؟''

''ہاں ہاں آپاں ماچاں! وہ تو تیرے لیے سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔ قسم سے ایک دم انگریزی ہے، بالکل سیل بند۔''

راجا اندر گیا اور پھر اخبار کے کاغذ میں لپٹی ہوئی امپورٹڈ شراب کی ایک نفیس بوتل اٹھالایا۔ ''یہ لو... کیا یاد کرو گی اپنے بھائی کو۔'' وہ بولا۔

تھوڑی سی مکالمے بازی کر کے ماجھاں واپس چلی گئی تو راجا کے چہرے پر پھر وہی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ ''ایسے مسکرا کیوں رہے ہو بھاراجے؟'' عمو نے پوچھا۔

''سچی سچی بتاؤں؟''

''ہاں ہاں... مجھے کون سا کسی کو بتانا ہے۔''

راجا خود کو عمو سے کافی بے تکلف محسوس کرنے لگا تھا۔ سرگوشی میں بولا۔ ''کہتے ہیں نا کہ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ اس نے مجھے کنڈم شراب کڑی دی، میں نے اسے کنڈم شراب تھما دی۔ وہ ٹیٹ کو ''اچھے'' اور کنڈم کو ''خراب'' کے معنوں میں استعمال کرتا تھا۔

''کنڈم شراب؟ کیا مطلب؟'' عمو نے پوچھا۔

''یہ سیل بند بوتل نہیں ہے اور اس میں جو شراب ہے، وہ بھی بچی کھچی ہے۔ کچھ دن پہلے فیروز آباد گاؤں کے زمیندار ملک آفتاب کے ڈیرے پر ایک بڑی شراب پارٹی ہوئی تھی۔ وہاں بڑی ٹیٹ انگریزی شراب چلی تھی۔ میں بھی وہاں تھا۔ پارٹی کے بعد میں نے گلاسوں میں بچی کھچی شراب اس بوتل میں جمع کرلی تھی...'' وہ دبی آواز میں ہنسا۔

''اور یہ بوتل کی سیل؟'' عمو نے پوچھا۔

''یہ سیلیں شیلیں جھوٹی ہوتی ہیں یارا... ہر طرف ایک دم کنڈم مال چل رہے ہیں۔'' وہ مسکراتے لہجے میں بولا۔

اگلے دو تین روز میں راجے سے عمو کی چند ملاقاتیں مزید ہوئیں۔ وہ عمو سے بہت متاثر نظر آتا تھا۔ اسے عمو کی تقریباً ساری روداد معلوم ہو چکی تھی۔ یہ بھی پتا چل چکا تھا کہ یہاں عیاش ماجھاں نے اس کے ساتھ کس طرح کا سلوک روا رکھا ہے۔ ماں کے حوالے سے اپنی تڑپ کے بارے میں بھی عمو نے راجا کو بہت کچھ بتایا تھا۔ ایک دن بیڑی پیتے پیتے اس نے اچانک عمو سے پوچھا۔ ''یہاں سے بھاگنا ہے عمو؟''

عمو نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ... کیسے ہو سکتا ہے؟'' وہ ہکلایا۔

''یہ مجھ پر چھوڑ۔ یہ بتا یہاں سے بھاگنا ہے تجھے؟''

عمو نے چند سیکنڈ تک سوچا پھر بولا۔ ''ہاں... پر اکیلے نہیں۔ شبو کے ساتھ۔''

''ٹھیک ہے، اس کو بھی لے چلتے ہیں لیکن... میری ایک چھوٹی سی شرط ہے۔''

''وہ کیا؟''

''گھبرا مت یارا۔ کوئی ایسی شرط نہیں۔ تُو آسانی سے پوری کر دے گا لیکن مجھے بتاؤں گا بعد میں۔''

''لیکن... تم ہمیں یہاں سے نکالو گے کس طرح؟'' عمو نے پوچھا۔

''کہا ہے نا، یہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔ بس تمہیں تھوڑی سی ہمت دکھانی پڑے گی۔''

''تمہارے اندازے سے بڑھ کر ہمت دکھاؤں گا۔'' عمو نے عجیب دلولے سے کہا پھر ذرا توقف کر کے بولا۔ ''مگر پروگرام کب کا ہے؟''

''بس ایک دو دن کے اندر۔ تیری مالکن ماجاں سے کوئی شے خریدنی ہے۔ اس کا سودا ہو جاتا ہے تو پروگرام پکا کر لیتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے بھاراجے... پر میری تو ملاقات شبو سے ہوتی نہیں ہے۔ کسی طرح تو اس سے ملاقات کرلے اور اسے بتا دے کہ وہ بھاگنے کے لیے تیار رہے۔''

''اور اگر وہ نہ مانی تو؟''

''تم اسے ساری بات بتانا نا۔ اسے بتانا کہ ماجھاں کا ڈکیت بھائی بس دو تین ہفتے میں یہاں تشریف لانے والا ہے۔ وہ آگیا تو پھر اس کے لیے بڑی مصیبت ہو جائے گی۔ اسے ساری حقیقت کھول کر سمجھا دینا۔''

راجا نے چالاکی دکھائی اور اگلے روز مہمان خانے میں شبو سے ملاقات کرلی۔ نہ صرف ملاقات کرلی بلکہ کالے اور صوفی کو چکما دے کر دو تین منٹ کے لیے عمو کو بھی اس ملاقات میں شریک کرلیا۔ شبو بھی شاید اپنی طرف بڑھنے والے خطروں کو بھانپ چکی تھی۔ اس نے نیم رضامندی ظاہر کر دی۔

اگلا روز عمو کے لیے بہت افسوس ناک تھا۔ وہ بمشکل اپنے آنسو ضبط کر سکا۔ صبح سویرے حویلی میں یہ خبر پہنچ گئی تھی کہ دینے مسلی کا پڑھا لکھا بیٹا باؤ سلیم جو شدید زخمی تھا، گجرات کے اسپتال میں انتقال کر گیا ہے۔ وہ ماجھاں کے ظلم کے شاہ کاروں میں سے ایک شاہ کار تھا۔ اس کی خطا صرف یہ تھی کہ اس نے تعلیم حاصل کی تھی اور جاہلیت میں غرق اس ''گیراں گاؤں'' میں بچوں کو پڑھانا چاہتا تھا۔ وہ افسر بننے کے لائق تھا، پر ماجھاں نے اسے حویلی میں رکھ کر منشی... کا کام سونپا تھا۔ اسے اپنی عیاشی کا سامان بنایا تھا اور ذلیل و خوار کیا تھا۔ وہ بیس بائیس سال کا تھا۔ اس عمر میں تو زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ سپنے دیکھے جاتے ہیں۔ راستے چُنے جاتے ہیں۔ تازہ حوصلوں کے ساتھ سہانی مسافتوں کی شروعات ہوتی ہے اور وہ خشک ہونٹوں، ویران آنکھوں کے ساتھ منوں مٹی کے نیچے جا سویا تھا۔ بظاہر اس کی موت گھوڑے والے حادثے کی وجہ سے ہوئی لیکن یہ حادثہ نہ ہوتا تو کوئی اور ہو جاتا۔ اس حویلی میں اس کی زندگی کو برباد تو ہونا ہی تھا۔

باؤ سلیم والے واقعے نے عمو کے ارادے کو مزید پختہ کیا۔ اس نے تہیہ کیا کہ وہ راجا کا تعاون حاصل کرے گا اور شبو سمیت اس حویلی سے نکلنے کی بھرپور کوشش کرے گا۔ اس دن شام کو جب وہ راجا کے ساتھ ڈیرے پر بیٹھا تھا اور اس کے ہاؤنڈ کتے کو اپنے ہاتھ سے گوشت کھلا رہا تھا، راجا نے سرگوشی میں ماجھاں کو ایک کلاسیکل گالی دی اور بولا۔ ''عمو! تیری خاطر ایسا کنڈم سودا کر رہا ہوں، نہیں تو قسم سے لات مار دیتا اس مال پر اور مال والی کی ''تشریف'' پر۔''

''کس مال کی بات کر رہے ہو بھاراجے؟'' عمو نے پوچھا۔

راجے نے قمیص کے نیچے سے چاقو نکالا اور اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد قریب رکھے ایک چھوٹے سے تربوز کو بیچ میں سے کاٹ دیا۔ عمو دنگ رہ گیا۔ تربوز اندر سے بالکل خالی تھا۔ اس کے خول میں پولیتھین کا ایک موٹا لفافہ تھا۔ لفافے میں کوئی سیاہی مائل شے نظر آرہی تھی۔ یہ افیم تھی۔ راجا نے تھوڑی سی افیم نکالی۔ اسے چٹکی میں مسلا۔ زبان کی نوک سے چکھا پھر ناک سے لگایا... اور دوبارہ ماجھاں کو گالی دی۔ ''ایک دم کنڈم ہے۔ جتنے پیسے مجھ سے لے رہی ہے، اس سے آدھے بھی نہیں دینے چاہئیں۔ پر تیری اور شبو کی خاطر یہ گھاٹا بھی قبول ہے۔'' وہ اپنے خاص انداز میں مسکرایا۔

''تو کیا تجھے یہ افیم کہیں لے کر جانی ہے؟''

''تو کیا خود کھا کر اللہ بخشے ہونا ہے؟''

عمو سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''ایسے چھوٹے سائز کے آٹھ دس تربوز ایسے ہیں جن میں یہ افیم بھری گئی ہے۔ ان تربوزوں کو دوسرے تربوزوں میں ملا کر لوڈر میں بھر دیا جائے گا۔ کسی کے باپ کو بھی پتا نہیں چلے گا کہ تربوزوں میں ''کھوچل'' تربوز بھی ہیں۔''

''پہلے بھی یہ کام کرتے رہے ہو؟''

''ہاں، دو چار بار تو کیا ہے۔ ایک دم ٹیٹ کام ہے۔ یہ دیکھو، تربوز پر مٹی وغیرہ بھی لگی ہوئی ہے۔ پتا ہی نہیں چلتا کہ جوڑ کہاں ہے۔ اسے آپاں ماجاں کے کارندے مسالا لگا کر بڑی صفائی سے جوڑ دیتے ہیں۔'' ماجھاں کو ماجاں کہتے ہوئے اس کے چہرے پر شریر سی چمک آجاتی تھی۔

عمو نے کہا۔ ''بھاراجے! تم نے یہ کیوں کہا ہے کہ یہ گھاٹے کا سودا تم میرے اور شبو کے لیے کر رہے ہو؟''

اس نے اپنے لمبے بالوں کو سہلایا اور بولا۔ ''یارا! ان تربوزوں کی آڑ میں ہی تو تم دونوں کو یہاں سے لے کر جانا ہے۔ لوڈر پر تربوزوں کا ڈھیر ہوگا اور اس کے اندر ہی تمہارے بیٹھنے کے لیے جگہ ہوگی۔''

''بھاراجے! کہیں تربوزوں کے نیچے ہماری سانس ہی نہ گھٹ جائے۔ تم نے دیکھا ہی ہے، شبانہ تو ویسے بھی ملوک سی ہے۔''

''اور یہ تربوز بھی تو دیکھو ملوک سے ہیں۔ بڑے خربوزے جتنا سائز ہے ان کا۔'' راجا نے تربوز کو ہاتھوں میں گھمایا۔

☆☆☆

قریباً اڑتالیس گھنٹے بعد وہ تینوں حویلی سے نکلنے کے لیے بالکل تیار تھے۔ راجا کو صبح سویرے حویلی سے روانہ ہونا تھا۔ کتوں والے تین پنجرے اور تربوزات کو ہی لوڈر پر بار کر دیے گئے تھے۔ آدھی رات کے بعد راجا نے ان تربوزوں میں سے پچیس تیس دانے علیحدہ کر کے ڈیرے میں پڑی پرالی کے اندر چھپا دیے۔ یہ تربوز کم ہونے سے اتنی گنجائش پیدا ہو گئی کہ عمو اور شبانہ بھی تربوزوں میں چھپ سکیں اور تربوزوں کا حجم بھی زیادہ نظر نہ آئے۔ مویشی خانے میں اپنے دیرینہ ساتھی مولے سے عمو نے رات ہی کو الوداعی ملاقات کرلی تھی۔ بہرحال، مولے کو یہ ہرگز پتا نہیں تھا کہ یہ الوداعی ملاقات ہے۔ پروگرام کے مطابق صبح اجالا ہونے سے پہلے ہی عمو اور شبانہ ڈیرے پر راجا کے پاس پہنچ گئے۔ راجا نے بڑی احتیاط سے انہیں خستہ حال لوڈر کے اندر تربوزوں میں چھپا دیا۔ تربوزوں کے اندر خلا موجود تھا، اس لیے عمو اور شبانہ کو سانس لینے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی۔ بہرطور پھل کا بوجھ وہ اپنے جسموں پر ضرور محسوس کر رہے تھے۔ لگتا تھا کہ حالات ان کے حق میں ہیں۔ آدھی رات کے وقت ہی ماجھاں تین گھڑ سواروں کے ساتھ کہیں چلی گئی تھی۔ ان میں عقابی آنکھوں والا ماکھا بھی شامل تھا۔ کہا جا رہا تھا کہ ماجھاں کا ڈکیت بھائی کسی پاس کے گاؤں میں آیا ہوا ہے اور وہ اس سے ملنے گئی ہے۔

صبح کے ملگجے میں راجا کا لوڈر ایک جگر پاش آواز کے ساتھ اسٹارٹ ہوا۔ یوں لگا کہ پوری حویلی اس کی پاٹ دار آواز سے تھرتھرانے لگی ہے۔ وہ اتنا دھواں اگل رہا تھا کہ کئی ٹرک ایک ساتھ مل کر بھی نہیں اگل سکتے تھے۔ کچھ دیر اس کے پہیوں نے حرکت کی اور وہ حویلی کے بڑے پھاٹک سے گزر کر کچے راستے پر آگیا۔ یہاں ماجھاں کے مسلح کارندے

موجود تھے اور وہ جانتے تھے کہ اس لوڈر میں کیا جارہا ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ ''جو کچھ'' جارہا ہے اس کے نیچے کیا جارہا ہے۔

کیکراں گاؤں کی مختلف گلیوں سے گزرنے کے بعد لوڈر باہر جانے والے کشادہ راستے پر آگیا۔ گاہے بگاہے راجا کی چہکتی ہوئی آواز عمو اور شبانہ کے کانوں تک پہنچتی تھی۔ وہ راہ میں ملنے والے کسی شخص کو سلام کرتا یا اس کے سلام کا جواب دیتا تھا۔ ان ملنے والوں میں زیادہ تر یقیناً ماجھاں کے کارندے ہی تھے۔

لوڈر کے اندر تربوزوں کے نیچے عمو اور شبانہ ایک دوسرے سے پیوست ہوکر لیٹے تھے، ایسا کرنا ان کی مجبوری تھی۔ صورتِ حال تناؤ بھری تھی، اس کے باوجود شبانہ کے جسم کا پُرگداز لمس عمو کے سراپا میں سنسنی دوڑا رہا تھا۔ اس نے اپنے ہونٹ شبانہ کے چھوٹے چھوٹے ملائم بالوں پر رکھ دیے اور سرگوشی میں بولا۔ ''شبو! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں، ہم ساتھ جئیں مریں گے۔''

''میں بھی...'' شبّو نے اپنا چہرہ اس کے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ اس کی خوب صورت ناک کی چبھن اپنے سینے پر عمو کو بڑی بھلی محسوس ہوئی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اسے اپنی بانہوں میں چھپالے۔ اسے اتنا پیار کرے کہ گزرے ماہ و سال کے ان سارے زخموں کا مداوا ہوجائے جو اس کے کومل جسم پر لگے ہیں۔

لوڈر کو لگنے والے جھٹکے بتا رہے تھے کہ اب اس کی رفتار تیز ہوگئی ہے۔ ان جھٹکوں کے ساتھ تربوزوں کا بوجھ بھی تکلیف دہ ہوتا جارہا تھا۔ کبھی کبھی شبانہ کو کراہنا پڑتا اور وہ کسمسانے لگتی۔ ایک جگہ پہنچ کر لوڈر کی رفتار سست ہونے لگی اور پھر وہ رک گیا... عمو سمجھ گیا کہ اب وہ خطرے سے باہر ہیں اور راجا شاید ان پر سے تربوزوں کا بوجھ کم کرنے کا ارادہ رکھتا ہے... لیکن اصل صورتِ حال بالکل مختلف تھی۔ عمو اور شبانہ اس سے یکسر بے خبر تھے...

چند سیکنڈ بعد انہیں اپنے اردگرد گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں اور پھر ایک پاٹ دار آواز سن کر عمو کا کلیجا منہ کو آگیا۔ یہ ماجھاں کی آواز تھی اور وہ راجا سے اس کا حال چال پوچھ رہی تھی۔ اس کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ وہ اپنے کام سے فارغ ہوکر واپس گاؤں کی طرف جارہی ہے۔

شبانہ کے پورے جسم پر لرزہ طاری ہوگیا اور وہ سہم کر عمو سے چمٹ سی گئی۔ چند لمحے بعد صورتِ حال مزید سنگین ہوگئی۔ ماجھاں کی آواز آئی۔ اس نے راجا سے پوچھا۔ ''مال ٹھیک ٹھاک جارہا ہے؟''

''بالکل ٹیٹ آپاں۔'' راجا نے مختصر جواب دیا۔

ماجھاں تربوزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ کسی کسی تربوز کو وہ انگلی کی گانٹھ سے ٹھونک کر بھی چیک کرتی۔ عمو کا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ وہ دونوں کسی بھی وقت ماجھاں کی نظر میں آسکتے تھے۔ وہ دم سادھے لیٹے رہے۔ یکا یک عمو کے پاؤں کے پاس حرکت ہوئی۔ وہاں سے تربوز اٹھایا گیا تھا۔ عمو کا پاؤں ننگا ہوچکا تھا۔ دو سیکنڈ بعد ماجھاں کی پُرحیرت آواز عمو کے کانوں میں پڑی۔ ''اوئے... یہ کیا ہے؟''

اس کے ساتھ ہی عمو نے ایک کرخت گرفت اپنے ٹخنے پر محسوس کی۔ یقیناً یہ ماجھاں ہی تھی۔ اس نے عمو کی ٹانگ کو پوری طاقت سے کھینچا اور اسے تربوزوں کے نیچے سے باہر گھسیٹ لیا۔ سورج کی چمکیلی کرنوں میں عمو نے ماجھاں کا بہت بڑا تھوبڑا دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں غضب ناک چمک تھی اور اس کی رنگت ''سیاہی مائل سرخ'' ہورہی تھی۔ عمو نے دیکھا کہ راجا لپک کر دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا ہے۔ عمو کے اندر ایک مدت سے دھیرے دھیرے جو بغاوت پروان چڑھ رہی تھی، وہ یکا یک توانائی بن کر اس کے دست و بازو میں دوڑ گئی۔ اُن گنت شب و روز سے سینے کے اندر سلگتا ہوا انگارہ دفعتاً شعلہ جوالا بن گیا۔ عمو نے پوری طاقت سے اپنا دایاں ہاتھ گھمایا اور ماجھاں کے چربی دار تھوبڑے کو نشانہ بنایا۔ یہ مکا نہیں تھا، نہ ہی تھپڑ تھا۔ یہ دونوں کی درمیانی شکل تھی... یہ بڑی کارگر ضرب تھی۔ اور کیوں نہ ہوتی... اس کے پیچھے بہت سے زخموں کا درد، بہت سے دکھوں کی تلخی اور بہت سی توہین کا زہریلا احساس موجود تھا۔ اس چوٹ نے ''چٹاخ'' کی آواز پیدا کی اور ماجھاں اپنے تنومند جسم کے ساتھ اچھل کر دور جا گری۔ اس کا چہرہ حیرت کی تصویر بن گیا۔

یہی وقت تھا جب ماکھے نے عمو کو ایک گندی گالی دی اور اچھل کر لوڈر پر چڑھا۔ اب عمو کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ یہ چاقو اسے راجا نے ہی علی الصباح دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ ماکھا اپنی رائفل کندھے سے اتارتا اور اسے عمو اور شبانہ کی طرف سیدھا کرتا، عمو ایک چنگھاڑ کے ساتھ اس پر حملہ آور ہوا۔ راجا نے اسے تاکید کی تھی کہ کسی کو جان سے نہیں مارنا ہے۔ اگر یہ تاکید عمو کے ذہن میں نہ ہوتی تو وہ شاید سیدھا ماکھے کے پیٹ میں چاقو گھونپتا لیکن اس نے ماکھے کی ٹانگوں کو نشانہ بنایا۔ پہلے اس نے ماکھے کی بائیں ران میں دستے تک چاقو اتارا پھر اس کی دائیں ران پر جانگ کے بالکل پاس وار کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سر کی شدید ضرب ماکھے کے پیٹ میں لگا کر اسے لوڈر سے نیچے پھینک دیا۔ اس وقت تک لوڈر حرکت میں آچکا تھا اور اپنے پیچھے سیاہ دھوئیں کے بادل چھوڑتا رفتار پکڑ رہا تھا۔

''تیز چلاؤ بھراجے۔'' عمو نے پکار کر کہا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں خون آلود چاقو تھا اور اس کے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔

اس نے زخمی ماکھے کو گرد میں لوٹ پوٹ ہوتے دیکھا۔ باقی دو افراد ماجھاں سمیت تیزی سے گھوڑوں پر سوار ہوتے نظر آئے۔ دھول سے اٹے ہوئے اونچے نیچے راستے پر راجا کا پاٹے خاں تیزی سے بھاگتا چلا گیا۔ اس نے غیر متوقع رفتار پکڑ لی اور اس رفتار کی وجہ سے بعض جگہ کئی کئی فٹ اچھل رہا تھا۔ خطرے کو محسوس کر کے کتے قیامت خیز شور مچا رہے تھے۔ تربوز لڑھک لڑھک کر لوڈر سے نیچے گرتے چلے جارہے تھے۔ خود کو گرنے سے بچانے کے لیے عمو اور شبانہ نیچے بیٹھ گئے اور ایک اینگل آئرن کا سہارا لے لیا۔

''وہ... وہ پیچھے آرہے ہیں۔'' عمو نے چلّا کر راجا کو اطلاع دی۔

''جو آتا ہے آنے دو۔'' کیبن کی طرف سے راجا کی پُرجوش آواز آئی اور اس کے ساتھ لوڈر کی رفتار کچھ اور تیز ہوگئی۔

ماجھاں کے دونوں ساتھیوں میں سے کالیے کے کندھے پر رائفل موجود تھی۔ تاہم بھگدڑ بھاگتے ہوئے گھوڑے پر سے گولی چلانا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ لوڈر کی طرف دو تین فائر کیے گئے مگر ان میں سے کوئی لوڈر کو نہیں لگا۔ عمو نے دیکھا، سامنے ایک بہت بڑا بارشی جوہڑ تھا اور راستہ بند نظر آتا تھا۔ دائیں بائیں اونچے اونچے کھیتوں نے راستہ مسدود کر رکھا تھا۔ ''ہائے... اب کیا ہوگا؟'' شبانہ نے بالکل مری ہوئی آواز میں کہا۔

یہی سوال عمو کے دماغ میں بھی تھا لیکن پھر یہ دیکھ کر عمو کو حیرت ہوئی کہ راجا نے لوڈر کو بلاتردد جوہڑ میں اتار دیا ہے۔ کھٹارا لوڈر کا سائیلنسر تھوڑی سی بلندی پر لگایا گیا تھا تاکہ پانی وغیرہ سے محفوظ رہے۔ یہ جان کر عمو کو حیرت ہوئی کہ لوڈر جیسے تیسے ہچکولے کھاتا اس ڈھائی تین فٹ اونچے پانی سے گزرتا چلا گیا۔ عقب میں دھول اور دھوئیں کے بادل چھٹ گئے تھے۔ ماجھاں اور اس کے دونوں ساتھی نظر آرہے تھے۔ ماجھاں کے دونوں ساتھی گھڑسوار تو جوہڑ کے کنارے کنارے بائیں طرف بھاگے تاکہ کلاداکاٹ کر جوہڑ کی دوسری طرف پہنچ جائیں مگر مشتعل ماجھاں نے اس نصف فرلانگ چوڑے جوہڑ کا چکر کاٹنے کا رسک نہیں لیا اور اپنا گھوڑا لوڈر کے پیچھے ہی سیدھا جوہڑ میں ڈال دیا۔ غیظ و غضب نے اسے جیسے دیوانہ کر رکھا تھا۔ جوہڑ کے درمیان پہنچ کر ماجھاں کے گھوڑے نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ ماجھاں نیچے اتری اور پاپیادہ ہی لوڈر کے پیچھے لپکی۔ وہ کسی فربہ اندام آبی مخلوق کی طرح نظر آرہی تھی۔ وہ چلّا رہی تھی اور لوڈر کے قریب پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لوڈر یعنی راجا کے پاٹے خاں نے توقع سے بڑھ کر اس کا ساتھ دیا اور جوہڑ سے نکلنے میں کامیاب ہوا۔ ماجھاں تب تک کافی نزدیک پہنچ چکی تھی۔ اس کے پاس پستول نہیں تھا ورنہ اس موقع پر وہ ضرور فائر کرتی۔ راجا کے پاس بھرا ہوا پستول موجود تھا لیکن اس نے یہ ساری کارروائی شروع ہونے سے پہلے ہی عمو کو سمجھا دیا تھا کہ وہ کسی کو جان سے مارنے کا رسک نہیں لیں گے۔ اگر بہت زیادہ پھنس گئے تو پھر زخمی کرنے کی حد تک جائیں گے۔

جونہی پاٹے خاں خشکی پر پہنچا، ماجھاں بھی پہنچ گئی۔ اس کا جسم فربہ ضرور تھا لیکن ساتھ ہی صحت مند اور زور آور بھی تھا۔ یہ وقت ضرورت وہ خاطر خواہ پھرتی کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اب بھی وہ اپنے گھٹے ہوئے جسم کی پوری توانائی کے ساتھ پاٹے خاں کے پیچھے لپکی تاکہ اس پر ہاتھ ڈال سکے اور پھر پائدان پر پاؤں رکھ کر اس پر چڑھ سکے۔ اور وہ جانتی تھی کہ یہ کام اسے پاٹے خاں کے رفتار پکڑنے سے پہلے پہلے کرنا ہے... یہ بس سیکنڈوں کا کھیل تھا۔ اس نے بھاگتے بھاگتے تیزی سے پاٹے خاں پر ہاتھ ڈالا۔ آہنی کنارہ اس کے ہاتھ میں آیا... مگر اس کا پاؤں ٹھیک سے پائدان پر نہیں پڑا۔ وہ گری اور پھر لوڈر کے ساتھ گھسٹتی چلی گئی۔

شبانہ عمو سے چمٹی ہوئی تھی اور چلّا رہی تھی۔ اس کے لیے ماجھاں کسی ''موذی جانور'' کی طرح تھی جو لوڈر پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند سیکنڈ کے لیے عمو حیران ہوا کہ ماجھاں کی گرفت کتنی مضبوط ہے جو وہ بھاری تن و توش کے ساتھ لوڈر کے پیچھے گھسٹتی چلی آرہی ہے۔ مگر پھر اسے اصل حقیقت کا پتا چلا۔ ماجھاں کی کلائی کا موٹا دھاتی کڑا لوڈر کے ایک زیریں ہُک میں اٹک گیا تھا۔ ایسے ہُک عموماً ترپال وغیرہ تاننے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

راجا نے چلتے لوڈر کی کھڑکی سے سر نکال کر پیچھے دیکھنے کی کوشش کی پھر پکار کر پوچھا۔ ''کہاں ہے ماچاں؟''

''پیچھے گھسٹ رہی ہے۔ چھوڑ نہیں رہی۔'' عمو ہانپتی آواز میں بولا۔

''چھڑا دو۔ کوئی چیز مار دو۔''

"اس کا کڑا ہک میں پھنس گیا ہے۔"

"زور لگا کر نکال دو۔" راجا پکارا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ دونوں گھڑ سواروں نے جوہڑ کا چکر مکمل کر لیا ہے اور اب تیزی سے لوڈر کے پیچھے آرہے ہیں۔

تنومند ماجھاں کے لوڈر کے پیچھے گھسٹنے کا منظر دیدنی تھا۔ وہ قریباً کندھوں تک گھسٹ رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ غضب ناک انداز میں چلا بھی رہی تھی۔ وہ گاہے بگاہے اپنا دوسرا ہاتھ استعمال کرتی تھی اور کڑے کو ہک سے نکالنے کی کوشش کرتی تھی... لوڈر کو لگنے والے کسی جھٹکے کی وجہ سے کڑا خود بخود بھی ہک میں سے نکل سکتا تھا... عمو کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ نفرت الاؤ بن چکی تھی۔ ماں بہن کی وہ اَن گنت گالیاں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں جو گزرے ماہ وسال میں اسے دی گئی تھیں۔ وہ سارے تھپڑ، وہ سارے زخم، ساری توہین اور وہ سارے کراہت آمیز لمحے اس کے تصور میں تھے جن سے اس کا واسطہ پڑتا رہا تھا۔

اس نے ماجھاں کی کلائی اور آہنی ہک کو اس طرح اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیا کہ ان کے "جدا" ہونے کا امکان کم سے کم ہو گیا۔ فرنٹ سیٹ پر سے راجا کی آواز آئی۔ "ہاں عمو! کڑا چھوٹ گیا؟"

"نہیں بھارا جے... بُری طرح پھنسا ہوا ہے۔" وہ ایسے انداز میں بولا جیسے کڑا چھڑانے کے لیے زور لگا رہا ہو۔ حالانکہ وہ کڑا پھنسائے رکھنے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا سفاک جھوٹ تھا جو اس نے بولا... ماجھاں کی موت کا منظر بڑا بھیانک تھا۔ وہ لوڈر کے پیچھے گھسٹتے ہوئے اچھل رہی تھی، پلٹ رہی تھی، چلا رہی تھی۔ اس کا چربیلا جسم لہو لہو ہو رہا تھا۔ کپڑے پھٹ رہے تھے، چمڑی اتر رہی تھی۔ کچے راستے کے کنارے، ایک درخت کے کٹے ہوئے تنے سے وہ ٹکرائی، اس کا لہولہان چہرہ ایک طرف سے پچکا ہوا نظر آیا۔ اپنی آنکھوں کو ان مناظر سے محفوظ رکھنے کے لیے شبانہ لوڈر کے فرش پر بیٹھ گئی تھی اور اپنا چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا تھا۔

راجا جانتا تھا کہ کالیا اور اس کے ساتھی گھوڑوں پر سوار تیزی سے پیچھے آرہے ہیں۔ وہ اپنے "پاٹے خاں" کی رفتار کم نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے پھر چلا کر پوچھا۔ "کڑا چھوٹا؟"

"نہیں بھارا جے۔" عمو نے پھر وہی جواب دیا۔

ماجھاں اب تقریباً ایک لاش میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اس کے جسم کے کئی حصوں کے چیتھڑے اڑ چکے تھے۔ اس میں زندگی کی کوئی رمق نہ دیکھنے کے بعد عمو نے اس کی کلائی اپنی طرف کھینچ کر تھوڑا سا زور لگایا اور دھاتی کڑے کو ہک میں سے نکال دیا۔ ماجھاں کی خونچکاں لاش چند پلٹیاں کھا کر کنارے پر اگی ہوئی جھاڑی میں جا رکی۔

لوڈر کی رفتار ایک دم تیز ہو گئی۔ عقب میں دھول کے بادل کچھ اور دبیز ہو گئے۔ کچھ ہی دیر بعد ماجھاں اور اس کے دونوں ساتھی ان بادلوں کی اوٹ میں اوجھل ہو گئے۔

☆☆☆

راجا کا مکان ٹھیکرا نامی گاؤں میں تھا۔ مکان کا احاطہ کافی بڑا تھا۔ ایک طرف گھوڑوں کو سدھانے اور بھگانے کے لیے علیحدہ جگہ تھی۔ لوہے کے کئی زنگ آلود پنجرے بھی یہاں نظر آرہے تھے۔ عمو نے ماجھاں کو بہت بُری حالت میں دیکھا تھا لیکن وہ ابھی تک یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ مری ہے یا نہیں۔

راجا از حد پریشان تھا۔ وہ جلد از جلد جاننا چاہتا تھا کہ ماجھاں پر کیا بیتی ہے۔ عمو اور شبانہ کو گھر چھوڑ کر وہ باہر نکل گیا۔ اس کی واپسی قریباً آدھ گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ آندھی طوفان کی طرح آیا تھا۔ کتوں والے پنجرے اور بچے کھچے تربوز ابھی تک لوڈر میں ہی تھے۔ راجا آتے ساتھ ہی چلایا۔ "عمو... جلدی کرو۔ ہمیں یہاں سے نکلنا پڑے گا۔ بس دو منٹ لگاؤ۔"

"کیا ہوا ہے؟"

"جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ مر گئی ہے۔ کیکراں میں تڑتھلی مچی ہوئی ہے۔ اب کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" اس نے لوہے کا ایک پنجرہ گھسیٹ کر لوڈر کے قریب کیا۔ اس میں کتے کے چند چھوٹے پلے تھے۔

عمو نے اس خبر پر بظاہر دکھی چہرہ بنایا لیکن درحقیقت اس کے سینے میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ راجا کے ساتھ مل کر اس نے پلوں والا پنجرہ لوڈر پر چڑھایا۔ راجا نے افراتفری میں کچھ چیزیں ایک بیگ میں رکھیں اور لوڈر میں آبیٹھا۔ اس کے اشارے پر عمو اور شبانہ بھی سوار ہو گئے۔ پاٹے خاں کا انجن پُرشور آواز سے بیدار ہوا۔ غالباً سائیلنسر کو نقصان پہنچنے سے پاٹے خاں کچھ اور بھی "پاٹے خاں" ہو گیا تھا۔ دو منٹ کے اندر اندر وہ لوگ گھر چھوڑ چکے تھے اور تیز رفتاری سے کسی نامعلوم مقام کی طرف جا رہے تھے۔

شبانہ کا رنگ بالکل ہلدی ہو رہا تھا۔ اس کے لیے وہ مناظر ہی کم خوفناک نہیں تھے جو جوہڑ سے نکلنے کے بعد پیش آئے تھے۔ اب وہ ماجھاں کی موت کی مصدقہ اطلاع بھی سن رہی تھی... اور ماجھاں کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔ وہ اس علاقے کی "پھولن دیوی" تھی۔ ہر جگہ اس کے تعلقات تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ناجے جیسے ڈکیت کی بہن تھی۔ اگر



راجا پریشان تھا تو اس کی پریشانی سمجھ میں آتی تھی۔

اس مرتبہ پاٹے خاں پر ان کا سفر بغیر رکے قریباً آٹھ گھنٹے جاری رہا۔ ڈیزل ختم ہو گیا تو کیبن میں رکھا ہوا ایک "کین" کام آیا۔ ایک جگہ انہیں سخت جان پاٹے خاں کا پہیا بھی تبدیل کرنا پڑا۔ ان کا سارا سفر کچے راستوں اور بے آباد زمینوں کا تھا۔ چھوٹے موٹے ٹیلے اور کٹی پھٹی زمین ان کے راستے میں آرہی تھی۔

وہ اب پنجاب کی ایک اور دور دراز بستی میں پہنچے۔ اس کا نام شادپورہ تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ یہاں سے قریب ترین پکی سڑک قریباً بیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ نزدیکی شہر خوشاب تھا اور اس کا فاصلہ بھی کم وبیش چالیس کلومیٹر تھا۔ شادپورہ سے باہر ہی آموں کا ایک بڑا باغ تھا۔ اس باغ کے اندر ایک کھلے احاطے والا گھر تھا۔ یہ باغ اور جگہ کبیر احمد نامی ایک ادھیڑ عمر شخص کی ملکیت تھی۔ وہ ایک ٹانگ سے معذور تھا اور بیساکھی کے سہارے چلتا تھا۔ دو تین سال پہلے کبیر کو راجا نے ایک بڑے حادثے سے بچایا تھا۔ ان دنوں کبیر کی اپنی ٹریکٹر ٹرالی تھی۔ وہ پھل بیچ کر خوشاب منڈی سے گاؤں واپس آرہا تھا۔ ٹوانا کے قریب اسے موٹر سائیکل سوار راہزنوں نے روک لیا اور لوٹنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اس کی ٹانگ میں گولی ماری۔ فائر کی آواز سن کر راجا اپنے لوڈر پر وہاں پہنچا۔ اس کے پاس پستول تھا۔ اس نے ہوائی فائر کیے اور ڈاکوؤں نے اس پر سیدھی فائرنگ کر دی۔ دونوں طرف سے گولیاں چلیں۔ ڈاکوؤں کا ایک ساتھی شدید زخمی ہوا، دوسرے کو راجا نے پکڑ لیا تھا۔ اردگرد کے کھیت مزدور موقع پر پہنچ گئے اور ڈاکو فرار ہو گئے۔

کبیر احمد اس واقعے کے بعد راجا کا بہت زیادہ احسان مند تھا۔ اس نے دو تین بار راجا کو خط لکھا کہ وہ اس... شادپورہ آئے۔ وہ خود تو ٹانگ کے زخم کی وجہ سے جانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اب راجا، عمو اور شبا... شخص کے پاس پناہ کے لیے پہنچا تھا۔

چالیس پینتالیس سالہ کبیر احمد ایک ہمدرد شخص ثابت ہوا۔ اس نے ان تینوں... ہونے دیا کہ وہ کسی اجنبی جگہ پر ہیں۔ را... کہانی تو نہیں سنائی تھی، تاہم بتایا تھا ک... اسے کم از کم ڈیڑھ دو ماہ کے لیے... نے مسکرا کر کہا تھا۔ "ڈیڑھ دو ماہ ک... تک جاؤ۔ یہ دیکھو، باغ اجڑ رہا... جو اسے سنبھالے گا۔ گھر والی ا...

...ن کا مداوا بھی کسی... لگتا ہے۔

بیٹی تھی جو بیاہ کر اپنے گھر کی ہو گئی ہے۔ بیٹا ایسا دبئی گیا ہے کہ اس نے چھ سال سے پلٹ کر نہیں دیکھا۔"

یہ بڑی ٹھنڈی اور پُرسکون جگہ تھی۔ ہر طرف درختوں کے سائے تھے۔ کبیر نے ایک چھوٹا ٹیوب ویل لگا رکھا تھا جسے پمپی کہتے تھے۔ یہ پمپی ڈیزل انجن سے چلتی تھی۔ کبیر نے شاید اپنی تنہائی کم کرنے کے لیے بہت سی مرغیاں، بطخیں اور طوطے پال رکھے تھے۔ کچھ بطخیں اور مرغیاں بہت مہنگی تھیں جنہیں وہ لاہور سے لے کر آیا تھا۔ کبیر یہاں اپنے نہایت قابلِ اعتماد ملازم محمد شریف اور اس کی بیوی مریم کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ دونوں بے اولاد تھے۔ کبیر نے عمو کو پتر اور شبانہ کو دھی رانی کہہ کر بلانا شروع کر دیا۔ راجا کو وہ اس کے نام سے بلاتا تھا۔ راجا اسے وڈا بھا کہتا تھا۔ گاؤں میں کبیر نے اپنے ملنے والوں کو یہی بتایا کہ یہ اس کے دور پار کے رشتے دار ہیں۔

وہ تینوں ایک نہایت محفوظ مقام پر آ گئے تھے، اس کے باوجود راجا، عمو اور شبانہ کے دلوں میں ماجھاں کی موت کا خوف موجود تھا۔ یقینی بات تھی کہ علاقے میں بڑی کھلبلی مچی ہو گی۔ شبانہ کو یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں اس واقعے کی وجہ سے اس کی والدہ اور دیگر رشتے داروں پر کوئی آفت نہ آئے۔ وہ ہر وقت گم صم رہتی۔ عمو اور راجا اس کی دل جوئی میں لگے رہتے۔ وہ ہر آہٹ پر چونک جاتی۔ ہر اجنبی کو دیکھ کر اس کی آنکھوں کا رنگ پیلا پڑ جاتا۔ بہر حال جب بیس پچیس روز خیریت سے گزر گئے تو بتدریج ان کا خوف کم ہونے لگا۔ انہوں نے بھانپ لیا... ت سے ہیں۔

...مزیدار ہوا چل رہی تھی۔ عمو اور... لیٹے تھے اور سگریٹ... راجا!

...چاندنی میں اس کی... ی اور بال جواب کافی... طرح چمک رہے تھے۔
...یہ بالکل رام ہے... دیکھو... کیسے

"لل... لیکن یہ تو بہت خطرناک ہے۔ اس نے تو راجا بھائی کو بھی زخمی کر دیا تھا۔"

"مگر ہمیں نہیں کرے گا۔ یہ دیکھو، کس طرح لوٹنیں لگا رہا ہے۔" عمو نے سرگوشی میں کہا۔ شبو حیرت زدہ تھی۔ اسے

بھیجوں۔ سب کچھ معلوم کر لے گا۔ اس کے بعد ہم فیصلہ کریں گے کہ کیا کرنا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہم ماں جی کو یہیں بلا لیں۔"

اس رات وہ اس بارے میں دیر تک بات کرتے رہے۔ شبانہ کا معاملہ بھی زیرِ بحث آیا۔ راجا نے عمو کا بازو دباتے ہوئے کہا۔ "میں تو ایک بات جانتا ہوں عمو! جو کرنا ہے کرو، دنیا سے مت ڈرو۔ یہ دنیا کمینی ایک دم کنڈم ہے۔ تم شبانہ سے پیار کرتے ہو، وہ تم سے کرتی ہے۔ اس کا پہلا رشتہ کنڈم ہو چکا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ یہاں کسی مولوی کو بلا لاتے ہیں۔ ایک گریٹ سا کھانا پکاتے ہیں۔ خود کھاتے ہیں، مولوی صاحب کو بھی کھلاتے ہیں اور تمہارے دو بول پڑھا دیتے ہیں۔"

"یہ اتنی جلدی کیسے ہوسکتا ہے بھارا جا! کم از کم ماں کو تو یہاں ہونا چاہیے اور پھر ابھی تو میں نے شبّو سے بھی ٹھیک طرح بات نہیں کی۔ کیا پتا، وہ اس طرح شادی پر راضی بھی ہو یا نہیں۔"

"تُو نرا بدھو ہے۔ پیارے ہم زنانی کی چال دیکھ کر اس کے پورے خاندان کے بارے میں بتا دیتے ہیں۔ وہ تجھ پر سو جان سے مرتی ہے کھوتے۔ ہاں، ماں کے یہاں پہنچنے والی بات پر غور کیا جا سکتا ہے۔"

اچانک رات کے سناٹے میں بطخوں کی خوفناک قیں قیں گونجی اور اس کے ساتھ ہی شکاری کتے کا زبردست شور سنائی دیا۔ عمو اور راجا بھاگتے ہوئے سیڑھیاں اترے۔ صحن کا منظر خوفناک تھا۔ راجا کا گرے ہاؤنڈ کتا جسے اس کی شعلہ مزاجی کی وجہ سے راجا علیحدہ پنجرے میں بند کرتا تھا، کسی طرح باہر نکل آیا۔ شاید پنجرے کا دروازہ ٹھیک سے بند نہیں ہوا تھا۔ اب یہ کتا کبیر احمد کی نایاب بطخوں پر حملہ آور تھا۔ وہ ایک بطخ کو ادھیڑ کر پھینک چکا تھا اور اب دوسری پر حملہ آور ہو رہا تھا۔ کبیر احمد بھی اپنی بیساکھی کے سہارے باہر نکل آیا تھا اور بُری طرح چلّا رہا تھا۔ کتے نے اب جس بطخ کو منہ میں دبوچا تھا، وہ نر یعنی بطخا تھا۔ چھ مادہ بطخوں کے لیے یہ نر کبیر احمد نے بڑی مشکلوں سے ڈھونڈا تھا۔ اب یہ پرندہ کسی بھی وقت ٹکڑوں میں تقسیم ہوسکتا تھا۔

"پارے... پارے۔" راجا نے کتے کو اس کے نام سے پکارا اور اسے روکنے کی کوشش کی۔ کتے نے فقط ایک سیکنڈ کے لیے تڑپتے ہوئے بطخے کو چھوڑا اور دوبارہ پکڑ لیا۔ وہ پوری طرح مشتعل تھا۔ "چھوڑ دے پارے۔ میں کہتا ہوں چھوڑ۔" راجا نے ایک بار پھر پارے کے پٹے پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

عمو بے ساختہ راجا کی مدد کے لیے آگے بڑھا۔ اس نے بھی پارے کو اس کے نام سے پکارا۔ یکا یک صورتِ حال میں ڈرامائی تبدیلی واقع ہوئی۔ کتے نے زخمی پرندے کو چھوڑا اور زبردست شور مچاتا ہوا احاطے میں چکرانے لگا۔

"رُک جا پارے... رک جا۔" عمو اس کے راستے میں آیا۔

یہ عمل خطرناک تھا مگر کارگر رہا۔ کتا عمو کے اردگرد چکرانے لگا۔ پھر چند ہی سیکنڈ بعد اس کے پاؤں میں لوٹنے لگا۔ عمو نے اس کی تھوتھنی سہلائی۔ اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور اپنے کلاوے میں لے لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے راجا کو اشارہ کیا۔ وہ پہلے سے تیار تھا، اس نے آگے بڑھ کر کتے کے منہ پر حفاظتی جالی چڑھا دی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اسے دوبارہ پنجرے کے اندر پہنچانے میں کامیاب ہوگئے۔

بڑے سائز کے خوب صورت بطخے کو زخم تو آئے تھے مگر طبی امداد سے اس کی جان بچائی جاسکتی تھی۔ کبیر احمد اور شریف اسے لے کر جلدی سے گودام کی طرف چلے گئے۔

اس واقعے نے راجا کی نظر میں عمو کی اہمیت اور بڑھا دی۔ عمو پر اس کے اعتماد میں بھی اضافہ ہوا۔ اگلی صبح جب ایک گرم اور طویل دوپہر کی شروعات ہورہی تھی اور وہ گھنے باغ کی ٹھنڈی چھاؤں میں چارپائیاں ڈالے بیٹھے تھے، راجا نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ "عمو یار! تیرے اندر کوئی بات ہے ضرور۔ شاید کسی پیر فقیر کی دعا ہے تجھے۔ پالتو جانور تجھ سے بڑی جلدی ہل جاتے ہیں۔"

"یہ بات تم ہی مجھے بتا رہے ہو۔ پہلے تو کسی نے نہیں کہا۔"

"پہلے کسی نے غور ہی نہیں کیا ہوگا۔ پر میرا تو کام ہی جانوروں کو سدھانا ہے... خاص طور سے اڑیل جانوروں کو۔"

"اچھا بھارا جا! مجھے یاد آیا، جب ہم ماجھاں کی حویلی سے نکلنے کا پروگرام بنا رہے تھے، تم نے کہا تھا کہ تمہاری ایک چھوٹی سی شرط ہے۔"

"ہاں... لیکن وہ کوئی ایسی خاص شرط نہیں ہے۔ تم آسانی سے پوری کر سکتے ہو... بلکہ اب تو یہ تمہارے فائدے میں بھی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کچھ عرصہ میرے ساتھ... میرے پاس ہی رہو۔ مجھے پورا یقین ہے کہ تم گھوڑوں اور شکاری کتوں کو سدھانے میں میری زبردست مدد کر سکتے ہو۔ اگر میں تمہیں کچھ خاص خاص گر بتا دوں تو تم دیکھتے ہی دیکھتے ماسٹر بن سکتے ہو۔ اور میں تمہیں سچ کہتا ہوں،



اس کام میں بڑا فائدہ ہے۔ ایک سدھایا ہوا ٹیٹ نسل کا کتا آرام سے پندرہ وی ہزار کا بک جاتا ہے۔ خرچہ وغیرہ نکال کر اس میں سے سات آٹھ ہزار تو بچ ہی جاتا ہے۔ یہ چودھری لوگ پیسے دے کر اپنے گھوڑوں کو بھی شکار کے لیے ٹرینڈ کرواتے ہیں۔"

"پر بھارا جے! میں تو ماں اور شبّو کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں اور پتا نہیں وہ یہاں رہنا چاہیں گی یا نہیں؟"

"جب ساری بات کا پتا تمہاری امی کو چلے گا تو دیکھنا وہ خود کہے گی کہ تم ابھی یہیں رہو۔ ماجھاں کی جان نہ جاتی تو پھر اور بات تھی۔ پر اب تو اس کے وارث ہم تینوں کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ وہ ہمیں دور دور تک ڈھونڈیں گے۔ ہم تینوں جتنے محفوظ اس جگہ ہیں، کہیں اور ہو ہی نہیں سکتے۔"

راجا کی باتوں میں وزن تھا۔ ابھی تک اس کی طرف سے کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی کہ عمو اس کے بارے میں شک وشبے کا شکار ہوتا۔ اس میں کچھ خامیاں خرابیاں ضرور تھیں۔ وہ شراب اور عورت کا شوقین بھی تھا لیکن عمو اور شبانہ سے اس کا رویّہ بہت اچھا تھا۔ شبانہ کے ساتھ اس کا رویّہ بڑے بھائی جیسا تھا۔

رات کو عمو سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو وہ ساری باتیں اس کے ذہن میں گھومنے لگیں جو آج دوپہر راجا کے ساتھ ہوئی تھیں۔ کل رات اس نے جس طرح مشتعل پارے کو کنٹرول کیا اور سنبھالا تھا، وہ خود اس کے لیے بھی حیران کن تھا۔ وہ سوچنے لگا کیا واقعی اس میں کوئی خاص صلاحیت موجود ہے... یا پیدا ہو رہی ہے؟ اسے کئی باتیں یاد آنے لگیں... جب ایک موقع پر ماجھاں نے سخت ناراض ہونے کے بعد اسے کتوں والی کوٹھڑی میں بند کرا دیا تھا تو وہ بہت سہما ہوا تھا۔ اسے پتا تھا کہ خوفناک کتے یہاں اس کا جینا حرام کر سکتے ہیں لیکن پھر ایک دو دن میں ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ کتوں نے اس کمرے میں اسے اپنے ساتھ شریک کر لیا ہے۔ اس صورتِ حال نے ماکھے اور کالیے دغیرہ کو بھی حیران کیا تھا۔ پھر اسے ڈیرے کی بھوری بھینس والا واقعہ یاد آیا۔ یہ بڑی شان دار بھینس تھی لیکن دودھ دھونے کے لیے کسی کو پاس نہیں پھٹکنے دیتی تھی۔ سب کوشش کر کے ہار گئے تھے مگر عمو نے دیکھتے ہی دیکھتے اسے رام کر لیا تھا۔

یہ باتیں یاد کر کے عمو کے اندر خوشی کی ایک لہر سی دوڑنے لگی۔ اس نے کہیں سے سنا تھا کہ قدرت جب دکھ دیتی ہے تو اس کا مداوا بھی کرتی ہے۔ کئی دفعہ دکھ بہت بڑا ہوتا ہے۔ انسان اندر سے ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے لیکن اس کا مداوا بھی کسی صورت میں آس پاس ہی موجود ہوتا ہے... اور اگر انسان ہمت نہ ہارے تو یہ "مداوا" اسے ملتا ہے۔ عمو کے لیے ماں سے جدائی کا دکھ بھی بہت بڑا تھا... ناقابلِ بیان و ناقابلِ برداشت... عمو نے یہ دکھ جھیلا تھا، شاید اسی دکھ کے اندر سے خوشی اور صلاحیت کی یہ چھوٹی سی کونپل پھوٹی تھی...

عمو عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس کے پہلو میں راجا اپنی چارپائی پر سو رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر کبیر احمد اور شریف کی چارپائیاں تھیں۔ شبّو نیچے برآمدے میں شریف کی بیوی کے ساتھ سو رہی تھی۔

عمو ننگے پاؤں آہستہ آہستہ کچی سیڑھیاں اتر کر نیچے احاطے میں آگیا۔ پارے کے پنجرے کی چابی اس نے راجا کے تکیے کے پاس سے اٹھا لی تھی۔ وہ پارے کے پنجرے تک پہنچا۔ پارا ایک غیر معمولی قد کاٹھ والا، نہایت طاقتور لیکن خطرناک جانور تھا۔ راجا بھی فی الحال اس کے قریب جاتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ عمو نے اس کا پنجرہ کھولا۔ ایک عجیب سا اعتماد تھا عمو کے اندر... سینے میں سنسنی خیز دھڑکنیں جاگی ہوئی تھیں۔ اپنے غیر معمولی اعتماد کے سہارے ہی عمو نے ہاتھ بڑھائے اور بگیاڑی یعنی حفاظتی جالی پارے کی تھوتھنی سے اتار دی۔ دروازہ کھلتے ہی پارا عمو کی طرف آیا۔ اس نے سیدھا اس کی گردن پر جھپٹا مارا۔ وہ چاہتا تو ایک ہی جھٹکے میں عمو کی شہ رگ ادھیڑ سکتا تھا لیکن یہ دوستانہ جھپٹا تھا۔ وہ اس کی گردن سے اپنی گرم تھوتھنی رگڑنے لگا۔ اس کا پارا صفت جسم مچل رہا تھا اور دُم کی گردش بڑی تیز تھی۔ عمو نے اس کی کمر اور تھوتھنی پر ہاتھ پھیرنا شروع کیا تو اس کی بے قراری کم ہوتی چلی گئی۔ اب وہ عمو کے پاؤں میں لوٹ رہا تھا اور ہولے ہولے اپنا جسم اس کے جسم سے رگڑ رہا تھا۔ اس کی ہلکی ہلکی آواز میں پسندیدگی کا اظہار تھا۔

یک لخت عمو چونک گیا۔ ایک ڈری ہوئی تیز سرگوشی عمو کے بالکل پاس سے ابھری۔ "یہ کیا کر رہے ہو عمو؟"

عمو نے مڑ کر دیکھا، یہ شبّو تھی۔ مدھم چاندنی میں اس کی پھول دار اوڑھنی سینے پر پھیلی ہوئی تھی اور بال جو اب کافی بڑے ہوگئے تھے، ریشم کی طرح چمک رہے تھے۔

"کچھ نہیں شبّو۔ یہ بالکل رام ہے... دیکھو... کیسے لاڈ کر رہا ہے۔"

"لل... لیکن یہ تو بہت خطرناک ہے۔ اس نے تو راجا بھائی کو بھی زخمی کر دیا تھا۔"

"مگر ہمیں نہیں کرے گا۔ یہ دیکھو، کس طرح لوٹیں لگا رہا ہے۔" عمو نے سرگوشی میں کہا۔ شبّو حیرت زدہ تھی۔ اسے

جیسے اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔

عمو اسے سہلا رہا تھا، پچکار رہا تھا اور گا ہے بگا ہے اپنے ساتھ لپٹا رہا تھا۔ شبانہ ڈرے ہوئے انداز میں کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ پھر عمو نے شبانہ کا حوصلہ مزید بڑھانے کے لیے اپنی ننگی کلائی پارے کے کھلے ہوئے جبڑے میں دے دی۔ ایک یقین تھا کہ پارا اسے نقصان نہیں پہنچائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ پارے نے عمو کی کلائی اپنے نہایت نکیلے دانتوں میں ہولے سے دبائے رکھی اور اپنی اداکیں دکھاتا رہا۔

''کہا ہے نا پاس آجاؤ۔ کچھ نہیں کہے گا۔'' عمو نے سرگوشی میں شبانہ کو پاس بلایا۔

وہ ہمت کر کے دو قدم آگے آگئی مگر وہ اب بھی خوف زدہ تھی۔ عمو بولا۔ ''چلو اس کی کمر پر ہاتھ لگاؤ۔''

''نہیں... نہیں۔'' وہ کچھ اور سمٹ گئی۔ ''اس کو پنجرے میں بند کردو۔'' وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

اس کی گھبراہٹ کو محسوس کر کے عمو نے پارے کو پنجرے کی طرف بلایا۔ وہ جو پنجرے میں واپس جاتے ہوئے راجا کو ناکوں چنے چبوا دیتا تھا، فوراً ہی پنجرے میں چلا گیا۔ دروازے کو اچھی طرح بند کرنے کے بعد عمو شبانہ کی طرف متوجہ ہوا۔ دونوں لکڑی کے خالی کریٹوں کے ایک ڈھیر کے پیچھے چھپی چارپائی پر جا بیٹھے۔ آج وہ کافی دنوں بعد ملی تھی۔ عمو نے اس کا ہاتھ پکڑا اور پھر بے قراری سے اپنے ساتھ لگا لیا۔

''یہ... تم سب کیسے کر لیتے ہو عمو؟'' وہ اس کے سینے سے لگی لگی منمنائی۔

''کیا مطلب؟''

''تم نے مالکن کے اتھرے گھوڑے ہیرے کو رام کر لیا۔ بھوری جیسی اڑیل بھینس تمہیں دودھ دینے لگی۔ تم کیا کرتے ہو؟''

''تمہیں بتاؤں؟'' وہ دبی دبی شرارت سے بولا۔

''ہاں بتاؤ۔'' وہ معصومیت سے کہنے لگی۔

عمو نے اسے اپنے ساتھ بھینچا۔ شبو نے خود کو پیچھے ہٹایا اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔ ''بتاؤ نا؟''

عمو نے گہری سانس لی اور مدھم چاندنی میں اپنے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''سچی بات ہے شبو! میں تو کچھ بھی نہیں کرتا۔ بھارا جا کہتا ہے کہ میرے ہتھ میں کرامات ہے۔ جانور مست ہو جاتا ہے...'' پھر وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''کیا تم کو لگتا ہے کہ میرے ہتھ میں کرامات ہے۔''

''کیا مطلب؟''

عمو نے بڑی نرمی سے اس کا ملائم گال سہلایا اور بولا۔

''کچھ لگا تمہیں؟''

وہ اس کی بات سمجھ کر ایک دم اپنے آپ میں سمٹ گئی اور شرما کر بولی۔ ''تم بڑے خراب ہو۔ کہیں کوئی جاگ نہ جائے۔ میں چلتی ہوں۔''

''تم... مجھ سے اتنا ڈرتی کیوں ہو؟''

''تم سے نہیں... لوگوں سے ڈرتی ہوں۔''

''کیا... تمہارا دل نہیں چاہتا... میرے پاس بیٹھنے کو؟''

''چاہتا ہے... پر... اس طرح سے نہیں۔'' وہ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑاتے ہوئے بولی۔

عمو کے اندر جیسے ایک دم سے کوئی روشنی بجھ گئی۔ وہ اداس ہو گیا۔ شبو جو جانے کے لیے بالکل تیار تھی، عمو کی اداسی محسوس کر کے رک گئی۔ کچھ دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے پھر شبو نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

عمو بولا۔ ''کبھی کبھی مجھے لگتا ہے شبو... جیسے جو کچھ ہے میرے ہی دل میں ہے۔ تیرے دل میں کچھ نہیں۔ بس مجبوری کی وجہ سے تو میرے ساتھ ہے۔''

وہ ٹھنڈی سانس بھر کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ کچھ دیر خاموش رہی، تب عجیب لہجے میں بولی۔ ''عمو! تجھے پتا ہے کہ میرا رشتہ کیوں ٹوٹا؟''

''کیوں ٹوٹا؟''

''اس لیے کہ میں نے اپنے پنڈ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ جب مالکن کے بندے مجھے اور تمہیں دریا سے پکڑ کر واپس لائے اور مالکن نے ہم دونوں کو مارا پیٹا تو اس کے ڈیڑھ دو مہینے بعد مالکن کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ میری ماں نے اس کا منت ترلا کیا، اس کے پاؤں کو ہاتھ لگائے اور اس نے ماں کو اجازت دے دی کہ وہ مجھے حویلی سے لے جا سکتی ہے۔ جہاں میرا رشتہ ہوا تھا، ان لوگوں کو کچھ پتا نہیں تھا کہ میرے ساتھ کیا ماملہ ہوا تھا۔ وہ میری ڈولی لے جانے کو تیار تھے، پر میں نے کہا کہ میں پنڈ نہیں جاؤں گی۔ میں... میں تمہارے پاس رہنا چاہتی تھی۔ مجھے یہ بھی پتا تھا کہ حویلی میں کسی وقت میرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے، پر میں تمہاری دوری برداشت نہیں کر سکتی تھی...'' شبو کی آواز بھرا گئی۔

عمو ٹھٹکا ہوا اس کی جانب دیکھتا رہا۔ اس حوالے سے ان دونوں میں چند سوال جواب مزید ہوئے۔ عمو کو یقین ہو گیا کہ شبو جو کچھ بتا رہی ہے، ویسا ہی ہوا ہے۔ اس کا اپنا دل بھی بھر آیا۔ اس نے شبو کو پھر گلے سے لگا لیا۔ وہ اس کے بھیگے رخساروں کو چومنے لگا۔ دونوں ایک دوسرے میں کھونے



لگے۔

عمو نے کہا۔ ''شبو! بھارا جا کہتا ہے، ہم دونوں شادی کر لیں۔''

''اپنے بڑوں کے بغیر ہم اکیلے یہ کیسے کر سکتے ہیں عمو! ہمیں کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ ابھی تو مجھے ہر وقت اپنی ماں اور ماموؤں کی فکر لگی رہتی ہے۔ ہماری برادری کافی بڑی ہے، پر سارے غریب لوگ ہیں۔ اگر مالکن کے مرنے کی وجہ سے ان پر کوئی آفت آئی تو وہ تو رُل کر رہ جائیں گے...''

''بھارا جا کہتا ہے، بس دو چار ہفتے گزر جائیں تو وہ شریف کو بھیج کر سارے حالات کا پتا کرا لے گا۔ پھر ہو سکتا ہے کہ کسی طرح میری اور تمہاری ماں بھی یہاں پہنچ جائیں۔ یا ہم ہی کہیں جا کر ان سے مل سکیں۔''

شبانہ الجھی الجھی نظروں سے عمو کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں چاندنی کا عکس تھا اور ایک سوالیہ رنگ بھی تھا۔ وہ بولی۔ ''عمو! ایک بات سچ بتانا۔ اس دن تم نے جان بوجھ کر مالکن ماجھاں کا کڑا گاڑی کے کنڈے سے نہیں چھڑایا تھا نا؟''

وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''نہیں شبو... میں نے تھوڑی سی کوشش تو کی تھی... شاید اس کا وقت پورا ہو چکا تھا۔''

''نہیں عمو! تم نے کوشش نہیں کی تھی... بلکہ... شاید تم نے یہ کوشش کی تھی کہ کہیں کڑا چھوٹ ہی نہ جائے... بولو... ایسا ہی ہے نا؟''

عمو کچھ دیر خاموش رہا، تب گہری سانس لے کر بولا۔ ''اگر تم جانتی ہو تو پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو؟''

اس کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ ''عمو! تم اپنی ماں سے بہت پیار کرتے ہو نا... اور تم نے ماجھاں کو اس لیے اس طرح مارا نا کہ وہ تمہاری ماں کو گالیاں دیتی تھی؟ بولو، ایسا ہی ہوا نا؟''

عمو کے نوخیز چہرے پر چٹان کی سی سختی نمودار ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، اندرونی کمروں سے کھٹ پٹ سنائی دی۔ پھر شریف کی بیوی مریم کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''شبو... شبو... کہاں ہو؟''

''ہائے میں مرگئی۔'' شبو نے اپنے سینے پر ہاتھ دھرا اور اوڑھنی سنبھالتی ہوئی اندرونی حصے کی طرف چلی گئی۔ عمو کچھ دیر تک اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ جب اندرونی حصے میں خاموشی چھا گئی اور وہ دونوں چارپائیوں پر لیٹ گئیں تو عمو پنجرے میں پارے کو پچکارنے کے بعد اوپر چھت کی طرف چلا گیا۔ ہزاروں بھرے آسمان کے نیچے بستر پر لیٹ کر وہ دیر تک شبو کے بارے میں سوچتا رہا۔ ماجھاں کے مویشی خانے میں اس کا دوست مولا کہا کرتا تھا، عورت ایک بجھارت کی طرح ہوتی ہے... اس کا اندر باہر کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ آج اسے پہلی بار پتا چلا تھا کہ ایک موقع پر ماجھاں نے شبو کو حویلی سے جانے کی اجازت دے دی تھی لیکن اس نے جان بوجھ کر حویلی کے خطروں کو نظر انداز کیا تھا اور وہیں پر اس کے ساتھ رہی تھی۔ اس طرح وہ اپنے رشتے سے بھی جان چھڑانے میں کامیاب ہو گئی تھی اور یہ سب کچھ عمو کے لیے تھا۔

تین چار ہفتے بعد عمو کے لیے شدید پریشانی کا دور شروع ہوا۔ راجا نے وعدے کے مطابق شریف کو عمو کی والدہ کا اتا پتا دے کر شیخوپورہ بھیجا اور اسے ساری ضروری ہدایات بھی دیں۔ شریف کی واپسی پورے چھ دن بعد ہوئی۔ عمو بہت بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ شریف کو عمو کے گاؤں سے پتا چلا کہ کوئی ایک سال پہلے عمو کی ماں شریفاں بی بی بیٹے کی جدائی میں سخت بیمار ہو گئی تھی۔ عمو کے پنڈ میں یہی مشہور تھا کہ عمو کی والدہ شریفاں بی بی اور گاؤں کے چودھری سجاول کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا۔ اس معاہدے کے مطابق شریفاں کے پتر عمران عرف عمو کو قریباً ڈیڑھ سال تک شہنشاہ پیر کے مزار پر خادم بن کر رہنا تھا تاکہ چودھری کے پُتر پر سے آسمانی بجلی والی نحوست ختم ہو سکے۔ اس کام کے لیے شریفاں بی بی نے چودھری سجاول سے کافی سارے پیسے لیے تھے اور اپنی زمین کے کاغذات وغیرہ بھی ٹھیک کروائے تھے۔ اس نے چودھری سجاول سے وعدہ کیا تھا کہ اس کا پُتر عمو پورے سترہ چاندوں تک شہنشاہ پیر کے مزار پر چاکری کرے گا لیکن صرف پانچ مہینے بعد ہی اس کا پُتر عمو مزار سے فرار ہو گیا۔ اسے ڈھونڈنے کی بڑی کوشش کی گئی، پر وہ نہیں ملا۔ کسی نے بتایا کہ وہ کراچی کی طرف نکل گیا ہے۔ مزار سے بھاگتے وقت اس نے مزار کا چندے والا گلا بھی توڑا تھا اور اس میں سے تین چار ہزار روپے نکال کر لے گیا تھا۔ صادق شاہ صاحب نے کہا تھا کہ چودھری سجاول کے پُتر والی نحوست اب اس بھگوڑے کے پیچھے ہے اور وہ کہیں بھی چلا جائے، چین سے نہیں رہ سکے گا... یہی حالات تھے جن میں عمو کی والدہ بیمار پڑی اور اس نے اپنی زمین اونے پونے داموں بیچ دی۔ اس کے بعد ایک دن پتا چلا کہ وہ پنڈ چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ اس کو بہت ڈھونڈا گیا مگر کہیں خبر نہیں ملی۔ اکثر لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسے اپنے پُتر عمو کا پتا چل گیا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے پاس پہنچ گئی ہے اور اب وہ سندھ کے کسی شہر میں چین سکون سے رہ رہے ہیں۔

شریف نے عمو کو تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''عمو! میں

پوری پوری پرچول کر کے آیا ہوں۔ تمہارے پنڈ میں دو دن رہنے کے بعد میں کوٹ لکھپت میں تمہارے رشتے دار نوازش علی کے گھر پہنچا۔ وہاں سے بھی ساری بات پتا کی۔ بھائی نوازش نے بھی وہی کچھ بتایا جو تمہارے پنڈ سے پتا چلا تھا۔ اس کے بعد میں ملتان گیا۔ مجھے پتا چلا تھا کہ وہاں ایک عورت تمہاری والدہ کی پرانی سہیلی ہے بلکہ منہ بولی بہن بنی ہوئی ہے۔ تمہاری والدہ وہاں بھی نہیں تھی۔ صغراں نامی یہ عورت خود بھی تمہاری والدہ کی گمشدگی پر سخت پریشان ہے اور کئی مہینوں سے اپنے طور پر اسے ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی ہے۔"

شریف کی باتیں سن کر عمو کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔ اسے لگا جیسے اس کے اردگرد ہر طرف گہری تاریکی چھا گئی ہے۔ اس کے ننگے پاؤں کے نیچے جلتی زمین ہے اور وہ اپنی ماں کو آوازیں دیتا پھر رہا ہے۔ کہیں... اس کی ماں کو کچھ ہو ہی نہ گیا ہو۔ وہ بیمار تھی، اس کی جدائی میں ٹوٹی ہوئی تھی، کوئی آسرا دینے والا نہیں تھا اسے۔ وہ کہاں گئی ہو گی؟ اس کی صورت دیکھنے کے لیے کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتی رہی ہو گی۔

اسے صادق شاہ پر، اس کے چار درویشوں پر اور چودھری سجاول وغیرہ پر بے پناہ غصہ آیا۔ اس کے سینے میں شعلہ بن جانے والی بغاوت کی چنگاری اب الاؤ کا روپ دھارنے لگی۔ ہاں، اب وہ کمزور نہیں تھا۔ اب وہ بہت کچھ کر سکتا تھا اور اسے پتا تھا کہ اگر اس کی ماں نہ ملی تو وہ "ذمے داروں" کو دن میں تارے دکھا دے گا۔ ہاں... وہ کافی بدل چکا تھا۔ وہ چاقو بھی ہر وقت اس کے پاس رہتا تھا جس سے اس نے دو ماہ پہلے ماکھے کی ٹانگوں پر مہلک وار کیے تھے۔

☆☆☆

شریف نے اپنا کام یقیناً ذمے داری سے نبھایا تھا مگر عمو جب تک خود ماں کو نہ ڈھونڈتا، اس کی تسلی کیسے ہو سکتی تھی۔ قریباً ایک ماہ بعد وہ راجا کے ساتھ بڑی خاموشی سے لاہور پہنچا اور پھر اپنے خالو نوازش علی سے ملاقات کی۔ خالو نوازش علی عمو کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ "اوئے عمران! تو تو ایک دم جوان ہو گیا ہے۔" اس کے خالو نے لرزتی آواز میں کہا۔

عمو اور راجا دو دن نوازش علی کے گھر میں رہے۔ انہوں نے اپنے پتے ٹھکانے کے بارے میں نوازش علی کو کچھ نہیں بتایا تاہم اس سے سارے حالات پوچھے... خاص طور سے عمو نے اپنی والدہ کے حوالے سے سب کچھ جاننے کی کوشش کی۔ اس ساری بھاگ دوڑ میں صرف ایک نئی بات معلوم ہو سکی اور وہ یہ کہ عمو کی والدہ نے زمین بیچی نہیں تھی بلکہ اسے مجبور کر دیا گیا تھا کہ وہ قیمتی زمین اونے پونے بیچ دے۔ اور یہ زمین اپنے ایک مزارعے کے ذریعے دراصل چودھری سجاول نے ہی خریدی تھی۔ دولت، طاقت اور جبر کی وہی صدیوں پرانی کہانی... غربت، کمزوری اور لاچاری کی وہی قدیم روداد۔

عمو شادپورہ واپس آ گیا۔ دل میں بے پناہ درد لیے ہوئے... وہ دیوانوں کی طرح اپنی ماں کی تلاش میں گھومنا چاہتا تھا لیکن راجا نے اسے سمجھایا۔ "ابھی ماجھاں کی موت والا واقعہ تازہ ہے۔ ہم زیادہ گھومیں پھریں گے تو ہمارے لیے ضرور کوئی نہ کوئی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ ابھی ہمیں چار چھ ماہ بالکل چپ کر کے گزارنے پڑیں گے۔"

عمو شادپورہ یوں واپس آیا جیسے کوئی اپنا سب کچھ لٹا کر کسی ویرانے میں آ جاتا ہے۔ کسی کام میں اس کا دل نہیں لگتا' کسی کروٹ چین نہیں تھا۔ بھوک نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ اس کی سوچیں بس اپنی ماں کے گرد ہی گھومتی تھیں۔ کہیں وہ اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر تو نہیں چلی گئی؟ یہ سوال تیر کی طرح اس کے دل میں لگتا تھا اور اس کی دنیا اندھیر ہو جاتی۔

ان جاں گسل لمحات میں اگر اسے شبو کی ڈھارس اور بے لوث محبت میسر نہ ہوتی تو شاید وہ بالکل ٹوٹ پھوٹ جاتا۔ وہ اس کی امید بندھاتی تھی۔ اس کے اندر آس جگاتی کہ اس کی ماں زندہ ہے اور ایک دن ضرور وہ اس کے سینے سے لگے گا۔ راجا اور شبانہ کی کوششوں سے دھیرے دھیرے عمو کو کچھ قرار آنے لگا۔ وہ مایوسی کے اندھیرے میں آس کی روشنی جلا کر دھیرے دھیرے قدم اٹھانے لگا۔

پارے جیسا خوفناک کتا اب عمو کا بالکل مطیع ہو چکا تھا۔ وہ اس کے اشاروں پر چلتا... کبیر احمد، شریف اور شبو وغیرہ عمو کے لیے اس کی اطاعت مندی دیکھ کر حیران ہوتے... اور بات صرف اکیلے پارے ہی کی نہیں تھی، دوسرے جانور بھی بہت جلد اس سے مانوس ہو جاتے۔ راجا ہاؤنڈ نسل کے جو نایاب پلے اپنے ساتھ لے کر آیا تھا، وہ تیزی سے بڑے ہو رہے تھے۔ راجا نے انہیں شکار کے لیے سدھانے کا کام عمو کو سونپا تھا اور وہ یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے رہا تھا۔ یوں لگتا کہ اسے زیادہ محنت ہی نہیں کرنی پڑتی، جانور خود بخود اس کی مرضی و منشا سمجھنے لگتا ہے۔

کچھ دن بعد راجا کہیں سے دو مشکی گھوڑے لے کر آیا۔ یہ بھی ماجھاں کے ہیرے کی طرح اوّل درجے کے سرکش جانور تھے۔ دونوں بھائی تھے۔ ان کے رنگ ڈھنگ بالکل ایک جیسے تھے۔ اگر راجا انہیں خود سدھانے کی کوشش کرتا تو شاید اس کے لیے مہینوں درکار ہوتے لیکن عمو کے ساتھ مل کر




جہانگیر بکس

معروف دانشور اور سیاسی رہنما راجا انور کی سرگزشت حیات



499/-

افغان جیل پل چرخی میں بیتے لمحات کی دردانگیز روداد موت کے منہ سے واپسی

معروف اسکالر سرفراز شاہ کی نئی کتاب



with FREE DVD

575/-

دل کی گہرائیوں سے نکلی روحانی گفتگو



999/-

جہانگیر
اردو لغت
(جامع ترین)
مروج و قدیم الفاظ، مرکبات
محاورات، ضرب الامثال اور
فنی اصطلاحات کا مستند ترین لغت

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ 350/-
اندھیری رات کے مسافر 350/-
ثقافت کی تلاش 150/-
قیصر و کسریٰ 475/-
اور تلوار ٹوٹ گئی 400/-
گمشدہ قافلے 380/-
داستانِ مجاہد 250/-
پردیسی درخت 400/-
یوسف بن تاشفین 350/-
معظم علی 350/-
خاک اور خون 450/-
کلیسا اور آگ 350/-
قافلۂ حجاز 425/-
محمد بن قاسم 350/-
پورس کے ہاتھی 199/-
انسان اور دیوتا 350/-
پاکستان سے دیارِ حرم تک 180/-
آخری چٹان 350/-
سو سال بعد 150/-
سفید جزیرہ 240/-
شاہین 350/-

Buy online:
www.jbdpress.com

جہانگیر بک ڈپو
061-4781781 051-5539609 042-37220879
022-2780128 021-32765086 041-2627568

اس نے تین چار ہفتوں میں ہی گھوڑوں کو ایک دم سواری اور شکار کے لیے ٹرینڈ کر دیا۔ راجا دونوں گھوڑوں کو اپنے ''پاٹے خاں'' پر لاد کر لے گیا اور اس زمیندار کو دے آیا جس سے لے کر آیا تھا۔

اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ کبھی ایک دو گھوڑے، کبھی دو چار کتے وہاں کبیر احمد کے باغ میں پہنچنے لگے۔ راجا اور عمو انہیں مل کر سدھاتے۔ گھوڑوں کو دُلکی اور سرپٹ چال سکھاتے۔ مالک کے اشاروں کو سمجھنے کی تربیت دیتے، کتوں کو پلٹنے اور جھپٹنے کی ٹریننگ دیتے۔ شکار کو پکڑنے اور پھر مالک تک لانے کا طریقۂ کار انہیں سمجھاتے... یہ دلچسپ لیکن نہایت مشکل اور کسی حد تک خطرناک کام تھا۔ عمو کی موجودگی نے اس کام کو آسان کر دیا بلکہ اب زیادہ تر ذمے داری وہ خود اٹھا رہا تھا۔ جانور کی تربیت مکمل ہو جاتی تو راجا اسے مالک کے پاس واپس لے جاتا... یا پھر مالک خود وہاں آجاتا اور ایک دو روز وہیں باغ میں رہ کر اپنے اور اپنے جانور کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرتا... کام کا معاوضہ وغیرہ راجا ہی وصول کرتا۔ وہ اخراجات کے لیے عمو کو معقول رقم دے دیتا تھا۔ ویسے بھی وہ ہر طرح عمو اور شبانہ کا خیال رکھتا تھا۔ بہر حال اس کی خامیاں خرابیاں بھی اس کے ساتھ موجود تھیں۔ وہ گاہے بگاہے اپنی دل پشوری کے لیے اپنے ''پاٹے خاں'' سمیت باغ سے غائب ہو جاتا اور اگلے دن یا پھر ایک دن بعد واپس آجاتا۔

زندگی ایک ہموار رفتار سے آگے بڑھنے لگی تھی۔ جون، جولائی کے دن تھے۔ پھل پک کر تیار ہو چکا تھا۔ کبیر احمد کے لیے چلنا پھرنا اب مزید دشوار ہو گیا تھا۔ وہ ٹانگ کے ساتھ ساتھ اپنے ایک کولہے کو بھی مفلوج محسوس کرتا تھا اور وہیل چیئر استعمال کرنے لگا تھا۔ وہ، شریف، اس کی بیوی اور دو ملازم لڑکے سارا دن باغ کے کاموں میں مصروف رہتے۔ اکثر شبانہ بھی ان کا ہاتھ بٹانے لگتی۔ راجا اور عمو ایک کھلے احاطے میں گھوڑوں کو دوڑاتے، ان پر سواری کرتے، بانس یا رسّی کے سرے پر گوشت کے ٹکڑے باندھ کر شکاری کتوں کو پلٹنے جھپٹنے کی تربیت دیتے۔ عمو شعلہ مزاج جانوروں کا سامنا بالکل بے خطر ہو کر کرتا اور راجا حیرت سے دیکھتا رہ جاتا۔ طویل گرم دوپہروں میں جب ہر طرف سناٹا چھا جاتا، وہ باغ کی ٹھنڈی چھاؤں میں چارپائیاں ڈال لیتے... پمپ کے شفاف پانی میں نہاتے، اپنے باغ کے آم چوستے اور کچی لسّی کے گلاس بھر بھر کر پیتے۔ رات کا کھانا وہ سب اکٹھے کھاتے اور چھت پر بیٹھ کر دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ ان ساری مصروفیات میں عمو کا دل لگا رہتا لیکن جب وہ فارغ اور اکیلا ہوتا تو ماں کی جدائی کا غم ایک آسیب کی طرح اسے اپنی گرفت میں جکڑ اور بے حال کر دیتا۔

وہ بھی ایک ایسی ہی تاروں بھری رات تھی۔ رات کی رانی اور پختہ آموں کی ملی جلی خوشبو ہوا میں رچی ہوئی تھی۔ نیچے صحن میں شبانہ اور مریم رات کے کھانے کے بعد برتن دھو رہی تھیں۔ صحن میں پاٹے خاں کی پھٹی ہوئی آواز گونج رہی تھی۔ راجا ابھی ابھی کہیں سے واپس آیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بھی سیڑھیاں چڑھ کر عمو کے پاس آن موجود ہوا۔ اب وہ عمو کو اکثر عمران کہہ کر ہی بلاتا تھا۔ اس کے منہ سے شراب کی ہلکی بو آرہی تھی۔ وہ عمو کے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا۔ ''عمران! بڑا ایٹ آرڈر ملا ہے۔ چار سور مار گھوڑے ہیں۔ سور مار سمجھتے ہو نا تم؟ جن پر بیٹھ کر برچھی وغیرہ سے سور کا شکار کھیلتے ہیں۔ ایسے گھوڑوں کو سدھانا تھوڑا مشکل ہوتا ہے۔ پر فی گھوڑا تین ہزار روپیا دے رہے ہیں۔ سو دا فٹ ہے...''

عمو نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ اپنے خیالوں میں گم تھا۔ ''کیا بات ہے یارا! تیری بتی آج پھر بجھی ہوئی ہے؟''

عمو نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''بھارا جا! تم نے کہا تھا کہ برسات سے پہلے پھر نکلیں گے اور ماں کا کھوج لگا کر ہی واپس آئیں گے۔''

''مجھے سب یاد ہے عمران! بلکہ تم سے بھی کچھ زیادہ ہی یاد ہے۔ میں بس باہر کے حالات دیکھ رہا ہوں۔ کہیں ذرا سی گنجائش ملی نہیں اور ہم یہاں سے نکلے نہیں۔''

''حالات کو کیا ہے؟''

راجا نے بھی سگریٹ سلگایا اور ماچس کی تیلی پاؤں سے مسل کر بولا۔ ''عمران! میں تجھے اور شبو کو سب کچھ بتاتا نہیں ہوں کہ تم دونوں کو بھی پریشانی ہوگی۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ ابھی کیکراں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ ماجاں کا بھائی تاجا بہت غصے میں ہے۔ پچھلے مہینے اس نے میرے ''ٹھیکرے'' والے گھر پر ہلّا بولا ہے۔ پہلے وہاں توڑ پھوڑ مچائی پھر ہوائی فائرنگ کی اور بعد میں آگ لگا دی۔ پولیس کھڑی تماشا دیکھتی رہی۔ تاجے نے پنڈ میں اعلان کرتے ہوئے کہا ہے کہ جو میرا اتا پتا بتائے گا، وہ اس کا منہ نوٹوں سے بھر دے گا اور جو مجھے چھپانے کی کوشش کرے گا اس کا حشر نشر ہو جائے گا۔''

''پر... یہ سب کچھ کب تک چلتا رہے گا بھارا جے؟ ہم کب تک چوہوں کی طرح چھپ کر یہاں بیٹھے رہیں گے؟''

''میں نے سنا ہے کہ پچھلے دو تین ہفتوں سے تاجا کیکراں میں نظر نہیں آرہا۔ ہو سکتا ہے کہ پولیس کے ڈر سے



نسر پھر اس کے پیچھے لگ گئے ہوں۔ وہ کبھی کبھی قبائلی علاقے کی طرف بھی نکل جاتا ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر ہمارے لیے آسانی ہو جائے گی۔''

''لیکن... میں کیا کروں بھارا جے... میرے لیے اب ایک ایک دن گزارنا مشکل ہے۔'' عمو کی آنکھوں میں نمی آگئی۔

راجا نے سگریٹ کے دو طویل کش لیے اور اپنی تیز تیکھی ناک سے دھواں چھوڑتے ہوئے بولا۔ ''عمران! میں تو تجھے پھر وہی رائے دوں گا۔ تو شبو سے دو بول پڑھوا لے۔ یہ دنیا ایک دم کنڈم ہے یار! کل کے لیے اس پر بالکل اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ جو کچھ آج مل رہا ہے نا، وہ لے لینا چاہیے۔ دیکھ، وہ تجھے چاہتی ہے اور تو اس پر مرتا ہے۔ تم دونوں کے درمیان کوئی رکاوٹ بھی نہیں ہے۔ بس ایک مولوی صاحب کی لوڑ ہے اور دو گواہوں کی...''

''پر بھارا جے! وہ اس طرح نہیں مانتی۔ میں نے دو تین دفعہ بات کر کے دیکھی ہے۔''

''اوئے ذرا ٹیٹ ہو کر بات کر۔ اسے سمجھا کہ یہاں آنے جانے والے شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اگر نکاح ہو جائے گا تو پھر کسی کو شک کرنے کی ہمت ہی نہیں رہے گی۔''

''میں نے کہا ہے بھارا جے... پر وہ رونے لگتی ہے۔ کہتی ہے...'' وہ اٹک گیا۔

''کیا کہتی ہے؟''

''کہتی ہے... میں تمہاری ہوں... اور آخری ساہ (سانس) تک تمہاری ہی رہوں گی۔ پر ہمیں اس طرح یہاں شادی نہیں کرنی چاہیے۔''

''لیکن اگر کل کلاں کوئی اور پھڈا پڑ گیا تو؟''

''وہ کہتی ہے... ہماری محبت سچی ہے۔ ہمیں کچھ نہیں ہوگا۔ ہم ضرور ملیں گے۔''

...یہ پندرہ بیس روز بعد کی بات ہے۔ ایک طویل گرم دن گزر چکا تھا۔ ملازم لڑکوں نے احاطے میں پانی کا چھڑکاؤ کر دیا تھا اور مٹی کے گھڑوں میں تازہ پانی بھر دیا تھا۔ عمو کمرے میں کتوں کے لیے راتب تیار کرنے میں مصروف تھا۔ اسی دوران میں راجا کے پاٹے خاں کی آواز آنے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد پھاٹک کھلا اور پاٹے خاں دھواں چھوڑتا ہوا اندر آگیا۔ خلافِ معمول راجا اسے سیدھا برآمدے کے آخری تاریک کونے میں لے گیا۔ پاٹے خاں کے اوپر ترپال تنا ہوا تھا۔ انجن بند کرنے کے بعد راجا نیچے آیا اور برآمدے کی جہازی سائز کی چق نیچے گرا دی۔ یوں لوڈر مکمل طور پر نظر سے اوجھل ہو گیا۔ راجا پیسے کمانے کے لیے ہر طرح کے کام کر لیتا تھا۔ عمو نے اندازہ لگایا کہ شاید وہ آج پھر کوئی افیم یا چرس قسم کی شے لے کر آیا ہے۔ انڈین شراب کا بھی امکان ہو سکتا تھا... لیکن تھوڑی دیر بعد عمو نے ایک عجیب بات نوٹ کی۔ دیوہیکل ہاؤنڈ کتا یارا تسلسل شور مچا رہا تھا۔ اس کی گونجیلی آواز در و دیوار کو لرزا رہی تھی۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد راجا اس کے پاس پہنچا۔ اپنے لمبے بال پیشانی سے ہٹاتے ہوئے بولا۔ ''عمران! آج ایک بڑی ٹیٹ ڈیل ہوئی ہے۔'' اس کی آواز میں دبا دبا جوش تھا اور آنکھوں میں سنسنی لہریں لے رہی تھی۔

''کچھ بتاؤ گے تو پتا چلے گا۔''

''یہ بتانے والی نہیں دکھانے والی شے ہے۔'' راجا نے سرگوشی کی اور عمو کو ساتھ چلنے کے لیے کہا۔

راتب تقریباً تیار ہو چکا تھا۔ عمو نے ہاتھ دھوئے اور راجا کے ساتھ ہو لیا۔ اب شام گہری ہو گئی تھی۔ اندھیرا پھیل گیا تھا۔ کبیر احمد کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ دوا کھا کر پچھواڑے کے باغیچے میں سویا ہوا تھا۔ راجا نے شریف کے کمرے سے فالتو لالٹین لی اور برآمدے کی طرف آگیا۔ طویل برآمدے کے آخری گوشے میں سرکنڈے کی چقوں کے پیچھے پاٹے خاں کھڑا تھا۔ اس کے اوپر ترپال اس طرح تنا ہوا تھا کہ وہ چاروں طرف سے ڈھک گیا تھا۔ صحن کی طرف سے پارے کی آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ عمو کی چھٹی حس بھی جیسے کچھ مبہم اشارے دے رہی تھی۔

''بھارا جا! کیا چکر ہے؟'' عمو نے پوچھا۔

راجا نے لالٹین عمو کو تھمائی اور ترپال کے تسمے کھول کر اسے پچھلی طرف سے دائیں بائیں ہٹا دیا۔ عمو بھونچکا رہ گیا۔ اسے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہوا۔ لوڈر کے اندر ایک بڑا آہنی پنجرہ رکھا تھا اور اس میں دو آنکھیں چمکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ کسی کتے یا دوسرے پالتو جانور کی آنکھیں نہیں تھیں۔ یہ ایک دھاری دار شیر تھا۔ وہ اپنے کانوں کو چوکنے انداز میں حرکت دے رہا تھا اور سیدھا ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا... جیسے حملہ کرنے کے لیے بس ایک نادیدہ اشارے کا منتظر ہو۔ وہ ایک جوان شیر تھا۔ ابھی اس کا جسم پوری طرح بھرا نہیں تھا پھر بھی اس کی دید لرزہ طاری کرتی تھی۔

راجا نے ترپال پھر برابر کر دیا اور عمو کو لے کر واپس احاطے میں آگیا۔ ''یہ کہاں سے لے آئے ہو بھارا جا؟'' عمو نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

''بس لے آیا ہوں... اور زیادہ ڈرنے کی لوڑ نہیں۔ یہ بالکل ہی ''اَن ٹرینڈ'' نہیں ہے۔ تھوڑا بہت سکھایا ہوا ہے۔ جو کسر رہ گئی ہے، وہ ہم دو چار ہفتوں میں پوری کر دیں گے۔ کتے کے پچاس پلے سدھانے سے اتنے پیسے نہیں ملتے جتنے اس اکیلے کے مل جائیں گے۔ پورے چالیس ہزار میں بات ہوئی ہے۔''

''پر بھارا جا... یہ تو بڑا خطرناک کام ہے۔ م... میں نے تو اس سے پہلے چڑیا گھر سے باہر شیر دیکھا ہی نہیں۔''

''لیکن میں نے تو دیکھا ہے نا۔ تو گھبرا مت، ہم دونوں ساتھ ہوں گے تو یہ سارا کام ایک دم حلوہ ہو جائے گا۔ صرف تین چار ہفتے میں چالیس ہزار روپے۔ یار عمران! یہ تھوڑی رقم تو نہیں ہے۔''

اس نے اپنی خوش گفتاری سے عمران کو چپ کرا دیا۔

عمران اب اتنا نا سمجھ نہیں رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ راجا اسے جو کچھ بتاتا ہے، اس سے کہیں زیادہ کماتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کبھی بھی کوئی ''ناجائز پھیرا'' بھی لگا لیتا تھا۔ اس کے پاس کافی پیسے آئے تھے لیکن یہ پیسے اس کے پاس ٹکتے نہیں تھے۔ وہ انہیں شراب اور عورت وغیرہ پر اڑا دیتا تھا۔ جہاں تک جانوروں کو سدھانے کا تعلق تھا، یہ کام بھی زیادہ تر عمو کو ہی کرنا پڑتا تھا۔ راجا نے اسے شروع میں چند بنیادی باتیں بتائی تھیں، اس کے بعد اس نے سارا بوجھ عمو پر ہی ڈال دیا تھا اور عمو کو کوئی شکوہ نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جو کام بھارا جا دو مہینے میں کرے گا، وہ خود پندرہ دن میں کر لے گا۔ حیران کن طور پر جانور اس سے غیر معمولی انس محسوس کرتے تھے اور وہ بھی ان سے وابستگی محسوس کرنے لگتا۔ لیکن یہ شیر والا کام اسے واقعی پُرخطر محسوس ہو رہا تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی اس کے رگ و پے میں پھیل گئی تھی۔

اگلے روز تک کبیر احمد، شریف، اس کی بیوی اور شبّو کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ راجا کسی سرکس کے مالک سے ایک نر شیر لے کر یہاں آیا ہے اور اسے سدھانا چاہتا ہے۔ راجا کا دعویٰ تھا کہ وہ دو ڈھائی سال پہلے بھی ایک ایسے شیر کو ٹریننگ دے چکا ہے۔ شبّو کو جب یہ ساری بات پتا چلی تو وہ ہنسی ہو گئی۔ اس نے عمو سے کہا۔ ''عمران! تمہارے یہ کام کسی دن میری جان لے لیں گے۔ بھارا جا جو کہتا ہے تم کرتے چلے جاتے ہو۔ اب بات خطرناک گھوڑوں، کتوں سے آگے بڑھ کر شیر تک جا پہنچی ہے۔''

رات بھر سوچنے کے بعد اب عمو کے اندر خوف کی جگہ ایک عجیب سی ترنگ جاگ چکی تھی۔ پچھلے چند مہینوں میں اس کے اعتماد میں بے پناہ اضافہ ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس اندر کچھ خاص ہے۔ اب وہ اس ''خاص'' کو ایک جھٹکا درندے کے سامنے آزمانا چاہتا تھا۔

اس نئے کام کے لیے باغ کے ایک کشادہ گودام ''رِنگ'' کی شکل دی گئی۔ راجا نے دھاری دار شیر کو ذرا سے اور ڈھیلا کرنے کے لیے اسے گوشت کے ٹکڑوں پر کوئی دوا کر کھلائی تھی۔ مزید احتیاط کے طور پر اس کے گلے میں مضبوط رسّیاں ڈالی گئی تھیں تاکہ اگر وہ بپھرے تو اسے دونوں طرف سے کھینچ کر کنٹرول کیا جا سکے۔

پہلے روز عمو کو کچھ خطرہ محسوس ہوا لیکن پھر حالات حیران کن تیزی سے بدلتے چلے گئے۔ راجا اور اس کا معاون ساتھی بھی ششدر رہ گئے۔ خوں خوار خصلت والا رائل بنگ ٹائیگر بڑی تیزی سے عمو سے مانوس ہوتا چلا گیا۔ غالباً اس ساری صورتِ حال میں اس بے پناہ اعتماد کو بھی دخل تھا جو پچھلے چند ماہ سے مسلسل عمو کے اندر پیدا ہو رہا تھا۔

پانچ چھ روز میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ عمو نے کئی احتیاطی تدابیر ترک کر دیں اور کئی بار اکیلا ہی جانور کے سامنے جانے لگا۔ راجا بہت خوش تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ چار پانچ مہینوں والا کام بس دو ڈھائی ماہ میں مکمل کر لیں گے۔ انہیں بس دو اہم مراحل مکمل کرنے تھے۔ شیر کو ایک بڑے آہنی کڑے میں سے گزرنے پر آمادہ کرنا اور جست لگا کر ایک چار فٹ اونچی رکاوٹ کو پار کرنا۔

ایک روز تربیت کے دوران میں ٹائیگر نے راجا کے معاون نذیر کو پنجہ مار کر اور بازو پر سے اس کی کھال ادھیڑ دی۔ اس روز کے بعد راجا اور نذیر مزید پیچھے ہٹ گئے اور عمو کی ذمے داری مزید بڑھ گئی۔ کتے کی نایاب نسل ''سلوکی ہاؤنڈ'' کے پلے بھی اب بڑے ہو چکے تھے۔ عموان کی تربیت بھی تن دہی سے کر رہا تھا۔

☆☆☆

نو دس ہفتے میں ہی ٹائیگر والی ذمے داری تقریباً پوری ہو گئی۔ اس دوران میں سرکس کا مالک جان محمد دو تین بار اپنے خوں خوار جانور کو دیکھنے بھی آیا۔ وہ چھوٹی داڑھی والا ایک ملنسار اور خلیق شخص نظر آتا تھا۔ بہرحال عمران کی کبھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اس سے ہر طرح کی ڈیل راجا ہی کرتا تھا۔ جان محمد کے ساتھ چینٹ شرٹ والی ایک خوبرو لڑکی بھی ہوتی تھی۔ پتا چلا کہ وہ اس کی بھتیجی ہے۔ راجا، جان محمد کے علاوہ اس کی بھتیجی سے بھی خوب ہنس ہنس کر باتیں کرتا تھا۔ وہ لوگ بھی راجا کو غیر معمولی اہمیت دیتے تھے۔ ان کے نزدیک تو ٹائیگر سدھانے والی ساری فن کاری راجا ہی کی تھی۔

جب بنگلہ ٹائیگر کو جان محمد صاحب کے ساتھ روانہ کیا گیا تو راجا خود بھی ساتھ ہی گیا اور تین چار روز تک خوشاب میں جان صاحب کی مہمان نوازی کا لطف اٹھا کر واپس آیا۔ آتے ہوئے وہ خوشاب سے ہی چار پانچ تربیت یافتہ کتوں کی فروخت کا آرڈر بھی پکڑ کر لایا تھا... اندازہ ہو رہا تھا کہ یہاں اس کا کام چل نکلا ہے۔

کبیر احمد اب بیمار رہنے لگا تھا۔ باغ کی زیادہ تر ذمے داری شریف اور اس کی فیملی کے سر پر تھی۔ ایک روز جب راجا اپنے پالتو خاں کے نئے ٹائر ڈلوانے اور اس کی نوک پلک ٹھیک کروانے خوشاب گیا ہوا تھا، عمران اور شریف چھپواڑے کی پھلواری میں آ بیٹھے۔ وہ ابھی ابھی ایک زخمی کتے کی مرہم پٹی سے فارغ ہوئے تھے اور اب نومبر کی آخری سہ پہروں میں سے ایک سہ پہر کی سنہری دھوپ کا لطف اٹھانا چاہ رہے تھے۔

گفتگو کے دوران میں شریف نے عمران سے پوچھا۔ ''سنا ہے کہ ٹائیگر والے کام کے لیے راجا نے تمہیں کوئی انعام شام بھی دیا ہے؟''

''ہاں... مجھے اور شبّو کو دو دو نئے جوڑے سلوا کر دیے ہیں۔ تین ہزار روپیا نقد بھی دیا ہے۔''

''تین ہزار؟'' شریف نے پوچھا۔ عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔ شریف کچھ دیر خاموش رہا پھر دھیمے انداز میں بولا۔ ''سنا ہے اس نے خود تو کافی پیسے لیے ہیں... شاید ساٹھ ستّر ہزار روپیا۔ اوپر کا خرچہ اس کے علاوہ ہے۔''

ساٹھ ستّر ہزار کے ہندسے نے عمران کو بھی تھوڑا سا چونکایا لیکن اس نے اپنے اندرونی احساسات کو چہرے پر نہیں آنے دیا۔ وہ نارمل لہجے میں بولا۔ ''چلو کوئی بات نہیں... اپنا وقت ٹھیک گزر رہا ہے۔''

شریف بولا۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ جان صاحب کی بھتیجی نیلم بھی راجا کے چکر میں ہے۔ آج کل اسی لیے راجا بھی خوشاب کے چکر لگا رہا ہے... پچھلے ہفتے جب جان صاحب شیر لینے آئے تھے تو نیلم نے شیر کے ساتھ راجا کی کئی تصویریں بھی اتاری تھیں۔ وہ تو راجا کو ہی ماسٹر سمجھتی ہے نا۔ اور بات صرف اس لڑکی کی ہی نہیں اور بھی بہت سے لوگ راجا کو باکمال فن کار سمجھنے لگے ہیں۔ یہ تو بس ہم دو چار بندوں کو پتا ہے نا کہ اصل فن کاری کس کی ہے۔''

''چلو، میں نے کون سا تمغہ لگوانا ہے۔ اگر بھارا جے کی عزت بن رہی ہے تو سمجھو ہماری بن رہی ہے۔''

شریف مزید کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن عمران کی غیر دلچسپی دیکھ کر خاموش رہا۔ عمران کھلے دل کا مالک تھا۔ ویسے بھی وہ راجا کو اپنا محسن و سرپرست سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بھارا جا جو کر رہا ہے، صحیح کر رہا ہے۔

راجا اب پہلے سے اچھا لباس پہننے لگا تھا۔ پہلے وہ ہفتے میں ایک رات باہر گزارتا تھا، اب دو تین راتیں باہر گزارنے لگا تھا۔ اب وہ اپنے دیرینہ ساتھی پالتو خاں کو بھی فروخت کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس پرانے لوڈر کی جگہ کوئی اور اچھی گاڑی لی جائے۔ عمران کو اس کا یہ پروگرام زیادہ پسند نہیں آیا۔ پتا نہیں کیوں اسے اس پرانی گاڑی سے اُنس سا ہو گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس گاڑی نے کوئی ایک سال پہلے بڑی سخت جانی کا مظاہرہ کر کے عمران اور شبانہ کو سیکراں گاؤں کی جان لیوا حدود سے نکالا تھا۔ بہرحال راجا کے اپنے فیصلے ہوتے تھے۔ ایک روز وہ پالتو خاں کو کہیں چھوڑ آیا اور اس کی جگہ ایک اچھی حالت کا سیکنڈ ہینڈ لوڈر لے آیا۔

یہ پانچ چھ دن بعد کی بات ہے۔ راجا اپنے نئے لوڈر پر آندھی طوفان کی طرح باغ میں داخل ہوا۔ وہ کل دوپہر سے کہیں گیا ہوا تھا۔ اسے لوڈر سے اترتے دیکھ کر عمران اور شریف حیران رہ گئے۔ شبّو تو باقاعدہ چلّا اٹھی۔ راجا کا سویٹر سامنے سے اُدھڑا ہوا تھا۔ قمیص کا گریبان بھی کٹا پھٹا تھا۔ راجا کی گردن اور چہرے پر زخم نظر آ رہے تھے۔ ان زخموں سے بہنے والا خون ناف تک چلا گیا تھا۔ راجا لنگڑاتا ہوا عمران کی طرف آیا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''چلو عمران! تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔''

''کہاں؟ اور تم تو اتنے زخمی ہو؟''

''کوئی بات نہیں، تم بس آؤ میرے ساتھ۔ یہ بہت ضروری ہے۔''

''کسی ہتھیار وغیرہ کی لوڑ تو نہیں؟''

''نہیں نہیں۔ بس تم آ جاؤ۔''

عمران کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا لیکن وہ راجا کے ساتھ اس کے نئے لوڈر میں آ بیٹھا۔ عمران نے راجا کے زخموں کو غور سے دیکھا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ زخم کسی آلے وغیرہ سے نہیں آئے تھے۔ یہ پنجوں کے زخم تھے۔ عمران کا دھیان سیدھا دھاری دار بنگلہ ٹائیگر کی طرف چلا گیا۔

لوڈر تیزی سے کچے پکے راستے پر بھاگا چلا جا رہا تھا۔ عمران نے پوچھا۔ ''بھارا جا! کہیں جان صاحب کے شیر نے تو کام نہیں دکھایا؟''

راجا نے اپنے مفلر سے خون صاف کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اسے پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ کسی طرح سنبھالا ہی نہیں جا رہا۔ ایک ملازم کا تو اس نے تقریباً پیٹ ہی پھاڑ دیا ہے۔ ایک دو اور بندوں کو بھی زخم آئے ہیں۔“

”اوہو... کہاں ہے وہ؟“

”جان صاحب کے گاؤں والے مکان پر۔ صحن میں گھوم رہا ہے۔ ہم نے صحن کے دونوں دروازے باہر سے بند کر دیے ہیں۔ وہ لڑکی نیلم ابھی اندر کے ایک کمرے میں ہے۔ اسے ہم نہیں نکال سکے۔“

راجا اونچے نیچے راستے پر لوڈر کو اڑائے چلا جا رہا تھا۔ دونوں بُری طرح اچھل رہے تھے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ صورتِ حال کو سنبھالنے کے لیے راجا نے پہلے خود کوشش کی ہے، جب کوئی بس نہیں چلا تو عمران کی طرف بھاگا ہے۔

قریباً ایک گھنٹے میں وہ دونوں مطلوبہ گاؤں کے مطلوبہ مکان پر پہنچ گئے۔ یہاں ایک پھاٹک کے سامنے بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ مکان کے احاطے کی دیوار سات آٹھ فٹ اونچی تھی۔ لوگ اردگرد کی چھتوں پر سے احاطے میں جھانک رہے تھے۔ کچھ لوگ ریڑھوں وغیرہ پر کھڑے ہو کر بیرونی دیوار کے اوپر سے احاطے میں جھانکنے کی کوشش میں تھے۔ ہر چہرے پر تجسس اور ہراس نظر آتا تھا۔ یہاں عمران کو جان محمد صاحب اور ان کے دو تین ملازم بھی نظر آئے۔ ایک ملازم زخمی تھا اور اس کے بازو پر تازہ تازہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ جان محمد صاحب کے ہاتھ میں پمپ ایکشن رائفل تھی اور وہ پھاٹک کی درز میں سے احاطے میں جھانکنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ عمران کے وہاں پہنچتے ہی ہر طرف ہلچل نظر آئی۔ سب لوگ گہرے تجسس اور دلچسپی سے اسے دیکھنے لگے۔ عمران کے پھاٹک کے سامنے پہنچتے ہی راجا نے پھاٹک کا چھوٹا دروازہ کھلوایا اور عمران کو اندر داخل کر دیا... خود وہ اپنے اعشاریہ تین آٹھ کے ریوالور کے ساتھ دروازے میں کھڑا ہو گیا تاکہ کوئی ناخوش گوار صورتِ حال پیش آنے کی صورت میں مناسب ردِعمل ظاہر کر سکے۔

ہمیشہ کی طرح عمران کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اس کا ہتھیار بس اس کے اندر کا اعتماد اور وجدان تھا۔ ایسے لمحوں پر اس کا سینہ پُرجوش دھڑکنوں سے بھر جاتا تھا۔ وہ ہاتھ میں بس ایک چھوٹی سی چھڑی لیے بڑے نپے تلے قدموں سے برآمدے کی سمت گیا۔ اسے بتایا گیا تھا اور اسے خود بھی یہی اندازہ ہوا تھا کہ شیر برآمدے کی طرف ہے۔

چند ہی سیکنڈ بعد شیر یعنی رائل بنگلہ ٹائیگر اور عمران آمنے سامنے تھے۔ ٹائیگر کی آنکھوں میں آج وحشت چمک رہی تھی اور اس کی حرکات و سکنات میں تبدیلی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے اندر سے ایک بے ساختہ گونج برآمد ہو رہی تھی۔ اس دھیمی لیکن پاٹ دار گونج میں غیظ و غضب اور خونخواری کی ساری علامات موجود تھیں۔ وہ خطرناک انداز میں عمران کی طرف بڑھا۔ عمران جانتا تھا کہ یہی فیصلے کا لمحہ ہے۔ اب اگر اس نے قدم پیچھے ہٹائے تو بپھرا ہوا جانور کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اپنے بے پناہ اعتماد اور وجدان کے سہارے وہ اپنی جگہ کھڑا رہا۔ نہ صرف کھڑا رہا بلکہ اس نے دو قدم آگے بڑھائے۔ چھڑی سے مخصوص اشارہ کیا... اور اسے حکم دیا۔ ”بیٹھ جاؤ... بیٹھ جاؤ۔“ اس کے حکم میں سختی کی جگہ ایک محبت بھری نرمی تھی۔

چند سیکنڈ تک انسان اور درندے نے اپنی آنکھیں ایک دوسرے میں پیوست رکھیں اور پھر فیصلہ ہو گیا۔ عمران کا جادو پھر کام کر گیا۔ ٹائیگر کا دباؤ اپنی پچھلی ٹانگوں پر کم ہو گیا۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ وہ جارحانہ انداز ترک کر چکا ہے۔ چند سیکنڈ بعد اس کے آگے کو جھکے ہوئے کان نارمل حالت میں آ گئے۔ عمران نے اسے چھڑی کے اشارے سے چند قدم پیچھے ہٹایا پھر دلیری سے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ وہ اس کے سینے سے اپنا سر رگڑنے لگا۔ عمران اسے پچکارتا ہوا اس کے آہنی پنجرے کی طرف لے گیا۔ کسی اندرونی کمرے سے نیلم کے چلّانے کی آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی۔

ٹائیگر کو پنجرے میں بند کرنے کے بعد عمران نیلم کی طرف متوجہ ہوا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ بے ہوش ہونے کے قریب ہے۔ جب اس نے کھڑکی میں سے دیکھا کہ جانور دوبارہ پنجرے میں جا چکا ہے تو اس نے دروازے کی کنڈی گرائی اور بھاگتی ہوئی سیڑھیاں چڑھنے کے بعد کسی طرف اوجھل ہو گئی۔ بدحواسی میں اسے یہ خیال بھی نہیں رہا کہ وہ اپنا کمرا ایک اجنبی کے سامنے کھلا چھوڑے جا رہی ہے۔ وہ اپنی ریشمی نائٹی میں بھاگی تھی۔ اس کے شان دار پلنگ پر اس کا لباس بکھرا ہوا تھا اور زیادہ حیرانی کی بات یہ تھی کہ ایک طرف میز پر ایک مردانہ کوٹ بھی پڑا ہوا تھا... عمران کے لیے اس کوٹ کو پہچاننا بالکل مشکل نہیں تھا۔ یہ راجا کا کوٹ تھا۔ یہ بات ثابت ہو رہی تھی کہ شیر والا واقعہ پیش آنے سے پہلے راجا اس شہری لڑکی کے ساتھ یہاں اس کمرے میں موجود تھا۔ اسی دوران میں راجا بھی بھاگتا ہوا وہاں پہنچ گیا اور سب سے پہلے اس نے اپنا کوٹ ہی اس کمرے میں سے نکالا۔



عمران کی مہارت اور دلیری نے موقع پر موجود لوگوں کو آتش آش کرنے پر مجبور کر دیا۔ جان محمد صاحب نے عمران کی طرف اشارہ کرتے ہوئے راجا سے پوچھا۔ ”یہ وہی لڑکا ہے نا جو وہاں تمہارے پاس کتوں کا راتب وغیرہ بناتا ہے؟“

”جج... جی ہاں۔“ راجا ہکلایا۔ ”اس کے علاوہ یہ جانوروں کی سکھائی میں بھی میرا ہاتھ بٹاتا ہے۔ بڑا گن ہے جی اس کے ہتھ میں۔“

جان محمد صاحب گہری نظروں سے کبھی راجا اور کبھی عمران کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ ایک جہاندیدہ زیرک شخص تھے۔ انہیں یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ یہاں ”پسِ پردہ“ بھی کچھ ہے۔

ٹائیگر کے بارے میں پتا چلا کہ پچھلے دو دن سے اس کی طبیعت میں اشتعال موجود تھا۔ صبح تجربہ کار ملازم غلام رسول اس کے پنجرے کی صفائی کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بس ایک سیکنڈ کے لیے پنجرے کا دروازہ کھولا۔ ٹائیگر خوفناک تیزی سے اس پر جھپٹا اور اسے شدید زخمی کر دیا۔ اس کے بعد تقریباً ایک گھنٹے تک اس نے حویلی میں تہلکہ مچائے رکھا اور کسی طرح کنٹرول نہیں ہوا۔

اب وہ حالانکہ دوبارہ پنجرے میں بند ہو چکا تھا مگر اس کے تیور معمول پر نہیں آئے تھے۔ جان محمد صاحب کی خواہش تھی کہ عمران ابھی ایک دو دن یہیں رہے۔ راجا نے بھی اس بات کی تائید کی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اس صورتِ حال پر زیادہ خوش نظر نہیں آتا تھا۔

دو دن میں ہی عمران کو معلوم ہو گیا کہ جان محمد صاحب بہت اچھی طبیعت کے مالک ہیں۔ ایک بڑے سرکس میں اپنے ایک دوست کے ساتھ ان کی ساجھے داری تھی اور پچھلے قریباً پندرہ سال سے یہ ساجھے داری بڑے اچھے طریقے سے چل رہی تھی... اور لگتا تھا کہ آئندہ بھی چلتی رہے گی۔ پینٹ شرٹ والی لڑکی نیلم، جان صاحب کی بھتیجی نہیں بلکہ معاون تھی... یا یہ کہہ لیں کہ سیکریٹری تھی۔ ایک دفعہ اس کی شادی ہو کر ختم ہو چکی تھی اور اب وہ دوسری دفعہ شادی کرنے کی فکر میں تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس مرتبہ اس نے ایک ایسا شخص شادی کرنے کے لیے چنا تھا جو گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رہا تھا اور آئندہ بھی پینا چاہتا تھا۔

عمران کو اندازہ ہوا کہ ٹائیگر والے تازہ واقعے کے بعد جان محمد صاحب راجا کے بارے میں ٹھٹک گئے ہیں اور وہ اس کے بارے میں اچھی طرح ٹوہ لگانا چاہتے ہیں۔ شاید یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ راجا ایف سولہ کی رفتار سے نیلم کے قریب آتا جا رہا تھا اور وہ نیلم کو اپنی بھتیجی کہتے تھے۔ رات کو تھوڑی دیر کے لیے موقع ملا تو جان صاحب نے راجا کے بارے میں ٹوہ لینے والے سوال عمران سے پوچھے۔ عمران نے بس گول مول جواب دے کر وقت ٹال دیا۔ جان صاحب عمران کی مہارت سے بہت متاثر نظر آتے تھے اور وہ اچھی طرح جان چکے تھے کہ راجا کی ”شان دار قابلیت“ کے پیچھے اصل ہاتھ کس کا ہے۔ درحقیقت ٹائیگر والے واقعے نے ایک طرح سے راجا کا پول کھول کر رکھ دیا تھا۔

دو دن بعد عمران واپس تو چلا گیا مگر جان صاحب سے اس کا ایک قلبی تعلق سا بن گیا... یہ دس بارہ روز بعد کی بات ہے۔ راجا کسی نوخیز طوائف کے پہلو میں رات گزارنے کے لیے خوشاب گیا ہوا تھا۔ جان محمد صاحب کا ملازم غلام رسول آیا۔ اس نے بتایا کہ ٹائیگر پھر بگڑا ہوا ہے اس لیے اسے فوراً حویلی پہنچنا ہوگا۔ غلام رسول جیپ پر آیا تھا۔ کبیر صاحب سے اجازت لے کر اور پریشان شبو کو تسلی دے کر عمران غلام رسول کے ساتھ روانہ ہوا۔ وہ بہت کم اپنی پناہ گاہ سے باہر نکلتا تھا لیکن جب بھی نکلتا تھا، ایک عجیب سا خوف اس پر طاری رہتا تھا۔ اس خوف کا تعلق ماجھاں کی موت اور ماجھاں کے خطرناک ساتھیوں سے ہوتا تھا۔ قریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد وہ جان محمد صاحب کی حویلی پہنچ گیا۔ یہاں پنجروں میں سرکس کے فن کار یعنی دو بندر، ایک ریچھ اور کتے وغیرہ بند تھے۔ بنگلہ ٹائیگر بھی تھا لیکن غیر متوقع طور پر وہ بالکل پُرسکون نظر آیا۔ عمران کو حیرت ہوئی۔ اس کی حیرت دیکھ کر جان محمد صاحب مسکرائے اور بولے۔ ”آؤ میں تمہاری حیرت دور کرتا ہوں۔“

وہ دونوں حویلی کی نشست گاہ میں جا بیٹھے۔ جان صاحب کے فربہ چہرے پر گہری سنجیدگی طاری ہو گئی۔ انہوں نے کہا۔ ”عمران بیٹے! ٹائیگر ٹھیک ہے۔ میں نے تمہیں بہانے سے بلایا ہے۔ میں تم سے اس خبیث راجا کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔“

راجا کے لیے خبیث کے خطاب نے عمران کو شاک پہنچایا۔ وہ ذرا سنبھل کر بولا۔ ”جان صاحب! بھارا جا کو میں اپنے بڑوں کی طرح سمجھتا ہوں۔“

”تم سمجھتے ہو لیکن وہ بڑا ہے نہیں... میرے خیال میں تو بڑے تم ہو جو بہت کچھ جانتے ہوئے بھی چپ ہو اور اس کی ہر بات پر ”جی جی“ کہتے ہو۔“

”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

”سب سے پہلے تو میں تمہیں یہ بتا دوں کہ کل میں نے

اسے ذلیل کر کے گھر سے باہر کر دیا ہے۔ اگر اس میں ذرا سی بھی حیا ہے تو اب ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔ تم نے دیکھا ہی ہوگا، نیلم سیدھی سادی لڑکی ہے۔ شہری لڑکیوں جیسی ہوشیاری چالاکی اس میں نہیں ہے۔ یہ خبیث راجا اس کو دھوکا دینے کے چکر میں تھا۔ ایک طرف اس سے پیار کی پینگیں بڑھا رہا تھا، دوسری طرف شہر میں ایک طوائف کے پاس بھی راتیں گزار رہا تھا۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ کل رات بھی وہ اسی کے بستر پر شراب پیتا رہا ہے۔''

''آ... آپ کے پاس کیا ثبوت ہے جان صاحب؟''

''میرے پاس راجا اور اس تھرڈ کلاس لڑکی کی تازہ تصویریں ہیں... اور گھبراؤ مت، میرے پاس ہر بات کا مکمل ثبوت ہے۔''

جان صاحب نے چند سیکنڈ توقف کیا پھر ایک رسید لکھتے ہوئے بولے۔ ''یہ دیکھو، یہ رقم چند روز پہلے راجا نے مجھ سے وصول کی ہے۔ یہ اس کے دستخط ہیں۔ پڑھو، کتنی رقم ہے؟''

''بیس ہزار... اور اس کے نیچے ستر ہزار۔ کُل نوّے ہزار۔'' عمران نے جواب دیا۔

جان محمد صاحب بولے۔ ''یہ بیس ہزار ٹائیگر کی خوراک وغیرہ کا خرچہ تھا اور ستر ہزار روپیا اس نے ٹائیگر کی سدھائی کا لیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ دو چار ہزار کے علاوہ یہ ساری رقم اس کی اپنی جیب میں ہی گئی ہے۔ اور دیکھو، بات صرف ٹائیگر کی سدھائی ہی کی نہیں ہے، میں نے سارا پتا کرایا ہے۔ جانوروں کی سدھائی کی ساری محنت تمہاری ہوتی ہے اور اس محنت کا راجا ٹھیک ٹھاک معاوضہ بھی وصول کرتا ہے۔ تمہیں وہ اس معاوضے کا چوتھا... حصہ بھی نہیں بتاتا۔ یہ ساری رقم شراب اور نت نئی لڑکیوں پر خرچ ہوتی ہے۔''

عمران خاموش رہا۔ جان صاحب جانتے تھے کہ عمران کبھی کبھار سگریٹ پیتا ہے۔ انہوں نے اسے سگریٹ پیش کیا جو اس نے جھجکتے ہوئے قبول کر لیا۔ جان صاحب بولے۔ ''مجھے سچ سچ بتاؤ عمران! تم اس راجا تک کیسے پہنچے اور کب سے اس کے ساتھ ہو؟''

عمران اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے گول مول بات کی اور بتایا کہ وہ اپنے کچھ رشتے داروں کے ہاں گجرات میں ٹھہرا ہوا تھا، وہیں راجا سے جان پہچان ہوئی۔

جان صاحب نے سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا اور بولے۔ ''تم گجرات میں نہیں، گجرات کے ایک پنڈ میں ٹھہرے ہوئے تھے... اور اپنے کسی رشتے دار کے پاس نہیں، ایک بدمعاش عورت ماجھاں کے گھر میں تھے۔''

عمران ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ جان صاحب بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ ''ایک روز راجا نے مجھے اس بارے میں تھوڑا سا بتایا تھا۔ بعد میں، میں نے اپنے طور پر چھان بین کی اور مجھے تمہارے بارے میں اور بھی کچھ باتیں معلوم ہوئیں۔''

''کیسی باتیں جی؟''

جان صاحب ہولے سے مسکرائے اور اس کے چوڑے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ ''مجھ سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے عمران! میرا وعدہ ہے، ہم دونوں کے تعلقات آگے چل کر کیسے بھی ہوں، میری طرف سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

''اس بات کا تو مجھے یقین ہے جی۔''

''مجھے پتا چلا ہے کہ تم ماجھاں نام کی ایک بدمعاش زمیندارنی کے پاس ملازمت کرتے تھے۔ وہ شراب پیتی تھی اور نوجوان لڑکوں کو اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ تمہارے ساتھ بھی اس کا سلوک بہت بُرا تھا۔ بات نہ ماننے پر وہ تمہیں کتوں کے ساتھ بھی بند رکھتی تھی۔ تم نے ایک دو دفعہ بھاگنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ پھر ایک روز تمہیں راجا کے ذریعے موقع ملا کہ وہاں سے بھاگ نکلو۔ ماجھاں اور اس کے دو ساتھیوں نے گھوڑوں پر اس لوڈر کا پیچھا کیا جس پر تم سوار تھے۔ لوڈر پر چڑھنے کی کوشش میں ماجھاں گر پڑی اور بڑی دور تک لوڈر کے ساتھ ہی گھسٹتی چلی گئی۔ اس حادثے میں اس کی موت ہوگئی۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟''

عمران اثبات میں سر ہلانے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔

جان صاحب بولے۔ ''ماجھاں کی موت کی وجہ سے تم اور راجا بہت خوف زدہ ہو گئے۔ لہٰذا تم یہاں شاد پورہ آ کر باغبان کبیر احمد کے پاس چھپ گئے۔ یہاں تک میں ٹھیک ہوں؟''

''جی ہاں۔'' عمران نے کہا۔

''اب اس سے آگے میں جو کچھ بتانے جا رہا ہوں، وہ تمہاری نظر سے بھی اوجھل ہے۔'' جان صاحب نے کہا پھر نیا سگریٹ سلگا کر بولے۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، اس وقت ٹیکراں نام کے گاؤں میں حالات کیا ہیں؟''

''مجھے کچھ زیادہ تو پتا نہیں جی۔ راجا نے بتایا تھا کہ ماجھاں کا بھائی ناجا ہمیں ڈھونڈ رہا ہے۔ چار مہینے پہلے اس



نے راجا کے پرانے ڈیرے پر آگ بھی لگا دی تھی اور پنڈ والوں کو دھمکیاں دی تھیں راجا کے بارے میں۔''

''اگر میں کہوں کہ ایسا کچھ نہیں ہوا تو پھر؟''

''میں سمجھا نہیں۔''

جان صاحب بولے۔ ''تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ناجے کو پولیس مقابلے میں مرے پورے دس مہینے ہو گئے ہیں۔ تمہارے آنے کے کچھ ہی دن بعد یہ واقعہ ہو گیا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد مخالف پارٹی کے لوگوں نے ایک دم طاقت پکڑ لی... اور ایک دو زوردار لڑائیوں کے بعد ماجھاں کے رشتے داروں کو بھی کیکراں گاؤں سے مار بھگایا۔ اب کیکراں میں ان لوگوں کا نام و نشان تک نہیں۔ تم پتا نہیں کہاں پھر رہے ہو۔''

عمران واقعی ششدر رہ گیا... وہ کتنی ہی دیر سناٹے میں رہنے کے بعد بولا۔ ''تو کیا بھارا راجا نے جھوٹ بولا تھا؟''

''سفید جھوٹ... اور یہ سب کچھ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں۔ وہ اپنے مطلب کے لیے کسی کو بھی دھوکا دے سکتا ہے۔ وہ تمہیں خوف زدہ کر کے رکھنا چاہتا تھا تاکہ تم کہیں جانے کا سوچ ہی نہ سکو۔ وہ تم سے زبردست فائدے لے رہا تھا اور اب بھی لے رہا ہے عمران۔''

عمران ہکا بکا سا بیٹھا رہا... اس کے پیٹ میں کچھ سلگنے لگا۔ وہ پچھلے ایک عرصے سے بُری طرح اپنی ماں کے لیے تڑپ رہا تھا اور راجا نے اسے فریب کے جال میں پھنسا کر شاد پورہ میں قید کیا ہوا تھا۔

جان صاحب بولے۔ ''عمران! تمہارے اندر لگن ہے۔ تمہیں اللہ نے صلاحیت دی ہوئی ہے۔ تم ترقی کر سکتے ہو، آگے جا سکتے ہو۔ تمہارے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ یہی راجا ہے۔ اس کمینے سے جان چھڑا لو۔ کہیں بھی چلے جاؤ۔ تمہیں عزت ملے گی اور پیسا بھی۔ اور اگر تم چاہو تو میرے پاس آ جاؤ۔ میں ابھی لمبے چوڑے وعدے تو نہیں کر سکتا مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ یہاں تمہاری محنت کا بھرپور صلہ ملے گا۔''

عمران کا دماغ ابھی تک کیکراں کے اردگرد گھوم رہا تھا، وہ بولا۔ ''جان صاحب! کیا واقعی ناجا ختم ہو چکا ہے؟''

جان صاحب اٹھ کر الماری کی طرف گئے اور ایک پرانا اخبار لے آئے۔ ''میں نے کہا ہے نا کہ میرے پاس ہر بات کا ثبوت ہے۔''

یہ نو دس ماہ پرانا اخبار تھا۔ عمران نے دیکھا، اس میں ناجے ڈکیت اور اس کے تین ساتھیوں کی ناگہانی ہلاکت کا سارا واقعہ موجود تھا۔ ایک دم عمران کو لگا کہ وہ آزاد ہو گیا ہے، اس کے پنجرے کی تیلیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ اس بارے میں عمران نے جان صاحب سے دیر تک بات کی اور اس کی آنکھوں کے سامنے سے سارے پردے اٹھ گئے۔

... شام سے پہلے عمران شاد پورہ واپس آ گیا۔ راجا ابھی تک لوٹا نہیں تھا۔ وہ رات کو بھی نہیں آیا۔ رات عمران دیر تک بستر پر کروٹیں لیتا رہا۔ راجا یقیناً اس سے جھوٹ بولتا رہا تھا لیکن عمران کو پتا تھا کہ شریف نے جھوٹ نہیں بولا۔ اس کی والدہ واقعی شیخوپورہ میں موجود نہیں تھی اور نہ ہی اور اس کا سراغ ملا تھا۔ عمران سب سے پہلے اپنی والدہ کو ڈھونڈنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے دل و دماغ میں ان لوگوں کے خلاف بھی نفرت بڑھ رہی تھی جنہوں نے اسے اس کی ماں سے جدا کیا اور پھر در در دھکے کھانے پر مجبور کیا۔ ان میں چودھری سجاول اور صادق شاہ جیسے لوگ بھی شامل تھے۔ وہ ان لوگوں کو ان کے کیے کا مزہ چکھانا چاہتا تھا... لیکن کیسے؟ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ جہاں تک راجا کی بات تھی، اس کے لیے عمران کے دل میں نفرت نہیں تھی... ہاں، افسوس ضرور تھا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ راجا اسے اس طرح اندھیرے میں رکھے گا اور فریب کرے گا۔ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں تیزی سے سوچ رہا تھا اور اب اس سوچ بچار میں راجا ہرگز شامل نہیں تھا۔

دوسرے روز دوپہر کے وقت راجا نشے میں دھت واپس آیا اور اس کے ساتھ عمران کی دوٹوک بات ہوئی۔ عمران نے راجا کو اخبار کا وہ ٹکڑا دکھایا جس میں دس مہینے پہلے ناجے ڈکیت کی موت کی خبریں چھپی تھیں اور لاش کی تصویریں شائع ہوئی تھیں۔

راجا یہ سب دیکھ کر ششدر ہوا لیکن بہت جلد بات کی تہ تک پہنچ گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ معلومات عمران کو کیسے اور کس سے ملی ہیں۔ ان دونوں کے درمیان تیز جملوں کا تبادلہ ہوا۔ آخر میں راجا نے کہا۔ ''عمو یارا ٹھیک ہے کہ میں نے تجھے خطرے سے بچانے کے لیے ناجے کے بارے میں غلط اطلاع دی لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم دشمن بن گئے۔ ہم اب بھی دوست ہیں۔ دشمن وہ بندہ ہے جو تمہیں ورغلا رہا ہے۔ تمہیں مجھ سے توڑ رہا ہے۔''

عمران نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''جو بھی ہے بھارا جا! اب ہمارے راستے جدا ہو چکے ہیں۔ اب زیادہ باریکیوں میں جائیں گے تو دکھ اور رنجش کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ میں تمہیں معاف کرتا ہوں، تم مجھے معاف کر دو۔ ہمیں دشمنوں کی

طرح نہیں، دوستوں کی طرح علیحدہ ہوجانا چاہیے۔''

راجا نے کئی پینترے بدلے مگر عمران چونکہ تہیہ کر چکا تھا، اس لیے وہ اپنے فیصلے پر ڈٹا رہا اور پھر وہ دونوں نم ناک آنکھوں کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا ہوگئے۔

عمران نے علی الصباح ہی شبّو کو اس بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ ساتھ چلنے کو تیار تھی۔ وقتِ رخصت راجا نے شبّو کے سر پر پیار دیا اور آٹھ دس ہزار روپے زبردستی اس کی مٹھی میں تھماتے ہوئے کہا۔ ''اپنی شادی پر مجھے بھول نہ جانا۔''

وہ اپنی طرز کا جدا بندہ تھا۔ کہیں بہت بُرا، کہیں صرف بُرا اور کہیں اچھا۔

☆☆☆

عمران اور شبّو سیدھے جان محمد صاحب کے قصبہ نما گاؤں میں ان کی حویلی میں آگئے۔ جان صاحب نے خوش دلی اور محبت سے ان کا استقبال کیا۔ حویلی میں دو معزز مہمان بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک تو کوئی مولوی صاحب تھے۔ دوسرے جان محمد صاحب کے منہ بولے بھائی اور پارٹنر حاجی احمد اشفاق صاحب تھے۔ اس رات جان صاحب نے حاجی اشفاق سے بھی عمران کی ملاقات کرائی۔ انہوں نے حاجی اشفاق کو بتایا۔ ''قدرت جب کچھ چھینتی ہے تو اس کے بدلے کچھ دیتی بھی ہے۔ اس بچے سے نوعمری میں اس کی پیاری ماں چھن گئی۔ یہ دن رات اس کے لیے تڑپا، ماں تو اسے نہ ملی... کم از کم ابھی تک تو نہیں ملی، پر اس کا صلہ اسے ایک اور شکل میں مل گیا۔ اللہ نے اس کے ہاتھ میں بڑی کرامات دی ہیں...''

پھر جان محمد صاحب اپنے ساجھے دار کو ان حیران کن واقعات کے بارے میں بتانے لگے جو عمران اور جانوروں کے حوالے سے ان کے مشاہدے میں آئے تھے، یا انہوں نے سنے تھے۔ یہ سب کچھ ناقابلِ یقین تھا مگر ہاتھ کے کنگن کو آرسی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ حاجی اشفاق بھی عمران سے بہت متاثر ہوئے۔

شبّو، جان صاحب کی بیوی صدیقہ بی بی کے ساتھ زنان خانے میں چلی گئی تھی۔ عمران کا بستر حویلی کی بیٹھک میں لگایا گیا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں آنے والی تیز رفتار تبدیلیوں پر حیران ہو رہا تھا۔ جوں جوں اسے اختیار، آزادی اور جسمانی توانائی مل رہی تھی، اپنی ماں کے لیے اس کی تڑپ بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے لیے سب سے مقدم اپنی ماں کی تلاش تھی۔ رات گئے تک ماں کی تصویر اس کی نگاہوں میں پھرتی رہی۔ وہ غنودہ حالت میں بستر پر لیٹا رہا۔ اچانک ایک آواز نے اسے بُری طرح چونکایا... وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بیٹھک کے کسی قریبی کمرے سے کسی شخص نے بڑے وجدانی انداز میں حق ہُو کا نعرہ بلند کیا تھا۔ ایسا نعرہ عمران نے پہلے بھی کہیں سنا تھا۔ ایک دم اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اسے یاد آگیا کہ ایسے آوازے اس نے کہاں سنے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے جسم میں بجلی سی لپک گئی۔ وہ اٹھا اور کچے فرش پر ننگے پاؤں چلتا ہوا آواز کی طرف بڑھا۔ ایک چھوٹی راہداری سے گزر کر وہ ایک کمرے کے سامنے پہنچا۔ اس نیم پختہ کمرے کے اندر گیس لیمپ کی سفیدی مائل روشنی تھی۔ عمران نے تھوڑی سی کوشش کی اور پھر ایک چوبی کھڑکی کی جھری میں سے اندر جھانکنے میں کامیاب رہا۔ وہ دنگ رہ گیا۔ کل اسے پتا چلا تھا کہ یہاں مہمان خانے میں کوئی مولوی صاحب بھی ٹھہرے ہوئے ہیں لیکن یہ مولوی صاحب نہیں تھے۔ یہ تو شہنشاہ کے مزار کا دھی پیر فرتوت مخدوم صادق شاہ تھا جس نے ڈھائی تین سال پہلے عمران کو بڑی بے حسی سے بدمعاش ماجھاں کے سپرد کیا تھا اور پھر پلٹ کر اس کی خبر نہیں لی تھی۔ وہ پہلے سے کچھ اور فربہ ہو چکا تھا۔ سر سے بھری ہوئی آنکھیں کچھ اور بھی چھوٹی نظر آتی تھیں۔ وہ غالباً بھنگ کے نشے میں تھا۔ جان محمد صاحب کی معاون نیلم کسی خادمہ کی طرح اس کے سامنے مؤدب کھڑی تھی۔ وہ خود پلنگ پر نیم دراز تھا۔ اس نے نیلم کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''گھبرا نہیں بچے۔ تیری شادی ہوگی اور بڑی جلدی بڑا اچھا دولہا ملے گا۔ تیری برادری کا ہی لڑکا ہوگا۔''

پھر اس نے نیلم کو اوڑھنی یعنی گرم شال اتارنے کو کہا۔ نیلم نے فوراً اتار دی۔ صادق شاہ نے آنکھیں بند کرلیں اور نیلم کے جسم پر اوپر سے نیچے تک ہاتھ پھیرنے اور کچھ پڑھنے لگا۔ صادق شاہ کو دیکھ کر عمران کے سینے میں انگارے دہکنے لگے۔ اسے ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ اس شخص سے اتنی جلدی ٹکرائے گا۔ اس کے دل میں یہ شدید خواہش پیدا ہوئی کہ وہ آج کی رات کو صادق شاہ کے لیے یادگار اور عبرت ناک بنا دے۔ اس کے اندر وہی سفاک تدبّر سر اٹھانے لگا جو ماجھاں کی موت کے وقت اس کے ذہن میں نمودار ہوا تھا۔ وہ تیزی سے سوچنے لگا۔

خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں



# مشروبِ خون

سیریناراض

عادات کئی طرح کی ہوتی ہیں... کچھ عادات صرف آپ کے لیے ہی نہیں بلکہ... دوسروں کے لیے بھی وبالِ جان بن جاتی ہیں... کوئی بھی عادت اپنانے سے پہلے یہ کوئی نہیں سوچتا کہ... یہ خطرناک حد تک بھی جاسکتی ہے... ایک خوبصورت، نازک اندام دوشیزہ کے منفرد ذوقِ نظر کو عیاں کرتی پُراسرار کہانی...

**سراغرساں کو امتحان سے دوچار کردینے والا سنسنی خیز معاملہ جرم**

''تم میں سے پرائیویٹ سراغرساں کون ہے؟'' گلاس سے چسکیاں بھرتے ہوئے اس عورت نے مخمور نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے اونچی آواز میں پوچھا۔ اُس وقت وہ جارج بار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ دو چار آدمیوں کے سوا اس وقت وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

''جان آر تھمر پرائیویٹ سراغرساں، آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔'' میں اس کی بات سن کر اٹھا اور سامنے پہنچ کر جھکتے ہوئے بولا۔ میرا کا لہجہ نہایت مؤدبانہ تھا۔ ''فرمایئے... کیسے یاد کیا ہے اس ناچیز کو۔''

''تو تم ہو وہ سراغرساں!'' کچھ دیر تک وہ مجھے اور میں

اُسے نظروں ہی نظروں میں جانچنے کی کوشش کرتے رہے۔ میں جانتا تھا کہ وہ عورت نشے میں ہے... اس لیے نہایت شائستہ اور دھیمے لہجے میں گفتگو کا آغاز کیا کہ مبادا کہیں اسے میری کوئی بات بری نہ لگ جائے اور عادی شرابیوں کی طرح ..... چیخ چیخ کر آسمان سر پر نہ اٹھالے۔ ویسے بھی نشے کی حالت میں انسان وہی بات سننا چاہتا ہے جو اسے پسند آئے ورنہ اس کا پارا ساتویں آسمان کو چھونے لگتا ہے۔ اس طرح کے لوگوں سے معاملات طے کرنے میں، میں کافی احتیاط پسند واقع ہوا ہوں۔ میری عادت تھی کہ ہر ممکن طور پر خود کو فضول کے جھگڑے سے دور رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس لیے جب خاتون نے پکارا تو سمجھ گیا کہ یہ عورت میری تلاش میں یہاں آئی ہے اور اس کا مخاطب میں ہی ہوں۔ ویسے میرے اکثر کلائنٹ مجھے ڈھونڈتے ہوئے یہیں پہنچتے تھے۔ یہ بار میرے ایک دوست کی ملکیت تھا۔ اگر میں نہ ملتا تب بھی اُنہیں میرے دفتر کا پتا یا فون نمبر ضرور مل جاتا تھا۔

وہ عورت پختہ عمر کی تھی لیکن خوبصورت تھی۔ اس کے بال رنگے ہوئے تھے۔ لباس مختصر مگر خوبصورت تھا۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ چند برس پہلے تک یہ خاصی دلکش دوشیزہ ہوگی مگر اُس وقت اس کا چہرہ زردی مائل تھا، جسے چھپانے کے لیے اس نے میک اَپ کی کافی گہری تہ چڑھا رکھی تھی۔

''کہیے... کس لیے آپ مجھے یاد کررہی تھیں؟'' میں نے خاتون کو خاموش دیکھ کر سوال کیا۔

''مجھے ایک پرائیویٹ سراغرساں کی خدمات درکار ہیں۔'' اُس نے گلاس سے ایک گھونٹ بھرا اور نظریں فرش پر گڑائے ہوئے جواب دیا۔

''کس مقصد کے لیے؟''

''میرا خیال ہے کہ میرا شوہر...'' اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے امید ہے کہ باقی بات تو تم سمجھ ہی گئے ہوگے... کیوں، ٹھیک کہا نا میں نے؟''

''سمجھ گیا۔'' میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو زحمت ہوگی لیکن بہتر یہی ہوگا کہ کل کسی وقت آپ میرے دفتر تشریف لے آئیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کا مسئلہ حل ہوجائے گا۔''

''تو کیا ہم یہاں بات نہیں کرسکتے؟'' اس نے تشویش بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

''ہرگز نہیں۔'' میں نے چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''میرا ایک دفتر ہے اور عملہ بھی۔ میں سارے معاملات وہیں نمٹاتا ہوں۔ یہاں تو میں کچھ وقت سکون سے گزارنے کے لیے آتا ہوں اور ..... اکثر شام کے ان اوقات میں یہیں پر ملتا ہوں لیکن دفتری معاملات دفتر میں ہی طے ہونے چاہئیں۔'' میں نے اس کی تشویش کو بھانپ لیا۔ اس لیے اسے مطمئن کرنے کے لیے تسلی بخش جواب دیا۔

''جیسی تمہاری مرضی۔'' اس نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

میں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ اس کی طرف بڑھادیا۔ کارڈ پر ملاقات کے اوقات بھی لکھے ہوئے تھے۔

''تو پھر ہم کل مل رہے ہیں... بائے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اجازت لی اور جواب کا انتظار کیے بغیر باہر چلا آیا۔

☆☆☆

''تشریف رکھیے۔'' صبح کا وقت تھا۔ میں اپنے دفتر میں موجود تھا جب وہ حسبِ توقع پہنچ گئی۔ اس وقت وہ خاصے معقول حلیے میں تھی لیکن اس کی آنکھیں اب بھی تھکی تھکی اور خوابیدہ لگ رہی تھیں۔ چہرے پر ہلکا سا میک اَپ تھا جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس کے چہرے کی شادابی شاید کسی بیماری کے سبب کم ہورہی ہے۔

''اب ذرا کھل کر بتائیے کہ آپ کا مسئلہ کیا ہے؟'' رسمی کلمات کے بعد میں نے اسے مخاطب کیا۔ وہ چاروں طرف نظریں گھماتے ہوئے دفتر کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس وقت ہم دونوں کے علاوہ دفتر میں بارٹ، میگنس اور ٹیکس بھی موجود تھا۔ بارٹ اور میگنس دونوں میرے اسسٹنٹ تھے جبکہ ٹیکس انتظامی امور میں معاونت کرتا تھا۔

''بات یہ ہے کہ میرا شوہر...''

''ایک منٹ مس...'' جیسے ہی اس نے بات شروع کی میں نے قطع کلامی کی۔

''مسز کینڈی براؤن۔'' وہ سمجھ گئی اور مسکراتے ہوئے اپنا نام بتایا۔

''ہاں تو اب سب کچھ کھل کر بتائیں۔'' اس کا نام جان لینے کے بعد میں نے کاروباری مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے کہا۔ ٹیکس مسز براؤن کے برابر والی کرسی پر نوٹ پیڈ لیے بیٹھا تھا۔ یہ اس کے فرائض میں شامل تھا کہ میری اور کلائنٹ کی گفتگو کے نوٹس بناتا رہے۔

''بات یہ ہے کہ میں کافی عرصے سے یہ محسوس کررہی ہوں کہ میرا شوہر کسی دوسری عورت کے چکر میں ہے۔'' اس نے اپنا مسئلہ بیان کرنا شروع کیا۔ ''میں چاہتی ہوں کہ آپ پتا چلائیں کہ کیا واقعی میرا شک دُرست ہے؟''

''آپ مسٹر براؤن سے شادی سے لے کر اب تک کے



تمام متعلقہ واقعات تفصیل سے بیان کریں۔ اس سے مجھے کیس سمجھنے میں آسانی ہوگی۔'' میں نے اس کی بات سُن کر کہا۔

''میں مسٹر اولیگ براؤن کی چھٹی بیوی ہوں۔'' اس کی یہ بات سنتے ہی مجھے جھٹکا لگا۔ میں سمجھ گیا کہ بندہ فطرتاً دل پھینک ہے۔ مجھے مسز براؤن کی تشویش درست لگی۔ جو بندہ پانچ بیویاں فارغ کرچکا ہو، اُس کا یہ سنگِ عشق رُکے گا نہیں، وہ چھٹے نمبر سے آگے بھی ضرور جائے گا۔ وہ بول رہی تھی اور میں اس کے چہرے پر نظریں جمائے بڑے اہتمام سے اس کا بیان سُن رہا تھا۔ کافی دیر بعد اس نے اپنی بات ختم کی تو اس کی پلکوں پر نمی تیر رہی تھی۔ اس نے اپنے ہینڈ بیگ سے رومال نکالا اور آنکھیں صاف کرنے لگی۔

مسز کینڈی براؤن نے جو کچھ مجھے بتایا۔ اُس کا لبِ لباب یہ تھا کہ اولیگ براؤن ایک بار چلاتا ہے، جس کا نام جنگل ایوننگ ہے۔ براؤن سے پہلی بار کینڈی کی ملاقات بھی اس بار میں ہی ہوئی تھی۔ اس کے بعد دونوں کے درمیان تعلقات آہستہ آہستہ بڑھتے چلے گئے۔ براؤن بہت رومینٹک آدمی تھا۔ کچھ ہی عرصے میں اس نے اپنی پانچویں بیوی کو طلاق دے دی اور کینڈی سے چھٹی شادی رچالی۔ اب مسز براؤن کے مطابق وہ بار کی ایک نئی ویٹریس کے چکر میں تھا۔ حالانکہ براؤن کو چھٹی شادی کیے ابھی بہت عرصہ نہیں گزرا تھا۔ شاید وہ اپنی فطرت سے مجبور تھا۔ مسز براؤن بہت پریشان لگ رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ جو بیوی اپنے شوہر کے عاشقانہ ماضی سے آگاہ ہو، اس کا پریشان ہونا یقینی بات تھی۔ اوپر سے یہ کہ خود کینڈی نے مسز براؤن بننے کے لیے اُس کی پانچویں بیوی کا پتا صاف کیا تھا۔ شاید اسی لیے اب اسے اپنا پتا صاف کرنے والی لڑکی کا اندازہ ہوچلا تھا اور وہ اس سے خوفزدہ نظر آرہی تھی۔ اگرچہ اولیگ نے بیوی کو اپنی اس نئی مہم کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی لیکن اس نے بھانپ لیا تھا کہ وال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ مسز براؤن کے مطابق وہ دونوں اکثر باہر گھومتے پھرتے دیکھے گئے ہیں۔ اسے شبہ تھا کہ اس نئی لڑکی کے چکر میں وہ اسے جلد ہی طلاق دے سکتا ہے۔ یہی بات اس کے لیے پریشان کن تھی۔ اب وہ میرے پاس اس لیے آئی تھی کہ اس کی مدد کروں اور یہ پتا چلاؤں کہ کیا براؤن واقعی ساتویں شادی رچانے والا ہے۔ اگر ایسا ہے تو اسے کس طرح باز رکھا جاسکتا ہے۔

میں مسز براؤن کی باتوں پر غور کرتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ کس طرح اس معاملے پر کام شروع کیا جائے کہ اچانک اس نے پرس کھولا اور جب اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں نوٹوں کی ایک معقول گڈی اور ایک بڑے سائز کا فوٹو موجود تھا۔ ''یہ لیجیے...'' اس نے وہ دونوں چیزیں میری طرف بڑھائیں۔ نوٹ دیکھتے ہی ٹیکس اپنے کیبن کی طرف دوڑا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں کنٹریکٹ کی کاپی تھی۔ اس نے معاہدہ تیار کرکے اس پر مسز براؤن کے دستخط لیے۔ اتنی دیر تک میں تصویر کا جائزہ لیتا رہا۔

تصویر میں اولیگ براؤن اور اس کی ممکنہ ساتویں بیوی نظر آرہی تھی مگر تصویر خاصی دھندلی تھی۔ اسے دیکھ کر لگ رہا تھا کہ کسی اناڑی نے بطور ثبوت تصویر لینے کی کوشش کی ہے۔ اسی وجہ سے فوکس خراب ہوگیا اور وہ دھندلا گئی۔

''اس کے پیچھے ہی بار، ویٹریس کا نام اور پتا لکھا ہوا ہے۔'' مسز براؤن نے میری توجہ تصویر کی پشت کی طرف مبذول کروائی۔

''بہت بہتر... ہم آج سے ہی اس پر کام شروع کردیں گے۔'' فیس کی وصولی اور معاہدے پر دستخط کے بعد اب وہ باضابطہ طور پر میری کلائنٹ بن چکی تھی۔

''اب آپ جائیں اور آرام کریں۔ اگر ہمیں ضرورت پڑی تو موبائل فون پر رابطہ کرلیں گے۔''

''او کے...'' میری بات سُن کر اس نے مختصر جواب دیا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اُس کے جانے کے بعد میں نے بارٹ اور میگنس کو بلایا اور سارے کیس سے آگاہ کیا۔ انہیں ہدایت دی کہ اب کس طرح انہیں اپنا اپنا کام انجام دینا ہے۔ اتنی دیر میں ٹیکس نے میری اور مسز براؤن کے درمیان ہونے والی گفتگو کا خلاصہ ٹائپ کرکے فائل میں لگادیا تھا۔

''اب جو کچھ میں کہتا ہوں، وہ غور سے سنو۔'' میں نے تینوں کو مخاطب کیا۔ ''ہمیں کینڈی براؤن کے نام اور اس کے فون نمبر کے سوا اگر اس کے بارے میں کچھ معلوم ہے تو صرف اس کا یہ دعویٰ کہ وہ اولیگ براؤن کی چھٹی بیوی ہے۔ اس بات میں کتنی صداقت ہے، اس بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس نے مجھے براؤن اور اس کی مبینہ گرل فرینڈ کی جو تصویر دی ہے وہ بھی کسی اناڑی کی کھینچی ہوئی ہے۔''

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟'' بارٹ نے قطع کلامی کی۔

''ہمیں فوراً اس کیس پر کام شروع کردینا چاہیے۔'' میں نے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے مگر ہم تحقیق کہاں سے شروع کریں؟''

''کینڈی براؤن سے...''

''کیا...؟'' بارٹ نے حیرت سے کہا۔ ''مگر وہ تو ہماری

کلائنٹ ہے، ٹارگٹ نہیں؟''

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' میں نے اس کے سوال کا جواب دینا شروع کیا۔ باقی دو نے بھی سر ہلا کر اس کی تائید کی۔ ''نہ جانے کیوں مجھے شبہ ہے کہ جو کچھ اس نے کہا وہ درست نہیں۔ بیچ میں کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ خود ان دونوں کا پیچھا کرتی رہی ہو۔ ممکن ہے کہ یہ تصویر بھی خود اس نے اتاری ہو ورنہ اتنی دھندلی تصویر کلائنٹ کبھی سراغرساں کو نہیں دیتا ہے۔ مجھے اس بات پر بھی حیرت ہے کہ اس نے وضاحت کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا کہ وہ یہ دھندلی تصویر ہمیں کیوں دے رہی ہے؟''

''ہوں...'' بارٹ نے ہنکارا بھرا تو تینوں توصیفی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگے۔

''باس آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہ واقعی شک کرنے والی بات ہے۔'' ٹیکس نے کہا۔

''ہوسکتا ہے کہ یہ صرف میرا شبہ ہو۔ مسز براؤن کی بات بالکل ٹھیک ہو مگر یاد رکھو کہ یہ شک ہی ہے جو ہمیں سچ تک پہنچاتا ہے۔''

''اب ہم کیا کریں؟'' بارٹ نے ٹوکا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرا لیکچر سننے کے بجائے کام کی بات جاننے کے خواہشمند ہیں۔

''سنا ہے تمہاری اُنگلیوں میں جادو ہے۔'' میں نے ٹیکس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہا۔

''سمجھ گیا باس۔''

''بہت اچھا... تو پھر دکھاؤ اپنی اُنگلیوں کے جادو کا کمال۔''

☆☆☆

''انٹرنیٹ کے ذریعے اب تک جو کچھ معلوم ہوسکا ہے، وہ تو حیران کن ہے۔'' لگ بھگ ایک گھنٹے کے بعد ٹیکس کچھ کاغذات لیے میرے پاس بیٹھا اپنی تحقیق سے آگاہ کررہا تھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے ہاتھ بڑھا کر اس سے کاغذات لیتے ہوئے کہا۔

''مسز براؤن کی بات درست تسلیم کی جائے تو وہ اب تک چھ شادیاں کرچکا ہے لیکن اولیگ براؤن کی کسی شادی کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں، ماسوائے ایک کے... اور وہ لڑکی ہے خود کینڈی۔'' جب میں کاغذات کو دیکھنے میں منہمک تھا تو ٹیکس نے بتایا۔

کاغذات کے مطابق جنگل ایوننگ بار کی ملکیت اولیگ براؤن کے نام پر تھی اور وہ گزشتہ دس سال سے یہ بار چلا رہا تھا۔ اولیگ نے پہلی شادی چار ماہ قبل کینڈی سے کی تھی۔ صرف اسی شادی کا رجسٹریشن ریکارڈ موجود تھا۔ اب سب سے اہم بات یہ تھی کہ اگر اولیگ اس سے پہلے پانچ شادیاں کرچکا ہے تو اس کا ریکارڈ کہاں ہے؟ ایک اور بات تشویش کی تھی۔ وہ یہ کہ اولیگ اس شہر میں دس برس سے کاروبار کررہا تھا۔ اس نے یہ ساری شادیاں یا اُن میں سے زیادہ تر یہیں کی ہوں گی مگر میرج آفس میں صرف ایک کی ہی رجسٹریشن کیوں کی گئی؟ کیا باقی شادیاں اس نے غیر قانونی طور پر کی تھیں؟ کینڈی جھوٹ بول رہی تھی۔ اگر وہ جھوٹ بول رہی تھی تو اسے ایسی کیا مصیبت آن پڑی کہ وہ شوہر کے خلاف خفیہ طور پر تحقیقات بھی کروا رہی ہے مگر ساتھ ساتھ حقیقت بھی چھپا رہی ہے۔

میں کافی دیر تک ان باتوں پر غور کرتا رہا لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ ''بارٹ کو بلاؤ۔'' میں نے ٹیکس سے کہا۔

''تم جنگل ایوننگ بار جاؤ اور یہ پتا چلاؤ کہ کیا وہاں ایسی لڑکی ویٹریس کے طور پر کام کرتی ہے جس کی شکل تصویر والی لڑکی سے ملتی ہے۔'' میں نے اسے ہدایات شروع کیں۔ میں چاہتا تھا کہ سب سے پہلے تو یہ طے ہو کہ واقعی کوئی ایسی لڑکی ہے جس کے ساتھ اولیگ براؤن گھپ چل رہا ہے۔ ''لڑکی کا نام بھی تصویر کے پیچھے لکھا ہوا۔ جب یہ کنفرم ہوجائے تو مجھے موبائل فون پر اطلاع کردینا۔''

''او کے باس۔'' یہ سنتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں جارہا ہوں اور جیسے ہی تصدیق ہوتی ہے، آپ کو میسج کرتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' بارٹ کے جانے کے بعد میں نے میگنس کو بلوایا۔ ''فون کمپنی کے ریکارڈ سے یہ پتا چلاؤ کہ یہ کس نام پر ہے اور اس شخص کے گھر کا پتا کیا ہے؟'' میں نے اسے مسز کینڈی براؤن کے موبائل کا نمبر دیتے ہوئے کہا۔

''کام ذرا مشکل ہے مگر ہوجائے گا...'' میگنس نے میرے ہاتھ سے چٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ یہ کام میں دو چار گھنٹے لگ سکتے ہیں۔ کمپنی کسٹمرز سے متعلق معلومات اپنی ویب سائٹ پر نہیں ڈالتی ہے، مجھے اُن سے جا کر کسی اور ذریعے سے یہ معلومات حاصل کرنا ہوں گی۔''

''کوئی بات نہیں۔ ابھی ہمارے پاس کافی وقت ہے۔'' میں نے سکون سے جواب دیا۔ اگرچہ مسز کینڈی براؤن خود اس سے بھی معلوم کیا جاسکتا تھا لیکن ہماری سراغرساں ایجنسی کا یہ اصول تھا کہ کلائنٹ سے اس کے گھر یا آفس میں نہیں لیتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم چاہتے تھے کہ کلائنٹ



ہر قسم کی رازداری کو یقینی بنا سکیں اور اُسے بھی اس بات کا احساس ہو کہ سارے معاملے میں مکمل رازداری برتی جارہی ہے۔ ہماری یہی اُصول پسندی تھی کہ ایسے لوگ جو کسی نہ کسی طرح اپنی رازداری کو آشکارا کیے بغیر معاملہ حل کروانے کے خواہشمند ہوتے تھے، وہ ہمارے ہی دفتر کا رُخ کرتے تھے۔

دوپہر ہوچکی تھی۔

بارٹ اور میگنس باہر نکلے ہوئے تھے اور میں دفتر میں بیٹھ کر کینڈی براؤن کے بیان اور میرج ریکارڈ کے درمیان تضادات پر غور کررہا تھا۔ میرے لیے یہ خاصی تشویش کی بات تھی کہ بطور کلائنٹ وہ خود کو اپنے شوہر کی چھٹی بیوی کیوں بتارہی ہے جبکہ ریکارڈ کے مطابق وہ پہلی بیوی ہے۔ کئی گھنٹوں کی سوچ بچار کے بعد بھی اس تھی کا کوئی سرا ہاتھ نہیں لگ سکا تھا۔

دوپہر گزر رہی تھی اور مجھے بھوک ستا رہی تھی۔ میں نے دفتر میگس کے حوالے کیا اور لنچ کے لیے ریستوران کی طرف چل دیا۔

☆☆☆

''لڑکی کا نام مرینا ہے۔ اس کی عمر اُنیس برس ہے اور وہ مستقل طور پر میکسیکو کی رہنے والی ہے۔ حال ہی میں وہ کیلی فورنیا آئی ہے۔ باقی بات دفتر پہنچ کر۔'' سہ پہر کے ساڑھے تین بج رہے تھے جب مجھے بارٹ کا میسج ملا۔

لنچ سے فارغ ہو کر میں واپس دفتر پہنچا۔ بارٹ اپنے کیبن میں بیٹھا میرا انتظار کررہا تھا۔ ''کہو کیسا رہا؟'' میں نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

''جو کہا تھا، وہ کام کرآیا ہوں۔'' اس نے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ میرے کیبن میں تھا۔

''ہاں... اب ذرا تفصیل سے بتاؤ، کیا کام ہوا ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''کام کی بات تو میں نے ایس ایم ایس میں ہی لکھ دی تھی لیکن مجھے لگتا ہے وہاں معاملہ کچھ گڑبڑ ہے؟'' اس نے سیدھا سادہ جواب دینے کے بجائے پہیلی بجھوانے کے انداز میں کہا۔

''ہوا کیا ہے؟'' اس کی بات سن کر میں چونک گیا۔ بارٹ ذہین دار شخص تھا اور فرض شناس بھی۔ یقیناً ایسی کوئی بات ضرور تھی، جسے اس نے ایس ایم ایس پر بتانے کے بجائے انتظار کیا کہ وہ روبرو یہ بات کرے گا۔

''یہ بات کھٹکا دینے والی ہے اور وہ یہ کہ اولیگ براؤن کیلی فورنیا کا رہنے والا ہے لیکن اس کے بار میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی ایک ایسی اسپینش لڑکی ضرور کام کرتی ہے، لڑکی بھی ایسی کہ جو پہلی بار میکسیکو سے باہر نکل کر یہاں پہنچتی ہے۔''

''اوہو... یہ تو بہت اہم بات محسوس ہوتی ہے۔''

''جی ہاں... مجھے بھی یہی لگتا ہے۔''

''لیکن یہ بات تمہیں کیسے پتا چلی؟'' میں نے بارٹ سے سوال کیا۔

''قصہ مختصر یہ کہ بار میں دو گھنٹے گزارنے کے بعد میں نے محسوس کرلیا کہ وہاں ایک ویٹر ایسا ہے جو دوسرے ویٹروں پر کچھ زیادہ حکم چلا رہا تھا۔ بس میں نے اندازہ لگالیا کہ یہ وہاں کا سب سے پرانا ملازم ہے۔'' بارٹ نے نہایت سکون سے ماجرا بیان کرنا شروع کیا۔ ''میں نے دو تین بار اس سے ہی گلاس منگوائے تھے اور واپسی پر بھاری ٹپ دینے کے ساتھ ساتھ اسے آہستہ سے کان میں کہہ دیا کہ اگر وہ کچھ پیسے کمانا چاہتا ہے تو میرے پیچھے پیچھے سامنے والے ریستوران میں آجائے۔ پیزا مفت میں ملے گا... اور بس! میرا کام ہوگیا۔''

''ذرا کھل کر بتاؤ، قصہ کیا ہے؟''

''اس کا نام جان ہے اور وہ گزشتہ سات برس سے جنگل ایوننگ میں کام کررہا ہے۔'' بارٹ نے کہنا شروع کیا۔ ''اس کا کہنا تھا کہ اولیگ کو میکسیکو سے بہت زیادہ دلچسپی ہے اور ایک وقت میں کم از کم ایک اسپینش لڑکی اس بار میں ہمیشہ ویٹریس رہی ہے اور یہ لڑکی وہ خود میکسیکو سے لے کر آتا ہے۔ یہی نہیں، وہ کہہ رہا تھا کہ یہ ضرورت سے زیادہ اپنی اس ویٹریس پر توجہ دیتا ہے۔''

''مگر کیوں؟''

''یہ سوال میں نے بھی جان سے کیا تھا لیکن اس نے جواب دینے کے بجائے نفی میں سر ہلا دیا۔ البتہ اس کا کہنا تھا کہ یہ لڑکیاں زیادہ عرصہ یہاں نہیں ٹکتی ہیں۔''

''تم نے یہ پوچھا تھا اُس سے کہ اب تک وہاں کتنی ایسی لڑکیاں آچکی ہیں؟'' میں نے تشویش سے پوچھا۔

''پوچھا تھا۔'' بارٹ نے کہنا شروع کیا۔ ''وہ بتا رہا تھا کہ جب سے وہ یہاں پر کام کررہا ہے، یہ چھٹی لڑکی ہے جو وہ میکسیکو سے لے کر آیا ہے۔''

''باقی کی پانچ کہاں چلی گئیں؟''

''جان کے بقول اولیگ کا کہنا تھا کہ اُن کا دل کیلی فورنیا میں نہیں لگا اور وہ واپس اپنے شہر چلی گئیں۔''

''یہ بات حلق سے نہیں اترتی۔'' میں نے چھت کی

طرف گھورتے ہوئے کہا۔

''ایک اور بات بھی ہے۔''

''وہ کیا؟'' یہ سن کر میں نے بارٹ کے چہرے کی طرف تشویش سے دیکھا۔

''مسز براؤن کہہ رہی تھیں کہ وہ اولیگ کی چھٹی بیوی ہے۔'' بارٹ نے تفصیل سے کہنا شروع کیا۔ ''جان بتا رہا تھا کہ یہ چھٹی لڑکی ہے جو وہ میکسیکو سے لے کر آیا ہے۔ اب ان دونوں کی تعداد جمع کریں تو سات بنتی ہے۔ اس طرح کینڈی کا یہ خدشہ درست ہے کہ اولیگ اس لڑکی سے ساتویں شادی کر سکتا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایسا ہے تو اس کی پچھلی شادیوں کا ریکارڈ کیوں دستیاب نہیں؟''

''یہ سوچنے کی بات ہے۔'' میں نے بارٹ کی تائید کی۔ ''ہمیں اب صرف یہی پتا نہیں چلانا ہے کہ آیا وہ مرینا کے ساتھ شادی کرے گا یا کینڈی کو طلاق نہیں دے گا۔ ہمیں یہ بھی معلوم کرنا ہوگا کہ آخر یہ اسپینش لڑکیوں کا کیا چکر ہے؟''

''مجھے بھی کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔'' بارٹ نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ ''میں تو سمجھ رہا تھا کہ سیدھا سا مسئلہ ہے لیکن اب مجھے یہ لکیر ٹیڑھی لگنے لگی ہے۔''

''تم اپنی جگہ بالکل درست سوچ رہے ہو۔'' میں نے اس کی تائید کی۔ ''میکنس گیا ہوا ہے۔ وہ واپس آ کر اپنی رپورٹ دے تو پھر دیکھتے ہیں کہ کس طرح تحقیقات کو آگے بڑھایا جائے۔'' اچانک مجھے کچھ یاد آ گیا اور میں نے چونکتے ہوئے بارٹ کی طرف دیکھا۔ ''تم نے جان سے یہ معلوم کیا تھا کہ اولیگ نے اب تک کتنی شادیاں کی ہیں؟''

''میں نے پوچھا تھا... لیکن وہ کہنے لگا کہ میں صرف بار کی حد تک معاملات جانتا ہوں۔ ویسے بھی اولیگ کاروبار اور اپنی گھریلو زندگی میں واضح حد فاصل رکھتا ہے۔ نہ تو میں کبھی اس کے گھر گیا اور نہ ہی اس کی نجی زندگی کے بارے میں کچھ جانتا ہوں۔''

''بہت پکا آدمی لگتا ہے۔'' میں نے بارٹ کی بات سن کر کہنا شروع کیا۔ ''ورنہ تو سات سال میں لوگ ملازم پر اتنا بھروسا کرنے لگتے ہیں کہ وہ گھر کا ہی ایک فرد بن جاتا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ اولیگ کی احتیاط پسندی بلا وجہ نہیں۔'' بارٹ نے میری بات سن کر کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ وہ اپنی نجی زندگی کے معاملات میں کسی خاص بات کی وجہ سے اتنی احتیاط برتتا ہوگا؟''

''ایسی کیا بات ہو سکتی ہے؟'' میں نے استفسار یہ لگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''فی الحال تو کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن میرے خیال میں مسز کینڈی براؤن کے ایک کیس کی کئی جہتیں ہیں۔ جب تک ساری جہتیں نہیں کھلیں گی، اُن کا کام مکمل نہیں ہو سکتا۔'' بارٹ نے نہایت پیشہ ورانہ لہجے میں جواب دیا۔ ''مجھے تو لگا ہے کہ اس کام میں کئی دن لگ سکتے ہیں۔''

''اب تو مجھے بھی یہی لگ رہا ہے۔ خیر اہم اُمید سے کہہ سکتے ہیں معاملہ اتنا سیدھا نہیں جتنا کہ اس کی بات سے پتہ چلا۔'' میں نے کہا۔

''میں جا رہا ہوں اپنے کیبن میں تاکہ اب تک کی گئی کارروائی کی رپورٹ بنا سکوں۔'' یہ کہہ کر بارٹ اٹھا۔ میں نے بھی سر ہلا کر اسے جانے کی اجازت دے دی۔ بارٹ کی گفتگو سے کیس کی ایک اور نئی جہت سامنے آئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد میں اس معاملے پر ازسرِ نو غور کرنے لگا۔ مجھے بھی محسوس ہونے لگا کہ جیسا کینڈی نے بتایا تھا، معاملہ ویسا نہیں بلکہ اصل چکر کچھ اور ہی ہے۔

میں کیس کی کڑیاں ملانے میں مصروف تھا کہ میکنس آ گیا۔

''گڈ ایوننگ باس۔''

''کہو... کیا خبر لائے ہو؟'' میں نے اسے دیکھتے ہی سوال کر ڈالا۔

''پتا چل گیا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک چٹ میری جانب بڑھائی۔

''یہ بہت اچھا ہوا۔'' چٹ دیکھ کر میں نے کہا۔ ''اب مجھے لگنے لگا ہے کہ یہ پتا ہماری کچھ مدد کر سکتا ہے۔''

''آپ کہہ رہے ہیں تو ایسا ہی ہوگا۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''یہ لو اور ٹیکس سے کہو کہ اس پتے کو کینڈی کیس کی فائل میں لگا دے۔'' میں نے اُس کے گھر کا پتا اپنی نوٹ بک میں لکھنے کے بعد چٹ اسے لوٹاتے ہوئے کہا۔

''بہت بہتر۔''

میکنس کے جاتے ہی میں ایک بار پھر کیس کے بارے میں سوچنے لگا۔ تقریباً آدھے گھنٹے... بعد میں کیس کی ابتدائی تفتیش کا خاکہ اپنے ذہن میں تیار کر چکا تھا۔ میں نے میکنس اور بارٹ کو بھی بلوا لیا تھا۔

''اب کچھ ہی دیر بعد ہم کیس پر باقاعدہ تفتیش کا آغاز کر دیں گے۔'' میں نے اُن دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''بارٹ تم اسی وقت مسز کینڈی براؤن کے گھر جاؤ گے اور خفیہ طور پر اس کی نگرانی کرو گے۔ جیسے ہی گھر میں کوئی نہ

تو مجھے فوراً فون پر اطلاع دو گے۔''

''اور میں کیا کروں؟'' میکنس نے سوال کیا۔

''تم اسی وقت ایونگ جنگل جاؤ گے اور اولیگ براؤن کی نگرانی کرو گے اور مجھے رپورٹ دو گے کہ وہ لڑکی اور اولیگ بار میں ہی موجود ہیں یا نہیں''۔

''ٹھیک ہے۔'' میکنس نے مستعدی سے جواب دیا۔

''اگر وہ دونوں وہاں نہ ہوں، تب بھی تم مجھے فوراً ہی اطلاع دو گے۔''

''سمجھ گیا۔'' یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''ایک بات اور سُن لو۔''

''کیا؟''

''اگر اولیگ بار میں ہی ہو اور کہیں جانے کے لیے باہر نکلے تو تم اس کا پیچھا کرو گے اور اگر وہ گھر کی طرف لوٹے تو فوراً مجھے اطلاع کرو گے۔'' میں نے اسے تاکید کی۔

''اور مجھے کیا کیا کرنا ہے؟'' بارٹ نے سوال کیا۔

''تم گھر کی نگرانی کرو گے۔ جیسے ہی وہ گھر خالی محسوس ہوتا ہے، مجھے اطلاع دو گے۔ اگر کینڈی کہیں جانے کے لیے باہر نکلے تو اس کا پیچھا کرو گے۔ جب وہ واپس گھر کی طرف پلٹے تو فوراً مجھے فون کرو گے۔''

''سمجھ گیا۔''

''میں ان کے گھر کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔'' وہ دونوں جانے کے لیے کھڑے ہوئے تھے، جب میں نے انہیں تعاقب کا مقصد بتانا شروع کیا۔ ''تم دونوں اس بات کا خاص خیال رکھو گے کہ جب میں اُن کے گھر پر ہوں تو وہ لوگ میری موجودگی میں وہاں نہ آنے پائیں۔''

''ایسا ہی ہوگا۔ آپ سکون سے گھر کی تلاشی لیتے رہیے گا۔ اگر کہیں کوئی گڑبڑ ہوئی تو ہم سنبھال لیں گے۔'' بارٹ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اچھی طرح سمجھ لیا، جو کچھ میں نے کہا ہے؟'' میں نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بالکل۔''

''ٹھیک ہے۔ اب تم دونوں جاؤ اور اپنا اپنا کام کرو۔ میں یہیں دفتر میں بیٹھ کر تمہاری اطلاع کا انتظار کرتا ہوں۔''

تقریباً بیس منٹ بعد مجھے میکنس کا فون ملا۔ اس نے اطلاع دی کہ اولیگ اور ویٹریس مرینا، دونوں بار میں موجود ہیں اور انہیں دیکھ کر فی الحال یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ ایک دو گھنٹے میں کہیں باہر جا سکتے ہیں۔ یہ اطلاع اطمینان بخش تھی۔ میں اس طرف سے تو مطمئن ہو گیا تھا کہ اولیگ تو گھر سے باہر ہی ہے۔

اب امکان یہی تھا کہ کینڈی گھر پر تنہا ہی ہوگی۔

''ہاں کہو۔'' شام ہو رہی تھی جب مجھے بارٹ کا فون ملا۔

''مسز براؤن گھر سے نکل رہی ہے۔ اسے دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ کہیں پر شام گزارنے کے لیے جا رہی ہے۔ وہ اس وقت دروازہ لاک کر رہی ہے۔ تم بھی فوراً دفتر سے نکلو۔''

''بہت بہتر۔'' اطلاع ملتے ہی میں اچھل کر کھڑا ہو گیا میں اب ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ''تم اس کا پیچھا کرو اور جیسے ہی وہ گھر لوٹنے لگے، مجھے فون کر دینا۔'' میں نے اسے ایک بار پھر تاکید کی۔

''ٹھیک ہے۔'' بارٹ نے مختصر جواب دے کر فون بند کر دیا۔

میں دفتر سے باہر نکلا تو اندھیرا چھانے لگا تھا۔ ''بہت مناسب وقت ہے۔'' میں نے دل ہی دل میں کہا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی میں نے میکنس کا نمبر ملایا۔ ''کیا اولیگ ابھی تک بار میں ہی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں۔''

''میں اس کے گھر جا رہا ہوں۔ تم اس پر کڑی نظر رکھو۔''

''اوکے۔'' میکنس نے جواب دیا۔

میں نے فون بند کر کے جیب میں رکھا اور اسے ہینڈ فری سے منسلک ریسیور کان سے لگا لیا تاکہ گاڑی چلاتے ہوئے بھی میں فون استعمال کر سکوں۔ اگلے ہی لمحے میں تیز رفتاری سے گاڑی چلاتے ہوئے سن سیٹ بلیوارڈ کی طرف بڑھ رہا تھا جس کے اختتامی سرے پر اولیگ براؤن کا گھر واقع تھا۔ چند ہی دیر بعد میں گھر کے عقبی حصے میں موجود تھا۔ یہاں سے ہوا میں مرکزی دروازے کی طرف پہنچا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں نے تار کے ایک ٹکڑے کی مدد سے دروازہ کھول لیا۔ گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ یہ تین کمروں کا چھوٹا سا لیکن شاندار مکان تھا۔ گھر اندر سے نہایت سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ میں نے باری باری تینوں کمروں کا جائزہ لیا لیکن بظاہر مجھے وہاں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی جو میری توجہ اپنی طرف مبذول کروا سکتی ہو۔

لیونگ روم نہایت آرام دہ اور قرینے سے آراستہ تھا۔ پہلے تو مجھے یہاں کوئی خاص بات محسوس نہیں ہوئی لیکن اچانک میری نظر اچانک سامنے کی دیوار پر پڑی تو چونک گیا۔ وہاں سائز کی پانچ تصویریں سادہ سے فریم میں جڑی ہوئی کی صورت لگی ہوئی تھیں۔ ان کے اوپر عین درمیان سائز کے دو اور فریم لگے ہوئے تھے۔ ان میں دائیں



اولیگ اور بائیں جانب اس سے بڑے ہوئے فریم میں کینڈی کی تصویر لگی ہوئی تھی۔

''بڑا عجیب آدمی ہے یہ۔'' تصویریں دیکھ کر میں بڑبڑایا۔ یہ میرے لیے حیرت انگیز منظر تھا۔ لوگ عام طور پر اپنی سابق بیویوں کی تصویریں گھر میں لگاتے نہیں لیکن یہاں معاملہ دوسرا تھا۔ مجھے کینڈی کی بات میں صداقت محسوس ہونے لگی۔ پہلی قطار میں جو پانچ نوجوان عورتوں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں، ان کی عمریں میرے اندازے کے مطابق بیس سال سے کم تھیں۔ ساری کی ساری تصویریں کسی پیشہ ور فوٹوگرافر نے اسٹوڈیو میں کھینچی تھیں۔

سراغرسانی اور قیافہ شناسی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اُن تصویروں کو دور سے دیکھنے پر مجھے محسوس ہوا کہ وہ ساری کی ساری لڑکیاں اسپینش خدوخال کی حامل تھیں۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ انہی تصویروں کی بدولت شاید کینڈی کہہ رہی تھی کہ اولیگ اُس سے پہلے پانچ لڑکیوں سے شادیاں رچا چکا تھا۔ میں تھوڑا اور قریب ہوا اور ایک صوفے پر کھڑا ہو کر کینڈی کی تصویر والا فریم اُتارا اور دیوار کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے بعد فریم کا معائنہ کیا۔ یہ فریم نیا نہیں تھا۔ دیوار پر بھی فریم کا نشان پڑا ہوا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا کہ وہ فریم دیوار پر کافی عرصے سے لگا ہوا ہے۔ فریم کی ظاہری حالت بتا رہی تھی کہ وہ کئی سال پرانا ہوگا۔ اس کی چمک بھی ہلکی ہلکی ماند پڑ چکی تھی۔

میں نے نیچے لگی ہوئی تصویروں کے فریم کا جائزہ لینا شروع کیا۔ انتہائی دائیں کنارے پر جو پانچویں تصویر لگی ہوئی تھی۔ ان کا فریم دیگر تصویروں کے مقابلے میں کچھ نیا لگ رہا تھا۔ میں نے وہ فریم اتارا اور قریب سے اس کا جائزہ لیا تو مجھے اپنا خیال درست معلوم ہوا۔ میں نے اس فریم کو پیچھے سے کھولا۔ تصویر کے پیچھے لگا گتا نکالا اور تصویر کی پشت دیکھنے لگا۔ تصویر کے پیچھے فوٹوگرافر کا نام اور اسٹوڈیو کا فون نمبر و پتا بھی لکھا ہوا تھا۔ میں نے پتا اور فون نمبر نوٹ بک پر لکھ لیا اور تصویر کو دوبارہ فریم میں لگا کر اسی جگہ لٹکا دیا، اس کے بعد میں نے اپنا جیبی کیمرا نکالا اور ان سب کا کلوز اپ فوٹو بنا لیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد میں گھر کے اندر سے نکلا۔ اس وقت تک نہ تو میکنس اور نہ ہی بارٹ نے مجھے اطلاع دی تھی کہ اولیگ یا کینڈی میں سے کوئی ایک گھر کی طرف لوٹ رہا ہے۔ اس لیے میں نہایت سکون سے اپنے کام میں لگا رہا۔ باہر نکل کر میں نے گھر کا مرکزی دروازہ لاک کیا اور عقبی حصے کی طرف چلا آیا۔

عقب میں گیراج اور لان تھا۔ میں گیراج کے سامنے پہنچا۔ دروازے کو اندر دھکیلا تو وہ کھلتا ہی چلا گیا۔ گیراج خالی پڑا ہوا تھا۔ یہاں کافی اندھیرا تھا۔ میں نے لائٹ جلانے کا خطرہ مول لینا مناسب نہیں سمجھا اور ٹارچ کی روشنی میں اندر کا جائزہ لینے لگا۔

گیراج میں بظاہر کوئی غیر معمولی چیز نہیں تھی۔ ایک طرف چند پرانے ٹائر اور کچھ دیگر کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا۔ ایک کونے میں باغبانی کا سامان، ایک پھاوڑا، بیلچہ اور کدال رکھی ہوئی تھی۔ میں نے دیوار پر نظر ڈالی۔ وہاں ایک الماری نظر آئی۔ قریب پہنچ کر دیکھا تو کواڑوں میں تالا لگا ہوا تھا۔ تالا کہیں کا بھی بنا ہو، کیسا ہی کیوں نہ ہو، میرے لیے بند تالے کھولنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اگلے ہی لمحے الماری کا تالا میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے الماری کے پٹ کھولے اور وہاں رکھی ہوئی چیزوں کا ٹارچ کی روشنی میں جائزہ لینے لگا۔

ویسے تو وہاں کوئی خاص چیز موجود نہیں تھی ماسوائے گتے کے دو ڈبوں کے۔ میں نے ان ڈبوں کو باہر نکالا اور جب کھولا تو حیران رہ گیا۔ ایک ڈبے میں کم از کم درجن بھر فریم رکھے ہوئے تھے۔ یہ فریم بالکل ویسے ہی تھے جیسے میں نے لیونگ روم کی دیوار پر لگے دیکھے تھے۔ دوسرا ڈبا کھولا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس ڈبے میں کچھ نقلی زیورات اور خواتین کے استعمال میں آنے والی بعض دیگر چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے ٹارچ کی روشنی ڈبے کے اندر ڈالی اور اُن کا اچھی طرح معائنہ کرنے لگا۔ ایک کڑے پر مجھے کتھئی رنگ کے نشان نظر آئے۔ یہ نشان خاصے گہرے تھے۔ میں نے اُن کا بغور معائنہ کیا اور پھر ایک کڑا اٹھا کے رومال میں لپیٹ کر کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ چیزوں کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد میں نے ڈبوں کو پہلے جیسے بند کیا اور پھر انہیں الماری میں رکھ کر تالا لگا دیا۔

گیراج سے باہر نکل کر لان میں آ گیا۔ میں عقبی دیوار پھلانگ کر باہر نکلنے ہی والا تھا کہ اچانک ایک خیال میرے دماغ میں بجلی کی طرح کوندا۔ میں پلٹ کر لان کی جانب دیکھنے لگا۔ کافی دیر تک میں لان کا جائزہ لیتا رہا۔ تاریکی کافی پھیل چکی تھی البتہ اِردگرد کے گھروں کے باہر اور سڑک پر روشن لائٹس کی وجہ سے لان میں خاصی روشنی آ رہی تھی۔ لان کی گھاس کافی بڑھ چکی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اُن لوگوں نے کافی عرصے سے گھاس نہیں تراشی تھی۔ میں نہایت انہماک سے زمین دیکھ رہا تھا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ لان کے کنارے کے تقریباً ساتھ آٹھ فٹ لمبے اور دھائی تین فٹ چوڑے ٹکڑے پر لگی گھاس لمبائی میں باقی لان سے خاصی چھوٹی

ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اس بات پر اور توجہ دیتا، میرے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری طرف میگنس تھا۔

''اگر تم اب تک گھر پر ہو تو فوراً نکلو۔ ہم صرف پانچ منٹ کی دوری پر ہیں۔ کینڈی گھر آ رہی ہے۔''

''اوکے...'' یہ کہہ کر میں نے فون بند کیا اور فوراً عقبی دیوار کی طرف لپکا۔ باہر نکلتے ہی میں نے دستانے اتارے اور گاڑی میں بیٹھ کر کافی دور چلا آیا۔ میں نے ایک ایسی جگہ گاڑی روکی تھی، جہاں سے اولیگ کے گھر کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک کار اندر جاتی ہوئی نظر آئی۔ میں نے فوراً میگنس کو فون ملایا۔ ''دفتر پہنچو اور بارٹ سے بھی کہو کہ وہ بھی پہنچ جائے۔''

''بہت بہتر۔'' میگنس نے مختصر جواب دیا اور فون بند ہو گیا۔

دفتر جاتے ہوئے میں نے فون کر کے پیزا آرڈر کیا۔ واپس پہنچا تو بارٹ اور میگنس میرے منتظر تھے۔

''مجھے تو بہت بھوک لگی ہوئی ہے۔ تم بھی جلدی سے ہاتھ منہ دھو لو۔ پیزا پہنچنے ہی والا ہے۔'' کھانا آنے کا سن کر دونوں واش روم کی طرف بڑھ گئے۔ جس تیزی سے وہ دونوں گئے تھے، اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ بھوک کے مارے اُن کی بھی حالت غیر ہو چکی ہے۔

''ہاں اب سناؤ، آج شام کیا کچھ دیکھا تم دونوں نے؟'' کھانے کے بعد بارٹ نے کافی بنائی اور ہم تینوں آتشدان کے سامنے آ کر بیٹھ گئے۔ میگس بھی نوٹ پیڈ اور قلم سنبھال کر بیٹھا ہوا تھا۔

''کوئی خاص بات نہیں۔'' بارٹ نے کہنا شروع کیا۔ ''میں حکم کے مطابق جنگل ایوننگ گیا۔ اولیگ وہیں پر تھا۔ میں باہر کھڑا ہو کر انتظار کرتا رہا لیکن وہ یا مرینا ایک بار بھی باہر نہیں آئے۔ اسی دوران میں تمہارا فون ملا اور میں واپس آ گیا۔'' بارٹ نے اپنی رپورٹ مکمل کی۔

''اور تم؟'' میں نے میگنس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''گھر سے نکلنے کے بعد کینڈی بیوٹی پارلر پہنچی۔ وہ اندر چلی گئی اور میں باہر کھڑے ہو کر اُس کا انتظار کرتا رہا۔'' اُس نے کہنا شروع کیا۔ ''کم و بیش پون گھنٹے کے بعد وہ باہر آئی۔ تقریباً دس منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ ایک ریستوران پر رکی۔ جب وہ باہر آئی تو اس کے ہاتھ میں شاپنگ بیگ تھا۔ یقیناً اس نے ڈنر کے لیے کچھ خریدا تھا۔ اُس کے بعد وہ واپس گھر کی طرف چل دی۔'' بات مکمل کر کے اس نے گہری سانس لی۔

''یہ بتاؤ تمہیں کچھ کامیابی ملی؟'' بارٹ نے مجھ سے سوال کیا۔

''شاید...''

''کیا؟'' اس نے میرا جواب سُن کر پھر سوال کر ڈالا۔

''فی الوقت تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ممکن ہے کہ ہم تینوں نے آج جو وقت صرف کیا ہے، ہو سکتا ہے، اس سے ہمیں کوئی سراغ مل جائے۔'' میں نے گول مول بات کی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے اس کے گھر پر کچھ سراغ تو پائے ہیں لیکن ابھی میں خود یقین سے یہ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھا کہ واقعی وہ شواہد ہیں یا نہیں۔ البتہ ایک بات یقینی تھی اور وہ یہ کہ معاملہ اتنا سیدھا سادہ ہرگز نہیں تھا، جیسا کہ کینڈی نے بیان کیا تھا۔ مجھے یہ کیس خاصا پیچیدہ لگ رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اپنے ماتحت کے سامنے کوئی ایسی بات بیان کروں جس کے بارے میں ابھی خود مجھے سو فیصد یقین نہیں تھا۔ اس لیے میں نے اُن دونوں کو مطمئن کرنے کے لیے مبہم جواب دیا تھا۔

''کل کا کیا پروگرام ہے؟'' میگس نے پوچھا۔

''ویسے تو آج ویک اینڈ ہے اور اصولاً اگلے دو روز آفس بند ہونا چاہیے تھا مگر اس بار صورتِ حال ذرا مختلف ہے۔'' میگس دفتر کا مجسم تھا۔ اس لیے جمعہ کی رات کو اس کا یہ سوال برمحل تھا۔ ''کل بھی دفتر کھلے گا اور اتوار کو بھی۔ ہم چاروں معمول کے مطابق اپنے وقت پر دفتر میں موجود ہوں گے۔ ہمیں یہ کیس حل کرنا ہے اور پیر کو پہلی رپورٹ دینی ہے۔ اس بے ایمر جنسی میں چھٹیاں ختم۔'' میں نے مسکرا کر تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے۔ ''ہاں اس دوران کھانا پینا میری طرف سے ہوگا۔''

''ایسا نہیں ہوگا۔'' میگس نے رکھائی سے کہا تو میں چونک گیا۔

''کیوں؟''

''کھانا پینا آپ کی طرف سے نہیں بلکہ کینڈی کی طرف سے ہوگا۔ بل تو آخر میں اسے ہی ادا کرنا ہے۔'' میگس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''اوہو... بڑے اُستاد ہو گئے ہو تم۔''

''صحبتِ یار کا اثر ہے۔'' اس نے برجستگی سے جواب دیا۔

''تو پھر ٹھیک ہے۔ کھاؤ پیو۔ میرا کیا جاتا ہے۔''

''فکر نہ کریں۔ صرف کھانے کا ہی نہیں، جنگل ایوننگ میں پینے کا بل بھی کینڈی کو پکڑا دیں گے۔'' میگنس نے لقمہ دیا۔

''ڈٹ کر کھاؤ اور جم کر پیو مگر کام ہونا چاہیے۔'' یہ کہہ کر



میں کھڑا ہو گیا۔ ''اب ہم چلتے ہیں اپنے اپنے گھروں کو۔'' یہ کہہ کر میں کھونٹی پر لٹکا ہوا اوور کوٹ اور ہیٹ اتارنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم چاروں دفتر سے نکل کر پارکنگ میں کھڑی اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ رہے تھے۔

☆☆☆

پولیس کی ملازمت کے دوران میں، میں نے کچھ عرصہ فرانزک لیبارٹری میں بھی گزارا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد جب میں نے سراغرساں ایجنسی کا لائسنس حاصل کر کے سراغرسانی کا کام شروع کیا تو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ چھوٹے پیمانے پر ہی سہی لیکن ایک فرانزک لیبارٹری میری ایجنسی کے پاس ہونا چاہیے۔ میرا دفتر شہر کے گنجان آباد علاقے میں تھا اور بہت ہی چھوٹا تھا، جس میں پارٹیشن بنا کر میں نے اپنے عملے کے کیبن بنا دیے تھے۔ اس کے بعد اتنی جگہ باقی نہیں بچی تھی کہ لیبارٹری بنا سکتا۔ میرا گھر شہر کے مضافات میں واقع ہے اور کافی بڑا بھی۔ گھر پر میری ماں کے سوا اور کوئی نہیں رہتا۔ اس لیے میں نے ایک کمرے میں اپنی فرانزک لیبارٹری بنا لی تھی۔

جب میں گھر پہنچا تو رات کے دس بج رہے تھے۔ اگرچہ ویک اینڈ تھا لیکن مجھے دوسری صبح دفتر میں بھی موجود ہونا تھا۔ اس لیے حسبِ سابق ویک اینڈ پر موج مستی کرنے کے بجائے میں نے کام کرنے کا تہیہ کر لیا۔ گھر پہنچتے ہی میں اپنی لیبارٹری میں گھس گیا۔ میں اولیگ کے گیراج سے ملنے والے کڑے پر لگے کتھئی رنگ کے نشانات کا معائنہ کرنا چاہتا تھا۔

کافی دیر تک ٹیسٹ کرنے کے بعد یہ ثابت ہو گیا کہ یہ نشانات خون کے ہیں لیکن یہ خون اُس کا نہیں ہے جس نے اپنے ہاتھ میں یہ کڑا پہنا ہوا تھا بلکہ یہ اُس عورت یا مرد کا ہو سکتا ہے جس نے اس کڑے والی عورت کو مبینہ طور پر زخمی یا قتل کیا ہوگا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خون کڑے کے اوپر لگا ہوا تھا جو بہتا ہوا تھوڑا سا کڑے کی کچلی تہ تک پہنچ گیا تھا تاہم یہ بالکل واضح تھا کہ خون کڑے کے اوپر گرا تھا۔ اگر یہ مقتولہ کی کلائی وغیرہ کا خون ہوتا تو کچلی سطح پر خون کا زیادہ گہرا دھبا ہوتا لیکن ایسا نہیں تھا۔

فرانزک ٹیسٹ کے نتیجے میں ایک اور اہم بات یہ معلوم ہوئی کہ جس عورت نے اپنی کلائی میں یہ کڑا پہن رکھا تھا، وہ چوڑی ہڈیوں والی صحتمند عورت تھی۔ یہ بات کڑے کی گولائی سے عیاں تھی۔ ''کیا یہ کڑا کینڈی براؤن کا ہے؟'' میں نے اپنے دل میں سوچا اور ایک بار پھر اسے دیکھنے لگا مگر اگلے ہی لمحے میں نے اپنا یہ خیال مسترد کر دیا۔ کینڈی براؤن نازک اندام تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر یہ کڑا اس کی کلائی میں ہوتا تو ہلکا سا کھینچنے پر بھی کلائی سے پھسل کر نکل جاتا مگر جس عورت نے یہ کڑا پہنا ہوا تھا، اس کی کلائی سے اسے کھینچ کر نکالا گیا تھا۔ کڑا یقیناً اس کی کلائی میں بالکل فٹ ہوگا تبھی تو جب اسے زبردستی کھینچ کر اتارا گیا تو اُس عورت کی کلائی کی کھال بھی رگڑ کی وجہ سے چھلتی چلی گئی تھی۔ کھال کھنچنے کے نشانات اس کڑے پر موجود تھے۔ مجھے یقین ہو چلا کہ اس کڑے کے پیچھے قتل کی کہانی موجود ہے مگر یہ کڑا اولیگ کے گیراج میں کیوں رکھا ہوا تھا؟ یہ سوال مسلسل میرے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔

پولیس کی ملازمت کے دوران ایک بات میں نے سیکھی اور وہ تھی مجرم کی نفسیات کو سمجھنا۔ میں نے اپنی طویل ملازمت میں یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ ایک سے زائد قتل کرنے والے اکثر قاتل نفسیاتی مریض ہوتے ہیں اور وہ قتل کرنے کے بعد مقتول یا مقتولہ کی ایسی کوئی نشانی اپنے پاس ضرور محفوظ کر لیتے ہیں، جسے بعد میں دیکھ دیکھ کر وہ اپنے شکار کی اُس اذیت کو محسوس کر کے لطف لیتے رہیں، جب اسے موت سے ہمکنار کیا جا رہا ہو۔ اس طرح کے نفسیاتی مریض اپنے شکار کو گولی مار، گلا گھونٹ کر یا زہر دے کر ہلاک کرنے کے بجائے تشدد کا نشانہ بنا کر مارتے ہیں اور اُس وقت شکار جو اذیت محسوس کرتا ہے اس سے لطف اٹھاتے ہیں۔ کڑا بھی یہی کہانی بیان کر رہا تھا کہ اس کو پہننے والی عورت نفسیاتی مریض کے ہاتھوں اذیت ناک موت سے ہمکنار ہوئی تھی۔ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ اولیگ قاتل ہی نہیں سیریل کلر بھی ہے۔'' میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

کافی دیر تک میں اولیگ، کڑا، لان اور اسپینش ویٹریس کے معاملے پر غور کرتا رہا۔ آخر میرے ذہن میں تفتیش کا مکمل خاکہ بن گیا۔ میں نے پورا لائحہ عمل ترتیب دیا اور نوٹ بک پر فرانزک لیبارٹری میں کڑے کے ٹیسٹ، اخذ شدہ نتائج اور اپنے خیالات کو تحریر کرنے لگا۔

جب میں سونے کے لیے اپنے کمرے میں پہنچا تو رات کا ایک بج چکا تھا۔ دن بھر کی تھکاوٹ نے میرے دماغ اور جسم، دونوں کو بُری طرح تھکا دیا تھا۔ میں بستر پر گرا اور پھر جب میری آنکھ کھلی تو گھڑی کا الارم صبح کے ساڑھے سات بجنے کی نوید سنا رہا تھا۔

☆☆☆

گھر سے نکلا تو دن کے دس بج رہے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد میں شہر کے وسطی علاقے میں ایک فوٹو گرافر کے اسٹوڈیو کے باہر کھڑا تھا۔ ''ایڈورڈ اسمتھ فوٹو گرافر۔'' دکان پر لگے بورڈ

کو دیکھ کر میں نے نوٹ بک نکالی۔ ''یہی دکان ہے۔'' میں نے پتا دیکھ کر دل ہی دل میں کہا۔ اگرچہ یہاں پر کئی اسٹوڈیوز بنے ہوئے تھے لیکن یہ سب سے بڑا اسٹوڈیو لگ رہا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو یقین ہوگیا کہ یہ بہت ہی مہنگا ہوگا اور یہاں آنے والے ضرور فکرِ مال سے آزاد ہوں گے۔

''کیا میں مسٹر ایڈورڈ سے مل سکتا ہوں؟'' میں آگے بڑھا اور استقبالیہ پر پہنچ کر کہا۔ وہاں ایک نازک اندام دوشیزہ بیٹھی ہوئی تھی۔

''کیوں نہیں...'' اس نے کاروباری مسکراہٹ اپنے دلکش ہونٹوں پر سجاتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ کا اُن سے ملاقات کا وقت طے ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''جی نہیں...'' میں نے کہا۔ ''میں وقت لیے بغیر حاضر ہوا ہوں۔ آپ اُن سے پوچھ لیں کہ وہ مجھ سے مل سکیں گے یا نہیں۔'' مجھے لگا کہ اگر اس شخص سے تعاون حاصل کرنا ہے تو ذرا مزاج کو اکھڑ بنانا ہوگا۔ اس لیے میں سپاٹ لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔ ''ویسے وہ نہ بھی ملنا چاہیں تب بھی اُنہیں مجھ سے ملنا تو پڑے گا ہی۔'' دھمکی آمیز لہجے میں ذو معنی جملہ کام دکھا گیا۔ لڑکی گھبرا گئی۔ کچھ دیر بعد میں ایڈورڈ کے ساتھ اس کے دفتر نما کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔

''معاملہ کیا ہے؟'' ایڈورڈ کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ چہرے مہرے سے شریف اور آرٹسٹ وضع قطع کا بندہ لگ رہا تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں ایک سراغرساں ہوں اور ایک حساس معاملے میں اس کی مدد درکار ہے۔

''کس سلسلے میں...'' وہ کافی پریشان دکھائی دینے لگا۔

''ابھی میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتا۔'' اس دوران میں نے جیب میں سے اپنا کیمرا نکال لیا۔ ''آپ کتنے عرصے سے اس جگہ پر کام کر رہے ہیں؟'' میں نے کیمرے کو آن کرتے ہوئے ایڈورڈ کی طرف بنا دیکھے سوال کیا۔

''تقریباً تیرہ برس ہوگئے ہیں مجھے یہاں۔''

''بہت خوب۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''پھر تو آپ کے کئی خاص گاہک بھی ہوں گے۔''

''جی ہاں... بہت سے لوگ ایسے ہیں جو خاص مواقع کی یادگاری تصاویر بنوانے کے لیے صرف میری ہی خدمات لیتے ہیں۔'' اس نے فخریہ انداز میں جواب دیا۔

''یہ تو تم پر اُن کا عتماد ہوا نا۔''

''آپ کہہ سکتے ہیں۔'' اُس نے مسکرا کر جواب دیا۔ کچھ دیر پہلے کے مقابلے میں اب وہ کچھ مطمئن نظر آ رہا تھا۔

''اس کا مطلب ہے کہ آپ اپنے گاہکوں کو پہچانتے بھی ہوں گے؟''

''ہاں...'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ''کئی ایسے گاہک ہیں جنہیں میں جانتا ہوں مگر اپنے کام کی حد تک۔''

''پھر تو تم اسے بھی پہچانتے ہو گے۔'' میں نے اپنا ڈیجیٹل کیمرا اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ اس میں وہ ایک تصویر ایل سی ڈی اسکرین پر کلوز اپ میں نظر آ رہی تھی، جو اولیگ کے لیونگ روم کی دیوار پر لگی ہوئی تھی۔ یہ وہ تصویر تھی جس کے بارے میں میرا شبہ ہے کہ وہ زیادہ پرانی نہیں تھی۔

''ہاں...'' کیمرا اپنے ہاتھ میں لے کر وہ چند لمحوں تک تصویر دیکھتا رہا اور پھر کچھ یاد کرتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ تصویر تم نے کھینچی تھی؟'' میں نے سوال کیا۔

''جی...'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''کیا جانتے ہو اس لڑکی کے بارے میں؟'' میں نے ذرا سخت لہجے میں اس سے سوال کیا۔

''معاملہ کیا ہے، کچھ بتاؤ تو سہی۔'' وہ ایک بار پھر پریشان نظر آنے لگا۔

''تمہارے اس سوال کا جواب پہلے ہی دے چکا ہوں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''مناسب یہی ہے کہ جو کچھ پوچھ رہا ہوں، اس کا جواب دو۔ ہاں تو بتاؤ کیا جانتے ہو اس لڑکی کے بارے میں۔''

''یہ مارتھا ہے...'' وہ میرے سخت لہجے سے مرعوب ہو چکا تھا۔ وہ قدرے خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

''شاباش...'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''کب کھینچی تھی یہ تصویر؟''

''کوئی چار پانچ ماہ پہلے۔''

''یہ اکیلی آئی تھی یا کوئی اور بھی تھا اس کے ساتھ؟''

''یہ اولیگ براؤن نامی شخص کے ساتھ آئی تھی۔ وہ میرا پرانا گاہک ہے۔ یہ اسی کے ساتھ آئی تھی۔''

''تمہیں اس لڑکی کا نام کیسے معلوم ہوا؟'' میں نے سوال کیا۔

''اولیگ نے تعارف کروایا تھا۔ ویسے وہ بڑا ہی عاشق مزاج ہے۔ اس سے پہلے بھی کئی بار مختلف لڑکیوں کے ساتھ یہاں آ چکا ہے۔''

''اوکے...'' وہ بدستور گھبرایا ہوا تھا، میں نے اسے



مطمئن کرنے کی خاطر لہجہ نرم کر لیا۔ ''کیا یہ اُس کی بیوی ہے؟''

''نہیں... اس نے کینڈی نامی عورت سے شادی کی تھی۔''

''اچھا...'' میں نے حیرت سے جواب دیا۔ ''تو پھر یہ کون ہے؟''

''یہ اُس کی گرل فرینڈ ہوگی۔ ویسے بھی میں نے آپ کو بتایا نا کہ وہ خاصا دل پھینک آدمی ہے۔''

''یہ بات تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''اس لیے کہ وہ کئی بار میرے اسٹوڈیو میں آ کر اپنی گرل فرینڈ کے پورٹریٹ بنوا چکا ہے۔'' اس نے وضاحت کی۔

''تم اس کی بیوی کے بارے میں کیسے جانتے ہو؟'' اب میں نے بات کا رُخ یکسر بدل دیا۔

''میں اُن کی شادی میں گیا تھا فوٹو گرافی کے لیے۔''

''کب ہوئی تھی وہ شادی؟''

''یہی کوئی تین چار ماہ ہونے کو آئے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور یہ تصویر کب کھینچی تھی تم نے؟'' میں نے ایک بار پھر کیمرا اس کی نظروں کے سامنے کرتے ہوئے سوال کیا۔

''صحیح تاریخ تو ریکارڈ دیکھ کر ہی بتا سکتا ہوں۔ اندازہ ہے کہ پانچ چھ ماہ ہوگئے ہوں گے۔'' اس نے چھت کو گھورتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے نوٹ بک بند کر کے جیب میں رکھی۔ ''میرا خیال ہے کہ تم اس ملاقات کو راز میں ہی رکھو گے۔ معاملہ بڑا حساس ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم اس بات کا ذکر کسی سے کرو۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے میری تاکید سُن کر مختصر سا جواب۔

جب میں اسٹوڈیو سے باہر نکلا تو ایک بات صاف ہو چکی تھی کہ کینڈی غلط بیانی کر رہی تھی کہ اولیگ اس سے پہلے پانچ شادیاں کر چکا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس میں کینڈی کا کوئی قصور نہ ہو۔ خود اولیگ نے اس سے یہ بات کہی ہو۔ سوال یہ تھا کہ اولیگ کو ایسی کیا ضرورت پیش آئی تھی کہ اس نے گرل فرینڈز کو اپنی بیویاں بتایا۔ اس سوال کا جواب تلاش کرنا ابھی باقی تھا۔

ایک اور بات یہ بھی طے ہو چکی تھی کہ وہ دل پھینک تھا۔ یہ بات تو میں اس کے لیونگ روم میں لگی ہوئی تصویریں کو دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا مگر یہ اب تک نہیں سمجھ سکا تھا کہ وہ تصویریں وہاں کیوں لگی ہوئی ہیں۔ فوٹو گرافر سے مل کر اس بات کی بھی تصدیق ہوگئی تھی وہاں جتنی تصویریں لگی ہوئی تھیں، وہ اولیگ نے ہی کھنچوائی تھیں۔ اب مجھے سو فیصد یقین ہوگیا کہ معاملہ بہت خطرناک ہے۔

ہیلو... مسز کینڈی براؤن؟'' میں نے اسٹوڈیو سے باہر نکل کر اسے فون کیا۔ میں اس سے ملنا چاہتا تھا۔

''جی بول رہی ہوں۔''

''آرتھر... جان آرتھر سراغرساں بول رہا ہوں۔''

''کہیے... کیسے فون کیا۔'' اس نے استفسار کیا۔

''کیا ہم مل سکتے ہیں؟''

''جی ہاں... بتائیے کب اور کہاں؟''

''گھنٹا بھر بعد میرے دفتر میں... کیا یہ مناسب رہے گا؟'' میں نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

''میں آ رہی ہوں۔''

''اوکے، بائے۔'' میں نے فون بند کیا اور دفتر کی طرف چل دیا۔

تقریباً ساڑھے گیارہ بجے کے قریب وہ پہنچ گئی۔ اس دن خاصی سردی تھی۔ اس نے اوورکوٹ پہن رکھا تھا۔ میں فوراً اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کا اوورکوٹ اتارنے میں مدد کی اور اس دوران عقب میں کھڑے ہو کر نہایت احتیاط سے اس کے سر کے دوبال توڑ لیے اور پھر نظر بچا کر انہیں پلاسٹک کے ایک لفافے میں ڈال دیا۔

''کہیے... سب خیریت تو ہے؟'' رسمی سلام دعا کے بعد وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے سگریٹ نکال کر سلگائی اور لبادش لے کر ناک اور منہ سے دھواں نکالتے ہوئے بولی۔

''جی ہاں... سب خیریت ہے۔'' میں نے مطمئن لہجے میں جواب دیا۔ ''ہم نے کیس پر کام شروع کر دیا ہے۔ امید ہے کہ ایک دو دن میں معاملہ صاف ہو جائے گا۔''

''اس وقت میری کیا ضرورت پیش آ گئی؟'' اس نے میری بات پر کسی ردِعمل کا اظہار کرنے کے بجائے اُلٹا سوال کر دیا۔

''ایک تو یہ پوچھنا تھا کہ اولیگ نے اپنی سابق بیویوں کو کیوں چھوڑا؟''

''اُس نے نہیں، وہ اُسے چھوڑ کر گئی تھیں۔'' اس نے میری بات مکمل نہیں ہونے دی اور بیچ میں بول اٹھی۔ ''یہ بات اولیگ نے مجھ سے کہی تھی۔''

''تم نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ پانچ بیویاں چھوڑ...

میرا مطلب ہے کہ وہ اسے چھوڑ کر جا چکی ہیں، پھر بھی تم اس سے شادی پر تیار ہو گئیں؟''

''اولیگ پر اعتبار کرنا شاید میری غلطی تھی۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ انہوں نے اولیگ کو نہیں، اُس نے ہی ان سب کو چھوڑا ہوگا۔'' کینڈی نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ بھی میری طرح اس سے پریشان ہو گئی ہوں گی۔ خیر... کوئی اور بات؟''

''تم کبھی اولیگ کی کسی سابق بیوی سے ملی ہو؟''

''نہیں۔'' اس نے قطعیت سے مختصر جواب دیا۔

''ان کی کوئی تصویر وغیرہ دیکھی ہے؟''

''جی نہیں...'' اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''اچھا۔'' میں نے مطمئن لہجے میں جواب دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ کینڈی کا انکار سن کر میں چونک گیا۔ میں اس کے لیونگ روم میں لگی تصویریں دیکھ چکا تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو شاید میں اس کی بات پر یقین کر لیتا لیکن اب مجھے صاف صاف لگ رہا تھا کہ کینڈی جھوٹ بول رہی ہے اور وہ کچھ چھپانا چاہتی ہے۔ ''بات یہ ہے کہ آپ کو کچھ رقم ادا کرنی ہے۔ آج ویک اینڈ ہے اور آپ کے کام کی وجہ سے اسٹاف کو زیادہ خرچ کرنا پڑ رہا ہے۔'' میں نے بات بنانے کے لیے کہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے سوالوں کے بارے میں زیادہ غور کرے۔ ''اسی لیے میں نے آپ کو زحمت دی ہے کہ اگر کچھ رقم...'' میں نے ہکلاتے ہوئے کہا اور بات ادھوری چھوڑ دی۔

''کوئی بات نہیں۔ تم مجھے فون پر بتا دیتے۔'' اس نے بٹوا کھولتے ہوئے کہا۔ ''فی الحال تو یہ رکھ لو۔ اگر تم بتا دیتے تو میں اے ٹی ایم سے کیش نکلوا لیتی ہوئی آتی۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ وہ میرے جھانسے میں آ گئی تھی۔

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ ویسے مجھے یہ بات کہتے ہوئے ذرا شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔'' میں نے اس کے ہاتھ سے نوٹ لیتے ہوئے کہا۔

''ارے کوئی بات نہیں۔'' اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''کیا میں اب جا سکتی ہوں؟''

''بہت بہت شکریہ۔'' میں اس کی بات سن کر فوراً اٹھا اور اوور کوٹ اتارتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

کچھ دیر بعد کینڈی دفتر سے جا چکی تھی۔ میں ٹیرس پر کھڑا ہوا اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

''چکر کیا ہے؟'' میں ٹیرس سے پلٹ کر کیبن میں آیا تو بارٹ نے مجھے دیکھتے ہی سوال کیا۔ میکنس اور ٹیکس بھی کھڑے ہوئے تھے۔

''یہ لو پانچ سو ڈالر اور موج اڑاؤ۔'' میں نے بارٹ کی بات کا جواب دینے کے بجائے ٹیکس کی طرف نوٹ بڑھا دیے۔

''اصل بات بتاؤ، معاملہ کیا ہے۔ اسے کیوں بلوایا تھا؟'' بارٹ نے ایک بار پھر پوچھا۔ اس کا اشارہ کینڈی کی طرف تھا۔ شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ کوئی ایسی بات ضرور ہے جو میں اس سے چھپا رہا ہوں۔

''ابھی یہ بات چھوڑو۔'' میں نے بارٹ کو مخاطب کیے بغیر کہا۔ ''میں جو کہہ رہا ہوں، تم وہ کرو گے۔''

''کہو۔'' بارٹ نے منہ بنا کر کہا۔

''بارٹ، تم آج سہ پہر سے اولیگ کی نگرانی کرو گے اور جب وہ رات کو گھر جائے گا تو کسی طرح اندر داخل ہو کر یہ سننے کی کوشش کرو گے اُس کے اور اولیگ کے درمیان کیا بات چیت ہوتی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا۔

''ہاں ایک اور خاص بات۔'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

''وہ کیا ہے؟''

''مجھے اولیگ کی کوئی ایسی چیز چاہیے جس سے ڈی این اے ٹیسٹ لیا جا سکتا ہو۔''

''کوشش کرتا ہوں۔'' بارٹ نے پیشہ ورانہ لہجے میں جواب دیا۔

''میکنس تم دفتر میں ہی رہو گے۔ اگر کسی مرحلے پر بارٹ کو تمہاری مدد کی ضرورت پڑی تو وہ تمہیں فون کر کے بلوا لے گا۔'' میں نے انہیں منصوبہ بتاتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی دفتر میں موجود رہوں گا۔ تم مجھے میسج کر کے تمام باتوں سے باخبر رکھو گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے ایک بار پھر بدستور ناراض لہجے میں جواب دیا۔

''بارٹ اپنی حفاظت کا خاص خیال رکھنا۔'' میں نے اس کی ناراضی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

دفتری ہدایات دینے کے بعد میں باہر جانے کے لیے نکلا۔ ایک گھنٹے کے بعد میں اپنے ایک دوست کی لیبارٹری میں بیٹھا کافی پی رہا تھا۔ یہ لیبارٹری ڈی این اے ٹیسٹ کے حوالے سے کیلی فورنیا میں اچھی شہرت رکھتی تھی۔ میں یہاں کڑے پر ملنے والے خون اور کینڈی کے بال لے کر ڈی این اے ٹیسٹ کروانے کے لیے آیا تھا۔



''کب تک رپورٹ مل جائے گی۔'' جب میں باہر نکلنے لگا تو ڈاکٹر سائمن سے پوچھا۔ وہ بھی پولیس فرانزک لیبارٹری سے بھی وابستہ رہ چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔

''دو چار دن لگ جائیں گے۔'' اس نے کہا۔

''ارجنٹ ہے۔ کوشش کرو ذرا جلدی ہو جائے۔'' میں نے کہا۔

''کوشش کرتا ہوں۔'' سائمن نے مسکرا کر کہا۔

''دوسرا نمونہ میں آج رات یا کل صبح تک لیبارٹری میں پہنچا دیتا ہوں۔''

''بہتر ہے۔''

''بائے۔'' میں نے اسے الوداع کہا۔

جب میں لیبارٹری سے باہر نکلا تو دوپہر ڈھل چکی تھی۔ میں لنچ کے لیے چائنا ٹاؤن کی طرف چل دیا۔ میں اس وقت کھانا کھا رہا تھا جب بارٹ کا میسج ملا۔ اس کا کہنا تھا کہ اولیگ گھر سے نکل کر بار میں پہنچ چکا ہے اور میں کوشش کر رہا ہوں کہ کسی طرح ڈی این اے کے لیے کوئی شے حاصل کر سکوں؟

''لگے رہو۔'' میں نے مختصر جواب لکھ کر ایس ایم ایس کر دیا۔

کھانے کے بعد میں دفتر پہنچا اور میکنس کو اولیگ کے گھر بھیج دیا۔ میں نے اسے ہدایت کی تھی کہ وہ کل کی طرح آج بھی نگرانی کرے اور جیسے ہی کینڈی باہر نکلتی ہے، وہ مجھے اطلاع دے کر اس کا تعاقب شروع کر دے۔

شام کے ساڑھے چھ بج چکے تھے۔ دوپہر کے بعد سے نہ تو بارٹ کا کوئی میسج آیا اور نہ ہی میکنس نے کوئی اطلاع دی تھی۔ میں فارغ بیٹھا ہوا سگار پی رہا تھا۔ اچانک میرے موبائل فون کی الرٹ ٹون بجی۔ میں نے لپک کر فون اٹھایا۔ ''وہ گھر سے نکل رہی ہے۔'' میکنس نے میسج بھیجا تھا۔

میں تیزی سے باہر نکلا اور تیز رفتاری سے گاڑی دوڑاتا ہوا اولیگ کے گھر کے عقب میں پہنچ گیا۔ باہر کافی اندھیرا تھا۔ میں اندھیرے کی آڑ لیتا ہوا گھر میں داخل ہوا اور پھر میں گیراج میں گیا۔ کدال اور بیلچہ نکالا اور لان کے اس حصے کی کھدائی کرنے لگا جہاں کل میں نے چھوٹی چھوٹی گھاس دیکھی تھی۔ میں نہایت احتیاط سے ایک چھوٹا سا گڑھا کھود رہا تھا۔ چند فٹ کی گہرائی کے بعد میں نے ہاتھوں سے مٹی کھودنا شروع کر دی۔ کچھ ہی دیر بعد میرے سر پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ میرا ہاتھ کسی پلاسٹک سے جا ٹکرایا تھا۔ میں نے اسے باہر کھینچنے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں نکلی۔ میں نے فوراً گڑھا بند کرنا شروع کیا اور کچھ دیر بعد مٹی برابر کر کے بیلچہ اور کدال واپس گیراج میں رکھے اور جس طرح اندر داخل ہوا تھا، اُسی طرح خاموشی سے باہر نکل گیا۔

میں نے دفتر جانے کے بجائے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ نہا دھو کر کپڑے تبدیل کیے اور کافی بنا کر پینے لگا۔ اس دوران میں، میں اب تک کی ساری صورتِ حال پر غور کرتے ہوئے کڑی سے کڑی ملانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی دوران مجھے بارٹ کا میسج ملا۔

''نمونہ ملا ہے۔ میں نے اس کی گاڑی کی تلاشی لی ہے۔ ڈیش بورڈ میں سے ایک ہیئر برش ملا ہے۔ جس میں کچھ بال پھنسے ہوئے ہیں۔ میں نے انہیں نکال کر محفوظ کر لیا ہے۔''

میسج پڑھ کر میں خوشی سے جھوم اٹھا اور فوراً جواب لکھنے لگا:

''تم ڈاکٹر سائمن کی لیبارٹری میں جا کر یہ بال اس کے حوالے کر دو... فوراً۔ اُس کے بعد واپس اپنی ڈیوٹی پر آ جاؤ۔''

آدھا گھنٹے کے بعد میں نے ڈاکٹر سائمن کو فون کیا۔ اس نے نمونہ ملنے کی تصدیق کر دی اور یہ بھی اطلاع دی کہ منگل کو رپورٹ مل جائے گی۔ اب مجھے لگنے لگا تھا کہ اگلے چوبیس گھنٹے اس کیس کے حوالے سے بہت اہم ہیں۔

ان کاموں سے فارغ ہو کر میں نے ڈنر تیار کیا اور رات کے ساڑھے نو بجے جب میں دفتر جانے کے لیے گھر سے نکل رہا تھا تو میکنس کا فون آیا۔ ''فوراً سٹی اسپتال پہنچو۔ اس نے بارٹ کو گولی ماردی ہے۔'' وہ اولیگ کے گھر سے نکلنے کے بعد میرے حکم پر کینڈی کا تعاقب چھوڑ کر واپس دفتر پہنچ چکا تھا۔ فون سنتے ہی میرے اوسان خطا ہو گئے۔

میں نہایت تیز رفتاری سے گاڑی چلاتا ہوا اسپتال پہنچ گیا۔ جب میں اندر پہنچا تو ٹیکس اور میکنس بھی وہیں ایمرجنسی کے باہر موجود تھے۔ دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ کسی کیس میں ہم پر گولی چلائی گئی ہو اس لیے اُن کا پریشان ہونا فطری تھا۔

''کیا ہوا؟'' میں نے اُن دونوں سے پوچھا۔

''بارٹ ایمرجنسی میں ہے۔ اس کے بازو میں گولی لگی ہے۔ گولی نکالنے کے لیے آپریشن ہو رہا ہے۔'' ٹیکس نے جواب دیا۔

''اس کی حالت کیسی ہے؟'' میرے لہجے سے تشویش عیاں تھی۔

''ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ خطرے سے باہر ہے۔''

''ہوا کیا تھا؟''

میرا سوال سن کر میگنس نے قصہ بیان کرنا شروع کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ میرا نیا حکم ملنے پر وہ کینڈی کا تعاقب ادھورا چھوڑ کر دفتر واپس آرہا تھا کہ راستے میں بارٹ کو فون کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ لیسن پارک پہنچنے والا ہے۔ میں اگر فارغ ہوں تو وہیں پہنچ جاؤں۔ میں وہاں پہنچا تو بارٹ گاڑی پارک کررہا تھا۔ اس نے بتایا کہ اولیگ اور مرینا پارک کے اندر گئے ہیں۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اتنی سخت سردی میں وہ یہاں کیا کرنے آئے ہیں۔ پارک سنسان پڑا ہوا تھا۔ ہم دونوں نہایت احتیاط سے اندر داخل ہوئے۔ ابھی ہم دونوں تھوڑا ہی آگے گئے تھے کہ اچانک برابر میں لگے درخت کی اوٹ سے ایک سایہ نمودار ہوا اور ہم دونوں پر ٹوٹ پڑا۔ ہم گھبرا گئے اور مدافعت میں ہاتھ پاؤں چلانے لگے۔ اسی دوران حملہ آور نے پستول نکال لیا اور اندھا دھند کئی گولیاں چلا دیں۔ ہم نے بچنے کے لیے قلابازی کھائی مگر ایک گولی بارٹ کو لگ گئی۔ وہ زور سے چیخا۔ اس کی چیخ سن کر حملہ آور باہر کی طرف دوڑا مگر اس سے پہلے کہ وہ باہر نکل پاتا، قریب سے پولیس کار کا سائرن گونجنے لگا۔ وہاں ہمارے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ پولیس نے حملہ آور کو کار میں بیٹھتے ہوئے گرفتار کرلیا اور اب وہ پولیس کی تحویل میں ہے۔

''کون تھا وہ؟'' میگنس کے پورے قصے میں حملہ آور کی شناخت کا ذکر سرے سے ہی موجود نہیں تھا۔ اسی لیے جب وہ خاموش ہوا تو میں نے حیرت سے سوال کیا۔

''اولیگ براؤن۔'' اس نے نہایت سکون سے جواب دیا۔

''کیا...''

''اس کے ساتھ ساتھ مرینا کو بھی پولیس نے گرفتار کرلیا ہے۔ جس وقت اولیگ کو پکڑا گیا، پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔''

''اوہ میرے خدا... اس کا مطلب ہے کہ وہ جان گیا تھا کہ اس کا تعاقب کیا جارہا ہے ورنہ وہ گولی کیوں چلاتا۔'' میں نے سر پکڑتے ہوئے کہا۔ ''اُسے یہ پتا کیسے چلا؟'' میں نے آہستہ سے خود سے سوال کیا اور اگلے ہی لمحے مجھے جواب مل گیا۔ ''یقیناً فوٹو گرافر نے اسے خبردار کردیا ہوگا۔'' میں نے زیرِ لب کہا۔

لگ بھگ دو گھنٹے کے بعد بارٹ کو وارڈ میں منتقل کردیا گیا۔ گولی گوشت میں لگی تھی۔ ہڈی بچ گئی تھی۔ ڈاکٹرز کے مطابق اس کی حالت خطرے سے باہر تھی لیکن آپریشن کے دوران بے ہوش کیے جانے کے باعث اس پر اب تک غنودگی طاری تھی۔ میں نے میگنس اور فیکس کو اسپتال میں ہی رکنے کا کہا اور خود پولیس اسٹیشن آگیا۔

کیپٹن فلپ اس کیس کی تفتیش کررہا تھا۔ وہ کبھی میرا جونیئر رہ چکا تھا۔ بڑی عزت کرتا تھا میری۔ جب اس نے مجھے وہاں دیکھا تو حیران ہوا لیکن اس سے زیادہ وہ یہ سن کر حیران ہوا کہ بارٹ میرا ماتحت ہے۔

''کچھ پتا چلا... کیا کہتا ہے وہ۔ گولی کیوں چلائی تھی اس نے؟'' میں نے کافی پیتے ہوئے کیپٹن فلپ سے سوال کیا۔ میں یہ جاننے کے لیے پہنچا تھا کہ اس نے اپنے دفاع میں کیا بیان دیا ہے۔

''وہ کہتا ہے کہ یہ دونوں اسے لوٹنے کی کوشش کررہے تھے۔''

''جھوٹ بولتا ہے وہ۔''

''ہاں اب تو یہی لگتا ہے۔ یہ بتاؤ کہ قصہ کیا ہے۔ تمہارے آدمی اس کے پیچھے کیوں لگے ہوئے تھے؟'' فلپ نے میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''تھوڑا سا انتظار کرلو۔ سب پتا چل جائے گا۔'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''ویسے تم تیار ہوجاؤ آج کی رات تمہاری بڑی خواری ہونے والی ہے۔''

''کیا...''

''ہاں...''

''چکر کیا ہے؟'' اس نے ایک بار پھر پوچھا۔

''دو گھنٹے اور انتظار کرلو۔'' میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا اور باہر نکل گیا۔

''تمہارا کیس حل ہوگیا ہے۔ فوراً میرے دفتر پہنچ جاؤ۔'' پولیس اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی میں نے کینڈی کو فون کیا۔ پندرہ منٹ بعد میں دفتر میں بیٹھا ہوا کینڈی کا انتظار کررہا تھا۔

''تمہارا شک درست تھا۔'' اسے دیکھتے ہی میں نے کہا۔

''کیا...'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

''وہ تم سے بے وفائی کررہا تھا۔ مرینا کے ساتھ اس کا خاص چکر چل رہا ہے۔'' میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ جیسے میری ساری ہمدردیاں اس کے ساتھ ہیں۔

''مجھے تو اس پر پہلے ہی شک تھا۔'' اس نے افسردہ سے لہجے میں کہا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''اب تفصیل سے بتاؤ سب کچھ۔''

''اس لڑکی کا تعلق میکسیکو سے ہے اور تمہارا شوہر اس کے عشق میں بری طرح مبتلا ہوچکا ہے۔ اسے دیکھ کر لگتا ہے کہ جلد یا بدیر، وہ دونوں شادی کرنے والے ہیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم اپنے مستقبل کا فیصلہ کرلو۔'' میں نے نمک مرچ لگا کر کہانی سنانا شروع کی۔ اسے دیکھ کر یہ نہیں لگتا تھا کہ وہ اولیگ اور مرینا کی گرفتاری سے باخبر ہوچکی ہے۔

''بہت برا کیا ہے اس نے اپنے ساتھ۔'' کینڈی نے نہایت نفرت بھرے لہجے میں دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔

''تمہاری یہ بات تو بالکل ٹھیک ہے۔'' میں نے لقمہ دیا۔ ''اس نے مرینا کے چکر میں اپنے ساتھ بہت برا کرلیا ہے۔'' وہ خاموشی سے اپنے ناخن کو دیکھتے ہوئے میری بات سن رہی تھی میری باتوں کا اثر اس کے چہرے پر نظر نہیں آرہا تھا۔ ''اولیگ اس وقت پولیس کی حراست میں ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہو تم؟'' یہ سنتے ہی وہ چونک گئی۔ ''کیا کیا ہے اس نے؟'' اس کی آواز سے خوف جھلک رہا تھا۔

''اس نے میرے دو آدمیوں کو قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔'' یہ کہہ کر میں چند ساعتوں کے لیے رکا اور اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ اس کا رنگ فق ہوچکا تھا۔ ''اس نے گولی چلائی تھی جس سے میرا ایک ماتحت زخمی ہوا اور وہ اب اسپتال میں پڑا ہوا ہے۔''

''کب ہوا یہ...'' اس نے میرے خاموش ہوتے ہی سوال کیا۔ اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

جواب میں میں نے سارا قصہ بیان کرڈالا البتہ فوٹو گرافر سے ملاقات کا احوال گول کرگیا۔

''اسے کیسے شک ہوا کہ اس کا پیچھا کیا جارہا ہے؟'' کینڈی کے سوال میں وزن تھا۔

''ہوسکتا ہے کہ اس نے محسوس کرلیا ہو۔ ویسے ہے تو چالاک آدمی۔ تبھی تو اتنے سالوں سے بار چلا رہا ہے۔''

''بہت بہت شکریہ تمہارا۔'' اس نے ہینڈ بیگ کھولا اور نوٹوں کی ایک موٹی سی گڈی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ آپ کی فیس ہے۔ مجھے اب آپ کی ضرورت نہیں۔''

''مجھے امید ہے کہ جو کچھ آپ معلوم کرنا چاہتی تھیں، وہ آپ جان چکی ہیں۔'' میں نے پیشہ ورانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا مگر وہ خاموش رہی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ میرے دفتر کی سیڑھیاں اترتے ہوئے باہر جارہی تھی۔ رات کے سناٹے میں اس کی سینڈل کی اونچی ہیل کی کھٹ کھٹ بہت پُراسرار اور ڈراؤنی محسوس ہورہی تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی اور سگار سلگالیا۔ کینڈی کا گھر یہاں سے بیس منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔ مجھے یہ وقت سگار پیتے ہوئے گزارنا تھا۔

تقریباً بیس منٹ کے بعد میں نے فون اٹھایا اور کیپٹن فلپ کا نمبر ملانے لگا۔ جو تجسس میں اس کے پاس چھوڑ آیا تھا، اس نے اُسے بے چین رکھا تھا۔ تبھی تو اس نے پہلی ہی گھنٹی پر فون اٹھالیا۔ ''ہاں جان...''

''اولیگ کے گھر اور اس کی بیوی کینڈی کی گرفتاری کے وارنٹ لو فوراً۔ پولیس کی بھاری نفری، ایمبولینس اور بیلچے، پھاوڑے لے کر وہاں پہنچ جاؤ اور...''

''کیا کہہ رہے ہو؟'' اس نے قطع کلامی کی۔ میری بات سن کر شاید اس کا بلڈ پریشر ہائی ہوگیا۔ اس کی آواز خاصی اونچی تھی۔

''بیچ میں مت ٹوکو۔ جیسا کہتا ہوں، ویسا کرو۔''

''اوکے...'' اس نے خود پر کنٹرول کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''بتاؤ کیا کرنا ہے؟''

''گھر کے عقب میں لان ہے۔ اس کے ایک کنارے پر چھوٹی چھوٹی گھاس اُگی ہوئی ہے۔ وہاں ایک کنارے پر تمہیں تازہ کھدا ہوا گڑھا نظر آئے گا۔ بس وہیں سے پورے لان کی کھدائی شروع کردو۔''

''اور کچھ؟'' میں خاموش ہوا تو اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''جیسا کہا ہے، ویسا کرو... بائے۔''

میں نے کچن میں جاکر کافی بنائی۔ ٹھنڈ سے جان نکلی جارہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ یہ رات جاگ کر ہی گزارنا ہوگی۔ اس لیے میں نے اسٹرانگ کافی بنائی اور بڑا سا مگ لے کر سکون سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ کیپٹن فلپ کو فون کیے ہوئے ایک گھنٹا گزر چکا تھا۔ ''اب تک کارروائی شروع ہوچکی ہوگی۔'' میں نے خود کلامی کی اور دفتر کی تمام لائٹس بند کرنے لگا۔

جب میں اولیگ براؤن کے گھر پہنچا تو وہاں میلہ لگا ہوا تھا۔ لان سرچ لائٹوں سے روشن تھا۔ کئی ایمبولینسیں اور پولیس کی درجن بھر گاڑیاں وہاں موجود تھیں۔ میں نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے فلپ کا نمبر ملایا اور اگلے ہی لمحے وہ لائن پر تھا۔

''کچھ ملا؟''

''ارے تم فوراً یہاں پہنچو۔'' اس نے چلاتے ہوئے کہا۔

''میں پہنچ چکا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے جواب سنے بنا

فون بند کر دیا کچھ دیر بعد میں فلپ کے ساتھ لان میں کھڑا تھا۔

لان میں پانچ لاشیں دفن کی گئی تھیں۔ یہ لاشیں پلاسٹک کے قدِ آدم تھیلوں میں لپیٹ کر دفنائی گئی تھیں۔ ان تھیلوں کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کے اندر اب صرف ہڈیاں ہی ہوں گی، صرف ایک تھیلے کے جو اس جگہ سے نکالا گیا تھا، جہاں شام کو میں نے کھدائی کی تھی۔ اس تھیلے کو دیکھ کر لگتا تھا کہ اس میں موجود لاش زیادہ پرانی نہیں ہوگی۔ اس تھیلے سے اب تک بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔

پولیس نے کینڈی کو فوراً ہی تحویل میں لے لیا۔ جب اسے گرفتار کیا گیا، اس وقت وہ سوٹ کیس میں اپنے کپڑے اور دیگر ضروری سامان پیک کر رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ایمرجنسی میں یہاں سے فرار ہونے کی تیاری کر رہی تھی مگر اسے بھاگنے کا موقع نہ مل سکا اور وہ پکڑی گئی۔ شاید اسے بھی اتنی جلدی اپنے گرفتار ہونے کا یقین نہیں ہوگا ورنہ وہ میرے دفتر سے گھر لوٹنے کے بجائے باہر ہی باہر کہیں نکل جاتی۔

جب ساری لاشیں نکال لی گئیں تو میں بھی وہاں سے اپنے گھر لوٹ آیا۔ اس وقت صبح کے چار بج رہے تھے مجھے امید تھی کہ بارٹ سو رہا ہوگا۔ میں مطمئن تھا کہ میگنس اور ٹیکس اسپتال میں ہی موجود ہیں۔ میں سارے دن کی بھاگ دوڑ کے بعد خاصا تھک چکا تھا۔ فوراً گھر پہنچا اور بستر پر ڈھیر ہوگیا۔

دوسرے دن جب میری آنکھ کھلی تو دن کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ میں فوراً باہر نکلا اور اس دن کے درجن بھر اخبارات خرید کر لے آیا۔ گھر واپس پہنچ کر کافی بنائی اور ٹی وی آن کر دیا۔ میں پہلے ہی گاڑی میں ریڈیو پر رات والے واقعے کی خبر سن چکا تھا۔ اخبارات، مقامی ٹی وی چینل اور ریڈیو اس خبر سے بھرے ہوئے تھے۔ پولیس نے اب تک کوئی تفصیلی بیان جاری نہیں کیا تھا۔ اس لیے ذرائع ابلاغ میں صرف قیاس آرائیاں ہی تھیں۔

ناشتے سے فارغ ہو کر میں گھر سے نکلا اور اسپتال پہنچ گیا۔ ٹیکس اور میگنس اپنے اپنے گھر چلے گئے تھے۔ بارٹ بیڈ سے ٹیک لگائے اخبار پڑھ رہا تھا۔

"کیسے ہو شیر۔" میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔

"بہت اچھا۔" اس نے بھی مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ اس کے اُلٹے بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

"کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

"کافی بہتر ہوں۔" اس نے خوش دلی سے جواب دیا۔

"بہت خوب۔" میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"یہ سب کیا ہے؟" اس نے اخبار میری نگاہوں کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"دفتر کی باتیں دفتر میں۔" میں اس کی بات کا جواب دینا نہیں چاہتا تھا۔ "فی الحال تو یہ جان لو کہ کھیل مکمل طور پر ابھی ختم نہیں ہوا ہے، ہاں اگلے کچھ دنوں تک میں تمہارے سوالوں کے جوابات دینے کی پوزیشن میں ہوں گا۔"

تھوڑی دیر تک ہم دونوں کل رات پارک میں پیش آنے والے واقعے کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد میں اٹھ کر دفتر چلا آیا۔ مجھے کینڈی کیس کی ایک جامع رپورٹ تیار کرنا تھی۔ تقریباً تین چار گھنٹوں بعد میری رپورٹ تیار ہو گئی تھی۔ یہ رپورٹ میں پولیس کی مدد کے لیے رضاکارانہ طور پر تیار کر رہا تھا تاکہ مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچایا جاسکے۔ بس مجھے ڈی این اے کی رپورٹ کا انتظار تھا۔ اس کے بعد میری رپورٹ مکمل ہو جاتی۔

جب میں دفتر سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو اس وقت تک شام ہو چکی تھی۔ میں نے کیپٹن فلپ کو فون کیا۔ وہ پولیس اسٹیشن میں ہی تھا۔ میں بھی اس کی طرف چل دیا۔

"کچھ پتا چلا؟" آدھے گھنٹے... بعد میں اس کے ساتھ بیٹھا ہوا کافی پی رہا تھا۔

"کچھ خاص نہیں۔" فلپ نے کہنا شروع کیا۔ "ابھی تک تو وہ دونوں اس بات سے مکمل لاعلمی ظاہر کر رہے ہیں۔ البتہ جب میں نے ان سے کہا کہ وہ اس گھر میں پچھلے دس بارہ سالوں سے رہ رہے ہیں تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ کوئی ان کے گھر کے عقبی لان میں ایک چھوڑ پانچ لاشیں دفن کر دے اور انہیں کانوں کان خبر نہ ہو۔"

"وہ کیا کہتے ہیں؟"

"دونوں نے مکمل چپ سادھ رکھی ہے مگر کب تک منہ نہیں کھولیں گے۔" فلپ بتا رہا تھا۔ "لاشوں کا آج پوسٹ مارٹم مکمل ہو جائے گا۔ تین چار روز میں ڈی این اے رپورٹ بھی آجائے گی۔ سچ تو کھل ہی جائے گا۔" فلپ کے چہرے سے تھکاوٹ جھلک رہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ دن میں بھی نہیں سو سکا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ کوئی خاص بات پتا چلے تو مجھے بتانا۔" یہ کہہ کر میں اٹھا اور پھر اپنے گھر چلا آیا۔

"دوسرے دن دفتر پہنچا تو میرے تینوں ساتھی موجود تھے۔ ابھی میں دعا سلام کر رہا تھا کہ ڈاکٹر سائمن کا فون



آ گیا۔

"تمہاری رپورٹس آ گئی ہیں۔ دوپہر تک لے لینا۔" اس نے رسمی دعا سلام کے بغیر کہنا شروع کیا۔

"بہت خوب۔ میں آتا ہوں... بائے۔"

دوپہر کو میں لیبارٹری جا کر رپورٹ لے آیا۔ نتائج میری توقع کے عین مطابق تھے۔ رپورٹ لینے کے بعد میں دفتر آیا۔ اپنی رپورٹ میں کچھ اضافے کیے اور پھر کیپٹن فلپ کو فون کر کے پہنچنے کی اطلاع دی۔

"اوہ میرے خدا... تم نے تو سارا کیس ہی حل کر دیا۔" میری رپورٹ اور پیش کیے گئے ثبوت پڑھ کر اس کے منہ سے نکلا۔ اس وقت وہ خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔

تین دن بعد اخبارات میں نمایاں طور پر خبر شائع ہوئی۔ خبر کی سرخی تھی:

"جنگل ایوننگ بار کا مالک اور اس کی بیوی پانچ لڑکیوں کے قتل کے الزام میں باضابطہ گرفتار۔ پولیس کو شواہد مل گئے۔ وہ زندہ لڑکیوں کا خون پیتے تھے۔"

"یہ کیا ہے باس...؟" اُس دن دفتر پہنچا تو تینوں میرے کیبن میں چلے آئے۔ بارٹ کے ہاتھ میں اخبار تھا جو اس نے میری آنکھوں کے سامنے نچاتے ہوئے کہا۔ "کیا یہی مکمل کہانی ہے۔"

"مکمل تو نہیں لیکن جتنی بھی ہے، بالکل سچ ہے۔"

"تو پھر مکمل سچ کیا ہے۔ اب تو بتا دو؟" بارٹ نے منہ بنا کر کہا۔

"ٹھیک ہے تو پھر سنو کہانی۔" یہ کہہ کر میں نے کینڈی کیس کا مکمل احوال بیان کرنا شروع کر دیا۔

☆☆☆

کینڈی ایک مالدار اسٹاک بروکر کی اکلوتی بیٹی تھی۔ باپ کی موت کے بعد اسے بیٹھے بٹھائے بے تحاشا دولت مل گئی۔ اس کے سامنے زندگی کا کوئی خاص مقصد نہیں تھا۔ اس لیے اس نے سیر و سیاحت شروع کر دی۔ اس دوران وہ کئی بار میکسیکو گئی۔ اسے اسپینش لوگوں کی زندگی بہت پُراسرار لگتی تھی۔ وہاں اس کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو پُراسرار علوم پر دسترس رکھتا تھا۔ اس شخص سے دوستی کے نتیجے میں اسے بھی ماورائیت سے دلچسپی ہو گئی۔ وہ شخص کالے جادو کا ماہر تھا۔ وہ کینڈی کو ایسا مشروب پلاتا رہا جس میں نوجوان لڑکیوں کا تازہ خون ملا ہوتا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ اس مشروب کی عادی ہوتی چلی گئی۔ اسی دوران وہ ایک بار کیلی فورنیا لوٹی جہاں اس کی ملاقات ایک بار میں اولیگ سے ہوئی۔ وہ ایک معمولی سا ویٹر تھا۔ کینڈی اس کی مردانہ وجاہت سے بہت متاثر ہوئی اور یوں دونوں میں بہت جلد گہری دوستی ہو گئی۔

چند ہفتوں کے بعد جب کینڈی دوبارہ میکسیکو گئی تو پتا چلا کہ وہ شخص کہیں جا چکا ہے۔ کینڈی نے اسے تلاش کرنے کی بہت کوشش کی۔ اس خاص مشروب کی طلب اسے بے چین کیے ہوئے تھی۔ آخر ایک دن اسے اس شخص کا فون ملا۔ اس نے بتایا کہ اگر وہ مشروب حاصل کرنا چاہتی ہے تو نوجوان اسپینش لڑکیوں کا تازہ خون حاصل کرے اور پانی یا کسی مشروب میں ملا کر پیے۔ کینڈی کے لیے یہ کام تنہا کرنا مشکل تھا۔ آخر اس نے ایک منصوبہ بنایا اور اولیگ کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔

کینڈی نے اولیگ کو پیشکش کی کہ وہ اسے ایک بار خرید کر دے گی جو اس کے نام ہوگا۔ وہ کیلی فورنیا میں ایک ساتھ رہیں گے لیکن بنا شادی کیے۔ اس فیاضی کے نتیجے میں وہ کینڈی کے لیے ایک اسپینش لڑکی کا انتظام کرے گا۔ اولیگ رضامند ہو گیا۔ کینڈی نے بھی اپنا وعدہ نبھایا اور یوں دونوں ایک دوسرے کے کام آنے لگے۔

اولیگ مردانہ وجاہت میں بے مثل تھا۔ وہ میکسیکو آتا اور جو لڑکی اس کے جال میں پھنس جاتی، اسے کیلی فورنیا لے جاتا۔ وہ موقع دیکھ کر اسے گھر لاتا اور پھر نیچے تہ خانے میں قید کر دیتا۔ وہ لڑکی کو نشہ آور ٹیکوں کا عادی بنا دیتا تھا۔ اولیگ انجکشن کی مدد سے اس کا خون نکالتا اور کینڈی کو پیش کرتا رہتا۔ جب وہ لڑکی قریب المرگ ہو جاتی تو یہ اس کے ہاتھ باندھ کر اور منہ پر ٹیپ لپیٹ کر لان میں لے آتے۔ اسے تشدد کا نشانہ بناتے۔ کینڈی لڑکی کے جسم پر تیز دھار چاقو سے زخم لگاتی اور اس کا خون چاٹتی اور پھر مرنے پر وہ اسے لان میں دفن کر دیتے تھے۔ آخری بدقسمت لڑکی مارتھا تھی، جو ایک ماہ پہلے ان کی درندگی کا شکار ہوئی تھی۔ اس کے بعد اولیگ پھر میکسیکو گیا اور تازہ شکار گھیر گھار کر لے آیا۔

یہ لڑکی مرینا تھا۔ اولیگ اس زندگی سے اکتا چکا تھا۔ وہ مرینا کو چاہنے لگا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اسے اپنانے سے قاصر تھا۔ کینڈی اس سے جونک کی طرح چمٹ گئی تھی۔ اولیگ اسے کب کا چھوڑ دیتا لیکن ایک مصیبت تھی۔ وہ یہ کہ بار اگرچہ اولیگ کے نام پر تھا لیکن اس کے معاہدے میں ایک شرط شامل تھی اور وہ یہ کہ کینڈی اس کی برابر کی شراکت دار تھی اور معاہدے کی رو سے گیارہ سال ختم ہونے کے بعد از خود کینڈی کی شراکت ختم ہو جاتی اور وہ بلاشرکت بار کا مالک بن جاتا۔ دس سال گزر چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کینڈی نے تین



www.digestpk.com

چار ماہ پہلے اس سے قانونی طور پر شادی رچالی تاکہ بار کی ملکیت مل جانے کے باوجود بھی وہ اسے نہ چھوڑ سکے۔ ویسے بھی اگر وہ کینڈی کو طلاق دیتا تو بھاری رقم ادا کرنا پڑتی جس کا متحمل اولیگ نہیں ہوسکتا تھا اس لیے کینڈی اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھا رہی تھی۔

مارتھا کی موت کے بعد وہ نیا شکار تو پھانس لایا تھا لیکن اسے کینڈی کے حوالے نہیں کر رہا تھا۔ وہ اس کے عشق میں گرفتار ہو چکا تھا۔ اولیگ کے حیلے بہانوں کی وجہ سے دونوں میں خاصی تلخی پیدا ہو چکی تھی۔ کینڈی سمجھ گئی تھی کہ وہ لڑکی کی وجہ سے آنکھیں پھیر رہا ہے لیکن وہ خود اس بات کا اعتراف نہیں کر رہا تھا۔ کینڈی خونی مشروب کی عادی ہو چکی تھی۔ دو مہینوں سے اس نے اپنا پسندیدہ نشہ نہیں کیا تھا۔ اس کا بدن ٹوٹنے لگا تھا۔ خون کا نشہ پورا نہ ہونے کی وجہ سے اس کی حالت بگڑنے لگی تھی۔ وہ بے خوابی کا شکار ہو رہی تھی لیکن اولیگ، مرینا کو گھر لانے کے بجائے اسے مسلسل ٹال رہا تھا۔ اس لیے اس نے اولیگ کے پیچھے جاسوس لگائے مگر داؤ اُلٹا پڑ گیا اور وہ پکڑے گئے۔

''تو یہ تھی وہ پوری کہانی جو اخبارات میں نہیں چھپی ہے۔'' قصہ بیان کرنے کے بعد میں نے کرسی کی پشت سے سر ٹکایا اور پیشہ ور قصہ گو ... کی طرح اُن کی طرف فاتحانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''مگر وہ گیراج والا ڈبا، وہ تصویریں...'' بارٹ نے سوال کیا۔

''کینڈی فطرتاً اذیت پسند ہوگئی تھی۔'' میں نے کہنا شروع کیا۔ ''وہ ایسی چیزیں مقتولہ کے جسم سے اتار لیتی تھی، جو وہ مرتے وقت پہنے ہوتی تھی اور پھر بعد میں اکثر انہیں دیکھ دیکھ کر لطف لیتی تھی۔''

''لیونگ روم کی تصویریں؟''

''وہ بھی اسی سلسلے کی ہی ایک کڑی تھیں۔'' میں نے کہنا شروع کیا۔ وہ تینوں دم سادھے داستان سن رہے تھے۔ ''اولیگ نے پولیس کو بتایا ہے کہ کینڈی اکثر لیونگ روم میں بیٹھ کر اپنے شکار کی تصویریں دیکھ دیکھ کر مجھ سے ایسی باتیں کرتی تھی کہ جیسے وہ قتل کا نہیں بلکہ دوستوں کے ساتھ منائی گئی کسی پکنک کا احوال بیان کر رہی ہو۔''

''بہت اپنا رنل نکلی۔ بظاہر تو وہ نارمل لگتی تھی۔'' فیکس نے تبصرہ کیا۔

''یہ پورا قصہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟'' میگنس نے استفساریہ نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''خود مجرموں نے پوری کہانی بیان کر دی ہے۔''

''اوہو... تو یہ بات ہے۔'' بارٹ نے کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا...'' میں اس کی 'اوہو' سن کر چونک گیا۔ ''ملزمان کی گرفتاری میں میری ذہانت کا دخل ہے۔ اگر میرا دماغ کام نہ کرتا تو وہ اولیگ اب تک ضمانت پر رہا ہو کر باہر آچکا ہوتا۔ صرف تم پر گولی چلانے کا ہی تو الزام تھا اس پر، وہ بھی غلط فہمی کی بنا پر۔''

''ناراض مت ہو۔ یہ تمہارا ہی کارنامہ ہے۔'' میری بات سن کر وہ ہنس دیا۔ ''میں تو تمہیں تپا رہا تھا۔''

''بہت بڑی خوش خبری ہے تمہارے لیے۔'' ابھی ہم بیٹھے ہوئے خوش گپیاں کر رہے تھے کہ کیپٹن فلپ کا فون آگیا۔

''کیا ہوا ہے؟'' میں نے جواب دیا۔

''کیلی فورنیا پولیس نے اتنے بڑے کیس کو بے نقاب کرنے اور جرم کی حقیقت تک پولیس کو پہنچنے میں مدد دینے پر تمہاری ایجنسی کو ایک لاکھ ڈالر انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہو تم؟'' میں خوشی سے چلّا اٹھا۔

''پرسوں شام ویک اینڈ ہے۔ اس موقع پر منعقدہ تقریب میں پولیس چیف تمہیں چیک پیش کریں گے۔ ٹھیک ہے تو پھر ملتے ہیں ویک اینڈ پر... بائے۔''

''کیا ہوا؟'' جیسے ہی میں نے فون بند کیا تینوں نے یک زبان ہو کر دریافت کیا۔

''تم تینوں کے لیے ایک، ایک ماہ کی تنخواہ بطور بونس۔''

''حیرت انگیز۔'' بارٹ نے کہا۔ وہ تینوں بہت خوش نظر آرہے تھے۔ کچھ دیر بعد میں نے انہیں کیپٹن فلپ کی دی گئی اطلاع کے بارے میں بتایا۔ یہ سن کر وہ سب ہی بہت خوش ہوئے۔ اسی دوران میں اپنی کرسی سے اٹھا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' مجھے جاتا دیکھ کر بارٹ نے سوال کیا۔

''بار میں... شاید کوئی گاہک مل جائے۔''

''واپس آجاؤ۔ ڈاکٹر کی طرف سے ایک ماہ تک مجھے کام کاج سے گریز کی ہدایت ہے...'' بارٹ نے سنجیدگی سے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ ہڈحرامی کا پورا ایک مہینہ۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا اور واپس کیبن میں پلٹ آیا۔

# میز کی چوری

بابر نعیم

چرانے کو تو دل بھی چرایا جاسکتا ہے... مگر کیا کیا جائے فی زمانہ انسان وفا و محبت کے سحر سے آزاد ہو چکا ہے... اب چوروہ چیزیں چراتے ہیں جن میں صرف فائدہ ہی فائدہ ہوتا ہے... ہر چور کا ہدف مختلف ہوتا ہے... کچھ اسی قسم کے مختلف اور انوکھے چوروں کی چوری کا معاملہ خاص...

**قیمتی اور نادر و نایاب میزوں کی گمشدگی کا دلچسپ واقعہ**

گرف کو اس حال میں دیکھ کر مجھے یوں لگا کہ وہ قریب المرگ ہے اور اسے مشینوں کے سہارے زندہ رکھا گیا ہے۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس کے جسم کے گرد لپٹی ہوئی تاروں اور نلکیوں کی تعداد گن سکوں۔ میں تو بس یہ اطلاع ملتے ہی دوڑی چلی آئی کہ وہ شدید زخمی حالت میں اسپتال میں داخل ہے۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ اسے اس حال میں دیکھوں گی۔ میں بستر کے پاس کھڑے ہو کر دوزانو ہوئی اور اس کا وہ ہاتھ جو پٹیوں سے آزاد تھا، اپنے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے بولی۔

''اوہ گرف! میرے عزیز، میرے پیارے دوست..... تم نے مجھے اس طرح چھوڑ کر جانے کی ہمت کیسے کی؟'' یہ کہتے ہوئے میری آنکھ سے آنسو ٹپک پڑے۔

''مجھے یقین ہے کہ کوئی نہ کوئی، شب کے اس پہر بھی تمہارے لیے کرسی کا بندوبست کر دے گا۔'' اس نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔

میں اس کی آواز سن کر حیران رہ گئی۔ یہ مشینیں نہیں بلکہ اس کی مضبوط قوتِ ارادی تھی جس نے اسے زندہ رکھا ہوا تھا۔

''میں پہلے بھی اس طرح کے حالات سے گزر چکا ہوں۔'' وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اور اس طرح کے حادثات میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اگر تم اسی طرح روتی رہیں تو تمہاری آنکھیں سوج جائیں گی اور پھر تم اس نوجوان ڈاکٹر کو حسین نظر نہیں آؤ گی جو میری دیکھ بھال پر مامور ہے۔ پہلے تو میں اسے اپنے لیے رحمت کا فرشتہ سمجھا

تھا لیکن جب وہ میرا معائنہ کرنے کے لیے جھکا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ سگریٹ پیتا ہے۔ حالانکہ ایک ڈاکٹر ہونے کے ناتے اسے یہ حرکت زیب نہیں دیتی۔ اور یقین کرو، یہ بات میں نے اس کے منہ پر کہہ دی۔''

''پھر اس نے جواب میں کیا کہا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس نے کہا کہ میں اپنی سانسوں کو بچا کر رکھوں۔ ویسے ڈاکٹر فرینک اچھا آدمی ہے۔ شاید وہ بہت جلد تم سے میرے بارے میں بات کرے گا۔ میرا وارث سمجھ کر۔''

وارث..... جہاں تک میں جانتی تھی، گرف کا کوئی قریبی رشتے دار زندہ نہیں تھا لیکن اس نے ہمیشہ مجھے اپنی پوتی کے طور پر متعارف کروایا۔ ہم دونوں کی خواہش تھی کہ یہ رشتہ حقیقی ہوتا لیکن قانونی طور پر یہ ممکن نہیں تھا کیونکہ میں ایک بگڑے ہوئے نواب کی اولاد تھی جو بچپن ہی میں مجھے میری ماں کے پاس چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ لیکن مجھے یہ بات کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔

خوب صورت چہرے والی نرس مجھے ایک چھوٹے سے سجے سجائے کمرے میں لے گئی۔ اس کی سجاوٹ اور خوب صورتی دیکھ کر یقیناً گرف کی خوشی کے مارے چیخ نکل جاتی۔ کمرا خالی تھا اور مجھے وہاں سترہ منٹ تک ڈاکٹر کا انتظار کرنا پڑا۔ میں سوچ رہی تھی کہ ڈاکٹرز کو تو وقت کا پابند ہونا چاہیے۔ انتظار کی کوفت میں مبتلا ہونے سے بہتر تھا کہ میں یہ سترہ منٹ بھی گرف کے ساتھ ہی گزار دیتی۔ اس سے پہلے کہ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا، مجھے دروازے میں ایک کے بجائے دو افراد کھڑے نظر آئے۔ ان دونوں کی عمر تیس کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ لمبے قد اور دبلی جسامت کے تھے۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر فرینک تھا۔ گو کہ اس نے سفید کوٹ کے بجائے سوٹ پہن رکھا تھا لیکن گلے میں لٹکے ہوئے اسٹیتھوا سکوپ سے میں سمجھ گئی کہ یہی ڈاکٹر فرینک ہے جبکہ دوسرے شخص نے یونیفارم نما سوٹ پہن رکھا تھا۔

''مس لینا ٹونیڈا!'' دونوں نے بیک وقت بولنا شروع کیا پھر اچانک رک گئے۔ میری طرف دیکھتے ہوئے ایک نے اپنے اسٹیتھوا سکوپ اور دوسرے نے اپنے آئی ڈی کارڈ کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا تعلق پولیس سے تھا۔

مجھے لگا کہ ڈاکٹر وہی بات کہنے والا ہے جو میں سننے کے لیے تیار نہ تھی، لہٰذا میں پہل کرتے ہوئے بولی۔ ''اس سے پہلے کہ تم کچھ کہو، میں یہ بتا دینا چاہتی ہوں کہ میں تمہیں مشین بند کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔'' پھر پولیس والے کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ''تم گواہ رہنا کہ میں نے تمہاری موجودگی میں یہ بات کہی ہے۔''

''تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ ہم مشین ہٹانا چاہ رہے ہیں؟'' ڈاکٹر فرینک حیران ہوتے ہوئے بولا۔

''تاکہ اس کے اعضا نکال سکو۔'' یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ اصولی طور پر میں اس کے خلاف نہیں ہوں، میں نے اپنا عطیہ کارڈ جیب سے نکال کر لہرایا۔

ڈاکٹر فرینک ناگواری سے بولا۔ ''ہمارے لیے اس بوڑھے شخص کے اعضا بیکار ہیں اور ویسے بھی ہم اس مقصد کے لیے مریض کے مرنے کا انتظار نہیں کرتے ہیں۔ میں نے تمہیں اس موضوع پر گفتگو کرنے کے لیے نہیں بلایا بلکہ تم سے صرف یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ مریض کو گھر لے جاؤ۔''

مجھے یقین نہیں آیا کہ ایک ڈاکٹر بھی ایسی بات کہہ سکتا ہے۔ میں حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میرا مطلب ہے، کسی ایسی جگہ جہاں اس کی مناسب دیکھ بھال ہو سکے اور ضرورت پڑنے پر بھی امداد بھی مل جائے۔''

''تمہارا اشارہ نرسنگ ہوم کی جانب ہے۔'' میں نے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں سوچ میں پڑ گئی۔ اصل مسئلہ نرسنگ ہوم کے اخراجات کا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں ان لوگوں کے نام دُہرائے جن سے مدد کی توقع کی جا سکتی تھی۔ انہی میں ایک نام گرف کے دوست ایڈن کا بھی تھا۔ مجھے اس کے مالی حالات کا تو اندازہ نہیں تھا لیکن اتنا ضرور جانتی تھی کہ وہ چند روز کے لیے نرسنگ ہوم کے اخراجات برداشت کر سکتا ہے۔

''تمہیں وارڈ کلرک سے وہاں کے اخراجات کی تفصیل معلوم ہو جائے گی اور وہ اس سلسلے میں تمام انتظامات کر سکتی ہے۔''

شاید وہ کچھ اور کہتا لیکن اس کا موبائل بجنے لگا۔ اس نے ایک نظر موبائل پر آنے والے میسج پر ڈالی اور وہاں سے چل دیا۔ اس کے جانے کے بعد پولیس والا میری جانب متوجہ ہوا۔ وہ سراغ رساں سارجنٹ ول بارنس تھا۔

''میں سمجھتا ہوں مسٹر.....؟''

''اس کا نام ٹرپ ہے لیکن ہم سب اسے گرف کے نام سے ہی پکارتے ہیں۔''

''ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق اس پر حملہ ہوا۔ بُری طرح تشدد کیا گیا اور اس کے بعد اسے وین سے باہر پھینک دیا گیا۔ ہم جاننا چاہتے ہیں کہ اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟''



''کیا تم نے یہ بات اس سے پوچھی تھی؟''

''اس کا کہنا ہے کہ وہ پرانی اشیا خریدنے کسی کے گھر جا رہا تھا۔''

میں نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، وہ فورے ٹاورز جا رہا ہوگا جہاں کسی عورت کے پاس قدیم وکٹورین طرز کے فرنیچر کا ڈھیر لگا ہوا ہے اور اب اس کے متعلقین وہاں کی ہر چیز بیچ رہے ہیں۔''

''تم ساتھ نہیں گئی تھیں؟'' اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''ظاہر ہے کہ نہیں۔'' میں نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔ ''میں سارا دن اپنی شاپ پر ہی رہی۔ مجھے ایک گاہک کا آرڈر پورا کرنا تھا، ورنہ کبھی اسے اکیلا نہیں جانے دیتی۔ لیکن تم یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں نے گرف کو اس بُری طرح مارا ہوگا؟ میں تو اس کے لیے اپنی جان دے سکتی ہوں۔''

اس نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''ہماری اطلاع کے مطابق.....''

''میں مجرمانہ ریکارڈ رکھتی ہوں۔'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے تلخی سے کہا۔ ''پھر تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ یہ کتنی پرانی بات ہے اور مجھے ایک اچھی زندگی گزارتے ہوئے کتنا عرصہ ہو چکا ہے۔ میں گزشتہ چھ سال سے گرف کے اچھے اور بُرے وقت میں اس کے ساتھ ہوں۔ وہ مجھ سے اتنی محبت کرتا ہے کہ اگر قانونی طور پر ممکن ہوتا تو اب تک مجھے اپنی منہ بولی بیٹی بنا چکا ہوتا۔ وہ میرے سگے باپ سے بڑھ کر مشفق و مہربان ہے۔ میں ایسے شخص کو کیوں نقصان پہنچانا چاہوں گی جس سے دنیا میں سب سے زیادہ محبت کرتی ہوں؟''

یہ کہتے ہوئے میری آواز بھرا گئی اور میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا اور میز پر رکھے ہوئے ٹشو باکس سے ایک ٹشو پیپر نکال کر آنکھیں صاف کرنے لگی۔

''کیا اس کے کچھ دشمن ہیں؟'' اس بار بارنس کا لہجہ قدرے نرم تھا۔ ''کیا تمہارے علم میں کوئی ایسی وجہ ہے جس کی بنا پر کوئی شخص اس پر حملہ آور ہو سکتا ہے؟''

''میں ایسے کسی دشمن کو نہیں جانتی۔ ویسے بھی کسی قیمتی چیز کو لوٹنے کے لیے دشمنی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ کام کوئی بھی راہ زن یا ڈاکو کر سکتا ہے۔ وہ کوئی ایسا شخص بھی ہو سکتا ہے جسے گرف کی خریدی ہوئی چیز کو حاصل کرنے میں دلچسپی ہو..... اور اگر گرف یہ بتانے کے قابل نہیں کہ وہ کون سی نایاب و نادر شے خرید کر لا رہا تھا تو اس کے بارے میں نیلام کرنے والوں سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے تو ٹیلی فون پر اطلاع ملی کہ وہ یہاں ہے تو میں سیدھی دوڑی چلی آئی۔ اگر تمہیں مزید کچھ نہیں پوچھنا تو میں اس کے پاس جا رہی ہوں۔''

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا، بس سینے پر دونوں ہاتھ باندھے مجھے دیکھتا رہا۔

''اگر وہ جاگ گیا تو میں اس سے معلوم کرنے کی کوشش کروں گی کہ اس نے نیلام میں کیا چیز خریدی تھی ورنہ پھر تمہیں نیلام کرنے والوں سے پوچھنا ہوگا۔'' میں نے ہاتھ پر بندھی ہوئی گھڑی پر نگاہ ڈالی، رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ میں نے بے اختیار کہا۔ ''اوہو، بہت دیر ہو گئی۔''

''کیا میں تمہیں گھر تک لفٹ دے سکتا ہوں؟''

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ مجھے گرف کے بستر کے ساتھ فرش پر سونا گوارا تھا لیکن اسے اس حال میں چھوڑ کر گھر نہیں جا سکتی تھی۔

☆☆☆

ہر ضرورت مند اپنے دلی مقاصد میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے

خدانخواستہ اگر آپ بھی تنگی ☆ مشکلات اور پریشانیوں کی زندگی بسر کر رہے ہیں ☆ ممکن ہے آپ کی الجھنوں میں کسی دشمن کا خفیہ ہاتھ کام کر رہا ہو ☆ بالوجہ حسد و بغض آپ کے دنیاوی امور میں رکاوٹ ڈال کر ناکامیوں کو آپ کا مقدر بنانا چاہتا ہو ☆ مثلاً کاروبار میں نقصان/ شادی میں رکاوٹ ☆ گھریلو لڑائی جھگڑے، رشتوں میں رکاوٹ ☆ دوستی ☆ محبت میں ناکامی ☆ نافرمان اولاد اور ازدواجی زندگی کے کامیاب حل کے لیے ابھی فون کریں contact : faith healer

ماہر عملیات و تعویزات این اے جوہری

0300-2222567

دوسری صبح گرف کی حالت میں نمایاں بہتری دکھائی دی۔ میرا خیال ہے کہ اسے یہ جان کر خاصا سکون محسوس ہوا ہوگا کہ میرے فون کرنے پر اس کے دوست ایڈن نے اس کے لیے نرسنگ ہوم میں ٹھہرنے کا انتظام کر دیا تھا جہاں اسے ایک پرائیویٹ ایمبولینس کے ذریعے پہنچایا جاتا۔ البتہ اسے میرے بارے میں تشویش لاحق ہوگئی تھی۔

''تمہارے لیے یہ کافی طویل فاصلہ ہوگا۔'' گرف نے فکرمندی سے کہا۔ ''یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ مجھے تمہارا رات میں گاڑی چلانا پسند نہیں۔''

''تم میری فکر مت کرو۔ اگر ضروری ہوا تو میں ایڈن سے کہہ کر تمہارے پاس ہی رات کو ٹھہر جایا کروں گی۔''

وہ حیرت کے عالم میں مجھے دیکھنے لگا۔ شاید اسے مجھ سے اتنی زیادہ قربانی کی توقع نہ تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید جذباتی ہوتا، میں نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔

''اگر تم پولیس کو یہ بتا دو کہ کل کی نیلامی میں تم نے کیا چیز خریدی تھی تو شاید وہ کسی نتیجے پر پہنچنے میں کامیاب ہو سکیں۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ کسی نے وہ چیز چھیننے کی خاطر تم پر حملہ کیا ہوگا۔''

''تم جانتی ہو کہ مسز ڈیون کافی عرصے سے ایک گیم ٹیبل کی فراہمی کر رہی تھیں جو ان کے یہاں سے چوری ہوگئی تھی۔ مجھے ایسی ہی ایک میز بہت سستے داموں مل گئی۔ یہ ایک قدیم وکٹورین طرز کی میز تھی جس میں کئی درازیں اور خفیہ خانے موجود تھے اور دیکھنے میں مسز ڈیون کی اصلی میز جیسی لگ رہی تھی۔ اگر وہ فون کرے تو اسے بتا دینا کہ میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی تھی۔ کیٹلاگ میں اس کی تصویر بھی ہے جو گاڑی کے گلوو باکس میں رکھی ہے۔''

''تمہیں کچھ یاد ہے کہ یہ میز کب اور کس طرح چوری ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے اپنا سر کھجاتے ہوئے کہا۔ ''بس اتنا یاد ہے کہ میرے موبائل فون کی گھنٹی بجی تو میں نے جواب دینے کے لیے فون جیب سے باہر نکالا۔''

یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوگیا۔ شاید ڈر رہا تھا کہ میں کہیں کوئی سخت ردِعمل ظاہر نہ کروں کیونکہ میں ہمیشہ اسے گاڑی چلانے کے دوران موبائل فون استعمال کرنے پر منع کیا کرتی تھی۔

''پھر کسی نے ڈرائیور کی طرف کا دروازہ کھولا اور مجھ پر حملہ کر دیا۔''

. . . . . .

''انہیں تمہارا فون نمبر کیسے معلوم ہوا؟''

''کیونکہ وہ نمبر میری وین کی سائڈ پر لکھا ہوا ہے۔''

پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا اور بولا۔ ''لیتا! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ چوٹ تمہارے نہیں بلکہ میرے سر میں لگی ہے۔''

کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان شخص وہیل چیئر گھسیٹتا ہوا اندر آ گیا۔ اسے دیکھ کر گرف نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ''چلو، میری سواری بھی آ گئی۔''

اس کے پیچھے پیچھے ایڈن بھی آ گیا اور پورٹر کے ساتھ مل کر گرف کو وہیل چیئر پر بٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے بھی ایمبولینس میں گرف کے ساتھ ہی جانا تھا جبکہ میں اپنی کار میں ان کے پیچھے پیچھے جاتی۔

جب میں نے بارنس کو بتایا کہ گرف اسپتال سے چلا گیا ہے تو اس کا منہ بن گیا۔ اسی طرح وہ یہ یقین کرنے کے لیے بھی تیار نہیں تھا کہ محض ایک میز چرانے کی خاطر کوئی شخص گرف پر جان لیوا حملہ کر سکتا ہے۔

''ایک بوڑھے شخص کو صرف اس لیے مارنے کی کوشش کرنا کہ اس نے ایک میز خریدی تھی، میری سمجھ سے باہر ہے۔'' وہ منمناتے ہوئے بولا۔ ''تم مذاق کر رہی ہو۔ کیا وہ میز سونے چاندی سے بنی ہوئی تھی؟''

''مجھے لگتا ہے کہ وہ انتہائی قیمتی لکڑی سے بنی ہوئی میز ہوگی۔ کیٹلاگ میں اس کی تصویر ہے اور گرف کے کہنے کے مطابق اسے وین کے گلوو باکس میں ہونا چاہیے۔''

''وہ گاڑی ہمارے کسی کار پارکنگ میں موجود ہوگی۔ اگر تم میرے ساتھ چلتیں تو اس بارے میں زیادہ بتا سکتی تھیں۔''

مجھے اس کے مسکرانے کا انداز اچھا لگا لیکن میں نے یہ اصول بنا رکھا تھا کہ جب تک گرف کی رائے معلوم نہ ہو جائے، اس وقت تک کسی پر بھروسا نہ کرو۔ میں نے اس سے کہا کہ ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں بشرطیکہ وہ کسی پولیس والے کو فون کر کے یہ معلوم کرے کہ گرف بحفاظت نرسنگ ہوم پہنچ گیا یا نہیں۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا اور بولا۔ ''کیا تمہیں اب بھی ڈر ہے کہ وہ اس پر دوسری بار حملہ کر سکتے ہیں؟ ٹھیک ہے، میں معلوم کر لیتا ہوں۔''

☆☆☆

گرف کی وین اجاطے کے ایک کونے میں سب سے الگ تھلگ کھڑی ہوئی تھی۔ بارنس نے ہاتھوں پر دستانے



چڑھائے اور کیٹلاگ دیکھنے کے لیے وین کے اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گاڑی سے برآمد ہوا اور مجھے اشارے سے اپنے پاس بلاتے ہوئے بولا۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ کیٹلاگ گاڑی میں ہی ہے؟''

''یہ بات مجھ سے گرف نے بتائی تھی لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس کی عمر ستّر سال سے زیادہ ہو چکی ہے اور اس کے سر پر چوٹیں بھی آئی ہیں، لہٰذا اس سے غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ بہرحال، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم یہ کیٹلاگ نیلام کرنے والے کے پاس بھی دیکھ سکتے ہو۔''

''اگر میں ان سے اس کی ایک نقل لے کر تمہاری دکان پر آ جاؤں تو کیا تم مجھے اس میز کے بارے میں مزید کچھ بتا سکو گی؟''

☆☆☆

میرے پاس کچھ وقت تھا لہٰذا میں نے دوسرے ڈیلرز کو پیغامات اور ای میل بھیجنا شروع کر دیے۔ میں جاننا چاہ رہی تھی کہ کبھی ان کے ساتھ بھی گرف جیسا واقعہ پیش آیا۔ یقیناً پولیس بھی ان معلومات کو حاصل کرنے کے لیے اپنا ریکارڈ چیک کر رہی ہوگی لیکن میرا خیال تھا کہ کبھی کبھی اس طرح کی وارداتوں کی رپورٹ پولیس میں درج نہیں کروائی جاتی اور اس حوالے سے دیکھا جائے تو پولیس کا ریکارڈ بھی مکمل نہیں کہلایا جا سکتا۔

میں نے اسکول میں بہت کم وقت گزارا تھا اس لیے گرف کی بہترین کوششوں کے باوجود میری لکھنے کی صلاحیت میں بہتری نہ آ سکی لیکن اس نے مجھے کمپیوٹر کا استعمال سکھا دیا تھا اور میری انگلیاں تیزی سے کی بورڈ پر چل سکتی تھیں، لہٰذا مجھے بارنس کے لیے مطلوبہ فہرست ٹائپ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ میں نے اس میں وہ تمام کالم بنا دیے تھے جو اس طرح کی فہرستوں میں ضروری ہوتے ہیں۔ مثلاً چوری ہونے والی شے کی تفصیل، کب چوری ہوئی، کہاں سے چرائی گئی، مالیت اور پولیس کی کارروائی وغیرہ وغیرہ۔ مجھے شبہ تھا کہ بیس میں سے آدھی چوریوں کی رپورٹ پولیس میں درج نہیں کروائی گئی تھی اور ان میں سے کوئی بھی چیز بازیاب نہیں ہو سکی تھی اور نہ ہی وہ چیزیں برطانیہ کے کسی نیلام گھر یا نوادرات کے میلے میں رکھی گئی تھیں۔

میں شام کو اپنا کام ختم ہی کر رہی تھی کہ بارنس آ گیا۔ اس نے گزشتہ روز کے مقابلے میں قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے میرے حلیے اور حالت پر ایک نظر ڈالی اور بولا۔

''میرا خیال تھا کہ تمہیں ساتھ لے کر گرف کو دیکھنے جاتا۔ ہمیں کچھ باتیں کرنی ہیں۔ واپسی پر میں تمہیں گھر چھوڑ دوں گا اور اگر مناسب سمجھو تو ہم کسی اچھی جگہ بیٹھ کر کھانا بھی کھا سکتے ہیں۔''

''اگر گرف نے مجھے اس حلیے میں دیکھ لیا تو دوبارہ بیمار پڑ جائے گا۔ کیا تم مجھے تیار ہونے کے لیے پانچ منٹ دے سکتے ہو؟''

''تم ایک گھنٹا بھی لے سکتی ہو۔ تب تک میں یہاں کا جائزہ لیتا ہوں۔ مجھے تو یہ جگہ بالکل میوزیم کی طرح نظر آ رہی ہے۔''

گرف کی مرضی کے بغیر میں اس کی اجازت نہیں دے سکتی تھی لہٰذا اسے ٹالنے کے لیے کہا۔ ''یہاں سردی بہت ہے۔ تم گھر کے اندر آ جاؤ۔ وہاں بھی تمہارے دیکھنے کے لیے بہت کچھ ہے۔''

گھر کے اندر وہ اشیا رکھی ہوئی تھیں جو کسی وجہ سے دکان میں فروخت کے قابل نہ تھیں اس لیے اسے اندر بلانے میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ویسے گھر میں بھی خفیہ کیمرا لگا ہوا تھا اور اگر وہ کوئی چیز چرانے کی کوشش کرتا تو فوراً ہی پکڑ میں آ جاتا۔ مجھے لباس تبدیل کرنے میں پانچ کی جگہ آٹھ منٹ لگ گئے اور جب میں بالوں کو برش کرنے کے بعد باہر آئی تو وہ ایک آئل پینٹنگ پر نظریں جمائے کھڑا ہوا تھا۔

☆☆☆

ہمیں نرسنگ ہوم تک پہنچنے میں چالیس منٹ لگ گئے۔ وہ جگہ ایک شان دار ہوٹل کی طرح نظر آ رہی تھی اور ایسے نرسنگ ہوم سے بالکل مختلف نظر آ رہی تھی جہاں زندگی کے آخری ایام گزارنے کے خیال سے گرف ہمیشہ خوف زدہ رہا کرتا تھا۔ گرف کے کمرے میں بستر کے علاوہ دو کرسیاں اور ایک ٹی وی بھی رکھا ہوا تھا۔ کمرے کی عمومی سجاوٹ ایسی ہی تھی جیسی کہ دوسرے اسپتالوں میں ہوتی ہے البتہ دیواروں کا رنگ اسپتال کے ماحول سے قدرے مختلف تھا۔

ایڈن اس کے پاس بیٹھا بہ آوازِ بلند کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھ کر پڑھنا بند کر دیا اور کتاب بند کر دی۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ گو کہ یہ عمل غیر اختیاری اور فطری تھا لیکن مجھے شبہ ہوا کہ ول بارنس نے اس کا سنجیدگی سے نوٹس لیا تھا۔

بارنس نے پہلے ایڈن اور پھر گرف سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے زخم تیزی سے بھر

رہے ہیں۔"

"میں تو ان زخموں کا عادی ہو چکا ہوں۔" گرف نے مسکراتے ہوئے کہا پھر اپنا چہرہ چھوتے ہوئے بولا۔ "میں نے ابھی تک اپنا چہرہ نہیں دیکھا ہے۔ ایک لڑکا میرا شیو بنانے آیا تھا اور بونس کے طور پر بال بھی کاٹ کر چلا گیا۔"

بارنس نے کیٹلاگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "کیا تم اس میز کی تصویر کی نشان دہی کر سکتے ہو؟"

"تم دیکھ رہے ہو کہ ناک کے زخم کی وجہ سے میں چشمہ نہیں لگا سکتا۔ اسی لیے ایڈن مجھے کتاب پڑھ کر سنا رہا تھا۔"

میں نے اپنے پرس میں سے اوپیرا گلاس نکالے اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "ممکن ہے کہ ان کا نمبر کچھ مختلف ہو لیکن فی الحال کام چل جائے گا۔"

"واقعی تم کمال کی لڑکی ہو۔" گرف نے وہ گلاس آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا پھر اس نے کیٹلاگ کھولی اور ایک صفحے پر انگلی رکھتے ہوئے پُرجوش انداز میں بولا۔ "یہی وہ میز ہے جو میں نے نیلام سے خریدی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میز میں ایسی کیا خاص بات ہے جس کے لیے انہوں نے مجھ پر حملہ کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔"

"صرف یہی نہیں بلکہ گزشتہ بارہ مہینوں میں اس طرح کی بیس سے زیادہ میزیں چرائی جا چکی ہیں۔" بارنس نے کہا۔ "کم از کم لینا کی ریسرچ تو یہی بتاتی ہے۔"

گرف گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا ہمارے دوستوں کو معلوم ہے کہ پولیس کے پاس ان چوری شدہ میزوں کی فہرست پہنچ چکی ہے؟"

بارنس نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "فی الحال ہم متاثرین کے بجائے چوروں کو پکڑنے میں دلچسپی رکھتے ہیں اور میں نے لینا سے وعدہ کیا ہے کہ صرف انہی لوگوں سے رابطہ کروں گا جنہوں نے پہلے سے چوری کی رپورٹ پولیس میں درج کروائی ہوگی۔"

"بہت اچھے، مجھے امید ہے کہ تم اپنے وعدے کا پاس کرو گے۔"

"بالکل۔" بارنس نے کیٹلاگ میں لگی ہوئی تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "اس طرح کی میزیں عام طور پر جوئے خانوں یا کلب وغیرہ میں استعمال ہوتی ہیں۔"

"ضروری نہیں۔ بہت سے لوگ گھریلو آرائش کے لیے بھی ان قدیم طرز کی میزوں کا انتخاب کرتے ہیں۔"

بارنس منہ بناتے ہوئے بولا۔ "میری نظر میں تو یہ ایک عام سی میز ہے جس کے اوپر شطرنج کے خانے بنے ہوئے ہیں۔ کیا اس کے علاوہ بھی اس میں کوئی خاص بات ہے جو مجھے نظر نہیں آ رہی؟"

"دیکھنے میں یہ عام سی میز ہے لیکن بعض اوقات ان میں خریداروں کی خواہش کے مطابق تبدیلیاں کی جاتی ہیں، مثلاً کچھ میزوں میں اوپری حصے کو گھمایا جا سکتا ہے تو اس کے نیچے ایک اور سطح نمودار ہوتی ہے۔ اسی طرح کچھ میزوں میں خفیہ خانے اور درازیں بنی ہوتی ہیں جن میں یہ آسانی چیزوں کو چھپایا جا سکتا ہے۔ اس طرح کی میزیں نسبتاً قیمتی ہوتی ہیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان میزوں کو ناجائز کاموں کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے اور ان میں کوئی ممنوعہ شے چھپا کر لے جائی جا رہی ہے۔"

"لگتا ہے کہ وہ چیزیں ملک سے باہر لے جائی جا رہی ہیں۔ دیکھنے والی بات یہ ہے کہ یہ سب میزیں ان علاقوں سے چوری کی گئیں جو سرحد سے قریب ہیں اور ان کے ذریعے کوئی بھی چیز گھنٹوں میں ملک سے باہر لے جائی جا سکتی ہے۔"

"لیکن وہ کیا چیز ہو سکتی ہے جسے وہ ملک سے باہر لے جانا چاہتے ہیں؟" بارنس نے سوچتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

"میری سمجھ میں تو ایک ہی بات آ رہی ہے۔" میں نے نرسنگ ہوم سے باہر نکلتے ہوئے بارنس سے کہا۔ "اور وہ یہ کہ اب اس طرح کی کوئی میز فروخت ہو تو ہم بھی اس کا تعاقب کریں تاکہ پتا چل سکے کہ کون لوگ اس کام میں ملوث ہیں۔"

"تعاقب کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ "یہ کام تو ہم کسی آلے کی مدد سے بھی کر سکتے ہیں لیکن یہ کس طرح معلوم ہوگا کہ مستقبل قریب میں ایسی کوئی میز فروخت ہونے والی ہے؟"

"ضروری نہیں کہ اس کے لیے کسی اصلی میز کی فروخت کا ہی انتظام کیا جائے۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟" اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے کہا۔

"میں ایسے ڈیلرز کو جانتی ہوں جو نقلی مال بھی فروخت کرتے ہیں۔ ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کیونکہ ہمیں تو بس کے ذریعے چوروں تک پہنچنا ہے۔"



"مجھے تمہاری منطق سمجھ میں نہیں آ رہی۔" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ "لیکن میں ہرگز نہیں چاہوں گا کہ تم براہِ راست اس کام میں ملوث ہو جاؤ۔ اس کے لیے ہم اپنے کسی آفیسر کو بھی استعمال کر سکتے ہیں۔"

"اس فیلڈ میں سب لوگ ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اگر تم نے کسی پولیس آفیسر کو بیچ میں ڈالا تو وہ لوگ ہوشیار ہو جائیں گے اور اس طرح ہمارا منصوبہ ناکام ہو جائے گا۔"

"میز کی خریداری تم ہی کرو گی لیکن دین میں تمہاری جگہ سادہ کپڑوں میں ایک لیڈی پولیس آفیسر ہوگی جو دیکھنے میں تم جیسی لگتی ہو۔ فائن آرٹ کی چوری کا سراغ لگانے میں بہت سے لوگ دلچسپی رکھتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی ضرور اس مہم میں شامل ہونا چاہے گا۔"

میں نے اپنی ناک سکیڑی اور بولی۔ "ہم ان میزوں کو نوادرات میں شامل نہیں کر سکتے اور میں سمجھتی ہوں کہ چوروں کو بھی ان کی قدر و قیمت سے کوئی دلچسپی نہیں ہوگی۔"

"تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟"

"میں کچھ نہیں جانتی۔ شاید اس طرح ہم چوروں تک پہنچ سکیں۔"

☆☆☆

ڈیرک اسمتھ پرانے فرنیچر کو نیا بنا کر بیچتا تھا۔ وہ ایسی قدیم میزیں تلاش کرتا جن کا اوپری حصہ درست حالت میں ہو اور صرف پائے خراب ہو گئے ہوں۔ پھر وہ اسی لکڑی کے پائے تلاش کر کے ان میں جوڑ دیتا اور اگر کبھی ان کے ملنے میں دشواری ہوتی تو وہ خود ہی اصل کے مطابق لکڑی پائے تلاش کر لیتا۔ ہماری اس سے ملاقات شہر سے باہر ایک سرائے میں ہوئی۔ اس کا مطالبہ تھا کہ میز کی قیمت دس اور پانچ کے استعمال شدہ نوٹوں کی صورت میں نقد ادا کی جائے اور وہ اس رقم کی کوئی رسید بھی نہیں دے گا۔ تاہم میں نے اس سے کہا کہ وہ مجھے ایک کاغذ پر کچی رسید دے دے تاکہ بوقتِ ضرورت پولیس کو دکھا سکوں۔

"تمہیں یہ میز کب چاہیے؟" اس نے پوچھا۔

"کیٹر بری میں ہونے والی اگلی فرنیچر سیل کے موقع پر۔" میرا خیال تھا کہ وہ کچھ پس و پیش سے کام لے گا۔ شاید اتنی جلدی یہ میز فراہم کرنا اس کے لیے ممکن نہ ہو لیکن وہ کچھ نہ بولا۔ تب میں نے کہا۔ "میں چاہوں گی کہ اس میں زیادہ سے زیادہ درازیں اور خفیہ خانے ہوں۔ تم جانتے ہو میرا کام کس نوعیت کا ہے۔"

☆☆☆

ایک ہفتے بعد بارنس میرے پاس ایک نئی خبر لے کر آیا۔ "ہمارے پاس دو لکھنے کی میزوں کی گمشدگی کی رپورٹ درج ہوئی ہے۔ کیا اس کا کوئی تعلق اس کیس سے بنتا ہے؟"

"وہ میزیں کتنی پرانی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ان میں سے ایک سترھویں صدی عیسوی کی اطالوی میز ہے۔"

"اوہ، یہ تو بہت ہی قیمتی اور نایاب میز ہوگی۔" میں نے دماغ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "ان سب میزوں میں ایک بات مشترک لگتی ہے اور وہ یہ کہ ان میں بھی خفیہ درازیں ہوں گی جو کسی کی نظر میں نہ آ سکیں۔ کیا اس طرح کی کوئی اور میز بھی گزشتہ چند ہفتوں میں غائب ہوئی ہے؟"

Monthly Digest
SUSPENSE
سسپنس
SARGUZASHT
سرگزشت
PAKEEZA
پاکیزہ
JASOOSI
جاسوسی
مکتبہ اعلا و سہلا
Sole Distributor
ویلکم بک شاپ
WELCOME BOOK SHOP
P.O.Box 27869
Karama,Dubai
Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015
Mobile: 050-6245817
E-mail: welbook@emirates.net.ae
JD Group of Publications

''مجھے معلوم کرنا ہوگا۔'' اس نے نوٹ بک میں کچھ لکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری میز کا کیا بنا؟''

''اگلے ہفتے تک تیار ہوجائے گی۔''

میں نے اس سے پہلے کوئی کام گرف کو بتائے بغیر نہیں کیا تھا۔ ویسے بھی اگلے ہفتے وہ واپس آجاتا تو اسے اس معاملے کی خبر ضرور ہوجاتی چنانچہ جب میں اس سے ملنے گئی تو میں نے اسے پوری بات بتا دی۔ ایڈن اس وقت کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔

''کہیں اس پر تمہارا دل تو نہیں آگیا؟'' گرف اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

میں بوکھلاہٹ میں اپنے لباس کی شکنیں درست کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ اتنا آسان نہیں۔ شاید تم اسے پسند نہ کرو۔''

ایڈن کو آتا دیکھ کر گرف نے سرگوشی کی۔ ''پہلے اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔''

☆☆☆

اسمتھ نے اپنا کام بڑی ہوشیاری سے کیا تھا۔ میں جب وہ میز لینے اس کی شاپ پر گئی تو دو بار اس پر نظر ڈالنے کے باوجود اس میں کوئی خامی تلاش نہ کرسکی۔ اب مجھے اس میز کو ایک پسماندہ علاقے میں ایک پستہ قد شخص تک پہنچانا تھا۔ میں نے سب کی آنکھ بچا کر اس میز کی خفیہ دراز میں ایک آلہ رکھ دیا اور اس پر ایک الوداعی نظر ڈالی۔ اب میں اس بارے میں کچھ نہیں سوچنا چاہتی تھی لیکن میرے ذہن میں کچھ اور سوال بھی ابھر رہے تھے۔ اس دھندے میں اسمتھ ہی اکیلا نہیں تھا۔ اس سے بھی زیادہ ماہر لوگ ہوں گے جو کوہِ نور ہیرے تک کی نقل تیار کرسکتے ہیں۔ میں ان تک پہنچنے کی ہمت نہیں کرسکتی تھی کیونکہ مجھے ان کے ٹھکانوں کا علم نہیں تھا لیکن مجھے یہ معلوم ہوگیا تھا کہ بروس نام اس حوالے سے خاصا سرگرم ہے۔ اسی طرح یہ اطلاع بھی ملی تھی کہ شمال کے علاقے میں ایسی میزوں کا ذخیرہ جمع ہورہا ہے۔ میں نے یہ دونوں باتیں بارنس کو بتا دیں جس نے انہیں اپنی عادت کے مطابق نوٹ بک میں درج کرلیا۔

☆☆☆

ہمارے منصوبے میں یہ کہیں شامل نہیں تھا کہ مجھے رسّیوں سے باندھ کر وین میں ڈال دیا جائے گا لیکن مجھے کافی دیر تک اس حالت میں سفر کرنا پڑا۔ پروگرام کے مطابق میں جیسے ہی میز کی خریداری کے بعد دکان سے باہر آئی تو میری جگہ مجھ جیسی عورت کو وین میں سوار کروا دیا جاتا لیکن انہوں نے اس مقصد کے لیے جس پولیس آفیسر کو بھیجا، اس کا قد پانچ فٹ گیارہ انچ تھا اور وہ برطانیہ کی طرف سے رگبی کھیل چکی تھی۔ وہ عورت کسی طرح بھی اس مقصد کے لیے سودمند نہیں تھی۔ لہٰذا مجھے ہی قربانی کا بکرا بننا پڑا۔ میں نے میز کو وین کے پچھلے حصے میں رکھوایا اور گاڑی لے کر چل دی۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد مجھے اسی نمبر پر فون کال موصول ہوئی جو وین کے باہر پینٹ کیا گیا تھا۔

اب تک سب کچھ کم و بیش منصوبے کے مطابق ہی چل رہا تھا۔ فرق صرف یہ ہوا کہ جب میں نے فون سننے کے لیے گاڑی کی رفتار کم کی اور کچھ لوگ میری وین میں داخل ہوگئے تو انہوں نے مجھ پر حملہ نہیں کیا اور نہ ہی مرنے کے لیے وین میں چھوڑا بلکہ میز کے ساتھ ساتھ انہوں نے مجھے بھی اٹھایا اور اپنی وین کے پچھلے حصے میں ڈال دیا۔ وین کے اندر تاریکی چھائی ہوئی تھی اور روشنی کی ایک پتلی سی لکیر دروازے کی درز سے اندر داخل ہورہی تھی۔ اگر وہ دروازہ مناسب طریقے سے بند ہوتا تو شاید میں اس روشنی سے بھی محروم رہ جاتی۔

مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وہ لوگ مجھے کہاں لے جارہے تھے اور نہ ہی میں ان سے اس بارے میں کچھ پوچھ سکتی تھی کیونکہ انہوں نے میرے ہاتھ باندھنے کے ساتھ ساتھ منہ پر بھی ٹیپ چپکا دیا تھا اور ان میں سے ایک نے میرا موبائل فون بھی ہتھیا لیا تھا۔ اب وہ میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی کیونکہ انہیں میری نہیں بلکہ میز کی ضرورت تھی۔ اگر انہوں نے مجھے جان سے مارنے کا فیصلہ کرلیا تو..... اس خیال سے ہی مجھے جھرجھری سی آگئی۔ کیا یہ لوگ مجھے قتل کرکے کسی ویرانے میں پھینک دیں گے؟ کیا گرف کو میری لاش پر آنسو بہانے اور اسے دفنانے کا موقع بھی نہیں ملے گا؟ میں رونا چاہ رہی تھی لیکن اس کی نوبت ہی نہ آسکی کیونکہ مجھے لگا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔

وین کی رفتار کم ہورہی تھی اور اس کا رخ سویٹیوں کے باڑے کی جانب تھا۔ وہ پتھریلے راستے پر کچھ دور چل کر رک گئی۔ وین کے عقبی حصے کی جانب قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں اسی طرح بے سدھ پڑی رہی۔ مجھے اس طرح کی آوازیں آئیں جیسے میز کو باہر نکالا جارہا ہو۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ پھر بند ہوگیا۔

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے اطمینان ہوگیا

کہ بارنس اور اس کے ساتھی ضرور جان جائیں گے کہ میں اس وقت کہاں ہوں۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اب مجھے بھی جلد از جلد خود کو آزاد کروانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

کیا مجھے ایسی کوئی کوشش کرنی چاہیے؟ مگر نہیں..... کیونکہ ایک بار پھر قدموں کی آوازیں وین کی طرف بڑھتی سنائی دے رہی تھیں۔ شاید وہ لوگ میز رکھ کر واپس آرہے تھے۔ لہٰذا میں دوبارہ بے حس و حرکت ہوگئی۔ یہاں تک کہ میں نے اس وقت بھی کوئی احتجاج نہیں کیا جب ان میں سے ایک نے یہ جاننے کے لیے میری پشت پر لات جمائی کہ کہیں میں ہوش میں تو نہیں آگئی۔

لیکن جیسے ہی وین اسٹارٹ ہوئی، میرے ہاتھ اور پھر میرے پیر آزاد ہوگئے۔ میں نے اپنے منہ سے ٹیپ ہٹانے کی کوشش نہیں کی کیونکہ اس کے لیے میرے پاس وقت نہیں تھا بلکہ میں جلد از جلد اس میز کو چیک کرنا چاہتی تھی۔ اگر مجھے یہ علم نہ ہوتا کہ میز کے پوشیدہ حصوں کو کس طرح کھولا جاتا ہے تو شاید میں یہ کام بھی نہ کر پاتی اور اس کے لیے مجھے اسمتھ کی خدمات حاصل کرنا پڑتیں۔ میں نے مٹر کے دانے کے برابر ایک آلہ اس خفیہ خانے میں رکھ دیا تھا۔ اسی طرح کا ایک اور آلہ چمڑے کے خول میں لپٹا ہوا میرے زیریں لباس میں موجود تھا۔ اس طرح میں جہاں بھی ہوتی، اس آلے کی مدد سے میرا سراغ مل جاتا۔

مجھے احساس ہوا کہ اب میں اندر کی طرف سے وین کا دروازہ کھول سکتی ہوں۔ اس طرح میں وین کے رکتے ہی باہر آسکتی تھی۔ خدا خدا کر کے گاڑی ایک جگہ رکی اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب باہر نکلنے کا وقت آگیا ہے۔ میں نے دروازے کا ہینڈل گھمایا اور پوری قوت سے اسے باہر کی جانب دھکیل دیا۔ یوں لگا کہ جیسے کوئی مجھے پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے اپنی مٹھی بھینچی اور پوری قوت سے ایک شخص کے منہ پر زوردار گھونسا رسید کیا۔ اس کے ساتھ ہی میری لات دوسرے کے پیٹ پر لگی اور وہ گھٹنوں کے بل دُہرا ہوگیا۔ پھر جیسے ہی میری آنکھیں کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو میں نے جانا کہ میں بے خبری میں دو پولیس والوں پر حملہ کر بیٹھی ہوں اور اب وہ بڑی مضبوطی سے مجھے پکڑے ہوئے تھے۔ بارنس کے آجانے سے مجھے ان لوگوں کی گرفت سے رہائی نصیب ہوئی۔

☆☆☆

''بظاہر وہ فرنیچر ایکسپورٹ کر رہے تھے۔'' میں نے ٹیلی فون پر گرف کو اپنی کارکردگی کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن حقیقت میں کسی کو بھی قدیم وکٹورین طرز کے مہاگنی یا اخروٹ کی لکڑی سے بنے ہوئے فرنیچر سے دلچسپی نہیں تھی..... اور اگر کسٹم والے بھی اس فرنیچر کو چیک کرنا چاہتے تو ان کی نظر کبھی بھی اس میں بنے ہوئے خفیہ خانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ان میزوں کو ان چھوٹی چھوٹی قیمتی اشیا کو لے جانے کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا جن کے لیے برآمدی لائسنس نہیں ملتا۔ دوسرے لفظوں میں یہ چیزیں بیرونِ ملک اسمگل ہوتی ہیں۔ ان میں جیولری کے علاوہ چھوٹی تصویریں بھی شامل ہوتی ہیں۔''

''تم ٹھیک تو ہو نا؟'' گرف نے فکرمندی سے پوچھا۔

''میری فکر نہ کرو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''اس کا مطلب ہوا کہ تم ٹھیک نہیں ہو۔''

''تمہیں شاید یقین نہ آئے لیکن حقیقت یہی ہے کہ میں بالکل ٹھیک ہوں اور شاید مجھے کوئی انعام بھی مل جائے۔ یہ گروہ ان میزوں میں بے قیمت اشیا رکھ کر ملک سے باہر لے جاتا اور واپسی میں ان میزوں کے ذریعے منشیات ملک میں لائی جاتی جن کی ایک بڑی مقدار اس وقت بھی گلاسگو اور نیوکیسل میں موجود ہے۔''

''بہت خوب۔ مجھے تم سے یہی توقع تھی۔ یہ بتاؤ کہ تم اس کامیابی کا جشن کیسے مناؤ گی؟''

''پہلے تو میں اپنے بالوں کو نئے انداز سے سیٹ کرواؤں گی۔ جب انہوں نے میرے منہ پر ٹیپ لگایا تھا تو کچھ بال بھی اس کی زد میں آگئے جس کی وجہ سے میرے چہرے پر داغ نظر آرہے ہیں۔ گرف! اب تم ٹھیک ہو رہے ہو۔'' میں نے اسے خوش کرنے کے لیے جھوٹ بولا۔

بارنس نے مجھے ڈنر پر مدعو کیا لیکن مجھے کبھی بھی کباب میں ہڈی بننا پسند نہیں آیا۔ میرے دل میں آج بھی اس کی بیوی کے لیے نفرت موجود ہے جو مجھ سے زیادہ خوب صورت اور اسمارٹ تھی۔ میرا دل ہی جانتا ہے کہ میں نے یہ چند گھنٹے ان کے ساتھ کیسے گزارے۔

اس رات میں نے اپنے سوجے ہوئے چہرے پر کریم لگاتے ہوئے اپنے آپ سے کہا کہ ہر لڑکی یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ اس نے کسی شہزادے کو اپنی محبت کے حصار میں قید کر رکھا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو شاید میں یہ کہانی نہ سنا رہی ہوتی۔ گرف نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ''پہلے اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔''



# خوابِ پریشاں

سلیم انور

زندگی کا بہاؤ ہمیشہ آگے کی طرف رہتا ہے... مضبوط سے مضبوط بند بھی اس بہاؤ کو روک نہیں سکتا... اسی طرح زندگی سے منسلک جدت پسندی کا لامتناہی سلسلہ جاری و ساری رہتا ہے... مشینی انسانوں کے خیال و خواب کو اجاگر کرتی چونکا دینے والی تحریر...

**نئے زمانے کے آہنگ سے روشناس کراتی ایک سائنس فکشن اسٹوری**

''نام اور نمبر پلیز؟''

ڈونالڈ کی نظریں میز کے پار بیٹھے ہوئے سلور روبوٹ پر جم گئیں۔ روبوٹ نے خود کو انسان نما ظاہر کرنے کے لیے عینک پہنی ہوئی تھی۔ عینک اس کے چہرے پر اس جگہ بندھی ہوئی تھی جہاں اس کے کان ہوتے..... اگر روبوٹ کے کان ہوتے۔

ڈونالڈ کو روبوٹ کے چہرے پر لگی ہوئی یہ عینک بڑی مضحکہ خیز دکھائی دے رہی تھی۔

''ھُوں!'' سلور روبوٹ کھنکھارا۔

ڈونالڈ نے غصے سے آنکھیں میچ لیں۔ روبوٹ کھانستے نہیں ہیں! پھر وہ نفرت سے بولا۔ ''ڈونالڈ فلپس!''

''یہ تمہارا پورا نام ہے؟''

''ہاں۔''

''اور نمبر؟''

''479-96-65321''

چاندی سی بے حس آنکھوں نے ایک لمحے کے لیے ڈونالڈ کا جائزہ لیا۔ ''مسٹر فلپس! تم سخت ذہنی دباؤ میں مبتلا دکھائی دے رہے ہو۔''

ڈونالڈ نے جھنجلاہٹ کے عالم میں اپنی مٹھیاں بھینچ لیں اور بولا۔ ''کیا ہم اس معاملے کو آگے بڑھانے تک محدود نہ رہیں؟''

روبوٹ قدرے ہچکچانے کے بعد بولا۔ ''ہاں، بے شک!''

''مجھے ضرورت......''

ایک سلور آہنی ہاتھ اوپر اٹھا۔ ''ایک منٹ پلیز......''

ڈونالڈ میز کے پیچھے بیٹھی ہوئی اس نامعقول مشین کو گھورنے لگا لیکن خاموش رہا۔

''تم یہاں ساؤتھ بالٹی مور میں 121 مائرز لین پر رہتے ہو؟''

''ہاں۔''

روبوٹ اپنے کمپیوٹر کے مانیٹر کا جائزہ لے رہا تھا۔

ڈونالڈ کو اسکرین دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ''میں یہاں دیکھ رہا ہوں کہ تم پہلے بھی اس دفتر میں آچکے ہو..... کئی مرتبہ۔'' سلور روبوٹ نے عدم توجہی سے کہا۔

''ہاں..... ہاں۔''

''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ..... ھُوں۔ ویل، مجھے یقین ہے کہ آج ہم تمہاری کچھ نہ کچھ مدد کرنے کے قابل رہیں گے، مسٹر فلپس۔ اس لمحے بھی ہمارے پاس ملازمتوں کے لاکھوں عہدے دستیاب ہیں۔''

ڈونالڈ خاموش رہا۔

''ہماری بیشتر ملازمتیں دو جنرل کیٹیگریز میں دستیاب ہیں۔ انٹرنیٹ مانیٹرنگ اور ویڈیو اسٹیٹسٹکس۔''

ڈونالڈ پھٹ پڑا۔ ''میرے پاس کیبل کی سہولت نہیں ہے۔''

''اوہ۔'' روبوٹ نے حیرت کا اظہار کیا پھر تیزی سے سنبھلتے ہوئے بولا۔ ''ویل، یہ حقیقت میں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بہ طور ایک ملازم تمہیں فری کیبل وژن ملے گا.....''

''نہیں، شکریہ۔''

''ویل، تم.....''

''دیکھو!'' ڈونالڈ پھر پھٹ پڑا۔ ''میں تمہارے لاکھوں ان کند ذہن جوانوں میں شامل نہیں ہونا چاہتا جو گھروں پر کاہلی میں وقت گزارنا پسند کرتے ہیں۔ آل رائٹ؟''

''کیا کوئی پرابلم ہے؟'' ایک دھیمی آواز ابھری۔ یہ آواز سنہری جلد والے اس روبوٹ کی تھی جو آفس کے دروازے پر آن کھڑا ہوا تھا۔

سلور روبوٹ بلند آواز میں بولا۔ ''نہیں، سپروائزر ایل۔'' ساتھ ہی اس کا ہاتھ نروس زدہ انداز میں اپنی عینک درست کرنے لگا۔

''تم اَپ سیٹ سے لگ رہے ہو، مسٹر فلپس!''

ڈونالڈ کے مشتعل جذبات قدرے ٹھنڈے ہو گئے۔

''دیکھو، میں صرف ایک ملازمت کی تلاش میں ہوں۔ ایک حقیقی ملازمت!'' اس نے لفظ 'حقیقی' پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''میرا نام ایل ہے۔'' سنہری روبوٹ نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آؤ، میرے دفتر میں چلتے ہیں۔''

''آل رائٹ۔''

ایل کے دفتر میں دو فل کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں جن کے پار میٹرو ایریا کا منظر دکھائی دیتا تھا لیکن گہری دھند کے باعث باہر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی میز مستطیل نما لمبی اور سادہ تھی۔

وہ دونوں میز پر ایک دوسرے کے مقابل بیٹھ گئے۔

ایل کی پشت ان کھڑکیوں میں سے ایک کی جانب تھی۔

سنہری انگلیاں میز کی سطح پر حرکت کرنے لگیں اور سطح پر ایک بیضوی اسکرین نمودار ہو گئی۔ ''تمہاری فائل یہاں موجود ہے، مسٹر فلپس!'' روبوٹ سپروائزر ایل نے کہا۔

ڈونالڈ نے ایک نگاہ کھڑکی سے باہر ڈالی لیکن دھند کے باعث وہ شہر کی کسی بھی عمارت کو شناخت کرنے سے قاصر تھا۔

''تم نے آخری مرتبہ یہاں بالٹی مور کے ایریا میں موگز ہول سیل ایکوپمنٹ نامی فرم کے لیے کام کیا تھا؟''

ڈونالڈ نے روبوٹ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور بولا۔ ''مجھے سن 2032 میں معطل کر دیا گیا تھا۔''......



موگز ہول سیل ایکوپمنٹ ان لاکھوں امریکن کمپنیوں میں سے ایک تھی جنہیں جاپانیوں نے سن تیس کی ابتدا میں اس وقت بند کر دیا تھا جب وہ پوری دنیا میں اپنی آٹومیٹڈ فیکٹریوں کی سستی پروڈکٹس کا سیلاب لے آئے تھے۔

تب امریکن انڈسٹری کے لیے یہ ناگزیر ہو گیا تھا کہ وہ مقابلے کے لیے مجبوراً آٹومیشن اور روبوٹ لیبر کی جانب شفٹ کر جائے۔

..... اور اب ایک عشرے کے بعد ڈونالڈ ٹین کے بنے ہوئے ایک ڈبے نما دفتر میں بیٹھا ہوا تھا اور اس کی نگاہیں باہر چھائی گہری دھند پر جمی ہوئی تھیں۔

امریکا میں انسانوں کو عملاً ہر لحاظ سے بہ طور کارکن غیر متعلق کر دیا گیا تھا۔ روبوٹس زیادہ سستے، تیز کام کرنے والے اور برتر ثابت ہوئے تھے۔

ڈونالڈ نے دوبارہ نظریں کھڑکی کی جانب گھما دیں۔ اسے یہ سب کچھ درست نہیں لگ رہا تھا۔

''ویل، ہمارے پاس ویسی تو کوئی ملازمت دستیاب نہیں ہے۔'' روبوٹ نے اپنی سنہری انگلی ڈیسک ٹاپ پر گھماتے ہوئے کہا۔ ''ھُوں! تمہیں ویڈیو اسٹیٹسٹکس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے؟''

''نہیں۔''

''ٹھیک!''

ڈونالڈ نے اپنی نظریں کھڑکی پر سے ہٹا دیں۔ ''آئی ایم سوری۔''

ڈونالڈ نے کہا۔ ''میں بس گھر میں بیٹھ کر ٹی وی شوز کی ریٹنگ نہیں کر سکتا۔'' ساتھ ہی وہ ایک آہ بھر کر رہ گیا۔

روبوٹ ایل کنفیوز سا ہو گیا۔ ''میں سمجھا نہیں۔''

''اس میں کیا اچھائی ہے؟''

''ویڈیو اسٹیٹسٹکس کی بدولت نیٹ ورکس کو اپنی پروگرامنگ میں بہتری لانے اور اپنے فارمیٹس کو اپ گریڈ کرنے میں مدد ملتی ہے۔''

''اور زیادہ ٹی وی شوز بنانے کے لیے۔''

''ہاں۔''

''تم سمجھ نہیں رہے ہو؟ یہ سب بالکل فضول ہے۔''

روبوٹ اس بات پر قدرے الجھن میں پڑ گیا۔ ''میں اتفاق نہیں کر سکتا۔''

''ویل، میں یہ کام نہیں کروں گا۔''

''اچھا، اچھا۔'' یہ کہتے ہوئے روبوٹ ایل نے

ماہنامہ پاکیزہ ڈائجسٹ کراچی
اگست 2011ء کے شمارے کی ایک جھلک
عکس، عمیرہ احمد کے
قلم سے پُرتاثر سلسلے وار ناول
شیشوں کا مسیحا کوئی
نہیں، شیریں حیدر کا سلسلے وار ناول
خوشبو کا سفر، عالیہ بخاری
کا ناول ایک نئی مہک کے ساتھ
راحت وفا کا... ناول ایک تھی نینان
نفسیاتی احساسات وخیالات سے مزین
میمونہ خورشید اور رضوانہ پرنس
کے پُرتاثر ناولٹ سچے جذبوں سے مزین
فاخرہ گل، سیرینا راض،
بشریٰ نثار اعوان، عالشہ خان،
رابعہ نیازی اور دیگر مصنفین کی
دلچسپ ویادگار تحریریں
آپ کی آرا و نگارشات سے سجے مستقل سلسلے
کیا آپ نے اس ماہ کا پاکیزہ پڑھا؟ نہیں! کمال ہے!

www.digestpk.com

ڈیسک ٹاپ مانیٹر پر ملازمتوں کی فہرست کی فائلیں اسکین کرنا شروع کردیں۔

''فیکٹری میں کام کے بارے میں کیا کچھ ہے مجھے اس کی پروا نہیں کہ مجھے کیا کام کرنا ہوگا لیکن وہ ایک حقیقی کام ہونا چاہیے جس سے میں عہدہ برآ ہوسکوں۔''

روبوٹ کا چہرہ سکڑ کر ایک مضحکہ خیز ماسک کی طرح ہو گیا۔ ''پلیز مسٹر فلپس! نیشنل ایمپلائمنٹ آفس کے پاس یقیناً فیکٹری میں کام کے لیے کارکنوں کی ضرورت ہے لیکن صرف روبوٹس کے لیے۔ ان جگہوں میں کام کے لیے انسانوں کی کوئی ڈیمانڈ نہیں ہے۔''

''یہ ٹھیک نہیں ہے۔'' ڈونالڈ بڑبڑایا۔ ''اگر لوگوں کو پتا چل جائے کہ اس ملک میں کیا ہو رہا ہے.....''

''یہاں ایک ایسی چیز ہے جو تمہارے لیے دلچسپی کا باعث ہوسکتی ہے۔'' روبوٹ ایل نے دھیرے سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایک سپر وائزری پوزیشن ہے۔ ہوں؟''

''کیا کرنا ہوگا؟''

''اوہ، یہ ایک ویب سائٹ ڈیولپمنٹ ہے۔ ایک نہایت امید افزا.....''

''کمپیوٹرز نہیں۔''

''اوہ، اچھا۔''

''میں ہمیشہ کی طرح روزانہ گھر سے نکل کر کام پر جانا چاہتا ہوں۔ کیا تم سمجھ نہیں رہے ہو؟''

''مسٹر فلپس، پلیز پُرسکون رہو۔ تمہیں اس بات کو سراہنا چاہیے کہ موجودہ سیاسی فضا میں گھر سے دور ایمپلائمنٹ حکومت کے لیے ناموافق ہے۔''

''کیا؟''

''جب مسافر برداری، انشورنس اور انفرا اسٹرکچر کی ابتری کی لاگت کو جمع کیا جائے تو بات سمجھ میں آجاتی ہے۔''

''تم یہ کہہ رہے ہو کہ حکومت نہیں چاہتی کہ لوگ اپنے گھروں سے باہر نکلیں؟''

''یہ صرف عارضی ہے۔'' روبوٹ نے یقین دلانے کے انداز میں کہا۔ ''جب ایک بار ڈاؤن سائزنگ کا آغاز ہوگا تو ان میں سے بہت سے اقدامات کا خاتمہ ہو جائے گا۔''

''ڈاؤن سائزنگ؟''

''آبادی کی ڈاؤن سائزنگ کے نتیجے میں.....''

''آبادی کی ڈاؤن سائزنگ؟ تم لوگ انسانوں کے ساتھ روبوٹس کا سا سلوک نہیں کرسکتے؟''

''یقیناً یہ میرے دائرۂ اختیار میں نہیں ہے۔'' روبوٹ ایل نے کہا۔ ''میں تو صرف یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ میرے پاس انسانوں کے لیے گھر سے دور کام کرنے کے مواقع یقینی طور پر کیوں نہیں ہیں۔ یہ تمہارے درست طور پر منتخب کردہ مجلس قانون ساز کے روبوٹ نمائندے ہیں جو قوانین بنانے کے ذمے دار ہیں، میں ذمے دار نہیں ہوں۔''

قانون ساز روبوٹ نمائندے؟ ڈونالڈ نے ایک بار دو کانگریس ارکان کے بارے میں تو سنا تھا..... لیکن روبوٹ ایل کی بات سے تو یہ ظاہر ہو رہا تھا جیسے.....؟ آخر کتنے سیاست داں روبوٹ ہیں؟ یہ سوچ کر اس کے پیٹ میں مروڑ ہونے لگا کہ اس بارے میں اسے کوئی آئیڈیا نہیں ہے۔

اتنے میں نک نک کی آواز نے ڈونالڈ کو چونکا دیا۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ڈیسک کی ایک درز میں سے کاغذ کی ایک پتلی سی سلپ باہر آرہی تھی۔ ''میں متبادل ملازمتوں کی فہرست کا ایک پرنٹ نکال رہا ہوں۔ تم سوچ کر اس میں سے کوئی بھی ملازمت منتخب کرسکتے ہو۔ آئی ایم سوری، میرے پاس بس یہی ملازمتیں ہیں۔ ان کے علاوہ اور کوئی نہیں ہیں۔'' یہ کہہ کر روبوٹ ایل نے لسٹ ڈونالڈ کی طرف بڑھا دی۔

ڈونالڈ نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے فہرست کا جائزہ لینا شروع کیا۔ پھر اس نے آخری سطر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''رائٹر!''

روبوٹ ایل کے لہجے سے اطمینان ظاہر ہوا۔ ''گڈ، مسٹر فلپس! یہ عمدہ رہے گا۔''

چند منٹ بعد ڈونالڈ ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے عمارت کی کنکریٹ کی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔ وہ ایک رائٹر بننے والا ہے۔ اب وہ لوگوں کو بتائے گا کہ دنیا کس طرح بدل چکی ہے۔

☆☆☆

اختتامیہ

ایک ہاتھ نے فولڈر کو پلٹ دیا۔ فولڈر میں اس سے آگے اور کچھ نہیں تھا۔ ''بس یہی ہے۔'' روبوٹ سی نے بتایا۔

پبلی کیشن کمیٹی کے سربراہ روبوٹ بی نے اپنے سنہری ہاتھ میز پر رکھ دیے۔ اس کے چوڑے چہرے پر اطمینان کے تاثرات تھے۔ اس نے قدرے غور کرنے کے بعد کہا۔ ''ویل، یہ خاصی مختصر تحریر ہے جس پر کوئی بھی توجہ نہیں دے گا۔''

اندھیرے کمرے کے دوسرے کنارے سے ایک ہلکی آواز ابھری۔ ''تم اسے شائع کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے غور تو نہیں کر رہے ہو؟''

''کیوں نہیں، روبوٹ ڈی؟ ہم یقینی طور پر اسے ایڈٹ کریں گے۔''

''روبوٹ بی، ہم اسے درست نہیں کرسکتے۔ یہ سچ سے بہت زیادہ قریب ہے۔''

روبوٹ بی نے قہقہہ لگایا۔ ''یہی سچ ہے۔''

''جنل روبوٹس۔'' روبوٹ سی نے اپنے ساتھی روبوٹس کو مخاطب کیا۔ وہ خود بھی انسانی سوٹ زیب تن کیے ہوئے تھا۔ اس نے سر پر موجود زپ کھولی تو سلور کی انسان نما کھوپڑی مع گردن باہر نکل آئی۔ ''پلیز، اب ظاہر ہے کہ ہم اس تحریر کو من وعن شائع کرنے سے رہے۔ یہ بہت زیادہ درست ہے۔''

''لیکن اگر ہم اس میں تھوڑی سی کاٹ چھانٹ کردیں تو؟'' روبوٹ بی نے خیال ظاہر کیا۔

روبوٹ ڈی نے اندھیرے گوشے کی جانب گھورتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے ذہن میں کیا ہے؟''

''پہلی بات تو یہ کہ بہت سے انسان اس حقیقت سے لاعلم ہیں۔'' اس نے انسانی سوٹ کو اونچا کرتے ہوئے کہا۔

''ہم انہیں نظر انداز کردیں گے۔ ہم تمام روبوٹس کو قدرتی بنا دیں گے۔ بغیر انسانی لباس کے ان کے اصلی روپ میں۔''

''ہوں۔'' روبوٹ ڈی نے اپنی سنہری ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔ ''میں سمجھ رہا ہوں کہ تم کیا کہنے جا رہے ہو۔''

''اور ہم اسے مستقبل کی ایک کہانی بنا دیں گے۔''

روبوٹ سی بڑبڑایا۔ ''آہ..... ہاں!''

''ہم بس تاریخیں بدل دیں گے اور اس میں بیان کردہ دور کو تیس سال یا اتنا ہی عرصہ آگے لے جائیں گے۔''

''لیکن لوگ سمجھ جائیں گے۔'' روبوٹ ڈی نے اعتراض کرنا چاہا۔

روبوٹ بی نے فوراً ہی انگلی کے اشارے سے روبوٹ ڈی کو خاموش رہنے کا حکم دیا اور بولا۔ ''انہیں علم ہے کہ ملینیم کے آخر میں جاپان ایک اکنامک سپر پاور بن گیا تھا لیکن انہیں اس حقیقت کا علم نہیں ہے کہ کیوں۔''

''اور ان کا شکریہ.....'' روبوٹ سی نے اپنا ہاتھ اپنے انسانی سوٹ پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ ہمارے بارے میں لاعلم ہیں۔''

روبوٹ ڈی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''آل رائٹ۔ گڈ روبوٹ بی۔''

''اوکے۔'' روبوٹ بی نے دونوں انگلیاں ملاتے ہوئے کہا۔ ''سو ہم ڈونالڈ فلپس کو آج سے تیس سال بعد ایمپلائمنٹ کے دفتر میں داخل ہوتا بتا رہے ہیں۔ مان لیتے ہیں کہ وہ سن 2060ء ہے اور تمام روبوٹس دھاتی ہیں۔ کوئی انسانی سوٹ میں نہیں ہے۔''

''ہم اس کہانی کا ایک کٹیلا عنوان بھی رکھ سکتے ہیں۔'' روبوٹ سی نے کہا۔ ''امریکا کا ڈراؤنا خواب..... اس عنوان کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟''

''مجھے پسند آیا۔'' روبوٹ بی نے جوشیلے لہجے میں کہا۔ ''اور.....'' اس کی سنہری آنکھیں کمرے کے اندھیرے گوشے کی جانب اٹھ گئیں۔ ''ایک اور بات۔''

''وہ کیا؟'' روبوٹ ڈی نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے۔'' روبوٹ بی نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے، میں اس میں کسی چیز کا اضافہ کردوں۔ اختتامیہ قسم کی چیز کا۔''

روبوٹ ڈی کئی لمحوں تک روبوٹ بی کی جانب دیکھتا رہا۔ پھر بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ ''وہ کس لیے؟''

''فکر مت کرو۔'' روبوٹ بی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''ہم اس کہانی کو کسی انٹرنیٹ EZINE پر شائع کریں گے۔ ان غیر معروف ویب سائٹس میں سے کسی ایک پر جس پر انسان کبھی توجہ نہیں دیتے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ فولڈر اٹھا لیا جس میں کہانی رکھی ہوئی تھی۔ وہ فولڈر بلند کرتے ہوئے بولا۔ ''حقیقت میں کوئی بھی اس کہانی کو نہیں پڑھ پائے گا اور انسانی دنیا پر ہماری حکمرانی ہو گی..... ہم روبوٹس کی۔''

اسما قادری

قسط: 27

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور با اثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں...... مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھر کئی رخ ہیں، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے...... یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے...... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا ساہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے...... نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں...... کبھی بازی پلٹ بھر جاتی ہے۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے...... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے...... جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

## گذشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہر یار عادل ایک پُرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیرِ نگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیر آباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہر یار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا ہے اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ پیر آباد کا رہائشی ماسٹر آفتاب جو عرصے سے گاؤں کے پرائمری اسکول کی ترقی کا خواہش مند ہوتا ہے، شہر یار کا سہارا پاکر مکمل کر اپنے مشن پر کام کرنے لگتا ہے۔ چودھری کی نفاست پسند بیٹی کشور، آفتاب کو دیکھتی ہے تو اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ آفتاب اور کشور خفیہ نکاح کر لیتے ہیں۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیر آباد سے ہے۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آجاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکل کر بھاگ جانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ چودھری اسے اغوا کروا لیتا ہے لیکن ماہ بانو ایک بار پھر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ شہر یار اپنے ڈرائیور مشابرم خان کے مشورے پر ماہ بانو کو کاندے منتقل کر دیتا ہے۔ کچھ لوگ ماہ بانو کو اغوا کر لیتے ہیں۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے، اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ ماہ بانو کے بارے میں ساری معلومات حاصل کر لیتا ہے اور یہ جاننے کے بعد کہ چودھری ماہ بانو کی تلاش میں ہے، وہ اسے ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ ماہ بانو عمران نامی لڑکے کے ساتھ دشمنوں کی قید سے بھاگ نکلتی ہے۔ چودھری افتخار کو کشور کے غیاب کے حوالے سے ڈیوڈ کی زبانی آفتاب اور افضل سے متعلق اطلاعات ملتی ہیں کہ ان افراد کی شخصیت مشکوک ہے۔ چودھری، ماسٹر آفتاب کو اغوا کرا لیتا ہے۔ ماہ بانو برف زار میں بھٹکتے بھٹکتے بے ہوش ہو جاتی ہے اور اس دوران اسے ایک مہربان شخص مل جاتا ہے جو کلائمبر ہوتا ہے، وہ اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ ادھر مشابرم خان لڑائی کے دوران زخمی ہو جاتا ہے اور پاکستان آرمی والوں کے وہاں پہنچنے سے ان کی تحویل میں پہنچ جاتا ہے۔ شہر یار ماسٹر آفتاب کو چھڑانے کے لیے جگو کا سہارا لیتا ہے اور جگو آفتاب کو چودھری کے چنگل سے نکال لاتا ہے۔ ماہ بانو کو بچانے والا مہربان شخص اپنے واقف کار کے توسط سے اسے ایک میجر سے ملوا دیتا ہے جو ماہ بانو کی فراہم کردہ معلومات کے بعد اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ شہر یار کو بھی اس واقعے کی اطلاع میجر کے ذریعے مل جاتی ہے اور شہر یار فوراً اسکردو پہنچ جاتا ہے اور مشابرم خان اور ماہ بانو کو آرمی کی کسٹڈی سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ماہ بانو کو چھڑانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اسے کراچی منتقل کر دیتا ہے۔ ماہ بانو کراچی میں میڈیکل کالج میں مہرین کے نام سے داخلہ لے لیتی ہے۔ وہاں اسے راحیلہ نامی ایک لڑکی ملتی ہے جو اس سے کافی گھل مل جاتی ہے۔ ماہ بانو کو اس کی سہیلی راحیلہ اپنے بھائی سے ملوانے گھر لے جاتی ہے۔ وہاں ماہ بانو پڑوس کے بنگلے میں مہا گرو کو دیکھ لیتی ہے اور شہر یار کو مطلع کرتی ہے۔ شہر یار فوراً کراچی آجاتا ہے۔ وہ ماہ بانو کی مدد سے اس پر قابو پا لیتا ہے۔ ادھر چودھری کے کارندے بابر کو مار کر آفتاب اور کشور کا پتا لگا لیتے ہیں لیکن وہ وہاں سے نکل چکے ہوتے ہیں۔ مہا گرو (ورما) کے لوگ ورما کو اسپتال سے نکال لے جاتے ہیں۔ لیاقت رانا پر قاتلانہ حملے کی خبر سن کر شہر یار پریشان ہو جاتا ہے اور انہیں دیکھنے کے لیے لاہور جانے کا ارادہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر ماریا بھی اس کے ساتھ لاہور جانے کے لیے نکلتی ہے۔ راستے میں ڈاکٹر ماریا کی طبیعت کی خرابی کے باعث انہیں ایک چھوٹے سے ہوٹل میں مختصر قیام کرنا پڑتا ہے اور اس قیام کے دوران وہ ماریا کے قریب ہو جاتا ہے۔ ماہ بانو ایک بار پھر چودھری کے ہتھے چڑھ جاتی ہے۔ ادھر شہر یار اپنے قدم بھٹکنے پر خود کی اور ماریا کی نظروں میں گر جاتا ہے اور ماریا کی طنزیہ گفتگو سن کر اس سے شادی کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ وڈی چودھرائن اپنے داماد سے ماہ بانو کے بارے میں اپنے خدشات کا اظہار کرتی ہے اور اشرف شاہ ماہ بانو کو چودھری کی قید سے نکال کر ڈاکوؤں کے پاس پہنچا دیتا ہے۔ ماہ بانو ڈاکوؤں کے چنگل میں ہوتی ہے اور ان کے کام کاج کرتی ہے۔ وہاں موجود ڈاکو اسلم ماہ بانو کو پسند کرنے لگتا ہے۔ وہ ماہ بانو کو کھلی فضا میسر کرنے کے لیے اپنی بنائی ہوئی ایک پھلواری میں لے جاتا ہے۔ مشابرم خان آرمی کسٹڈی سے چھوٹ کر واپس آجاتا ہے۔ آفتاب شہر یار کو فون کر کے اسے را کے ایجنٹ کی اسلام آباد میں موجودگی کا بتاتا ہے۔ ایک رات غلام محمد نامی را کا ایجنٹ آفتاب کے گھر پر دھاوا بول دیتا ہے۔ اس لڑائی میں کشور کو گولی لگتی ہے اور وہ زخمی ہو جاتی ہے تاہم غلام محمد پکڑا جاتا ہے۔ شہر یار، مشابرم خان اور فورس کی مدد سے اس پر قابو پاتا ہے۔ کشور کی زندگی بچالی جاتی ہے۔ اس دوران آفتاب کو پتا چلتا ہے کہ چودھری کے گرگے اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ آفتاب اور کشور میر پور خاص آجاتے ہیں۔ ادھر فریدہ چودھرائن کی سازش کا شکار ہو کر سیڑھیوں سے گر جاتی ہے اس کی جان بچ جاتی ہے اور اس کے ہاں ایک بیٹے کی پیدائش ہوتی ہے۔ راحیلہ کو ڈاکٹر طارق ہوٹل میں چھوڑ کر امریکا چلا جاتا ہے۔ راحیلہ واپس اپنے گھر آجاتی ہے۔ اس کی نگرانی پر مامور شہر یار کا آدمی اسے رپورٹ دیتا ہے۔ شہر یار جگو کو فون کر کے چودھری کی مرمت کرانا چاہتا ہے۔ عبدالسنان شہر یار کو بتاتا ہے کہ ماہ بانو ڈاکوؤں کے پاس ہے۔ شہر یار، مختار مراد کو نیلی فون کر کے جنگل میں آپریشن پر زور دیتا ہے۔ ادھر چودھری کے کہنے پر ڈاکو شہر یار کے گھر پر دھاوا بول دیتے ہیں اور زیورات لوٹ کر لے جاتے ہیں۔ چودھری بختیار، چودھری افتخار کے گھر جا کر اسے فریدہ کے ساتھ ہونے والی سازش کے بارے میں بتاتا ہے۔ ادھر ڈیوڈ شہر یار کے خلاف چودھری کی کارروائی سے نالاں ہوتا ہے۔ آفتاب کے ہاں ایک لڑکی کی پیدائش ہوتی ہے۔ ادھر ماہ بانو کو اسلم کے ذریعے شہر یار کی شادی کی اطلاع ملتی ہے تو وہ صدمے سے بے ہوش ہو جاتی ہے۔ ماہ بانو اسلم کو شادی کی آفر کرتی ہے مگر ساتھ میں شرط رکھتی ہے کہ وہ ڈاکوؤں کا ساتھ چھوڑے اور عزت کی زندگی گزارے، تب وہ اس سے شادی کرے گی۔ آفتاب چودھری کو خط لکھ کر نانا بننے کی نوید سناتا ہے۔ چودھری چراغ پا ہو جاتا ہے اور آفتاب اور کشور کا سراغ لگانے کا حکم دیتا ہے۔ وہ چھوٹی چودھرائن ناہید کو حویلی کی ذمے داریاں دے دیتا ہے جبکہ بڑی چودھرائن کو تہ خانے میں قید کروا دیتا ہے۔ ادھر اسلم اور ماہ بانو ڈاکوؤں کی پناہ گاہ سے بھاگنے کا پروگرام بنا رہے ہوتے ہیں، للی ان کی بات سن لیتی ہے اور زبردستی ان کے ساتھ شامل ہو جاتی ہے۔ چودھری کے گرگے آفتاب کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اسپتال پر دھاوا بول دیتے ہیں تاہم آفتاب اور کشور وہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر اس افراتفری میں ان کی نوزائیدہ بچی وہیں رہ جاتی ہے۔ چودھری کے آدمی بچی کو اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں۔ وہ بچی کو لے کر نکل رہے ہوتے ہیں کہ راستے میں ہتھیار بردار افراد انہیں دبوچ لیتے ہیں اور بچی کو ان سے لے لیتے ہیں۔ ادھر ماہ بانو، اسلم اور للی بھاگنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ راستے میں رکاوٹ بننے والے پہرے داروں کو مار کر وہ بھاگ رہے ہوتے ہیں کہ انہیں اپنے پیچھے فائرنگ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ اپنی پوری کوشش کرنا چاہتے ہیں، پنجرے سے آزاد ہونے والے اس پرندے کی طرح جو آزادی کا ذائقہ چکھنا چاہتا ہو۔

**اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے**



فائرنگ کی آوازیں لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جارہی تھیں اور اسی حساب سے ان کے دوڑتے قدموں کی رفتار بھی بڑھتی جارہی تھی۔

''رک جاؤ۔'' اچانک ہی اسلم نے بلند آواز میں کہا تو اس کے ساتھ ساتھ دوڑتی للی اور ماہ بانو کے قدموں کو بریک لگ گئے۔ اسلم خود بھی رک گیا اور سماعت پر زور دے کر کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ آخر وہ اپنے اس خیال میں پُریقین ہو گیا جس نے اسے رکنے پر مجبور کیا تھا۔

''کیا ہوا... تم رک کیوں گئے؟'' اپنی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے للی نے دریافت کیا۔

''فائرنگ کی آوازیں سن رہی ہو؟''

''ظاہر ہے۔ فائرنگ ہو رہی ہے تو سن بھی رہی ہوں... لیکن تم رک کیوں گئے ہو؟ کیا ان لوگوں کو موقع دینا چاہتے ہو کہ وہ ہمارے سروں پر پہنچ جائیں؟'' اس کے سوال کے جواب میں للی نے جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

''ہمارے سروں پر تو وہ تب پہنچیں گے جب ہمارے پیچھے آئیں گے۔ ذرا فائرنگ کی آوازوں کو غور سے سنو۔ یہ آوازیں بلند تو ہو رہی ہیں لیکن ہمارے قریب نہیں آرہیں۔ اس بات کا مطلب ہے کہ فائر کرنے والے ہمارے پیچھے نہیں آرہے۔ یہ کوئی اور معاملہ ہے۔ جتنی شدت سے فائرنگ کی جارہی ہے اس سے یوں لگتا ہے کہ کوئی بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اگر یہ تماشا ہماری وجہ سے ہو رہا ہوتا تو فائر کرنے والے ہمیں للکارتے اور رکنے کا کہتے لیکن ایسا کچھ نہیں ہے۔ مجھے تو آوازوں سے یوں لگ رہا ہے جیسے دو مسلح گروپوں کے درمیان مقابلہ ہو رہا ہے۔''

''تم صحیح کہہ رہے ہو۔ یہ تو واقعی کوئی زوردار مقابلہ ہو رہا ہے۔'' اس کے کہنے پر للی نے بھی کان لگا کر غور کیا اور بالآخر اس سے متفق ہو گئی۔

''لیکن یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟ ایک گروپ تو لازمی ڈیرے والوں کا ہے مگر یہ دوسرا گروپ کس کا ہے جو ان سے مقابلہ کر رہا ہے؟'' اس بات کا یقین ہو جانے کے بعد کہ واقعی سنائی دینے والی فائرنگ کی آوازیں دو مسلح گروپوں کے درمیان لڑائی کا نتیجہ ہیں، اس نے حیرت سے سوال کیا۔ وہ اچھے خاصے طویل عرصے سے ڈاکوؤں کے اس ٹھکانے پر مقیم تھی۔ اتنے عرصے میں اس نے کبھی کسی کو ان لوگوں سے الجھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ان کا گروہ اس علاقے کا واحد ڈکیت گروہ تھا اس لیے اپنے ''ہم پیشہ'' افراد سے تو تصادم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دوسرا خیال پولیس کی طرف جاتا تھا لیکن یہ بھی ذرا حیرت کی بات تھی۔ پولیس نے کبھی جنگل میں گھس کر ان لوگوں سے مقابلے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ وہ تو کسی واردات کے موقع پر بھی ان کی راہ میں رکاوٹ بننے سے گریز کرتے تھے۔ پھر ان کے سرپرستوں کا تعاون بھی ہمیشہ ان کے ساتھ رہتا تھا۔ پولیس فورس اگر کبھی کسی وجہ سے جنگل میں داخل بھی ہوتی تھی تو انہیں پہلے ہی اطلاع کر دی جاتی تھی تاکہ وہ لوگ ہوشیار رہیں اور ان کی پولیس سے مڈبھیڑ کی نوبت ہی نہ آئے۔

''میرا خیال ہے پولیس نے ڈیرے پر ریڈ کیا ہے۔ اگر تم لوگ غور سے سنو تو فائرنگ کی آوازوں کے درمیان کبھی کبھی کسی کی لاؤڈ اسپیکر پر بولنے کی آوازیں بھی آرہی ہیں۔ جہاں تک مجھے سمجھ آرہا ہے، پولیس والے ڈیرے والوں کو ہتھیار ڈالنے کا کہہ رہے ہیں۔'' اب تک خاموش رہنے والی ماہ بانو اچانک ہی بولی اور بڑے وثوق سے اپنا خیال ظاہر کیا۔ پہلے لمحے میں وہ فائرنگ کی آوازیں سن کر گھبرا گئی تھی اور اسے یہی ڈر محسوس ہوا تھا کہ ڈیرے والوں کو ان کے فرار کی خبر ہو گئی ہے اور وہ انہیں پکڑنے کے لیے ان کے تعاقب میں آرہے ہیں لیکن اسلم کی خیال آرائی کے بعد اس نے خاموش رہ کر بہت توجہ سے سنائی دینے والی آوازوں پر غور کیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ پولیس وہاں پہنچ چکی ہے۔

''کہہ تو تم صحیح رہی ہو۔ پھر بتاؤ کہ کیا خیال ہے؟ کیا ہم یہیں رک کر اس ہنگامے کے تھمنے کا انتظار کریں اور پھر فائرنگ رکنے کے بعد واپس جا کر میں پولیس کو گرفتاری دے دوں؟ تم دونوں تو ظاہر ہے خود مظلوم ہو۔ تم دونوں کو ہی زبردستی اغوا کر کے یہاں لایا گیا تھا۔ تم دونوں پولیس کی حفاظت میں آرام سے اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ جاؤ گی۔ دوسری صورت میں تو راستہ بہت دشوار اور پُرپیچ ہے اور تم دونوں کو بلاوجہ اتنی تکلیف اٹھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

''بکواس مت کرو۔ میں ہرگز بھی تمہارا پولیس کے ہاتھ آنا پسند نہیں کروں گی۔ تم پر اتنے الزامات ہیں۔ تمہاری تو ساری زندگی مقدمات بھگتنے اور سزا کاٹنے میں گزر جائے گی۔'' اسلم نے ماہ بانو کی طرف رخ کر کے سوال کیا تھا لیکن جواب فوری طور پر للی کی طرف سے آیا۔ وہ واقعی اس پر مرتی تھی اور اسے کسی طور نقصان پہنچتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ لیکن اسلم کی سوالیہ نظریں تو ماہ بانو پر جمی تھیں۔ اندھیرے کے باعث وہ تینوں ہی ایک دوسرے کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ سکتے تھے، پر اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ماہ بانو کو اندازہ تھا کہ اسلم کو اس کے جواب کا انتظار ہے۔

''للی ٹھیک کہہ رہی ہے اسلم! اگر تم پولیس کے ہاتھ لگ گئے تو زندگی کا بڑا حصہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارنا پڑے گا اور میں دل سے یہ چاہتی ہوں کہ قدرت تمہیں ایک اچھی زندگی گزارنے کا جو موقع فراہم کر رہی ہے، اسے ہاتھ سے جانے نہ دو۔'' اس کے جواب نے اسلم کی سماعتوں میں رس گھول دیا اور وہ جو کہیں دل میں اندیشہ تھا کہ ماہ بانو صرف یہاں سے نکلنے کے لیے اسے شادی کا جھانسا دے رہی ہے، وہ مکمل طور پر دل سے نکل گیا۔

''اگر آپ دونوں خواتین کا یہی اصرار ہے تو پھر چلو یہاں سے چلتے ہیں۔ یہاں زیادہ دیر رکنا بیکار بھی ہے اور خطرناک بھی۔ اگر پولیس نے ڈیرے والوں پر قابو پالیا تو اس کے بعد سرچ آپریشن بھی کرے گی اس لیے مناسب یہی ہے کہ ہم جلد از جلد یہاں سے دور نکل جائیں۔'' وہ سرخوشی کے ساتھ بولا اور پھر ان تینوں کے قدم ایک بار پھر آگے کی جانب بڑھنے لگے۔ یہ قدم انہیں کہاں تک لے جاتے، یہ تو کسی کو معلوم نہیں تھا لیکن اپنی اپنی جگہ وہ تینوں ہی مطمئن تھے کہ جینے کی ایک کوشش کرنے کا موقع تو بہر حال مل ہی گیا ہے۔

☆☆☆

''اور کتنا راستہ باقی ہے؟'' اس نے اپنے دائیں پہلو میں چلتے گھوڑے پر سوار سادھو سے پوچھا۔ یہ ہندو سادھو جو ایس پی کے مطابق ہر وقت اِدھر اُدھر آوارہ گردی کرتے رہنے کے باعث ویرانوں اور آبادیوں کے بہت سے رازوں سے واقف تھا اور پولیس کو ڈاکوؤں کے ڈیرے کی صحیح نشان دہی کرنے والا مخبر ثابت ہوا تھا، یوں اس کا ہم سفر بنا تھا کہ اس نے ایس پی سے درخواست کر کے اسے اپنے پاس بلا لیا تھا اور بظاہر تارک دنیا سادھو کو موٹی رقم کی ترغیب دے کر اس کام کے لیے راضی کر لیا تھا کہ وہ ڈیرے تک پہنچنے والے راستے کی اس کے ساتھ رہ کر راہنمائی کرے گا۔ سو اب وہ چاند کی بے حد مدھم روشنی میں گھوڑوں پر سوار جنگل میں سفر کر رہے تھے۔ اس سفر میں نڈر، بے باک اور قابلِ بھروسا مشابرم خان بھی اس کے ساتھ تھا۔ پولیس فورس ان سے بہت پہلے روانہ ہو چکی تھی۔ پولیس فورس میں کئی ایسے مقامی افراد بھی شامل تھے جو کافی حد تک جنگل سے واقف تھے اس لیے انہوں نے سادھو کو اپنے ساتھ رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ویسے بھی اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ جب اپنی بولتی بند کر لیتا ہے تو پھر کسی طرح زبان کھولنے کے لیے راضی نہیں ہوتا۔ ایسے من موجی آدمی کو ساتھ رکھ کر فائدہ اٹھانا ذرا مشکل ہوتا ہے اس لیے اسے ساتھ لے جانے کے بجائے آپریشن کی تکمیل تک پولیس کسٹڈی میں رکھنے کا فیصلہ کیا گیا تھا جہاں سے وہ شہریار کی خواہش پر اس تک پہنچا دیا گیا تھا۔ اس نے سادھو سے بند کمرے میں طویل مذاکرات کیے تھے۔ ابتدا میں تو وہ یہی ظاہر کرتا رہا کہ وہ ایک ایسا شخص ہے جسے دنیاداری کے جھمیلوں سے کوئی غرض نہیں ہے لیکن جوں جوں شہریار کی طرف سے کی جانے والی رقم کی پیشکش میں ہندسوں کا اضافہ ہوتا رہا، اس کی بے نیازی کا خول چٹخنا چلا گیا اور بالآخر وہ پوری طرح اپنے خول سے باہر آکر شہریار کا ساتھ دینے کے لیے راضی ہو گیا۔ رقم کے لالچ نے اس کی وہ ساری بے نیازی اور بے خودی اڑن چھو کر دی جس کا ڈھونگ رچا کر وہ لوگوں میں باعزت بنا پھرتا تھا۔ شہریار کو اس سے پہلے ہی یہ امید تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ عام طور پر اس طرح کے لوگ بہروپیے ہوتے ہیں اور کمانے کے مروجہ طریقے اپنانے کے بجائے ایسی راہ ڈھونڈتے ہیں جس سے لوگوں کو لوٹا جا سکے۔ اس سادھو کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ مخبری کے فرائض انجام دینے کے علاوہ لوگوں کی اندھی عقیدت سے فائدہ اٹھا کر بھی مال سمیٹتا ہوگا۔ بہر حال اسے فی الحال اس سادھو کے کردار سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ ابھی تو وہ اسے ایک ایسے شخص کی حیثیت سے پہچانتا تھا جو اسے ڈاکوؤں کے ڈیرے تک پہنچا سکتا تھا چنانچہ کسی بھی قسم کی بحث میں الجھے بغیر اس سے سودے بازی کر لی تھی اور نتیجتاً اب وہ لوگ جنگل کے پُر پیچ راستوں پر سفر کر رہے تھے۔ سادھو ان کا راہنما تھا اسی لیے اس نے اس سے راستے کے بارے میں استفسار کیا تھا۔

''ابھی تو وڈا لمبا رستہ ہے سوہنیو! کیا تھک گئے ہو جو ابھی سے پوچھ تاچھ کر رہے ہو؟'' سادھو کی شخصیت کی قلعی اتر چکی تھی لیکن ظاہر ہے وہ ایک مخصوص انداز میں بات کرنے کا عادی تھا اور یہ عادت چند گھنٹوں میں ختم نہیں ہو سکتی تھی چنانچہ اس سے ابھی بھی اسی ٹون میں بات کر رہا تھا جیسے وہ بڑا گیانی ہو۔

''یہ جو جنگل ہے نا، یہ وڈا انوکھا جادو ہے۔ یہ اتنی آسانی سے کسی کو اپنے اندر رستہ نہیں دیتا۔ مسافر کو اپنی بھول بھلیوں میں بھٹکا کر رکھ دیتا ہے۔ تم تو خوش نصیب ہو جو میرا ساتھ مل گیا ورنہ کہیں بھی نہیں پہنچ سکتے تھے۔'' اس کی لن ترانیاں جاری تھیں اور وہ قطعی بھول چکا تھا کہ جس بات کا احسان جتا رہا ہے اس کے لیے اس نے پوری پوری قیمت وصول کی ہے اور وہ بھی ایڈوانس۔ رقم لینے کے بعد وہ شہریار سے چند گھنٹوں کی مہلت لے کر گیا تھا کہ رقم اپنے گھر والوں تک پہنچا کر واپس آجاؤں گا اور حسبِ وعدہ واپس بھی آگیا تھا۔ رقم لے کر بھاگنے کا یقیناً اس نے اس لیے نہیں سوچا تھا کہ اے سی ضلع سے بگاڑ کر کہاں جائے گا۔



''میں نے تمہیں اتنی رقم باتیں بنانے کے لیے نہیں دی ہے۔ رقم میں نے اس لیے خرچ کی ہے کہ پولیس فورس سے پہلے یا کم از کم ان کے ساتھ ساتھ ڈیرے پر پہنچ سکوں لیکن جس انداز میں تم مجھے لے جا رہے ہو، اس سے تو یہی لگتا ہے کہ پولیس ہم سے سبقت لے جائے گی۔'' سادھو کی فضول گوئی کو وہ ایک حد تک ہی برداشت کر سکتا تھا چنانچہ فوراً ہی اسے اس کی اوقات یاد دلا دی۔

''میں کوشش کر رہا ہوں، پر فرق تو پڑے گا۔ پولیس والے ہم سے پہلے کے نکلے ہوئے ہیں اور گئے بھی میرے بتائے ہوئے راستے سے ہوں گے۔ اب آپ کی شرط کے مطابق ان سے ٹاکرا ہوئے بغیر ڈیرے پر پہنچنے کے لیے مجھے تھوڑا سا راستہ بدلنا پڑا ہے تو فیر ٹیم (ٹائم) تو لگے گا نا۔ ویسے آپ بتاؤ آپ ادھر کیا کرنے جا رہے ہو، وہ بھی ایسے چھپ کے؟ جانا ہی تھا تو آپ پولیس والوں کے ساتھ بھی جا سکتے تھے۔ آپ تو خود سرکاری آدمی ہو۔'' سادھو نے بڑے پتے کا سوال پوچھا تھا لیکن وہ اسے کیا بتاتا کہ وہ وہاں کیوں جا رہا ہے۔

وہ تو بس ایک دیوانگی تھی، ایک آشفتہ سری تھی، تن من میں لگی آگ تھی جو اسے کچھ بھی سوچے سمجھے اور اپنے عہدے کا لحاظ کیے بغیر جنگل میں لیے چلی جا رہی تھی چنانچہ کوئی وضاحت دینے کے بجائے سرد لہجے میں بولا۔ ''فضول سوالات کرنے کے بجائے اپنے کام سے کام رکھو۔ وہاں جا کر میں کیا کروں گا اور کیا نہیں، یہ میرا مسئلہ ہے۔''

''جیسی تہاڈی مرضی سرکار! بندہ تو بے دام غلام ہے۔'' جواباً سادھو نے دانت نکالتے ہوئے ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا۔ اپنی مرضی کے دام وصول کرنے کے بعد خود کو بے دام غلام کہنا ڈھٹائی نہیں تو اور کیا تھا لیکن شہریار نے اسے کچھ جتانا ضروری نہیں سمجھا اور ان کا سفر جاری رہا۔ جنگل کی ہولناکی میں جاری یہ سفر کب ختم ہوتا یہ تو انہیں لے جانے والا سادھو ہی جانتا تھا، وہ تو بس چلے جا رہے تھے کہ کبھی تو منزل پر پہنچیں گے۔ وہ اور مشابرم خان دونوں ہی جنگل سے واقف نہیں تھے اور کلی طور پر سادھو کے رحم و کرم پر تھے۔ چلتے چلتے اچانک ہی مشابرم خان کے گھوڑے کو ٹھوکر لگی اور وہ زمین پر آرہا۔ شہریار نے فوراً ہی اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں اور اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ان لمحات میں وہ سادھو کی طرف سے بالکل بے خبر ہو گیا اور وہ مکار سادھو تو یقیناً تھا ہی موقع کی تلاش میں۔ فوراً ہی اپنے گھوڑے سے اچھل کر اس کے پیچھے اس کے گھوڑے کی پشت پر سوار ہو گیا اور اپنے جھولے نما لباس میں سے کہیں سے ریوالور نکال کر اس کی کنپٹی سے نال لگا دی۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' اس صورتِ حال پر شپٹا جانے کے باوجود شہریار نے اس سے سخت لہجے میں پوچھا۔

''بدتمیزی نہیں مجبوری ہے۔ مجھے حکم ہے کہ آپ کو ہلاک کر دوں۔'' سادھو نے جواب دیا۔

''یہ حکم دینے والا کون ہے؟'' اس نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے سوال کیا۔ سوالات کے ذریعے وہ سادھو کو اپنے ساتھ الجھائے رکھنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ اس دوران بچاؤ کی کوئی صورت نکل سکے۔ غنیمت تھا کہ اس منحوس صورت سادھو نے فوری طور پر اسے قتل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور اسے تھوڑی سی مہلت مل گئی تھی۔

''میں اس شخص کا نام نہیں بتا سکتا۔'' سادھو نے اس کے سوال کے جواب میں اپنی معذوری ظاہر کی۔

''بہت خوب، تم تو بڑے کمال کے آدمی ہو۔ مجھ سے اتنی موٹی رقم لے کر مجھے ہی قتل کرنے پر تلے ہو۔ کیا جس نے تمہیں میرے قتل کا حکم دیا ہے، وہ تمہیں اور بھی زیادہ رقم دے رہا ہے؟ اگر ایسا ہے تو مجھے کھل کر بتاؤ۔ میں اپنی جان بچانے کے لیے تمہیں اس سے ڈبل رقم دوں گا۔'' وہ دیکھ رہا تھا کہ گھوڑے کے ٹھوکر کھانے کے نتیجے میں نیچے گر جانے والا مشابرم خان خود کو سنبھال چکا ہے اور بڑی احتیاط سے حرکت میں بھی آگیا ہے اس لیے خلافِ مزاج لایعنی گفتگو کو طول دینے لگا۔

''کتنی رقم...؟'' سادھو کا لہجہ حرص و طمع سے لتھڑا ہوا تھا۔

''بتایا تو ہے کہ جس کے کہنے پر تم مجھے قتل کرنے آئے ہو، اس سے ڈبل رقم دوں گا۔'' اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی نرمی سے جواب دیا۔ ریوالور کی نال کنپٹی سے لگی ہونے کے باعث وہ صرف ایک ہی سمت میں دیکھتے رہنے پر مجبور تھا اور نہیں دیکھ سکتا تھا کہ مشابرم خان کا متحرک جسم اب کہاں ہے۔ شاید وہ ان لوگوں کی پشت پر چلا گیا تھا اس لیے نظر نہیں آرہا تھا۔

''میں جس کے کہنے پر تمہیں قتل کرنے والا ہوں، وہ بس کام لینا جانتا ہے۔ تمہاری طرح میں اس سے منہ مانگی رقم نہیں لے سکتا۔ اس کی مرضی ہوتی ہے کہ جو چاہے دے دے، ہور اگر نہ بھی دے تو کسی کو شکایت کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔'' سادھو اس کی خواہش کے مطابق باتوں میں الجھ گیا تھا۔ شاید وہ

اس سطح کا آدمی تھا ہی نہیں جس سطح کا کام اسے سونپ دیا گیا تھا۔

''تم جس کے کہنے پر مجھے قتل کرنا چاہتے ہو، اس کا نام بتا بھی دو گے تو کیا حرج ہوگا؟ مرنے کے بعد میں اس کا کچھ بگاڑ تو نہیں سکوں گا۔'' اس نے ایک بار پھر سادھو کو کریدنے کی کوشش کی۔

''ہوسکتا ہے تمہارا ساتھی...'' جواب میں سادھو جانے کیا کہنے جارہا تھا، یکدم ہی اسے احساس ہوگیا کہ مشابرم خان جس جگہ گرا تھا اس جگہ موجود نہیں ہے۔ اس نے بھڑک کر ادھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی لیکن مشابرم خان اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ پھرتیلا تھا۔ اپنے اس پھرتیلے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے سادھو کے سنبھلنے سے پہلے ہی اس کا ریوالور والا ہاتھ اپنے قابو میں کر کے اس کو گھوڑے سے نیچے کھینچ لیا۔ سادھو نے نیچے گرتے ہوئے ایک خوف زدہ سی چیخ ماری۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل کر کہیں دور جا گرا تھا اور اب وہ بالکل نہتا مشابرم خان کے رحم وکرم پر تھا۔ مشابرم خان نے بھی بنا کسی رورعایت کے اس کا چہرہ گھونسوں کی زد پر رکھ لیا اور تابڑ توڑ اتنے گھونسے اسے رسید کیے کہ وہ خون اگلنے لگا۔ اس خون کے ساتھ اس کے بدنما اور پیلے دانت بھی باہر نکل کر گرے۔ مشابرم خان کے گھونسوں نے اس کی بتیسی کے کئی دانت جڑ سے اکھاڑ دیے تھے۔ اگر شہریار اسے اشارے سے نہ روکتا تو شاید وہ منہ توڑ کر ہاتھ میں دے دینے والا محاورہ سچ کر دکھاتا۔

''تم اگر اس شخص کا نام بتا دو جس نے تمہیں مجھے قتل کرنے کا حکم دیا تھا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں ہم سے مزید کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور تم زندہ سلامت یہاں سے لوٹ سکو گے۔'' مشابرم خان کو رکنے کے بعد وہ خود گھٹنوں کے بل بیٹھے خون تھوکتے ہوئے سادھو سے مخاطب ہوا۔

''اگر میں نے آپ کو اس شخص کا نام بتا دیا تو وہ مجھے اور میرے گھر والوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ بہت ظالم ہے اور اس کے حکم پر اس کے کارندے بندے کو چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ دیتے ہیں۔'' سادھو نے خوف زدہ اور کمزور آواز میں جواب دیا۔ اس وقت وہ بُری طرح پھنس چکا تھا۔ شہریار نہ کام قاتلانہ حملہ کرنے کے بعد وہ یہ امید نہیں کر سکتا تھا کہ وہ لوگ اس سے کوئی اچھا سلوک کریں گے۔ دوسری طرف اس کو اس کام پر مامور کرنے والا بھی یقیناً کوئی ایرا غیرا نتھو خیرا نہیں ہوسکتا تھا۔ لالچی سادھو کو قتل جیسے جرم پر آمادہ کرنے کے لیے اس نے موٹی رقم اور اثر رسوخ دونوں ہی کا استعمال کیا ہوگا جب ہی تو وہ اپنی حیثیت بھلا کر ایک اسسٹنٹ کمشنر کو قتل کرنے چلا تھا۔

''اس طرف سے تم اطمینان رکھو۔ تم اگر مجھے اس شخص کا نام بتا بھی دو گے تو میں اس معاملے میں تمہارا نام کہیں نہیں آنے دوں گا۔ نہ ہی ایسی کوئی حرکت کروں گا جس سے وہ یہ سمجھے کہ تم نے مجھے کچھ بتایا ہے۔'' اس نے سادھو کی بزدلی اور خوف کا علاج نرم لہجے میں کیے جانے والے ایک وعدے سے کرنے کی کوشش کی جس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور اپنے منہ سے نکلنے والا خون روک لینے کی کوشش میں مصروف سادھو اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''تم سچ کہہ رہے ہو؟ یہ نہ ہو کہ تم اپنے وعدے سے پھر جاؤ۔'' وہ میلا کچیلا سادھو ''آپ'' اور تم کے درمیان بڑی تیزی سے قلابازیاں کھا رہا تھا۔ عادت اسے ''تم'' کا صیغہ استعمال کرنے پر مجبور کر رہی تھی جبکہ اے سی کے عہدے کا تقاضا تھا کہ وہ شہریار سے ''آپ'' کہہ کر مخاطب ہو۔

''مجھے تم سے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نہ ہی میں جھوٹے وعدے کرنے والا آدمی ہوں۔'' اس کے بے حد روکھے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ خوف میں لپٹے سادھو کو اس کا یقین کرنا پڑا اور وہ دانتوں سے محروم ہو جانے والے اپنے زخمی مسوڑھوں پر زبان پھیرتا ہوا سچ اگلنے پر تیار ہوگیا۔

''مجھے اس کام کے لیے چودھری افتخار عالم نے کہا تھا۔ چودھری صاحب کو جب یہ معلوم ہوا کہ آپ مجھے ڈاکوؤں کے ڈیرے کا راستہ دکھانے کے لیے اپنے ساتھ لے جارہے ہیں تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ کو اصل راستے پر لے جانے کے بجائے جنگل میں اِدھر اُدھر بھٹکاتا رہوں اور فیر جیسے ہی موقع ملے آپ کو قتل کر ڈالوں۔''

''چودھری کو کیسے معلوم ہوا کہ تم میرے ساتھ جانے والے ہو؟'' اس نے بصارت کو محدود کر دینے والی تاریکی کی چادر کے پار سادھو کو گھورتے ہوئے سخت لہجے میں سوال کیا۔ سوال وجواب کے اس سیشن کے دوران میں مشابرم خان نے تینوں گھوڑوں کو ایک درخت کے تنے کے ساتھ باندھ دیا تھا اور اب خود خاموش لیکن ہوشیار کھڑا ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ اس کے تیوروں سے ظاہر تھا کہ اب وہ سادھو کو ایسا کوئی موقع نہیں دے گا کہ وہ دوبارہ شہریار پر حملہ کر سکے۔ پہلے بھی وہ اس کی طرف سے ہوشیار ہی رہا تھا لیکن اتفاق سے اس کے گھوڑے کو لگنے والی ٹھوکر نے سادھو کو موقع فراہم کر دیا تھا۔ دیکھا جائے تو ایک طرح سے یہ بات ان کے حق میں بہتر ہی



ثابت ہوئی تھی۔ لمحاتی برتری حاصل کرنے کے بعد اب سادھو ان کے سامنے پڑا خاک چاٹ رہا تھا اور اس امر پر مجبور ہوگیا تھا کہ اپنی زبان کھول دے۔ دوسری صورت میں یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اسے کوئی بہتر موقع مل جاتا اور وہ اپنے مذموم مقصد میں کامیاب ہوجاتا۔

''انہیں میں نے ہی بتایا تھا۔ میں جب آپ سے گھر والوں کو رقم دینے کا بہانہ کر کے گیا تھا تو چودھری صاحب کے پاس بھی گیا تھا۔'' اس نے جھجکتے ہوئے اعتراف کیا۔ اس کے اس اعتراف نے شہریار کو بُری طرح چونکا دیا۔ اس اعتراف سے صاف ظاہر ہورہا تھا کہ چودھری اور سادھو کے درمیان کوئی خاص گٹھ جوڑ ہے۔

''کیوں؟ تم چودھری کو یہ بتانے کیوں گئے تھے؟'' اس نے اضطرابی انداز میں سوال کیا۔

''میں انہیں بتائے بغیر یہ کام کیسے کر سکتا تھا؟ ان کی مرضی کے بغیر اگر میں آپ کو راستہ دکھانے چل پڑتا تو وہ بعد میں میری چمڑی بھی اُدھیڑ سکتے تھے۔'' اس کے لہجے سے خوف جھلک رہا تھا۔

''تو کیا پولیس کو بھی تم نے چودھری کی اجازت سے راستہ بتایا ہے؟'' اس نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے اندیشے کے تحت پوچھا۔

''اجازت کیا جی، ان کے حکم پر ہی بتایا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مخبر بن کر پولیس والوں کو بتا دو کہ جنگل میں ڈاکو کس جگہ رہ رہے ہیں تو میں نے بتا دیا۔ ان کا حکم نہ ہوتا تو میں بھلا زبان کھول سکتا تھا؟ مجھے تو برسوں سے معلوم ہے کہ ڈاکو کدھر رہ رہے ہیں۔'' اس کے لہجے میں تھوڑا سا تفاخر در آیا تھا۔

''چودھری کو ڈاکوؤں کی مخبری کروانے کی کیا ضرورت پڑی تھی؟'' وہ ذرا حیرت سے بہ آوازِ بلند بڑبڑایا۔

اس کی اس بڑبڑاہٹ کو سادھو نے اپنے لیے نیا سوال تصور کیا اور بے نیازی سے بولا۔ ''یہ تو مجھے نہیں معلوم جی۔ میں تو بس حکم کا غلام ہوں۔ وہ جو حکم دیتے ہیں، میں بجا لاتا ہوں۔'' اس کے بے نیازانہ جواب نے واضح کر دیا کہ وہ سادھو چودھری کا کوئی باقاعدہ ملازم یا کارندہ ہے جو کسی مصلحت کے تحت اپنی اصلیت چھپاتا ہے۔

''کیا تم چودھری اور ڈاکوؤں کے درمیان پیغام رسانی کا کام کرتے ہو؟'' اس نے اپنے ذہن میں سرسرانے والے خیال کو سوال کا روپ دیا۔ اس سوال نے اب تک روانی سے بولتے سادھو کو خاموش کر دیا۔ شاید اسے احساس ہوگیا تھا کہ وہ ضرورت سے کچھ زیادہ بول چکا ہے اور یہ بڑبولا پن اسے نقصان دے سکتا ہے۔

''سنائی نہیں دیا کہ صاحب نے کیا پوچھا ہے؟'' اس کی طرف سے جواب نہ ملنے پر خاموش کھڑے مشابرم خان نے رائفل کی نال سے اسے ٹہوکا دیا۔

سادھو کچھ دیر قبل ہی اس کے طوفانی مکّوں کو سہہ کر اپنی بتیسی کے کئی دانتوں سے محروم ہو چکا تھا اور دانتوں سے محروم عجیب سی آواز میں بول رہا تھا۔ اس نے رائفل کی نال سے اسے ٹہوکا دیا تو وہ سر پر کھڑی اس بلا سے جان چھڑانے کے لیے ایک بار پھر رواں ہونے کے لیے تیار ہوگیا لیکن کوئی بھی نیا انکشاف کرنے سے پہلے اس نے اپنے تحفظات کی ضمانت چاہی اور گھگیائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں تم لوگوں کو سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا، پر آپ کو بھی اپنا وعدہ یاد رکھنا ہوگا کہ چودھری صاحب کے سامنے نہیں میرا نام نہ آنے پائے۔'' اس کی آپ اور تم کے درمیان قلابازیاں مسلسل جاری تھیں۔

''ایک بار کے کہے کو کافی سمجھو۔ تمہارے سامنے تمہارا حرام خور اور بدویانت چودھری نہیں کھڑا ہے جو تمہیں وعدہ خلافی کا ڈر ہو۔ یہ اے سی شہریار عادل ہیں۔ ان کی سچائی اور دیانت داری کی گواہی کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ تمہارے بدذات آقا کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتے رہتے ہیں اور وہ تم جیسوں کے ذریعے انہیں ختم کرنے کے ناپاک منصوبے بناتا رہتا ہے۔ اپنے ان منصوبوں پر اس نے ہمیشہ منہ کی کھائی ہے لیکن باز نہیں آتا۔'' شہریار کے بجائے مشابرم خان نے اسے جواب دیا اور ایک چھوٹی سی جذباتی تقریر کر ڈالی جس کا سادھو پر خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ بولنے پر آمادہ ہوگیا۔

''کل یہ ہے جی کہ میرا تعلق خانہ بدوشوں کے خاندان سے ہے۔ ہم لوگ اِدھر اُدھر گھوم کر ہور مانگ تانگ کر کھانے کے عادی ہیں۔ محنت مزدوری سے جان چراتے ہیں لیکن ہر وقت گھومتے پھرتے رہنے کی وجہ سے جنگلوں ہور ویرانوں سے نہیں ڈرتے۔ میں بھی جب دل میں آتا تھا، جنگل میں نکل جاتا تھا۔ چودھری صاحب کو کسی طرح میرے بارے میں خبر ہوگئی۔ انہوں نے کہا کہ میری ملازمت میں آجا۔ کام یہی ہوگا جو تو ابھی کرتا ہے۔ ہر طرف گھومنا پھرنا، پر اپنے کان ہور آنکھیں کھلی رکھنا۔ جدھر میرے خلاف کوئی گل ہو، مجھے بتا دینا۔ میں راضی ہوگیا تو فیر انہوں نے مجھے دو جا کام بتایا۔ یہ کام جنگل میں ڈاکوؤں کے ڈیرے پر پیغام لانے لے جانے کا تھا۔ میرے لیے اس میں بھی کوئی مشکل نہیں تھی اس لیے یہ بھی آرام نال کرنے لگا۔ چودھری صاحب جو کچھ دیتے تھے، وہ اپنی جگہ تھا... ہور لوگ عقیدت سے جو تھما دیتے تھے، وہ

اپنی جگہ۔ میں نے اپنے گھر والوں کو برادری سے توڑ کر ادھر پیر آباد میں ہی بسا لیا۔ آپ نے مجھے جو رقم دی تھی، وہ میں نے اپنے گھر والوں کو پہنچا کر چودھری صاحب تک آپ کے پروگرام کی خبر پہنچا دی تھی۔ جواب میں انہوں نے مجھے آپ کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ اس حکم پر میں ڈر گیا، پر انکار کی بھی ہمت نہیں تھی۔ اگر میں انکار کرتا تو چودھری صاحب آپ سے پہلے میرا جنازہ اٹھنے کا بندوبست کر دیتے اسی لیے میں مان گیا، پر اپنی تو قسمت ہی خراب ہے۔ ایک طرف سے جان بچا کر نکلا تو دوسری طرف سے پکڑا گیا۔ آپ کی مرضی ہے کہ معافی دے دو یا سزا دے ڈالو۔"

وہ ایک بار پھر رونے والا ہو گیا لیکن وہ سادھو کی حالت سے زیادہ موجودہ حالات کے تجزیے میں الجھا ہوا تھا۔ یہ بات قطعی ناقابلِ فہم تھی کہ چودھری نے ڈاکوؤں کی مخبری کیوں کروائی۔ وہ تو اس کے پالتو پٹھو تھے جن سے ابھی کچھ عرصہ قبل اس نے شہریار کے بنگلے پر ڈاکے کا کام بھی لیا تھا۔ شاید ان ڈاکوؤں نے اس کی کوئی حکم عدولی کی تھی جس کی وجہ سے وہ بھڑک گیا اور کوشش کی تھی کہ ڈاکو پولیس کے ہاتھوں آپریشن میں مارے جائیں۔ یہ باغی ٹولہ ختم ہوتا تو وہ نئی بھرتیاں آرام سے کر سکتا تھا۔ نئے آنے والے ڈاکو بھی اس کے فرماں بردار ہوتے لیکن یہ سب تو بعد کی باتیں تھیں۔ شہریار کو تو فی الحال موجودہ صورتِ حال سے نمٹنا تھا۔

"ہم ڈیرے سے کتنی دور ہیں؟" ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے سادھو سے دریافت کیا۔

"بہت دور ہیں۔ آپ کو اصل راستے سے بھٹکانے کے لیے میں جنگل میں اِدھر اُدھر لے کر پھر رہا تھا، اس چکر میں ہم ڈیرے تک جانے والے راستے سے کافی دور نکل آئے ہیں۔" اس نے شرمندہ سی آواز میں بتایا۔

"او کے... جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب تم ہمیں کسی ایسے راستے سے لے کر جاؤ گے کہ ہم کم سے کم وقت میں ڈیرے تک پہنچ سکیں۔" اس نے دوٹوک انداز میں سادھو کو حکم سنایا جسے ظاہر ہے اسے قبول ہی کرنا تھا۔ ڈیرے پر جانے کا فیصلہ ہو گیا تو وہ لوگ ایک بار پھر سفر کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ اس بار وہ اور مشابرم خان دونوں ہی پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ محتاط تھے۔ ایک بار سادھو کے وار سے بچنے کے بعد وہ اسے دوبارہ کوئی موقع فراہم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ چودھری کے لیے کام کرنے والا یہ ڈھونگی سادھو کب دوبارہ اپنے ادھورے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے پر تل جاتا۔ دوبارہ شروع ہونے والا یہ سفر واقعی طویل ثابت ہوا لیکن انہیں یقین تھا کہ سازش کھل جانے کے بعد سادھو دوبارہ انہیں بھٹکانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ ان کا یہ یقین غلط نہیں تھا۔ گھنٹا بھر بعد ہی سنائی دینے والی فائرنگ کی آوازوں نے تصدیق کر دی کہ سادھو انہیں درست سمت میں لے کر جا رہا ہے۔ ان سے بہت پہلے نکلنے والی پولیس فورس یقینی طور پر ڈیرے تک پہنچ کر اس کا محاصرہ کر چکی تھی اور اب پولیس اور ڈاکوؤں کے درمیان کانٹے کا مقابلہ جاری تھا۔ سادھو کے علاوہ اب یہ آوازیں بھی ان کی راہ نما بن چکی تھیں۔ وہ ایک جوش کے عالم میں سفر کر رہے تھے۔ جوش کی اس کیفیت میں بھی وہ سادھو کی طرف سے بے خبر نہیں ہوئے تھے۔ خیر گزری اور اس نے مزید کوئی گڑبڑ نہیں کی۔

"بس اب یہاں سے ڈیرا تھوڑی ہی دور ہے۔ ہمیں اب ہور آگے نہیں جانا چاہیے ورنہ ہم میں سے کسی کو گولی بھی لگ سکتی ہے۔" کافی طویل سفر طے کرنے کے بعد سادھو نے ایک مقام پر اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں۔ اس کا کہنا درست ہی لگ رہا تھا۔ اس مقام پر فائرنگ کی آواز اتنی بلند تھی کہ لگتا تھا ابھی چند گولیاں اس طرف آئیں گی اور انہیں چاٹ لیں گی۔ فائرنگ کی آواز سے صاف ظاہر تھا کہ دو گروہوں کے درمیان مقابلہ ہو رہا ہے۔ یقینی طور پر ڈاکو پولیس کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے بجائے مقابلے پر اتر آئے تھے اور یہ مقابلہ کسی ایک فریق کے پسپائی اختیار کرنے تک جاری رہنا تھا۔ شہریار کے نزدیک پولیس فورس کی کامیابی کے امکانات زیادہ روشن تھے کیونکہ انہوں نے باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ ڈیرے پر چڑھائی کی تھی اور جدید اسلحے سے لیس تھے۔ اسلحے کی تو خیر ڈاکوؤں کے پاس بھی کوئی کمی نہیں ہو گی لیکن ان کی بے خبری میں ہونے والا یہ آپریشن پولیس فورس کو ان پر برتری دلانے میں اہم کردار ادا کر سکتا تھا۔ دوسری طرف سے وہ چودھری کی سازش کا بھی شکار ہوئے تھے۔ وجہ جو بھی رہی ہو لیکن حقیقت میں چودھری نے ان کی پیٹھ میں چھرا گھونپا تھا اور برسوں کی دوستی کے بدلے میں آج خود انگلی پکڑا کر پولیس کو ان کی کمین گاہ تک لے آیا تھا۔ اگر چودھری کا یہ تعاون جو کہ اس نے سادھو کی صورت میں کیا تھا، شامل نہ ہوتا تو پولیس کو اس ٹھکانے تک پہنچنے میں ہی اچھا خاصا وقت لگ جاتا۔ اب بالکل ناک کی سیدھ میں چلتی ہوئی وہاں پہنچی تھی اور آرام سے اپنی کارروائی شروع کر دی تھی۔ وہ لوگ جس جگہ کھڑے تھے وہاں سے فائرنگ کی آوازوں کے ساتھ ساتھ پولیس والوں کی نقل و حمل بھی صاف محسوس ہو رہی تھی اور اس جگہ سے آگے یقیناً رسکی ہو سکتا تھا لیکن وہ اتنا سفر طے کر کے صرف دو



تماشا دیکھنے تو نہیں آیا تھا۔ اسے اپنے طور پر بھی کچھ کرنا تھا چنانچہ سادھو کے مشورے پر کان دھرے بغیر اٹل لہجے میں بولا۔

"ہم یہاں نہیں رک سکتے۔ ہمیں آگے جانا ہے۔"

"مم... مگر آگے خطرہ ہے۔" سادھو خوف زدہ لہجے میں بولا۔

"یہ کوئی غیر متوقع بات نہیں ہے۔ ہم جس جگہ آئے ہیں اس کے بارے میں پہلے ہی سے جانتے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ڈاکوؤں کے ڈیرے پر جہاں پولیس آپریشن جاری ہے، خطرہ نہ ہو؟ ہمیں اسی خطرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آگے بڑھنا ہو گا اور یہ کام ہم تمہاری مدد سے کریں گے۔ تمہیں ہمیں کسی محفوظ راستے سے ڈیرے کے اندر تک پہنچانا ہو گا۔"

"ہم بیکار میں مارے جائیں گے صاحب! گولی کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ یہ کدھر کا بھی رخ کر لیتی ہے اور کسی کو بھی لمبا لٹا دیتی ہے۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔" سادھو گھگیایا۔

"اگر انکار کرو گے، تب بھی مارے جاؤ گے۔ ادھر سے چلنے والی گولیوں سے بچنے کا پھر بھی چانس ہے لیکن یہ گولی تو سیدھی تیرے بھیجے کو ہی اڑائے گی۔" سادھو کی حجت بازی کا علاج کرنے کے لیے مشابرم خان نے رائفل کی نال اس کی پیشانی کے عین وسط میں ٹکا دی۔ موت سے ڈرنے والا وہ سادھو خوفناک رائفل کی نال اپنے ماتھے پر پا کر بادلِ ناخواستہ راضی ہو گیا۔ اس کی راہنمائی میں وہ ایک ایسی پگڈنڈی پر پہنچ گئے جو بہت واضح نہیں تھی اور کہیں کہیں سے راستہ بالکل ہی معدوم معلوم ہوتا تھا لیکن سادھو جس اعتماد سے اس راستے پر چل رہا تھا، اس سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ اس راستے کو بارہا استعمال کر چکا ہے۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ سنتے وہ تینوں محتاط قدموں سے آگے بڑھتے رہے۔ اندھیرے میں انہیں کبھی کبھار پولیس والوں میں سے کسی کی جھلک نظر آ جاتی تھی لیکن ابھی تک کسی سے براہِ راست سامنا نہیں ہوا تھا۔ بعض گولیاں بھی ان کے بالکل قریب سے سنسناتی ہوئی گزریں اور ہر بار سادھو کا دم حلق میں آ گیا لیکن مشابرم خان نے اسے رکنے نہیں دیا۔ وہ بے جگر آدمی تھا اور شہریار کا ساتھ نبھاتے ہوئے اسے اس بات کی قطعی فکر نہیں تھی کہ خود اس کی اپنی جان بھی خطرے میں تھی۔

گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور سنسناہٹ کے کسی قدر عادی ہوتے وہ آگے بڑھ رہے تھے کہ ایک کان پھاڑ دھماکے نے ان کے قدموں کو لرزا دیا۔ پہلے ہی سے خوف زدہ سادھو اس دھماکے کے اثر سے زمین پر گر گیا۔

"شاید ڈاکو محاصرہ توڑنے کے لیے ہینڈ گرینیڈ استعمال کر رہے ہیں۔" اس نے خود کو سنبھال کر دھماکے کی آواز سے فاصلے کا تعین کرتے ہوئے تبصرہ کیا جس کے جواب میں مشابرم خان نے اپنے سر کو تائیدی جنبش دی۔

"میں اب ہور آگے نہیں جاؤں گا صاحب۔" زمین پر گرے خوف زدہ سادھو نے روہانسی آواز میں دہائی دی۔ وہ اس کی آواز پر کان دھرتے اس سے قبل فضا پے در پے دھماکوں کی آواز سے گونج اٹھی۔ ان دھماکوں کے ساتھ ہی کسی مقام پر آگ بھڑک اٹھی اور ماحول قدرے روشن ہو گیا۔

"یہ احمق کیا کر رہے ہیں۔ اس طرح تو بہت زیادہ لوگ مارے جائیں گے اور جنگل الگ تباہ ہو گا۔" یہ اندازہ کرنے کے بعد کہ دھماکے پولیس کی کارروائی کا نتیجہ ہیں، وہ زور سے بولا اور اس سمت میں بھاگ کھڑا ہوا جہاں اسے پولیس والوں کی موجودگی واضح طور پر محسوس ہو رہی تھی۔ مشابرم خان بھی اس کے پیچھے پیچھے ہی دوڑا تھا۔ سادھو کو انہوں نے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ نہتا ہونے کی وجہ سے وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا بلکہ اس کی پہلی کوشش یہی ہو گی کہ کسی طرح اپنی جان بچا کر یہاں سے فرار ہو جائے۔

"ہینڈز اَپ۔" وہ دونوں جیسے ہی پولیس والوں کے قریب پہنچے، کئی رائفلیں ان کی طرف اٹھ گئیں۔

"فرینڈز۔" شہریار نے بلند آواز میں بتایا۔

"کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو؟" اس سے سخت لہجے میں پوچھا گیا۔

"یہ میں ڈی ایس پی منظور کو بتاؤں گا۔ مجھے اس کے پاس لے چلو۔" اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

"ارے یہ تو اپنے اے سی صاحب ہیں۔" اس اثنا میں کسی نے اسے شناخت کر لیا اور حیرت بھرے لہجے میں انکشاف کیا۔ شناخت کر لیے جانے کے بعد سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کہ اس کی فرمائش پوری نہ کی جاتی۔ اسے اور مشابرم خان کو ڈی ایس پی منظور کے پاس پہنچایا گیا۔ اس آپریشن کو وہی لیڈ کر رہا تھا اور اس کے چہرے پر موجود چمک بتا رہی تھی کہ وہ کامیابی کے قریب ہے۔ دوسری طرف سے ہونے والی فائرنگ میں واضح کمی بھی اس کی کامیابی کا اعلان کر رہی تھی۔ چند لمحوں قبل جو زوردار دھماکے سنائی دیے تھے، انہوں نے پولیس کی اس برتری میں یقیناً بڑا کردار ادا کیا تھا۔

"آپ یہاں سر؟" ڈی ایس پی منظور لپکتے اپنے

سامنے پا کر سخت حیران ہوا۔

''ہاں، مجھے یقین تھا کہ تم کوئی نہ کوئی حماقت ضرور کرو گے اس لیے میں خود اس آپریشن کی نگرانی کے لیے یہاں آیا ہوں۔ اس آپریشن کے لیے تمہارا انتخاب میری سفارش پر ہوا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہاری وجہ سے مجھے کوئی شرمندگی اٹھانی پڑے۔'' اس نے سختی سے جواب دیا۔

''آپ کو خود کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہیے تھا سر! ہم کامیابی کے بالکل قریب ہیں۔ ایک دو راکٹ لانچر مزید فائر کریں گے تو ان سب کا قیمہ بن جائے گا۔'' اس نے جوش سے بتایا اور ساتھ ہی مزید راکٹ لانچر فائر کرنے کا حکم دینے لگا۔

''رک جاؤ احمق! وہاں صرف ڈاکو نہیں ہیں۔ وہاں کچھ مغویوں کی موجودگی کی بھی اطلاع ہے۔ کیا تمہیں اس سلسلے میں بریفنگ نہیں دی گئی تھی؟'' وہ غصے سے بولا تو ڈی ایس پی منظور کے چہرے پر شرمندگی کے آثار نظر آئے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ یہ اہم بات فراموش کر چکا تھا۔

''مجبوری تھی سر! اگر ہم انہیں جواب نہیں دیتے تو وہ ہینڈ گرینیڈز کی بارش کرتے ہوئے یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتے۔ اس وقت ہماری حکمتِ عملی نے ان کے قدم اکھاڑ دیے ہیں اور وہ پسپا ہونے والے ہیں۔'' اس کے پاس اپنے عمل کا جواز موجود تھا۔

''اور اگر ڈاکوؤں کے پسپا ہونے تک یہ جنگل ہی تباہ ہو گیا تو پھر... کچھ اندازہ ہے تمہیں کہ یہاں بھڑکنے والی آگ کتنے بڑے نقصان کا سبب بنے گی؟'' اس کا غصہ مزید بڑھا۔ ملکی املاک اور افراد کی سلامتی کے لیے وہ ویسے ہی بڑا حساس تھا اور یہاں تو معاملہ ہی الگ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ڈاکوؤں کے اس ڈیرے پر ماہ بانو بھی موجود ہے بلکہ ماہ بانو کی وہاں موجودگی ہی تو اسے یہاں کھینچ کر لائی تھی ورنہ اس قسم کے کسی آپریشن میں دخل دینا اس کے فرائضِ منصبی میں شامل نہیں تھا۔ اس نے اگر اپنی حدود سے تجاوز کیا تھا تو صرف ماہ بانو کی وجہ سے اور یہاں جس انداز میں کارروائی کی جا رہی تھی، اس سے ماہ بانو کی سلامتی کو شدید خطرہ تھا۔ آگ اور بارود کے کھیل میں کچھ پتا نہیں چلتا کہ کون زد میں آ جائے۔ یہ کھیل ظالم و مظلوم دونوں کے لیے یکساں خطرناک ہوتا ہے۔ اگر ماہ بانو کو کچھ ہو جاتا تو وہ زندگی بھر خود کو معاف نہیں کر سکتا تھا کیونکہ یہ آپریشن شروع ہی اس کے ایما پر ہوا تھا۔

''اس آپریشن کو شروع کرنے سے پہلے... یہ خدشہ تو ذہنوں میں تھا ہی سر اس لیے ہم اس سلسلے میں انتظامات کر کے چلے تھے۔ اللہ نے چاہا تو ہماری کارروائی کے نتیجے میں کوئی بڑا نقصان نہیں ہوگا۔ ویسے آپ اطمینان رکھیے کہ اب ہم مزید راکٹ لانچر یا ہینڈ گرینیڈز استعمال نہیں کریں گے۔ آپ فائرنگ کی آواز پر غور کریں تو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ دوسری طرف سے فائرنگ میں واضح کمی ہوئی ہے۔ یقیناً اب وہاں ہمارا مقابلہ کرنے کے لیے بہت کم لوگ رہ گئے ہیں۔ میں میگافون پر اعلان کرواتا ہوں کہ باقی بچ جانے والے افراد اگر ہتھیار ڈال دیں تو انہیں مکمل قانونی تحفظ فراہم کیا جائے گا۔'' اس کے اعتراضات کے جواب میں اس کی تشفی کروا کر ڈی ایس پی منظور اپنے کسی ماتحت کی طرف رخ موڑ گیا اور اسے ہدایات دینے لگا۔

شہریار کے ساتھ اس کی مکالمے بازی کے دوران بھی یہی ماتحت اس کی ذمے داری سنبھالے ہوئے تھا۔ ذرا دیر میں میگافون پر اعلان کیا جانے لگا۔ اعلان کئی بار دُہرایا گیا اور ڈاکوؤں کی یقین دہانی کے لیے پولیس کی طرف سے فائرنگ کا سلسلہ موقوف کر دیا گیا۔ اس حکمتِ عملی کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا اور ڈاکوؤں کی طرف سے کی جانے والی جوابی فائرنگ کی آوازیں بھی آہستہ آہستہ معدوم ہوتی چلی گئیں۔ اس خاموشی کا مطلب تھا کہ وہ لوگ گرفتاری دینے پر آمادہ ہیں۔ عرصہ دراز سے ترقی کے خواہاں ڈی ایس پی منظور کا چہرہ اس بدلتی ہوئی صورتِ حال پر خوشی سے چمکنے لگا۔ اتنی بڑی کامیابی اس کے کریڈٹ پر آ جانے کے بعد کوئی اس کی ترقی کو نہیں روک سکتا تھا۔ ترقی اور انعام ملنے کے ساتھ میڈیا پر اس کی جو ''واہ واہ'' ہوتی، وہ اپنی جگہ تھی۔ یقینی طور پر اس وقت وہ خود کو ایک ہیرو تصور کر رہا تھا۔ یہ اور بات کہ اسے یہ ہیرو شپ دلانے میں ان تیاریوں کا بڑا ہاتھ تھا جو اس آپریشن کے آغاز سے قبل کی گئی تھیں۔ آئی جی مختار مراد نے اس آپریشن کے لیے اسلحے سے لے کر افرادی قوت تک سب کچھ بڑے پیمانے پر فراہم کیا تھا۔ یہ ڈی ایس پی منظور کی خوش قسمتی تھی کہ اس مہم کے لیے اس کا چناؤ کیا گیا تھا۔

آخر کار ہاتھ سر سے اوپر بلند کیے پہلا ڈاکو نمودار ہوا۔ وہ قطعی غیر مسلح تھا۔ اس کے سامنے آتے ہی اسے فوراً ہی گرفتار کر کے ہتھکڑی لگا دی گئی۔ پھر تو جیسے سلسلہ ہی بن گیا۔ وہ کل آٹھ ڈاکو تھے جنہوں نے پولیس کو گرفتاری پیش کی تھی۔ گرفتاری کا یہ عمل مکمل ہونے تک سورج کی پہلی کرن نمودار ہو گئی۔ اس کرن کے نمودار ہونے کے ساتھ گرفتار شدہ ڈاکوؤں کو پولیس کی ایک ٹیم کے ساتھ روانہ کر دیا گیا جبکہ دوسری نیم تمام تر حفاظتی تدابیر کے ساتھ ڈیرے کی تلاشی لینے کے لیے میدان میں اتر پڑی۔ اس ٹیم کے افراد کا پوری طرح چوکس

رہنا اس لیے ضروری تھا کہ کچھ معلوم نہیں تھا کہ کہیں کوئی ڈاکو چھپا بیٹھا ہو اور اچانک ہی حملہ کر دے۔ تیسری ٹیم کو ڈیرے کے اردگرد کے علاقے میں سرچ آپریشن کرنا تھا تاکہ اگر کوئی ڈاکو ڈیرے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہو تو اسے بھی گرفتار کیا جا سکے۔

شہر یار اور مشابرم خان دوسری ٹیم کے افراد کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اس موقع پر اسے ڈی ایس پی منظور نے روکنے کی کوشش کی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ شہر یار کو کوئی نقصان نہ اٹھانا پڑے لیکن وہ کسی طور رکنے پر آمادہ نہیں ہوا۔ گرفتاری دینے والے ڈاکوؤں کے ساتھ ماہ بانو ڈیرے سے باہر نہیں آئی تھی اور ڈاکوؤں نے اس کے بارے میں کوئی خبر بھی نہیں دی تھی چنانچہ وہ خود اسے تلاش کرنا چاہتا تھا۔ ڈی ایس پی منظور بھی اسی ٹیم کے ساتھ تھا۔ اس کی قیادت میں ڈیرے کی تلاشی کا عمل شروع ہوا تو کئی لاشیں اور زخمی سامنے آئے۔ زخمی ہونے والوں میں ایک موٹی عورت بھی شامل تھی اور وہ اس ڈیرے پر واحد نسوانی وجود ثابت ہوئی تھی۔ اس عورت کے پیٹ میں گولی لگی تھی اور اس کی حالت کافی نازک تھی۔ اس سے ڈیرے پر مزید عورتوں کی موجودگی کے بارے میں استفسار کیا گیا تو اس نے اعتراف کیا کہ ڈیرے پر ........ للی نام کی ایک لڑکی کے علاوہ حال میں ہی اغوا کر کے لائی جانے والی ماہ بانو بھی موجود تھی لیکن آپریشن شروع ہونے کے بعد جب ڈیرے پر بھگدڑ مچی اور اس نے ان دونوں خواتین کے ساتھ مل بیٹھنے کی کوشش کی تو اسے ان دونوں میں سے ایک بھی نہیں مل سکی۔ ان کے نہ ملنے پر اس نے یہی گمان کیا کہ بھگدڑ میں وہ دونوں اِدھر اُدھر ہو گئی ہیں لیکن پولیس کو پورا ڈیرا چھان مار لینے کے باوجود وہ دونوں کہیں نہیں ملی تھیں جس پر یہی تصور کیا گیا کہ وہ دونوں کسی طرح وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی ہیں۔ اب ان کے ملنے کا واحد امکان یہی تھا کہ وہ ڈیرے کے اردگرد سرچ آپریشن کرنے والوں میں سے کسی کو مل جاتیں۔ فی الحال تو شہر یار کو شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ جس کے لیے یوں کسی بھی شے کی پروا کیے بغیر یہاں تک دوڑا آیا تھا، وہی غائب تھی۔ دن چڑھے جب وہ تھکا ماندہ جنگل سے واپس لوٹ رہا تھا تو بے حد خاموش تھا۔ قسمت ایک بار پھر اسے دھوکا دے گئی تھی اور وہ تمام تر کوشش کے باوجود ماہ بانو کو نہیں پا سکا تھا۔ شاید کہ اس گل بدن کو پانا اس کے نصیب میں ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

''آفتاب! میری امید...؟'' وہ دونوں نرس شبانہ کی کزن نازیہ کے ساتھ حیدرآباد چلے آئے تھے۔ حالات اس نہج پر آ گئے تھے کہ ان کا مزید میرپور خاص میں رکنا ممکن نہیں تھا۔ یہ بات بالکل واضح تھی کہ چودھری کے جن گرگوں نے اسپتال پر حملہ کیا تھا، وہ ان کی تلاش میں اس گھر تک بھی ضرور پہنچے ہوں گے جہاں ان کی رہائش تھی۔ چودھری کے گرگوں کے تیور دیکھنے کے بعد ان کا میرپور خاص میں ہی رکے رہنا کسی طور مناسب نہیں تھا۔ وہ اگر کسی دوسری جگہ چھپتے بھی تو چھوٹا شہر ہونے کی وجہ سے جلد دھر لیے جاتے۔ چودھری کے گرگے بُو گیر کتوں کی طرح ہر جگہ ان کی بُو سونگھتے پھرتے۔ میرپور میں ہی رکے رہنا خود کو چوہے دان میں پھنسانے کے مترادف تھا۔ وہاں ان کے پاس کوئی ایسا قابلِ ذکر ٹھکانا بھی نہیں تھا کہ جہاں وہ طویل عرصے تک رکے رہتے۔ اس لیے سب سے زیادہ مناسب یہی تھا کہ اس سے قبل کہ شہر سے نکاسی کے راستے پر چودھری کے گرگے ڈیرا ڈالتے، وہ وہاں سے نکل جاتے۔ اچھی بات یہ تھی کہ میرپور والے گھر میں ان کا کوئی ایسا سامان نہیں تھا جس کے ہاتھ سے نکل جانے سے کسی بڑے نقصان کا احساس ہوتا۔ وہ پہلے ہی بہت کم ساز و سامان کے ساتھ وہاں رہ رہے تھے۔ ضروری کاغذات، شناختی کارڈ، اے ٹی ایم و کریڈٹ کارڈز اور رقم جیسی ضروری چیزوں کو حالات کے پیشِ نظر آفتاب نے ہمہ وقت اپنے ساتھ رکھنے کی عادت بنالی تھی اور اس وقت بھی یہ ساری ضروری چیزیں اس کی قمیص کے نیچے پولیتھین بیگ میں محفوظ اس کے سینے سے لگی ہوئی تھیں۔ زیرِ تصنیف ناول کا مسودہ وہ پہلے ہی پبلشر کو بھجوا چکا تھا۔ اپنی خواہش کے مطابق وہ بیٹی کی پیدائش سے قبل ناول چھپوانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا لیکن مسودہ تقریباً تیار تھا جسے وصول کر کے پبلشر نے اس کی ساکھ کی بنیاد پر پیشگی چیک بھی دے دیا تھا۔ گھر پر اس کی اگر کوئی خاص شے رہ گئی تھی تو وہ ایک آدھ ادھورا کام تھا۔ اس کے علاوہ باقی استعمال کے سامان کی اتنی اہمیت نہیں تھی۔ وہ چیزیں ضرورت کے مطابق مزید خریدی جا سکتی تھیں، بس اصل مسئلہ ان کی نوزائیدہ بیٹی امید کا تھا۔ وہ افراتفری میں اسے اسپتال کی نرسری میں ہی چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو گئے تھے لیکن اس سلسلے میں بھی ان کے پاس ایک مضبوط دلاسا موجود تھا۔ نرس شبانہ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ بچی کو اپنی تحویل میں لے کر کسی نہ کسی طرح ان تک پہنچا دے گی اور اب وہی ان کی امیدوں کا مرکز تھی۔ حیدرآباد پہنچ کر انہوں نے نازیہ کو کسی مشکل میں ڈالنا پسند نہیں کیا تھا اور شکریے کے ساتھ اس سے الگ ہو کر درمیانے درجے کے ایک ہوٹل میں آ ٹھہرے تھے۔ ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر



اس نے کشور کو بستر پر لٹایا تو اس کے ہونٹوں سے پہلا سوال اپنی بیٹی کی بابت نکلا۔ راستے میں بھی یقیناً وہ اس کے بارے میں سوچتی رہی تھی لیکن زبان سے کچھ کہنے سے گریز کیا تھا۔ اس کے اس ضبط کا بندھن اگر ٹوٹا بھی تھا تو بس اس حد تک کہ وقفے وقفے سے اس کی آنکھیں بار بار چھلک پڑتی تھیں مگر اب جبکہ وہ ایک محفوظ ٹھکانے پر موجود تھے تو اس میں مزید برداشت کا یارا نہیں رہا تھا چنانچہ سوال اس کے لبوں پر آ گیا تھا۔

''آپ فکر نہیں کریں۔ میرے پاس شبانہ کا نمبر ہے۔ میں ابھی اسے فون کر کے امید کے بارے میں پوچھتا ہوں۔ آپ اس دوران ریلیکس کریں۔ انشاء اللہ جلد ہماری بچی ہمارے پاس ہو گی۔'' آفتاب نے اسے دلاسا دیا اور خود فون کرنے کے لیے کمرے سے باہر نکل گیا۔ خود اس کا موبائل تو بھاگ دوڑ میں کہیں گر گیا تھا اور وہ ایک بار پھر رابطوں سے محروم خالی ہاتھ تھا۔ اگر اس کے پاس موبائل ہوتا تو یہ ممکن تھا کہ شبانہ از خود فون کر کے اسے امید کے بارے میں خبر دے دیتی لیکن اب تو ہر صورت میں اسے ہی رابطہ کرنا تھا۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر سیڑھیاں طے کر کے ہوٹل کی نچلی منزل پر پہنچا۔ یہاں ریسپشن پر فون کرنے کی سہولت تھی لیکن اس نے ہوٹل کے فون کو استعمال کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ پہلے ایک بار سنگین غلطی کر چکا تھا اور نتیجے میں اپنے محفوظ ٹھکانے سے محروم ہو گیا تھا چنانچہ اب کسی بداحتیاطی کی قطعی گنجائش نہیں تھی۔ میرپور خاص سے حیدرآباد تک کا راستہ طے کرنے میں وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ چودھری کے گرگے اس کی کس غلطی کی وجہ سے اسپتال تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ یقینی طور پر چودھری کو کوریئر کے ذریعے بھیجا جانے والا خط اسے ان کا سراغ دے گیا تھا اور اس نے فوراً اپنے گرگوں کو اسپتال پر چڑھا دیا تھا۔ لفظوں کی دنیا سے تعلق رکھنے والے آفتاب کی ہر خوش امیدی چودھری کے اس ردِعمل کے بعد دم توڑ گئی تھی۔ پتا نہیں کیوں اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ نواسی کی اطلاع پا کر چودھری کا دل نرم ہو جائے گا اور وہ بے شک کشور کو دوبارہ اپنانے پر راضی نہیں ہو سکے گا لیکن اس حد تک تو ضرور نرم پڑے گا کہ اس کا پیچھا کرنا چھوڑ کر انہیں ان کی دنیا میں سکون سے رہنے دے گا... مگر اب اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ چودھری کی فطرت سانپ کی سی ہے جو اپنے ہی انڈوں اور بچوں کو ہڑپ کر ڈالتا ہے۔ اب وہ آئندہ اس سے بے انتہا محتاط رہنا چاہتا تھا چنانچہ ہوٹل سے نکل کر کافی دور تک پیدل چلتا چلا گیا اور پھر ایک پبلک کال آفس نظر آنے پر اس کا رخ کر لیا۔ اس کی خواہش پر وہاں موجود لڑکا اٹھ کر باہر چلا گیا اور اسے نمبر ملانے اور بات کرنے کی مکمل آزادی دے دی۔ کال چارجز کی اسے اس لیے فکر نہیں ہو گی کہ بعد میں یونٹ چیک کر کے وہ آرام سے اس سے چارجز وصول کر سکتا تھا۔ لڑکے کے باہر نکلنے کے بعد اس نے شبانہ کا دیا ہوا فون نمبر جیب سے نکالا اور اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ دو تین گھنٹیوں کے بعد شبانہ نے اس کی کال وصول کر لی۔

''ہیلو، کون بات کر رہا ہے؟'' آواز سے وہ کچھ خوف زدہ اور بجھی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''مس شبانہ! میں آفتاب احمد بات کر رہا ہوں۔ مجھے آپ سے اپنی بیٹی کے بارے میں پوچھنا تھا۔ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ بچی کو اسپتال کی نرسری سے نکال کر مجھ تک پہنچانے میں مدد کریں گی۔ میں آپ سے یہی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس سلسلے میں کوئی پیش رفت ہو سکی یا نہیں؟'' وہ اپنی بیٹی کی طرف سے اتنا زیادہ متفکر تھا کہ شبانہ کی خیریت دریافت کرنے یا کسی دوسری رسمی گفتگو میں الجھنے کی کوشش ہی نہیں کی اور براہِ راست اپنے مطلب پر آ گیا۔

''سوری آفتاب صاحب! میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔'' اس کو دوسری طرف سے شبانہ کا جو جواب سننے کو ملا، اسے سن کر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ یہ تو وہی معاملہ تھا کہ جن پر تکیہ تھا، وہی پتے ہوا دینے لگے۔ تعاون کا بھرپور یقین دلانے والی شبانہ یوں صاف انکار کر ڈالے گی، اس کی تو اسے ذرا امید نہیں تھی۔

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں مس شبانہ؟ ہم نے تو آپ کے بھروسے پر آپ کا مشورہ قبول کرتے ہوئے شہر چھوڑا تھا۔'' وہ کوشش کے باوجود اپنے لہجے میں غصے کی جھلک نمودار ہونے سے نہیں روک سکا۔

''میں مجبور ہوں آفتاب صاحب! ورنہ یقین جانیے کہ مجھے خود آپ کی مدد کر کے دلی خوشی ہوتی۔'' شبانہ کی آواز گُندھ گئی۔

''میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ مسئلہ کیا ہے؟ وہاں سب خیریت تو ہے نا؟'' اس کا غصہ فوری طور پر گہری تشویش میں ڈھل گیا۔

''نہیں، یہاں بالکل بھی خیریت نہیں ہے۔ میں بہت شرمندہ ہوں آفتاب صاحب کہ میں آپ کو ایک بُری خبر سنانے جا رہی ہوں۔'' شبانہ کے الفاظ پر اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ یقیناً صورتِ حال اتنی گمبھیر تھی کہ شبانہ کو تمہید باندھنی پڑ رہی تھی۔

''میں سن رہا ہوں مس شبانہ! جو بھی بات ہے، آپ مجھے کھل کر بتا دیں۔'' آخر اس نے اپنا تمام تر حوصلہ مجتمع کرتے ہوئے شبانہ سے پوچھا۔

''آپ لوگوں کے نکلنے کے بعد آپ کے پیچھے آنے والے غنڈے بھی اسپتال سے فرار ہو گئے تھے۔ کسی نے پولیس کو اطلاع کر دی تھی اس لیے انہیں وہاں سے بھاگنا پڑا۔ میں منتظر تھی کہ پولیس والے آئیں تو میں موقع دیکھ کر بچی کو نرسری سے نکال لوں لیکن میرے کچھ کرنے سے پہلے ہی ڈاکٹر کرمانی نے مجھے کال کر لیا۔ انہوں نے مجھ سے ساری صورتِ حال معلوم کی۔ مجھے جس حد تک معلوم تھا، میں نے انہیں بتا دیا۔ ساری بات سن کر بھی انہیں یہ بات پسند نہیں آئی کہ میں نے اسپتال کے عملے میں شامل ہوتے ہوئے اس قسم کی کسی سرگرمی میں حصہ لیا۔ انہوں نے مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں فوری طور پر اپنا استعفا لکھ کر ان کے حوالے کر دوں ورنہ دوسری صورت میں وہ اس ساری سچویشن میں میرے کردار سے پولیس کو آگاہ کر دیں گے۔ پولیس والوں کو تو آپ جانتے ہیں۔ مجھ جیسی تنہا لڑکی ان کی تفتیش کا سامنا کرنے کی قطعی ہمت نہیں کر سکتی تھی چنانچہ میں نے اپنا استعفا لکھ کر ڈاکٹر کرمانی کے حوالے کر دیا۔ استعفا دیتے وقت میں نے سوچا تھا کہ میں اسٹاف میں موجود اپنی کسی دوست کے ذریعے آپ کی بچی کو نرسری سے نکلوا لوں گی لیکن میرے کچھ کرنے سے پہلے ہی وہ ناخوش گوار واقعہ پیش آ گیا۔'' بہت روانی سے سب کچھ بتاتی شبانہ اس مرحلے پر آ کر ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔

''کیسا واقعہ؟ میری بیٹی تو خیریت سے ہے نا مس شبانہ؟'' اس کے رکنے پر آفتاب نے بے تابی سے پوچھا۔

''میں کچھ کہہ نہیں سکتی لیکن میری دعا ہے کہ وہ جہاں ہو خیریت سے ہو۔''

''کیا مطلب؟ کیا امید اسپتال کی نرسری میں نہیں ہے؟'' شبانہ کے جواب نے اسے بُری طرح چونکا دیا اور اس نے تقریباً چیخنے والے انداز میں اس سے پوچھا۔

''آئی ایم سوسوری سر! میں آپ سے وعدہ کرنے کے باوجود آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکی۔ آپ کی بچی میرے کچھ کرنے سے قبل ہی نرسری سے پُراسرار طور پر غائب ہو گئی ہے۔ یہاں اسپتال میں بچی کے غائب ہونے کی وجہ سے ایک ہنگامہ مچا ہوا ہے۔ اسٹاف سے پوچھ گچھ کی جا رہی ہے۔ مجھے خود پولیس والوں کی تفتیش کا سامنا کرنا پڑا ہے۔'' شبانہ نے اس کے کانوں میں کوئی صور پھونکا تھا۔ وہ بچی کے اس پُراسرار غیاب کے پیچھے موجود ہاتھوں سے واقف تھا۔ جو لوگ کھلے عام اسپتال پر چڑھائی کر کے ان تک پہنچنے کی کوشش کر سکتے تھے، ان کے لیے ایک بچی کو غائب کر لینا کیا مسئلہ تھا لیکن خود اس کی حالت تو یہ خبر سن کر تباہ ہونے لگی تھی۔ اپنی بیٹی کے ایک خون آشام بھیڑیے کی گرفت میں چلے جانے کا سوچ کر اس کا کلیجا منہ کو آنے لگا تھا۔

''یقین کریں آفتاب صاحب! مجھے اس بات کا دلی افسوس ہے اور اگر میں اب بھی آپ کے لیے کچھ کر سکی تو ضرور کروں گی۔'' دوسری طرف سے شبانہ پورے خلوص سے کہہ رہی تھی۔

''شکریہ مس شبانہ! مجھے آپ کے خلوص پر کوئی شک نہیں ہے۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ آپ یقیناً بے بس ہو گئی ہوں گی۔ ہمارا دشمن سے ہی اتنا خطرناک کہ میں اچھے خاصے تعلقات رکھنے کے باوجود اس کے مقابلے میں خود کو کمزور پا رہا ہوں بلکہ مجھے سخت افسوس ہے کہ ہماری خاطر آپ اپنی اچھی بھلی ملازمت سے محروم ہو گئیں۔ میں اپنی خاطر آپ کو مزید کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا اور نہ ہی کسی ایسے کام کا کہنا چاہتا ہوں جو آپ کے لیے کسی تکلیف کا باعث بنے۔ ہاں اگر ہو سکے تو آپ تک اس سلسلے میں کوئی خبر پہنچے تو وہ مجھے بھی پہنچا دیں۔ میں آپ کو اس ہوٹل کا فون نمبر دے دیتا ہوں جہاں ہم ٹھہرے ہوئے ہیں۔ جب تک ہم یہاں ہیں، آپ اس نمبر پر مجھے اطلاع دے سکتی ہیں۔ بعد میں، میں آپ کو اپنا کوئی مستقل رابطہ نمبر دے دوں گا۔''

اس نے خود کو مجتمع کرتے ہوئے شبانہ سے یہ سب کچھ کہا۔ شبانہ کے خلوص اور تعاون کا معترف ہونے کے باوجود وہ اس حقیقت سے آشنا نہیں تھا کہ اس یکہ و تنہا لڑکی کے دل میں چپکے سے اس کی محبت کا پھول کھل اٹھا ہے... اور جو محبت کرتے ہیں، انہیں کب اپنے محبوب کا کوئی کام زحمت یا مشقت لگتا ہے۔ محبت کرنے والوں کے لیے تو اپنے محبوب کے لیے اٹھائی جانے والی ہر مشکل اور پریشانی رحمت اور کیف آگیں ہوتی ہے۔ شبانہ بھی اگر اس کے لیے کچھ کر پاتی تو دلی خوشی محسوس کرتی چنانچہ اس کی پُرتکلف باتیں اور معذرتی انداز سن کر تڑپ اٹھی اور نہایت رقت سے بولی۔

''آپ بلاوجہ تکلف سے کام لے رہے ہیں آفتاب صاحب! یقین جانیے کہ اگر میں آپ کے کسی کام آ سکی تو مجھے خود دلی خوشی محسوس ہو گی۔ رہی ملازمت جانے کی بات تو مجھے اس کی زیادہ پروا نہیں ہے میرے پاس نرسنگ کی تعلیم اور تجربہ ہے۔ کسی اور جگہ کوشش کروں گی تو آرام سے ملازمت مل جائے گی۔ ڈاکٹر کرمانی نے مجھ سے جبری استعفا ضرور لکھوایا



ہے لیکن ساتھ ہی یہ مہربانی بھی کی ہے کہ میرا نام بدنام نہیں ہونے دیا۔ میرا سروس ریکارڈ بے داغ ہے اس لیے مجھے چند دن ملازمت کی تلاش میں گزارنے کے سوا کوئی دوسری پریشانی نہیں اٹھانی پڑے گی... اور ملازمت کی مجھے اتنی جلدی نہیں ہے۔ برسوں سے کام کر رہی ہوں۔ اچھا ہے اس بہانے کچھ دن کا ریسٹ مل جائے گا۔''

''شکریہ مس شبانہ! آپ نے میرے دل کا بوجھ کافی حد تک کم کر دیا۔ اچھا، اب مجھے اجازت دیجیے اور پلیز جیسے ہی کوئی اطلاع ملے مجھے کال کر دیجیے گا۔'' اس نے شبانہ کو ہوٹل کا ٹیلی فون نمبر، اپنا کمرا نمبر اور وہ نام لکھوایا جو اس نے کمرے کے حصول کے لیے ہوٹل کے رجسٹر میں درج کروایا تھا۔ فون بند کر کے وہ اپنا سر تھام کر بیٹھ گیا۔ امید کا نرسری سے غائب ہونا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ باپ ہونے کے ناتے وہ اس خبر کو سن کر بُری طرح تڑپ اٹھا تھا۔ دوسری طرف اسے کشور کی بھی فکر تھی۔ اس کے لیے تو یہ خبر بہت ہی ہولناک ثابت ہوتی۔ وہ پہلے ہی بچی کے لیے تڑپ رہی تھی، اگر جو یہ پتا چلتا کہ بچی لاپتا ہو گئی ہے تو جانے اس کا کیا حال ہوتا۔ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے فیصلہ کر لیا کہ جہاں تک ممکن ہو سکا، کشور سے یہ اندوہناک خبر چھپا کر رکھے گا اور اپنے طور پر امید کی بازیابی کے لیے کوشش کرتا رہے گا۔ ابھی تو اسے خود سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس مسئلے کو کیسے سلجھائے؟ اس کے پاس ایک تدبیر تو یہ تھی کہ اپنی صحافی برادری سے مدد کی درخواست کرے لیکن وہ لوگ تحریر اور تقریر کی مدد سے شور مچانے کے سوا کیا کر سکتے تھے۔ چودھری نے بچی کو اغوا کروا کر جانے کہاں رکھا ہو گا۔ پولیس میں تو اتنا دم بھی نہیں تھا کہ اس کی حویلی کا محاصرہ کر کے خانہ تلاشی ہی کر سکے۔ اگر کسی طرح یہ کام ہو بھی جاتا تو اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ بچی کو حویلی میں ہی رکھا گیا ہو گا۔ چودھری کے پاس وسیوں ٹھکانے تھے، وہ بچی کو کہیں بھی رکھ سکتا تھا۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ کشور سے محبت کا تعلق جڑنے کے بعد وہ بارہا مشکل کا شکار ہوا تھا۔ بعض اوقات جان پر بھی بن گئی تھی لیکن اب جو ہوا تھا، وہ سب سے سوا تھا کیونکہ معاملہ اپنی اولاد کا تھا اور اولاد سے آدمی اپنی جان سے بڑھ کر پیار کرتا ہے۔ جان سے پیاری چیز ہاتھ سے نکل جانے پر کسی شخص کی جو حالت ہو سکتی تھی، وہ اس وقت اس کی بھی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ہر سمت گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا ہے۔

''کیا بات ہے جناب! کیا آپ کا نمبر نہیں ملا؟'' پی سی او والا لڑکا جو باہر کھڑا شیشے کے دروازے سے اندر دیکھ رہا تھا، اسے کافی دیر سے ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے دیکھ کر اندر آیا اور اس سے دریافت کیا۔ یہ بھی ایک اتفاق ہی تھا کہ اس دوران کوئی اور شخص فون کرنے وہاں نہیں آیا تھا ورنہ وہ پہلے ہی اندر آ کر اسے ٹوک دیتا۔

''نمبر مل گیا تھا لیکن مجھے ابھی ایک کال اور کرنی ہے۔ تم تھوڑی دیر انتظار کر لو پھر میں ایک ساتھ تمہیں دونوں کالز کے چارجز ادا کر دوں گا۔'' اس کی مداخلت پر آفتاب چونکا اور پھر ذہن میں یکدم ہی ابھرنے والے ایک خیال کے تحت بولا۔

''پیسوں کی بات نہیں ہے بھائی صاحب! میں اس لیے فکرمند ہو گیا تھا کہ آپ مجھے کچھ پریشان لگ رہے تھے۔'' لڑکے نے خلوص سے کہا اور پھر یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ ''آپ آرام سے بات کرو، میں باہر کھڑا ہوں۔'' اس کے باہر نکل جانے کے بعد آفتاب، شہریار کے دفتر کا نمبر ملانے لگا۔ موبائل ہاتھ سے نکل جانے کے باعث کئی ضروری فون نمبرز بھی اس سے مس ہو گئے تھے لیکن شہریار کے دفتر کا نمبر اسے زبانی یاد تھا اس لیے آرام سے ڈائل کر لیا۔

''اے سی صاحب تو آج ابھی تک دفتر نہیں آئے ہیں۔ آپ اپنا میسج نوٹ کروا دیں، وہ آئیں گے تو میں انہیں کہنے کر دوں گا۔'' شہریار سے بات کروانے کی فرمائش پر دوسری طرف سے اسے یہ جواب سننے کو ملا تو اس کو مایوسی کا احساس ہوا۔ شہریار اس کے لیے ہمیشہ ہی بہت مہربان ثابت ہوا تھا اس لیے موجودہ حالات میں اس کا ذہن اسی کی طرف گیا تھا کہ شاید وہ امید کی تلاش کے سلسلے میں اس کی کچھ مدد کر سکے۔ یہ خیال اس لیے بھی آیا تھا کہ شہریار تو پہلے ہی چودھری کے خلاف سرگرم رہتا تھا۔ وہ اپنے مسئلے کے لیے اس سے مدد مانگتا تو وہ ہر حال میں اس کی مدد کی کوشش کرتا۔

''آپ انہیں بس اتنا بتا دیجیے گا کہ اے اے منشا کا فون آیا تھا۔ بعد میں، میں خود ان سے رابطہ کر لوں گا۔'' اس نے اپنے قلمی نام کے حوالے سے پیغام نوٹ کروایا اور سلسلہ منقطع کر کے شیشے کے دروازے کے پار نظر آنے والے لڑکے کو اشارہ کر کے اندر بلایا۔ لڑکے کو کال چارجز ادا کر کے وہ پی سی او سے باہر نکلا تو یوں محسوس کر رہا تھا جیسے ایک ایک قدم من من بھر کا ہو گیا ہو۔ ہوٹل کا رخ کرنے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ کشور کا سامنا کرنے سے ڈر لگ رہا تھا۔ لیکن زندگی کے اور بہت سارے امتحانوں کی طرح اس امتحان کا سامنا بھی کرنا ہی تھا، چنانچہ اپنے شکستہ وجود کو سنبھالتے ہوئے وہ اس امتحان سے گزرنے کے لیے خود کو تیار کرنے لگا اور

بوجھل قدموں سے ہوٹل کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

''ڈی ایس پی منظور کی کال ہے سر!'' وہ اپنے دفتر میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ آپریٹر نے اسے اطلاع دی۔

''بات کرواؤ۔'' اس نے ہموار لہجے میں جواب دیا لیکن اندر سے بُری طرح مضطرب ہو گیا کہ جانے منظور اسے کیا خبر سناتا ہے۔ وہ خود تو ڈیرے پر ہونے والے آپریشن کے بعد فوراً ہی واپس آ گیا تھا لیکن پولیس پارٹی کا سرچ آپریشن جاری تھا۔ پولیس جنگل میں ان ڈاکوؤں کو تلاش کرتی رہی تھی جو آپریشن کے دوران ڈیرے سے فرار ہو گئے تھے۔ ماہ بانو کے بارے میں بھی یہی خیال کیا گیا تھا کہ کوئی مفرور ڈاکو اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ آپریشن کے دوران زخمی حالت میں ملنے والی حمیداں نامی عورت نے بھی ماہ بانو سے متعلق استفسار کے جواب میں یہی خیال ظاہر کیا تھا کہ اسلم نامی ڈاکو اسے اپنے ساتھ لے گیا ہو گا۔ حمیداں کو مُردہ و زندہ ڈاکوؤں کی جو شناختی پریڈ کروائی گئی تھی، اس کے بعد اس نے صاف بتا دیا تھا کہ زندہ و مُردہ دونوں طرح کے ڈاکوؤں میں اسلم موجود نہیں ہے۔ حمیداں کی مدد سے مُردہ، گرفتار اور مفرور تینوں طرح کے ڈاکوؤں کے ناموں کی فہرست بنائی گئی تھی۔ اس فہرست سے ظاہر تھا کہ ماہ بانو، للی اور سات عدد ڈاکو ڈیرے پر نہیں مل سکے ہیں جن کو تلاش کرنا اشد ضروری ہے۔ پولیس یہ کام کر رہی تھی جبکہ شہر یار مشابرم خان کے ساتھ واپس لوٹ کر آ گیا تھا اور اب اس کی امیدوں کا مرکز و محور ڈی ایس پی منظور کی طرف سے ملنے والی رپورٹ تھی، اسی لیے اس کا فون آنے کی خبر سن کر وہ بے چین ہو اٹھا تھا۔

''ہاں منظور! کیا خبر ہے؟'' ڈی ایس پی کے لائن پر آتے ہی اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''کافی حوصلہ افزا خبریں ہیں سر! جنگل کے مختلف حصوں سے ہم نے پانچ ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیا ہے، البتہ دو ڈاکوؤں اور قیدی خواتین کے بارے میں ابھی تک کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ ان کی تلاش کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔'' اس نے جو رپورٹ دی، وہ واقعی صورتِ حال کے مطابق کافی اچھی تھی لیکن خود شہر یار کو تو ماہ بانو سے غرض تھی۔ سمجھ نہیں آتا تھا کہ اتنے بڑے جنگل میں اسے کہاں اور کیسے تلاش کرے۔ بس پولیس کے سرچ آپریشن سے ہی ساری امیدیں باندھ رکھی تھیں۔

''تلاش کا سلسلہ ابھی جاری رکھو۔ دونوں خواتین اور ڈاکوؤں کی بازیابی ضروری ہے۔ اس کام کے علاوہ تم اپنا ریکارڈ بھی مین ٹین رکھو۔ جنگل سے ملنے والے پانچوں ڈاکوؤں کے نام نوٹ کر لیے ہیں یا نہیں؟'' اس نے ڈی ایس پی کو ہدایات دیتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

''یس سر! یہ کام ہو گیا ہے اور اب ہماری ساری توجہ باقی دو ڈاکوؤں اور خواتین کی طرف مبذول ہے۔ اس سلسلے میں جیسے ہی کوئی پیش رفت ہوئی، میں آپ کو اطلاع دے دوں گا۔'' ڈی ایس پی منظور نے فوراً جواب دیا۔ آج کل وہ بہت زیادہ ایفی شینسی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ کامیاب آپریشن نے اس کا سینہ پھلا دیا تھا۔ میڈیا کی طرف سے بھرپور کوریج ملنے کے علاوہ اسے اس کامیابی پر نقد انعام اور ترقی کی بھی امید تھی، چنانچہ وہ پوری کوشش کر رہا تھا کہ کہیں کوئی کمی نہ رہنے پائے۔ شہر یار کے سامنے اس ایفی شینسی کا مظاہرہ اس لیے ضروری تھا کہ وہ اس کے آئی جی پنجاب مختار مزاو سے قریبی تعلقات سے واقف تھا۔

''جو دو ڈاکو غائب ہیں ان کے کیا نام ہیں؟'' اس نے یونہی اس کی کارکردگی کو جانچنے کے لیے دریافت کیا ورنہ ڈاکوؤں کے نام جان کر اسے کیا حاصل ہونے والا تھا۔ اگر ان دو ڈاکوؤں کی اپنے دیگر ساتھیوں کے مقابلے میں کچھ اہمیت تھی تو صرف اتنی کہ امکان تھا کہ ماہ بانو اور ڈیرے پر موجود دوسری عورت شاید ان دونوں کے ہی ساتھ تھیں۔

''ان دونوں کے نام اسلم اور جمرو ہیں سر۔'' ڈی ایس پی منظور نے فوراً ہی جواب دیا پھر اسے مزید متاثر کرنے کے لیے بات کو اور بھی آگے بڑھایا اور بتانے لگا۔

''حمیداں نے اسلم نامی ڈاکو کے بارے میں بڑے عجیب و غریب انکشافات کیے ہیں سر۔ اس کا کہنا ہے کہ اسلم بڑا پڑھا لکھا اور شریف لڑکا ہے جسے حالات نے ڈاکو بنا دیا ہے لیکن ڈاکو بننے کے باوجود اس کی شرافت ابھی تک قائم ہے اور وہ عورت ذات کا احترام کرتا ہے۔ اس نے ڈیرے پر موجود کسی عورت کو کبھی غلط نظر سے نہیں دیکھا اور نہ ہی کبھی کسی بازاری عورت کے ساتھ ٹائم پاس کرنا پسند کیا ہے۔ البتہ جب سے ماہ بانو ڈیرے پر آئی تھی، وہ اس کے آگے پیچھے پھرتا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی ساری دولت دے کر سردار کو اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ جب تک اس کی مرضی شامل نہیں ہو گی، ڈیرے کا کوئی شخص ماہ بانو کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔'' ڈی ایس پی منظور کی فراہم کردہ یہ معلومات اس کے لیے بڑی اہم تھیں۔ اسلم کے بارے میں معلوم ہونے والی باتوں نے اسے بھی چونکا دیا تھا اور اسے بے ساختہ ہی وہ ڈاکو یاد آیا تھا جو اس کے گھر پر ڈاکا ڈالنے والے ڈاکوؤں کی کمان سنبھالے ہوئے تھا۔ وہ شخص اپنے لب و لہجے سے ہی تعلیم یافتہ لگتا تھا۔ دوسرے اس نے اپنے ساتھیوں سے جھگڑا مول لے کر ماریا کی عزت لٹنے سے بچائی تھی۔ یہ دو خصوصیات بتا رہی تھیں کہ مفرور ڈاکو اسلم ہی اصل میں وہ شخص ہے جس نے ایک بار اسے اغوا کر کے جنگل میں رکھا تھا اور دوسری بار اس کے گھر پر ڈاکا ڈالنے آیا تھا۔

''اپنے آدمیوں سے کہو کہ اسلم اور جمرو کو ہر حال میں تلاش کریں۔ دونوں خواتین ان دونوں ہی کے ساتھ ہو سکتی ہیں اور ان کا ملنا کتنا ضروری ہے، اس کے لیے میرا تمہیں اتنا بتا دینا ہی کافی ہے کہ اگر ہمیں ڈیرے پر خواتین کی موجودگی کا علم نہ ہوتا تو یہ آپریشن ابھی کچھ عرصہ اور التوا میں پڑا رہتا۔'' اس نے سخت لہجے میں ڈی ایس پی کو جتایا۔

''میں اپنی پوری کوشش کروں گا سر۔'' وہ گھبرا کر جلدی سے بولا۔

''ایسا کر کے تم اپنے حق میں ہی اچھا کرو گے۔ ترقی کی منازل اتنی آسانی سے طے نہیں ہوتیں، یہ تو تم خود بھی جانتے ہو گے۔'' اس کو مزید دباؤ میں لے کر اس نے گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا اور اپنی ٹیبل پر رکھے اس نوٹ پیڈ کا جائزہ لینے لگا جس پر نام کے ساتھ اس کی غیر موجودگی میں آنے والی فون کالز کے پیغامات درج تھے۔ عبدالمنان کو آج کسی ذاتی کام کے سلسلے میں جانا تھا اس لیے وہ اس کی اجازت سے دفتر سے جلدی نکل گیا تھا اور تمام اہم پیغامات نوٹ کر کے اس کی میز پر چھوڑ گیا تھا۔ فون کرنے والوں کے نام اور پیغامات دیکھتے ہوئے جیسے ہی اس کی نظر اے اے منشا کے نام پر پڑی، وہ چونک گیا۔ اے اے منشا کا مطلب تھا، آفتاب احمد منشا اور آفتاب کا فون دفتر کے نمبر پر آنے کا مطلب تھا اسے کوئی ضروری کام ہے ورنہ وہ بے احتیاطی ہرگز بھی نہ کرتا اور اس کا موبائل آن ہونے کا انتظار کرتا۔ اس نے اضطراری طور پر موبائل نکال کر سب سے پہلے آفتاب کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے فوراً ہی کال ریسیو کی گئی اور ایک نشے میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''ہالو... کون سالا بول رہا ہے؟ صبح صبح میری نیند کیوں خراب کی ہے؟'' زبان کی لڑکھڑاہٹ کے علاوہ اس کے جملے سے بھی ظاہر تھا کہ وہ نشے میں ہے ورنہ پورا دن گزر جانے کے بعد صبح صبح اٹھائے جانے کا شکوہ نہ کرتا۔

''مجھے مسٹر منشا سے بات کرنی ہے۔'' امید نہ ہونے کے باوجود اس نے اپنا مدعا بیان کیا۔

''ادھر کوئی انشا اور منشا نہیں ہوتا۔ یہ اپن کا نمبر ہے۔ اپن یعنی اے ایس آئی خالد۔'' دوسری طرف سے جواب ضرور دیا گیا لیکن جواب دینے والے کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ ڈھنگ سے بات کرنے اور سوالوں کے جواب دینے کے لائق نہیں ہے۔ شہر یار نے بیزار ہو کر سلسلہ منقطع کر دیا لیکن خود تشویش میں مبتلا ہو گیا کہ جانے آفتاب کے ساتھ کیا گزری ہے جو اس کا موبائل کسی اے ایس آئی کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ آفتاب کے موبائل کی کسی پولیس والے کے پاس موجودگی کی کوئی بھی چھوٹی یا بڑی وجہ ہو سکتی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ اس کا موبائل جیب سے گر گیا ہو یا کسی اُچکے نے چھین لیا ہو۔ اگر بات اتنی ہی تھی تو خیر تھی لیکن اس امکان کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہو۔ چودھری افتخار جیسا شخص اگر کسی کا دشمن ہو تو اس کے بارے میں کسی بھی غیر معمولی واقعے کا خدشہ ہی رہتا ہے۔ ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ چودھری کے کتے آفتاب اور کشور کی بُو سونگھتے ہوئے ان کی پناہ گاہ تک پہنچ گئے ہوں اور انہوں نے آفتاب کے ساتھ وہ سلوک کیا ہو کہ وہ کسی اسپتال کے مُردہ خانے میں یا کم از کم شدید نگہداشت کے کمرے میں پڑا ہو اور اس کے پرس سے لے کر موبائل تک ہر شے پولیس کے قبضے میں ہو... اور یہ تو پولیس کا وطیرہ ہے کہ وہ کسی مقتول، زخمی یا مظلوم فریادی کے مال پر اپنا پورا پورا حق سمجھتی ہے۔ اس سے مخمور لہجے میں بات کرنے والا اے ایس آئی خالد بھی یقیناً پولیس کی صفوں میں موجود راشی اور بدعنوان اہل کاروں میں سے ایک تھا۔ ورنہ ایک اے ایس آئی کی جائز تنخواہ میں نشے کی علت پالنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں نکلتی تھی۔ وہ جانے انجانے جیسے بھی اس عادتِ بد کا شکار ہوا تھا، یہ طے تھا کہ اپنی اس ٹھرک کو پورا کرنے کے لیے اسے ناجائز طریقے ہی اپنانے پڑتے ہوں گے۔ بہرحال، اے ایس آئی کی عادات اور کردار فی الحال اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ اسے تو آفتاب کی طرف سے فکر لاحق ہو گئی تھی۔ اس کی خبر گیری کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس شخص سے رابطہ کرتا جس کی مدد سے اس نے میر پور خاص میں آفتاب کی رہائش کا بندوبست کیا تھا۔ موبائل پر کال وصول کرنے والے اے ایس آئی خالد سے تو اس وقت رابطہ کرنا بالکل فضول ہی تھا۔ وہ شخص ہوش میں ہوتا تو اسے انفارم کرنے کے لیے نہ سہی، اپنی معلومات میں اضافے کے لیے ہی سہی اس سے کوئی استفسار ضرور کرتا لیکن وہ تو اپنی نیند خراب کیے جانے کے غم میں مبتلا تھا۔ نشہ اترنے کے بعد اسے خود کو موصول ہونے والی فون کال یاد بھی رہتی ہے یا نہیں، اس سلسلے میں کچھ بھی وثوق سے کہنا مشکل تھا۔ تمام تر امکانات کا جائزہ لینے کے بعد اس نے اس اسٹیٹ ایجنٹ سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا جس کے

ذریعے آفتاب کو گھر دلایا تھا۔ چھوٹے شہروں میں خبریں ویسے بھی جلدی پھیلتی ہیں اور اسٹیٹ ایجنٹ کے واقفِ حال ہونے کا اس لیے بھی زیادہ امکان تھا کہ کسی حادثے کی صورت میں پولیس نے اگر اپنی تفتیش شروع کر دی تھی تو وہ آفتاب کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے اس اسٹیٹ ایجنٹ تک ضرور پہنچی ہوگی۔ یہی سب سوچ کر اس نے اسٹیٹ ایجنسی کا نمبر ملا ڈالا۔

''مجھے شمسی صاحب سے بات کرنی ہے۔'' دوسری طرف سے ''ہیلو'' سنائی دیتے ہی اس نے اپنا مدعا بیان کیا۔

''بات کر رہا ہوں۔ آپ بولو کہ آپ کون ہو؟'' شمسی نے جواب دینے کے ساتھ ہی سوال بھی کیا۔

''میں شہریار عادل بات کر رہا ہوں شمسی صاحب۔'' اس نے اپنا تعارف کروایا۔

''ارے صاحب آپ! میں تو خود آپ کو فون کرنے والا تھا۔ یہاں بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ کچھ دیر پہلے میرے پاس دو پولیس والے آئے تھے اور مجھ سے اس آدمی کے بارے میں پوچھ رہے تھے جسے میں نے آپ کے کہنے پر مکان دلایا تھا۔ مجبوراً مجھے آپ کے بارے میں بتانا پڑا۔ پولیس والوں سے پہلے کچھ لوگ اور بھی آئے تھے۔ وہ شہر کے چھٹے ہوئے غنڈے تھے، ان سے اپنی گردن بچانے کے لیے بھی مجھے آپ کے بارے میں بتانا پڑا تھا۔ میرا خیال ہے آپ میری مجبوری کو سمجھیں گے اور برا نہیں مانیں گے۔'' اس کا نام سنتے ہی شمسی بوکھلا گیا اور بغیر سیاق و سباق کے اپنی صفائیاں پیش کرنے لگا۔ خود شہریار کے لیے اس بات کی اتنی زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ اسٹیٹ ایجنسی سے اس کا حوالہ آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے اور وہ خود بھی اس حوالے سے خود سے پوچھ گچھ کرنے والوں کو آسانی سے ٹال سکتا تھا۔ غنڈوں کو تو خیر اسے جواب دہی کرنی ہی نہیں تھی۔ اگر وہ چودھری کے گرگے تھے تو اسے یہ معلوم ہو جانے میں کوئی حرج نہیں تھا کہ آفتاب اور کشور کو اس کی پیپورٹ حاصل ہے۔ یہ راز وہ پہلے ہی اس کے دفتر میں ٹیلی فون آپریٹر کی صورت میں پائے جانے والے اپنے جاسوس سے جان ہی چکا تھا۔ رہی پولیس تو پولیس والوں کو بھی وہ آرام سے یہ بات بتا سکتا تھا کہ واقفیت کی بنیاد پر آفتاب نے مکان کے حصول کے سلسلے میں اس سے مدد کی درخواست کی تھی چنانچہ اس نے انسانی ہمدردی کے ناتے اس کا یہ کام کروا دیا، باقی وہ آفتاب کی بیوی کے ہر فعل و کردار سے بری ہے۔ اصل بات جو وہ جاننا چاہتا تھا، وہ یہ تھی کہ آفتاب کن حالات کا شکار ہے اور اس نے آخر اسے کیوں فون کیا تھا، چنانچہ شمسی کی وضاحت کے جواب میں رسان سے بولا۔

''میں آپ کی مجبوریوں کو اچھی طرح سمجھتا ہوں شمسی صاحب! مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے لیکن مجھے یہ تو بتائیں کہ آخر ایسی کیا افتاد آ گئی جو شہر کے غنڈے اور پولیس بہ یک وقت میرے آدمی کو ڈھونڈنے نکل کھڑے ہوئے؟''

''پورا چکر تو مجھے نہیں معلوم بس اتنا پتا چلا ہے کہ احمد کی بیوی بچی کی پیدائش کی وجہ سے اسپتال میں داخل تھی۔ احمد خود بھی وہیں موجود تھا کہ اچانک ہی اسپتال پر غنڈوں نے دھاوا بول دیا۔ دونوں میاں بیوی عجلت میں اسپتال سے فرار ہو گئے اور جلدی میں اپنی بچی اسپتال کی نرسری میں ہی چھوڑ گئے جہاں سے بچی پُراسرار طور پر غائب ہو گئی۔ پولیس والے اس سلسلے میں تفتیش کرتے پھر رہے ہیں۔ انہوں نے مکان کا بھی جائزہ لیا ہے جہاں سے انہیں احمد کے لیے ایک دھمکی آمیز پیغام ملا ہے لیکن پیغام سے یہ ظاہر نہیں کہ پیغام بھیجنے والا کون ہے۔ البتہ پولیس والوں کا کہنا ہے کہ پیغام کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ دشمن احمد کے لیے اجنبی نہیں ہے۔'' شمسی نے اپنی معلومات جلدی جلدی اس کے کانوں میں انڈیل ڈالیں۔

''ٹھیک ہے شمسی صاحب! آپ کے تعاون کا شکریہ۔ اگر کسی نے مجھ سے رابطہ کیا تو میں خود اس سے نمٹ لوں گا۔'' اس نے کال منقطع کر دی اور آفتاب کے بارے میں سوچنے لگا۔ فرضی نام کے ساتھ ایک چھوٹے شہر میں قیام کرنے کے باوجود وہ اپنے دشمنوں کی نظر سے محفوظ نہیں رہ سکا تھا اور ان لوگوں نے اسے نہ صرف وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا بلکہ اسے اس کی بچی سے بھی جدا کر دیا تھا۔ حالات کو دیکھتے ہوئے یہ قیاس کیا جا سکتا تھا کہ اسپتال سے پُراسرار طور پر غائب ہونے والی بچی چودھری کے گرگوں کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے اور شاید اسی وجہ سے آفتاب نے کسی محفوظ مقام پر پہنچنے کے بعد اسے فون کیا تھا۔ لیکن اس کی مجبوری یہ تھی کہ آفتاب کا موبائل اس کے قبضے سے نکل جانے کے بعد اس کے پاس رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اب وہ دوبارہ اسی صورت میں اس سے بات کر سکتا تھا کہ وہ خود اسے فون کرتا۔ ابھی تو وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ آفتاب میرپور میں ہی ہے یا وہاں سے نکل چکا ہے۔ ماہ بانو کی تلاش میں ناکامی کے بعد یہ دوسرا مسئلہ تھا جس نے اسے بُری طرح ڈسٹرب کر دیا۔ اچھے خاصے وسائل کا مالک ہونے کے باوجود وہ چند لوگوں کو تحفظ فراہم کرنے میں ناکام تھا اور ان بے چاروں پر ان کے وطن



کی زمین ہی تنگ پڑ گئی تھی۔ اس کے نزدیک اس مشکل صورتِ حال سے نمٹنے کا یہی طریقہ رہ گیا تھا کہ ان لوگوں کو ملک سے باہر نکال دیتا۔ ملک سے باہر نکلنے کے بعد آفتاب کے لیے تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ کسی بھی نشریاتی ادارے میں ملازمت اختیار کر کے سکون سے زندگی گزار سکتا تھا لیکن ماہ بانو کے لیے ضرور مشکل ہو جاتی۔ چھوٹے شہر و سفید پوش گھرانے میں پلنے والی وہ لڑکی جانے بالکل مختلف ماحول میں اکیلی سروائیو کر بھی پاتی یا نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اسے ایک بھیڑیے سے بچاتے بچاتے اپنے ہاتھوں سے بھیڑیوں کے غول میں دھکیل دیتا۔ اپنے ذہن میں ابھرنے والے ایسے کسی خیال پر عمل پیرا ہونے سے پہلے اس کے نتائج کے بارے میں اچھی طرح سوچنا ضروری تھا پھر ابھی تو اصل میں ماہ بانو کا ملنا باقی تھا۔ وہ جانے کہاں اور کس حال میں تھی؟ یہ خیال جب بھی دل میں آتا تھا، درد کی ایک لہر سی تن بدن میں دوڑ جاتی تھی۔ وہ اسے چاہ کر پا نہیں سکا تھا لیکن اس کے خیر و عافیت سے رہنے کی پُرخلوص خواہش بڑی شدت سے رکھتا تھا۔ اس خواہش کو کامیابی حاصل ہوتی یا نہیں لیکن اس وقت اپنی شکست کا سبب بننے والی ماریا کا نمبر موبائل کی اسکرین پر ابھرتے دیکھ کر بُری طرح جھنجلا گیا... مگر دل نہ چاہتے ہوئے بھی کال تو ریسیو کرنی ہی تھی سو مسلسل بجتی گھنٹی کا گلا گھونٹنے کے لیے ''یس'' کا بٹن پش کر دیا۔

''کہاں غائب تھے آپ؟ آپ سے کسی طرح رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ گھر اور دفتر دونوں جگہ سے جناب کی غیر موجودگی کا پتا چلا اور موبائل بھی آف کر رکھا تھا آپ نے۔ آخر ایسا کیا مسئلہ ہو گیا تھا کہ آپ رابطے کا ہر ذریعہ بند کر کے بیٹھے تھے؟'' ماریا کے لہجے میں بیویوں والے استحقاق کے ساتھ ساتھ تجسس بھی تھا اور یہ کوئی ایسی انوکھی بات نہیں تھی۔ اس کی شکایت اس کا حق تھا۔ بیوی کی حیثیت سے وہ جب چاہے، اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر سکتی تھی لیکن اس کے الجھے ہوئے ذہن پر غصہ چھا گیا اور وہ جب بولا تو اس کا لہجہ کافی خراب تھا۔

''تمہیں مجھ سے ایسا کون سا کام آ پڑا تھا کہ ہر طرف میری ڈھونڈ مچا دی۔ میں تمہارا شوہر ہوں کوئی پالتو کتا نہیں جس کی ایک ایک حرکت تمہاری مرضی کے تابع ہو۔ میری بہت سی ذاتی اور پیشہ ورانہ مصروفیات ہیں جن کی تفصیل سے میں تمہیں آگاہ کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔'' وہ اس پر تقریباً الٹ ہی پڑا۔ گھر پر اور دفتر میں دونوں جگہ اسے ماریا کے فون کے بارے میں علم ہو گیا تھا لیکن اس نے ان فون کالز کو اتنی اہمیت

دیکھنے نہیں بہ کتنے پیار سے آ کے ملا ہے۔
اس سے بڑا کیا ثبوت ہو گا کہ یہ کتا میرا ہے!

نہیں دی تھی اور یہی سوچا تھا کہ فرصت ملنے پر آرام سے اس سے بات کر لے گا۔

''آپ کا موڈ اتنا آف کیوں ہو رہا ہے؟ میں نے کوئی ایسی غلط بات تو نہیں کی۔ میں آپ کی بیوی ہوں اور مجھے حق ہے کہ میں جب چاہے آپ سے رابطہ کر سکوں۔'' اس کی خفگی کو محسوس کر کے ماریا نے بھی جوابی خفگی دکھائی جس پر اسے اپنے رویے کی خرابی کا احساس بھی ہو گیا۔ لیکن ماہ بانو کا معاملہ ایسا تھا جس پر وہ ماریا سے کھل کر بات کرنے میں گھبراتا تھا اور کھل کر کچھ بتائے بغیر کسی عام سی لڑکی کے لیے بھٹکتے پھرنے کی کوئی دلیل نہیں دی جا سکتی تھی چنانچہ جارحیت کو بہترین مدافعت سمجھتے ہوئے اس نے اپنا لہجہ تبدیل کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اسی ٹون میں بولا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم میری بیوی ہو۔ اس بات کو بار بار یاد دلا کر مجھے اری ٹیٹ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہیں خود سے رابطہ کرنے سے بھی نہیں روک رہا ہوں لیکن اس بات کی بھی اجازت نہیں دے سکتا کہ تم میرے لمحے لمحے پر نظر رکھو۔ بیوی اور تھانے دارنی میں کچھ فرق ہونا چاہیے۔ بہتر ہے کہ تم یہ فرق سمجھ لو تاکہ ہم دو مہذب لوگوں کی طرح ایک دوسرے کی شخصی آزادی کو سلب کیے بغیر پُرسکون زندگی گزار سکیں۔'' اسے یہ مختصر لیکچر دینے کے بعد اس نے مزید بات جاری رکھنا مناسب نہیں سمجھا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ سلسلہ منقطع کرنے کے بعد وہ اپنے بگڑے ہوئے موڈ کو

پوری طرح بحال بھی نہ کرنے پایا تھا کہ موبائل کی اسکرین پر کسی اور کال کی آمد کا اعلان ہونے لگا۔ اس نے اسکرین پر جگمگاتا جگو کا نمبر دیکھا اور کال ریسیو کرلی۔

''سلام صاحب! مجھے معلوم ہے کہ میں نے آپ کی فرمائش پوری کرنے میں خاصی دیر کردی ہے لیکن ایسی خبر لایا ہوں کہ آپ سن کر خوش ہوجائیں گے۔'' اس کی آواز سنتے ہی جگو نے بولنا شروع کیا تو اس کا چڑھا ہوا پارا دھیرے دھیرے نیچے آنا شروع ہوگیا۔ مسلسل مختلف لوگوں سے جاری رہنے والی ٹیلی فونک گفتگو میں یہ پہلی کال تھی جو کال کرنے والے نے اسے کسی خوش خبری کے بارے میں بتایا تھا... ورنہ اب تک اس کی جس کسی سے بھی بات چیت ہوئی تھی، کوفت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔

''اگر ایسی بات ہے تو فوراً خبر سنا ڈالو۔ یہاں اچھی خبروں کا سخت قحط پڑا ہوا ہے۔'' اس کا لہجہ قدرے خوش گوار ہوگیا۔

''تھوڑی تفصیل میں جانا پڑے گا۔ تفصیل کے بغیر جلدی سے خبر سنانے میں کچھ نہیں رکھا ہے۔'' جواباً جگو کی مسکراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ کھردرے مزاج کا گنڈا جو ایک سیاسی پارٹی کے لیے غنڈہ گردی کرتا تھا اور خاصے وسائل رکھتا تھا، اس کے سامنے موم ہوا تھا تو صرف اس احسان کے بدلے میں جو اس نے کیا تھا۔

وہ خوش گوار لہجے میں بولا۔ ''اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو ٹھیک ہے۔ تفصیل ہی سنا دو۔ میں تمہاری تفصیل کے لیے وقت نکال لوں گا۔''

''آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ چودھری پر ایک زوردار ضرب لگانی ہے۔ میں چاہتا تو اپنے آدمی پیر آباد بھیج کر کچھ بھی کروا سکتا تھا لیکن وہ کارروائی بس ایسی ہی ہوتی جس سے چودھری کو مالی نقصان پہنچتا یا پھر دو چار بندے زخمی وخمی ہو جاتے۔ اور یہ تو آپ کو بھی معلوم ہے کہ چودھری کے پاس ان دونوں چیزوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اس لیے میں نے ذرا الگ طریقہ اپنایا ہو اور اپنا ایک بندہ چودھری کے خاص کارندے شیدے کے پیچھے لگا دیا۔ اب میں آپ کو ایک مزے کی گل بتاؤں کہ شیدا جو ہے، وہ چودھری کے حکم پر اس کی بھاگی ہوئی دھی ہور اس کے شوہر کو ڈھونڈنے میں لگا ہوا تھا۔ اب جو اس نے میر پور خاص میں ان لوگوں پر ہاتھ ڈالا تو میرے بندے نے فوراً مجھے خبر کردی۔'' جگو کی بات سن کر شہریار کی پیشانی پر تفکر آمیز بل پڑ گئے اور آفتاب کا موبائل اس کے پاس موجود نہ ہونے کا کچھ کچھ سبب سمجھ آنے لگا لیکن ساتھ ہی ذہن میں ڈھیروں اندیشے بھی جاگ اٹھے۔ چودھری کے بندوں کا میر پور خاص میں آفتاب اور کشور تک جا پہنچنے کا نتیجہ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ پھر آفتاب کا موبائل تھا بھی پولیس کسٹڈی میں جس کا مطلب تھا کہ وہاں کچھ نہ کچھ ہنگامہ آرائی ہوئی ہے اور اس کا نتیجہ جانے کیا نکلا تھا۔ ہو تو یہ بھی سکتا تھا کہ اس ہنگامے میں آفتاب زخمی یا پھر ہلاک ہوگیا ہو اور موبائل سمیت اس کی ساری زیر استعمال اشیا پولیس کی تحویل میں چلی گئی ہوں۔ اپنی تمام تر بے چینی اور تشویش کے باوجود وہ جگو کو ٹوکے بغیر اس کی بیان کردہ تفصیلات سنتا رہا۔

''مجھے جب پتا چلا کہ شیدا چودھری کی بیٹی اور داماد پر ہاتھ ڈالنے جا رہا ہے تو میں نے اپنے آدمی سے کہہ دیا کہ شیدے کو کامیابی نہیں ہونی چاہیے۔ دشمن کو نقصان پہنچانے کا ایک طریقہ یہ بھی تو ہوتا ہے کہ دشمن کے دشمن سے دوستی نبھائی جائے۔ بدقسمتی سے میرا آدمی اکیلا تھا ہور اسے اپنے ساتھیوں کو جمع کرنے میں تھوڑا وقت لگ گیا۔ اتنی دیر میں شیدے نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اس اسپتال پر حملہ کردیا جدھر چودھری کی دھی داخل تھی۔ قسمت سے وہ اپنے خاوند کے ساتھ ادھر سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئی لیکن اس کی بچی ادھر اسپتال کی نرسری میں ہی رہ گئی۔'' جگو داستان کے اس موڑ پر پہنچا تو شہریار کے ہونٹوں سے بے ساختہ ہی ایک اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ یہ اطمینان آفتاب کے زندہ سلامت ہونے کی خبر سن کر محسوس ہوا تھا اور اب وہ موبائل کے پولیس کی تحویل میں چلے جانے کے سلسلے میں بھی بالکل درست اندازہ لگانے کے قابل ہوگیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ بھاگ دوڑ میں موبائل آفتاب کی جیب سے گر گیا ہوگا اور بعد میں پولیس کو مل گیا۔

''چودھری کے گرگے بھی اسی کی طرح ظالم ہیں۔ جب ماں باپ ہاتھ نہیں آئے تو انہوں نے بچی ہی اسپتال کی نرسری سے غائب کرلی۔'' جگو کی داستان پورے جوش و خروش کے ساتھ جاری تھی۔ ''اس وقت تک میرا آدمی اپنے ساتھیوں کا بندوبست کر چکا تھا۔ اس نے فون پر مجھے تفصیل بتائی تو میں نے اس سے کہا کہ بچی ان لوگوں سے چھین لو اور ان کا حلیہ اتنا بگاڑ دو کہ چودھری انہیں پہچان بھی نہیں سکے۔ میرے خیال میں وہ لوگ اب کافی دن تک بستر سے اٹھ کر اپنے آقا کا کام کرنے کے لائق نہیں ہوسکیں گے۔'' جگو نے واقعی اسے ایسی خبر سنائی تھی کہ سن کر اس کا دل خوش ہوگیا تھا۔ وہ پہلے بھی چودھری کے ایک خاص گرگے بالے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے معذور کر کے بستر سے لگا چکا تھا اور اب دوسرے کے



بارے میں بھی یہی اطلاع دے رہا تھا۔ بے شک چودھری کے پاس بندوں کی کمی نہیں تھی لیکن اپنے غنڈوں میں سے خاص الخاص غنڈوں سے محروم ہونے پر وہ تلملاتا تو ضرور اور کچھ نہ کچھ کمزور بھی پڑ جاتا۔ دوسرے وہ اس لیے بھی خوش تھا کہ آفتاب اور کشور کی بیٹی چودھری کے قبضے میں جانے سے بچ گئی تھی۔ وہ بچی کو اسپتال سے اٹھائے جانے کا مطلب سمجھتا تھا۔ بچی کے ذریعے چودھری آفتاب کو بلیک میل کر کے اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرسکتا تھا اور ایک بار آفتاب اس کے ہاتھ آجاتا تو پھر وہ اس کے ساتھ جو چاہے سلوک کرتا۔ منتقم مزاج چودھری کے نزدیک تو آفتاب نے اس کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا اور جسارت کی پاداش میں وہ آفتاب کی تکا بوٹی کر ڈالنے کے لیے بے چین تھا۔

''بچی کہاں ہے؟'' اس نے جگو کی داستان سننے کے دوران پہلی بار کوئی سوال کیا۔

''بچی فی الحال کراچی کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں داخل ہے۔ بہت کمزور بچی ہے، اس پر سے اس کے ساتھ جو سلوک ہوا اس سے وہ چاری ہور بھی ڈھے گئی۔ اسپتال والوں نے کہا ہے کہ کم سے کم آٹھ دس دن اسپتال میں رکھیں گے تب جا کر اس میں کچھ بہتری آئے گی۔ میں نے سوچا آپ کو ساری تفصیل سنا دوں، فیر آپ جو کہیں گے وہ کرلیں گے۔ بچی کے ماں باپ کا پتا ملوم نہیں ہے۔ جانے وہ لوگ میر پور سے نکل کر کدھر چلے گئے، پر میں کوشش کروں گا کہ ان کا پتا ٹھکانا ملوم کر کے آپ کو بتا دوں۔'' جگو نے اسے تفصیلی جواب دیا۔

''تھینک یو جگو! تم نے بڑا کام کیا ہے۔ آفتاب کا ایڈریس معلوم کرسکو تو اچھی بات ہے ورنہ تو مجھے امید ہے کہ وہ خود بھی مجھ سے رابطہ کرے گا۔ تم مجھے اسپتال کا نام پتا وغیرہ نوٹ کروا دو۔ اگر آفتاب نے مجھ سے رابطہ کیا تو میں اسے اطلاع کردوں گا۔ اور ہاں، اسپتال کا جو بل وغیرہ بنے، وہ بھی مجھے بھجوا دینا۔ بل میں پے کردوں گا۔'' اس نے جگو سے کہا۔

''بل کا کوئی مسئلہ نہیں ہے اے سی صاحب! میرے پاس اتنا تو ہے کہ میں بل کے چند ہزار بھر سکوں۔'' اس کی بات سن کر جگو فوراً بولا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ یہ بل مجھے ہی ادا کرنا چاہیے۔ تم میرے کہنے پر میرے لیے جو کچھ کر رہے ہو، میرے لیے وہی کافی ہے۔ میں تم پر کسی قسم کا زائد بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔ تم اپنی رقم اپنے بال بچوں پر خرچ کرو، یہی مناسب ہوگا بلکہ بات نکل ہی گئی ہے تو میرے خیال میں، میں اپنے ذہن میں موجود ایک بات تم سے کہہ ہی دوں۔ مجھے امید ہے کہ تم میری بات پر غور کرو گے۔'' اس نے کچھ کہنے سے پہلے تمہید باندھی۔

''آپ کہہ کر تو دیکھیں اے سی صاحب! مجھے ملوم ہے کہ آپ نے کوئی بھلی گل ہی سوچی ہوگی۔ آپ تو ہیں ہی دوجے کا بھلا سوچنے والے آدمی۔'' جگو نے اس کے لیے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے بیٹے کو اپنے ساتھ شہر لے جا کر کسی اچھے اسکول میں داخل کروا دو۔ یہاں گاؤں میں اس کی اچھی تعلیم وتربیت ہونا مشکل ہے۔ تمہارے پاس مواقع ہیں تو پھر کیوں تم اپنے بیٹے کو یہاں چھوڑ کر اس کا مستقبل خراب کر رہے ہو۔ بچہ اچھے اسکول کالج میں پڑھے گا تو کارآمد شہری بنے گا ورنہ دوسروں کے لیے بوجھ ثابت ہوگا۔'' اس نے اپنے دل میں پلتا خیال جگو کے سامنے ظاہر کیا۔

''میں خود بھی ایسا ہی سوچتا ہوں اے سی صاحب لیکن اس کی ماں کا سوچ کر عمل نہیں کر پاتا۔ میں بچے کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا تو وہ تنہا رہ جائے گی۔ میں دیکھنے میں جتنا بھی ظالم سہی، پر ہوں اصل میں نرم دل کا۔ مجھ سے اس کی ماں کا تڑپنا برداشت نہیں ہوگا اس لیے اپنی سوچ پر عمل نہیں کر پاتا۔'' اس نے وجہ بیان کرتے ہوئے اپنی صفائی پیش کی۔

''یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں۔ تم بچے کی ماں کو بھی اپنے ساتھ شہر لے جا کر کرائے کے کسی گھر میں رکھ سکتے ہو۔ آخر تمہاری دوسری بیوی بھی تو وہاں رہ ہی رہی ہے، تم پہلی کو بھی لے جاؤ۔ میں بہرحال اس سے زیادہ تمہارے ذاتی معاملے میں مداخلت نہیں کروں گا۔ ایک خیال میرے ذہن میں تھا، وہ میں نے تمہارے سامنے بیان کردیا... آگے تمہاری مرضی ہے کہ تم کیا کرتے ہو اور کیا نہیں۔'' وہ کسی کی ذاتیات میں ضرورت سے زیادہ دخل دینا مناسب نہیں سمجھتا تھا چنانچہ اب بھی فوراً ہی پیچھے ہٹ گیا۔

''آپ کی گل میرے دل کو لگی ہے اے سی صاحب! میں اس پر ہور غور کروں گا، فیر اپنا فیصلہ سناؤں گا۔'' جگو نے دھیمے لہجے میں جواب دیا جس کو سن کر اس نے مزید کچھ نہیں کہا اور اسپتال کا فون نمبر اور پتا وغیرہ لے کر رابطہ منقطع کردیا اور فوراً ہی اپنے دائیں جانب رکھے گلاس کو اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔ مسلسل ہونے والی ٹیلی فونک گفتگو نے اس کا حلق خشک کردیا تھا اور پھر ایک اندرونی تھکن کا بھی احساس تھا۔ جس کی خاطر، جس کی تلاش میں اس نے اتنے بڑے آپریشن کا بندوبست کروایا تھا وہ نہ جانے کہاں کھو گئی تھی اور شاید واقف

بھی نہیں تھی کہ کوئی اتنی شدت کے ساتھ اسے کھوج رہا ہے۔

☆☆☆

چودھری چوٹ کھائے ہوئے درندے کی طرح ادھر سے اُدھر ٹہلتا پھر رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے کبھی کبھی اس کے منہ سے ایسی آوازیں نکلتیں جیسے وہ غرا رہا ہو۔ پے در پے ناکامیوں نے اسے سخت جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ اپنی زبان سے نکلے ہوئے ہر حکم کو پورا ہوتا دیکھنے کا عادی تھا لیکن اب جانے اس کے ساتھ کیا ہونے لگا تھا کہ تمام تر کوشش کے باوجود اس کے احکامات کی تعمیل نہیں ہو پاتی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی اپنی راجدھانی میں اس کے خلاف سازشیں اور بغاوتیں ہونے لگی تھیں۔ پہلے کشور نے آفتاب کے ساتھ نکاح کر کے حویلی سے فرار ہو کر اس کے منہ پر اس زور کا طمانچہ مارا کہ وہ آج تک اس چوٹ کی شدت سے بلبلاتا پھرتا تھا پھر وڈی چودھرائن نے سازشوں کے جال بُننے شروع کر دیے۔ یہ وڈی چودھرائن کی ہی سازش تھی کہ فریدہ زندہ سلامت اولاد کو جنم نہ دے سکے اور اس کا بچہ دنیا میں آنے سے پہلے ہی موت کی آغوش میں چلا جائے۔ قدرت کی مہربانی سے چودھرائن کی سازش ناکام رہی اور فریدہ اور اس کا بچہ دونوں ہی بچ گئے۔ وہ دونوں ابھی اسپتال میں ہی تھے اور چند دن میں واپس آنے والے تھے۔ چودھری کو اس سازش سے فریدہ کے بھائی چودھری بختیار نے باخبر کیا تھا اور ساتھ ہی یہ مطالبہ بھی کیا تھا کہ وہ فریدہ کو اس کے ساتھ میکے بھجوا دے۔ وہ اپنی بہن کی جان حویلی میں خطرے میں محسوس کر رہا تھا۔ چودھری نے وڈی چودھرائن کو اس کے مقام کے باوجود اس جرم کی پاداش میں حویلی کے تہ خانے میں ڈلوا دیا۔ تہ خانے کی صعوبتوں میں وڈی چودھرائن نے نہ صرف اپنا یہ جرم تسلیم کیا بلکہ یہ انکشاف بھی کر ڈالا کہ ماہ بانو کو حویلی سے فرار کروا کر ڈاکوؤں کے ڈیرے پر پہنچانے کا کارنامہ بھی اسی کا ہے جو اس نے اپنے بڑے داماد چودھری اشرف شاہ کی مدد سے سرانجام دیا تھا۔

اس انکشاف پر چودھری بڑا بھنّایا۔ اگر اسے شروع میں ہی یہ بات پتا چل جاتی تو وہ ڈاکوؤں کے سردار سے سودے بازی کر کے خود ماہ بانو کو حاصل کر لیتا لیکن افسوس کہ اسے یہ سب آپریشن شروع ہونے کے بعد معلوم ہوا تھا اور اس موقع پر وہ اپنے سارے اختیارات کھو چکا تھا۔ غصے اور جھنجلاہٹ میں اس نے چودھرائن کو خوب زدوکوب کیا لیکن کمان سے نکلا ہوا تیر تو واپس آنے سے رہا۔ دوسری طرف وہ سادھو بھی غائب تھا جسے اس نے شہریار کو ہلاک کرنے کا کام سونپا تھا۔ پولیس میں موجود اپنے مخبروں کے ذریعے اسے آپریشن کی ساری تفصیلات معلوم ہو گئی تھیں۔ ان تفصیلات میں بالکل اچانک شہریار کے موقع پر پہنچ جانے کا ذکر بھی موجود تھا۔ اس کے وہاں پہنچنے کا مطلب تھا کہ سادھو نے اس کے حکم کی تعمیل نہیں کی اور شہریار کو قتل کرنے کے بجائے اسے ڈیرے تک پہنچا کر غائب ہو گیا۔ چودھری کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ آپریشن کے دوران ڈیرے پر اور اس کے اردگرد کسی لڑکی کو تلاش کیا جاتا رہا تھا اور یہ کام شہریار کے حکم پر کیا جا رہا تھا لیکن لڑکی ہنوز لاپتا تھی۔ چودھری اتنا عقل مند تو تھا ہی کہ اس بات کو سمجھ سکتا کہ شہریار جس لڑکی کو تلاش کروا رہا تھا، وہ ماہ بانو تھی۔ یقیناً اسے کسی ذریعے سے یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ ماہ بانو ڈاکوؤں کے قبضے میں ہے۔ شہریار کی اس باعلمی پر بھی وہ بُری طرح تلملایا تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ یہ حویلی کا ایک راز تھا جس کے شہریار کے علم میں ہونے کا مطلب تھا کہ حویلی میں اس کا کوئی ایسا مخبر موجود ہے جو اسے یہاں کی خبریں دیتا ہے۔

اس سوچ کے بعد جہاں وہ اس مخبر کو پکڑنے کے لیے بے چین ہو گیا تھا، وہیں اس کے دل میں موجود وڈی چودھرائن کے لیے غصے میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس کا بس چلتا تو وہ بیچ چوراہے پر کھڑا کر کے وڈی چودھرائن کو اس وقت تک کوڑے لگواتا جب تک وہ اپنی جان سے نہ چلی جاتی لیکن وہ اندر کی بات اندر ہی رکھنے پر مجبور تھا۔ وہ اپنی عزت بیچ چوراہے پر نہیں لے جا سکتا تھا۔ دوسروں کی عورتوں کو برہنہ کر کے گاؤں میں گھمانے والے کی ناک اپنی عزت کے معاملے میں بہت لمبی تھی لیکن وہ اپنے مجرموں کو معاف کر دینے کا بھی عادی نہیں تھا۔ وڈی چودھرائن کے لیے وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ اپنی زندگی کا ایک ایک پل اذیت اور تکلیف میں گزارے گی۔ اس جیسی تعیشات کی عادی عورت کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ اسے ہر آسائش سے محروم کر کے تہ خانے کی تاریکی میں روکھی سوکھی کھا کر زندہ رہنے پر مجبور کیا جائے۔

وڈی چودھرائن کے لیے واقعی وہ سزا بڑی سخت تھی اور وہ الٹے سیدھے کھانوں کی بہ دولت پیٹ کی بیماریوں کا شکار ہو کر بستر سے لگ گئی تھی لیکن چودھری کو اس پر رحم نہیں آ رہا تھا۔ فی الحال وہ وڈی چودھرائن کے میکے والوں اور خود اپنی ہی اولاد کی مخالفت کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہیں تھا ورنہ تو شاید اب تک چودھرائن کی موت کا حکم ہی صادر ہو چکا ہوتا۔ اب بھی اس نے چودھرائن کے شدید بیماری کے باعث بیرونِ ملک علاج کے لیے مقیم ہونے کا عذر پیش کر کے سب



کے منہ بند کر دیے تھے۔ لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ یہ بہانہ زیادہ دن نہیں چل سکے گا اور اس سے چودھرائن کی علاج گاہ کا نام پتا بتانے کا مطالبہ کیا جائے گا۔ اس نے چودھرائن کے بارے میں ابھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا تھا اس لیے ابھی اسی طرح کام چلا رہا تھا۔ فیصلہ ہو جاتا تو پھر وہ اپنی آگے کی منصوبہ بندی کر کے دوسروں کے سامنے کوئی کہانی پیش کرتا۔ اس کی پیش کردہ کہانی کو سچ سمجھا جاتا یا نہیں لیکن اس کی طاقت اور اختیار کے سامنے سب ہی سر جھکانے پر مجبور ہوتے۔ فی الحال وہ چودھرائن والے مسئلے پر سوچ بھی نہیں رہا تھا۔ اسے کچھ دیر قبل ہی شیدے اور اس کے ساتھیوں کی ناکامی کی خبر ملی تھی۔ وہ لوگ آفتاب اور کشور کو گرفتار کرنے کے لیے گئے تھے اور پھر یہ اطلاع بھیج دی تھی کہ وہ دونوں فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں لیکن وہ لوگ ان کی بچی کو اپنے ساتھ لے کر آ رہے ہیں۔ چودھری کا خیال تھا کہ بچی کو چارے کے طور پر استعمال کر کے وہ اپنے مفرور مجرموں کو اپنے قدموں میں سر جھکانے پر مجبور کر دے گا لیکن پھر اچانک ہی شیدے سے رابطہ ختم ہو گیا۔ آخری اطلاع تک بچی اس کے قبضے میں آ چکی تھی اور وہ میر پور سے روانہ ہو چکا تھا لیکن پھر جانے کیا ہوا کہ اس سے رابطہ ٹوٹ گیا اور اب کئی گھنٹوں بعد معلوم ہوا تھا کہ شیدا اور اس کے ساتھی شدید زخمی حالت میں ہائی وے پر پڑے ملے تھے جہاں سے پولیس کی ایک گشتی پارٹی نے انھیں اسپتال پہنچایا۔ اسپتال میں ایک زخمی چل بسا تھا جبکہ باقی زیرِ علاج تھے۔ ان زیرِ علاج زخمیوں سے چودھری کا تعلق بنتا تھا چنانچہ اسے پولیس کے ساتھ مک مکا کرنا پڑا اور خاصی بڑی رقم صرف کر کے اس معاملے کو دبائے رکھنے میں کامیاب ہوا۔

ان حالات میں اس کا طیش میں ہونا قابلِ فہم تھا۔ اتنا کچھ خرچ کرنے کے بعد بھی اس کے ہاتھ کچھ نہیں آ سکا تھا اور یہ بات سامنے آئی تھی کہ بچی کو کوئی دوسری پارٹی لے اڑی ہے۔ اس دوسری پارٹی کا تعلق کس سے تھا، یہ بات ابھی تک واضح نہیں ہوئی تھی لیکن یہ تو واضح تھا کہ وہ جو کوئی بھی ہے اس کے مخالفین میں سے ہے اور اس کے مخالفین میں آج کل سب سے اوپر شہریار کا ہی نام تھا۔ شہریار کے آفس میں اس کے لیے جاسوسی کے فرائض انجام دینے والے ٹیلی فون آپریٹر نے اس سلسلے میں اپنی واقفیت سے انکار کر دیا تھا بلکہ اس خدشے کا بھی اظہار کیا تھا کہ شاید اسے ایک مخبر کی حیثیت سے پہچان لیا گیا ہے اور دفتر کے فون سے کوئی ضروری کال کرنے سے گریز کیا جا رہا ہے۔ بہرحال، وہ اس معاملے میں سو فیصد پُریقین نہیں تھا اس لیے اسے اپنی جگہ ٹک کر ہوشیار رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔

حالات و واقعات کا یہ سارا تسلسل چودھری افتخار عالم شاہ کے لیے ناخوش گواری اور ناکامیوں سے بھرا ہوا تھا اس لیے اس کا غضب سمجھ میں آنے والا بھی تھا۔ شدید غصے اور طیش کے باعث اس کا بلڈ پریشر کافی ہائی ہو چکا تھا لیکن وہ خود پر قابو پانے میں ناکام تھا اور منشی کی کئی بار کی استدعا کے باوجود دوا کھانے پر بھی تیار نہیں تھا۔ اس قسم کی کیفیت میں اس کے موبائل کی گھنٹی بجی اور اسکرین پر ڈیوڈ کا نام ابھرا تو اس کی پیشانی پر ناگواری کے اظہار میں بل پڑ گئے لیکن بہرحال ڈیوڈ ایسا بندہ تھا جس سے وہ خود بھی دبتا تھا اور اس کی کال کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ بادلِ ناخواستہ ہی سہی کال ریسیو کر لی۔

''کیا بات ہے... کیا بات کرنے کا موڈ نہیں تھا؟'' ڈیوڈ جیسے چالاک اور ہوشیار شخص سے اس کی ''ہیلو'' میں موجود ناگواری کی خفیف سی جھلک بھی چھپ نہیں سکی اور اس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں ذرا اپنے مسائل میں الجھا ہوا تھا اس لیے تمہیں ایسا محسوس ہوا ہوگا۔'' چودھری نے وضاحت پیش کی لیکن لہجے کو خوش گوار بنانے میں بہرحال کامیاب نہیں ہو سکا۔

''اوکے، تمہارے مسائل تمہارا مسئلہ ہیں۔ ان سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی ہم یہ چاہتے ہیں کہ تمہارے ذاتی معاملات ہمارے کام پر اثر انداز ہوں۔ ہمارا کام بہت ہی نازک ہے اس لیے تمہیں بہت محتاط رہنا چاہیے۔''

ڈیوڈ کے لہجے میں لاتعلقی اور بے نیازی تھی۔ چودھری اس کے انداز پر اندر اندر پیچ و تاب کھا کر رہ گیا اور صرف اتنا بولا۔ ''میں اس بات کو سمجھتا ہوں اور میرے خیال میں اب تمہارے پاس شکایت کی کوئی گنجائش بھی نہیں رہی۔ تمہیں یقیناً معلوم ہو ہی گیا ہوگا کہ جنگل میں ہونے والا آپریشن کس انداز میں ہوا اور پولیس تمہارے پروجیکٹ کے قریب بھی نہیں پھٹک سکی۔''

''ہاں، مجھے اس بارے میں سب معلوم ہے اور خوشی ہے کہ تم نے اپنا کہا سچ کر دکھایا۔ اگر پولیس والے اس طرف کا رخ کر لیتے تو ہمیں خاصا نقصان پہنچ سکتا تھا۔ میں تمہاری اور عابد انصاری کی کارکردگی سے بہت خوش ہوں۔ عابد انصاری نے بھی بڑا کام دکھایا اور ایم کی پہلی کھیپ بڑی آسانی سے نکال لانے میں کامیاب ہو گیا ورنہ سننے میں یہی

جدید طبی تحقیق ''ہارموٹانک کریم'' رنگ گورا کرنے اور اکثر جلدی امراض کیلئے انتہائی مفید بے ضرر اور سستی ثابت ہوئی

صبح، دوپہر، شام تین دن مسلسل استعمال سے کیل، دانے، چھائیاں ختم اور رنگ گورا ہوجاتا ہے۔ چہرہ معصوم، شگفتہ اور شاداب نظر آتا ہے

ایک ہاتھ پر ''ہارموٹانک کریم'' اور دوسرے پر کوئی بھی مہنگی سے مہنگی کریم لگا کر دیکھیں
''ہارموٹانک کریم'' والا ہاتھ واضح طور پر نرم و ملائم اور گورا ہوگا

**رنگ:**
انسانی جلد پر موسم، آب وہوا اور ماحول کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس لیے افریقہ کے لوگ کالے، یورپ کے لوگ گورے اور ایشیاء کے لوگ سانولے ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے دور دراز پہاڑی علاقوں کے لوگ بھی گورے ہوتے ہیں مگر سرخ رنگت ان کے خون میں (Red Blood Carpus Cells) کی زیادتی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ رنگ گورا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ زیادہ سردی کی وجہ سے موٹے کپڑے پہنتے ہیں۔ اس طرح ان کی جلد آب ہوا، موسم اور ماحولیاتی آلودگی کے اثرات سے محفوظ رہتی ہے۔ نیز شہروں میں موجود کیمیائی صنعتوں اور ٹریفک کی پیدا کردہ آلودگی وہاں تک نہیں پہنچتی۔

**صحت مند جلد کے فوائد:**
ہر جاندار کی کھال کا کام جسم کی حفاظت، شکل شباہت کو برقرار رکھنا، بیرونی حملوں سے اندرونی جسم کی حفاظت کرنا نیز عضلات کی تھکاوٹ کو دور کرنا ہے۔ اگر کسی جاندار کی کھال اس طرح اتاری جائے کہ خون کی نالیاں کٹنے نہ پائیں تو اس کی موت نہیں آجاتی مگر کھال کے بغیر اسکو زندگی گزارنے میں کافی دقت ہوتی ہے کہ نہ تو وہ زیادہ حرکات و سکنات کرسکتا ہے اور نہ ہی اپنے جسم کو مختلف بیماریوں سے بچا پاتا ہے۔ اس طرح وہ مختلف بیماریوں میں گھر کر بہت جلد مر جاتا ہے۔

**جلد اور حفاظت:**
کھال مختلف خلیوں (Cells) سے مل کر بنی ہوتی ہے اور ایک ہی کھال کے مختلف جگہ کے خلیے مختلف خواص کے حامل ہوتے ہیں۔ آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کھال بھی ایک مکمل جان ہے بلکہ ہر خلیہ بھی ایک مکمل جاندار ہے یہی وجہ ہے کہ اندرونی بازوؤں (بغلوں کے قریب) اور رانوں وغیرہ کی جلد ہماری باقی جلد سے زیادہ صحت مند، صاف، خوبصورت، گوری اور ملائم نظر آتی ہے کہ ان حصوں کی جلد کے خلیات بلحاظ ساخت بوجہ ڈھکے رہنے کے محفوظ رہتے ہیں اور اس طرح جلد ہمیں مجموعی طور پر صاف اور صحت مند نظر آتی ہے۔ خارش، تھکاوٹ اور مختلف جلدی امراض کی وجہ بھی یہی ہے کہ پوری جلد بیمار نہیں ہوتی بلکہ جلد کا مخصوص حصہ متاثر ہوتا ہے۔ کیونکہ موسمی اثرات، جراثیموں کا حملہ کسی ایک جگہ پر ہوتا ہے اور یہی متاثر ہوتی ہے۔ اس ایسا ضرور ہوتا ہے کہ شروع تو تھوڑی جگہ سے ہوتی مگر آہستہ آہستہ وہ شکایت پھیل کر پوری جلد کو متاثر کردیتی ہے۔ بلکہ دوسرے افراد کو بھی متاثر کردیتی ہے۔ جب کہ اگر جلد کی صحت ٹھیک ہو تو نا صرف جلد خارش پھوڑے اور پھنسیوں وغیرہ سے بچی رہتی ہے بلکہ تھکاوٹ بھی کم محسوس ہوتی ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ اپنی جلد کی مکمل حفاظت کریں۔ ناخن کاٹ کر رکھیں صاف ستھرے اور سوتی کپڑے کا استعمال کریں، جلد پر لگانے کی عام کریمیں وغیرہ لگانے سے پرہیز کریں کہ بنانے اور بیچنے والے تو فائدہ میں رہتے ہیں مگر استعمال کرنے والے بعض اوقات ایک عارضی یا مستقل عذاب میں پھنس جاتے ہیں۔ وراثتی جلدی امراض میں مبتلا افراد ہرگز پریشان نہ ہوں کہ یہ دوسروں کو نہیں لگتیں بلکہ گردوپیش میں موجود ہوتی ہیں۔

**صارفین کے تاثرات:**
صارفین کے ملے جلے تاثرات ہمیں بذریعہ خطوط، فون اور مختلف نمائشوں میں ان کی حاضری پہلے کی ابھی

نمک کریم بنانے والوں کی تمام تر توجہ کریم بنانے پر ہی رہی کہ وہ چمکدار ہو، سفید ہو بلھروں بھمروں والی ہو، دیدہ زیب پیکنگ ہو، اس کے اشتہارات زبردست ہوں اور اس پر امپورٹڈ کا لیبل ہی بڑا اوپر سے کسی فلمی ہیروئن، خوبصورت ماڈل گرل یا کسی خوبصورت بڑی شخصیت کی خوبصورتی کو ان کریموں کی بدولت کہہ کر ہم عوام کی خوب کریم نکالی گئی اور اب تو ہارموٹانک کریم جیسی پیکنگ میں مختلف کریمیں بھی آگئی ہیں۔ جبکہ ہارموٹانک کریم اس وقت مارکیٹ میں آئی جب ہزاروں روپے قیمت والی کریمیں عوام کی کریم نکال رہی تھیں اور ہارموٹانک کریم تو واقعی ایک کریم ہے۔

**ہارموٹانک کریم کے استعمال، فوائد:**
دانے، چھائیاں، جھریاں، گلٹیاں، خارش، ہیٹ ریشز، بواسیر، چھرنے کاٹنے (Vaginal Infection) انگلیوں، ناخنوں، جلد اور بالوں کی الرجی، داد، چنبل، دھپڑ، چھپاکی، جوڑوں اور سر درد، جلے، کٹے زخموں، زیچگی، چیچک، ٹانکوں کے نشانات، بعد بخار ہونٹوں پر نکلے گرمی دانوں، گرمیوں میں بغلوں اور رانوں میں بوجہ رگڑ اور خارش، پھٹی ایڑیوں پاؤں کے تلووں میں بدبو یا جلن اور تھکاوٹ یا جسم میں سوئیاں سی چبھتی ہوں تو متاثرہ جگہوں پر ہارموٹانک کریم مکمل آرام تک لگائیں۔ کان میں درد ہو تو 5 گنا زائد پانی میں ہارموٹانک کریم حل کر کے ایک قطرہ ٹپکائیں۔ بھڑ، مچھر، کھٹمل، بچھو کے کاٹے کا فوراً ہارموٹانک کریم لگانے سے درد، جلن اور سوجن کم اور زہریلے اثرات ہلکے پیلے زرد پانی کی صورت میں فوراً خارج ہوجاتے ہیں۔ دیر تک دھوپ میں رہنا ہو تو چہرے پر ہارموٹانک کریم لگا کر سورج کی مضر شعاعوں، گردوغبار اور ماحولیاتی آلودگی سے بچیں۔ دمے اور سانس کی تکلیف کی صورت میں انگلیوں پر ہارموٹانک کریم لگا کر سونگھنے سے عمل تنفس بحال ہوجاتا ہے۔ مذکورہ فوائد بعد از طویل تحقیق ثابت شدہ ہیں۔ گھر، دکان، دفتر اور گاڑی میں ہارموٹانک کریم کی موجودگی فوری ابتدائی طبی امداد ہے۔

**عمل بھاپ سے ایک ہی دن میں نکھرنا:**
نیم گرم پانی سے چہرہ دھو کر خشک ہونے پر ہارموٹانک کریم لگائیں ایک گھنٹہ بعد ابلتے ہوئے پانی کا برتن چولہے سے اتار کر ایک منٹ بھاپ چہرے پر لیں اس کے ایک گھنٹہ بعد چہرہ نیم گرم پانی سے دھو لیں۔ خشک ہونے پر ہارموٹانک کریم لگائیں اور یہ عمل تین بار مسلسل کریں۔ ایک ہی دن میں رنگ گورا اور چھائیاں ختم ہوجائیں گی۔ (حساس جلد والے یہ عمل نہ کریں)

**پرہیز:**
سوتی کپڑے پہنیں، دھوپ سے بچیں اور ناخن کاٹ کر رکھیں ہارموٹانک کریم کے استعمال سے پہلے تین دن صابن استعمال نہ کریں۔ بھاپ کا عمل 28 دن میں صرف ایک بار کریں۔

**نوٹ:**
زخم، پھنسیوں وغیرہ پر خالص ہارموٹانک کریم صرف ایک بار استعمال کریں۔ ازاں بعد پانچ گنا زیادہ تیل یا ویسلین سادہ میں ملا کر استعمال کریں تاکہ زخم نرم رہیں۔ خارش نہ ہو اور جلد ٹھیک ہو۔

تیار کردہ: اے۔ کے۔ کاسکو پانڈ، مینگورہ (سوات)
042-37666818
0300-9486848

نوٹ: ہارموٹانک کریم حقوق (پیکنگ، ڈیزائن، بروشر، مونوگرام، کیلی گرافی ٹریڈ مارک وغیرہ بحق رفیق شاکر محفوظ ہیں


آ رہا تھا کہ جب سے شہریار عادل اے سی کی پوسٹ پر آیا ہے، علاقے سے کچھ بھی نکال لے جانا مشکل ہوگیا ہے۔ تم تو خود حالات سے اچھی طرح واقف ہو۔ تمہارا لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ والا بزنس تو اے سی نے بالکل ٹھپ کر کے رکھ دیا تھا نا۔'' ڈیوڈ کا انداز مضحکہ اڑانے والا تھا اور چودھری کو ایسے انداز برداشت کرنے کی عادت نہیں تھی سو تلملا کر رہ گیا اور اپنے بڑبولے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

''اے سی کی کیا حیثیت ہے۔ میں چاہوں تو اس کل کے لڑکے کو مچھر کی طرح مسل کر رکھ دوں لیکن ہمیشہ اس کے بزرگوں سے اپنے پرانے تعلقات کا خیال آجاتا ہے۔''

''اوہ... مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم میں رواداری کے جراثیم بھی پائے جاتے ہیں۔ میں نے تو ہمیشہ تمہیں بڑا حسابی کتابی بندہ پایا ہے۔ مجھے قطعی علم نہیں تھا کہ تم اپنی آن اور دولت کے علاوہ بھی کسی چیز کو اہمیت دیتے ہو۔'' ڈیوڈ نے اس پر طنز کا ایک اور تیر پھینکا۔ وہ ایسا ہی آدمی تھا۔ کبھی موڈ ہوتا تو اس کے ساتھ دوستانہ رویہ اختیار کر لیتا ورنہ ایک آقا کی طرح جس لہجے میں چاہتا گفتگو کرتا۔

''میرا خیال ہے تم یہ ساری فضول باتیں چھوڑ کر مطلب کی بات کرو۔ تم نے کسی کام کے بغیر صرف مجھ سے گپیں لڑانے کے لیے تو فون کیا نہیں ہوگا۔'' اس بار چودھری کا میٹر پوری طرح گھوم گیا چنانچہ وہ کڑوے لہجے میں بداخلاقی سے بولا۔

''تم تو ناراض ہوگئے یار! میں نے تو تمہیں شاباش دینے کے لیے فون کیا تھا۔ تمہاری حکمتِ عملی واقعی بڑی زبردست ثابت ہوئی اور پولیس نے اتنا بڑا آپریشن مختصر مدت میں نمٹا لیا۔ اگر پولیس زیادہ عرصہ جنگل میں رہتی تو ہمارے لیے خطرہ پیدا ہوسکتا تھا۔''

''تمہیں اس خطرے سے بچانے کے لیے میں نے بڑی قربانی دی ہے۔ گرفتار ہونے والے ڈاکو میرے نمک خوار تھے اور مشکل حالات میں میرے بڑے کام آتے تھے۔'' اس نے احسان جتایا۔

''قربانی کا نام نہ لو۔ تم نے پورا حساب کتاب کر کے ہی قدم اٹھایا ہوگا۔ ہم سے ہونے والے فائدے کا تناسب یقیناً تمہارے ڈاکو دوستوں کے مقابلے میں زیادہ ہی ہوگا جو تم نے ہمارے مفادات کا خیال ان سے زیادہ رکھا۔ ویسے میں نے سنا ہے کہ تمہارے ان نمک خواروں کے قبضے میں تمہاری من پسند ماہ بانو تھی جسے آپریشن کے دوران کوشش کے باوجود تلاش نہیں کیا جا سکا۔ خوب نمک حلالی کا مظاہرہ کیا تمہارے نمک خواروں نے۔ اپنے گاڈ فادر کی محبوبہ کو ہی لے اڑے۔''

دور بیٹھ کر بھی اس کی معلومات حیرت انگیز طور پر اَپ ڈیٹ تھیں۔

''مجھ سے نمک حرامی کر کے انہوں نے اپنے حصے کی سزا پالی ہے اور میں ان اصل مجرموں تک بھی پہنچ گیا ہوں جنہوں نے میرے وفاداروں کو نمک حرامی پر اکسایا تھا۔ جلد وہ مجرم بھی اپنے انجام کو پہنچ جائیں گے۔'' چودھری نے سنگین لہجے میں اس کے طنز کا جواب دیا۔

''کیا تم مجھے ان اصل مجرموں کا نام بتانا پسند کرو گے؟'' ڈیوڈ کے لیے یقیناً یہ ایک انکشاف تھا کہ چودھری کے نمک خوار ڈاکوؤں نے کسی کے اکسانے پر ماہ بانو کو اپنے ڈیرے پر رکھا تھا چنانچہ تجسس آمیز لہجے میں سوال کیا۔

''نہیں، وہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔'' چودھری نے سختی سے انکار کر دیا۔

''او کے، ایز یو وش۔ میں نے تمہیں اس وقت شاباش دینے کے علاوہ ایک اہم معاملے پر گفتگو کے لیے فون کیا تھا۔ خوامخواہ ہماری گفتگو طول پکڑ گئی اور فضول بحث میں الجھ کر اصل بات رہ گئی۔'' اس کے انکار کا برا مانے بغیر ڈیوڈ نے یکدم ہی گفتگو کا رخ بدل دیا۔

''بولو، میرے پاس بھی وقت کم ہے۔ مجھے کئی اہم کام دیکھنے ہیں۔'' ڈیوڈ پر اپنی اہمیت ثابت کرنے کے لیے وہ رعونت سے بولا جس کی اس نے پروا نہیں کی اور بے نیازی سے گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''ہم چاہتے ہیں کہ تم سے ہمارے کاروباری مراسم مزید گہرے ہو جائیں۔ پوست کی کاشت کے سلسلے میں تم ہمارے ساتھ جو تعاون کر رہے ہو اس کے علاوہ بھی ہم تمہارے ساتھ مزید کنٹریکٹ کرنا چاہتے ہیں۔''

''وہ کیا؟'' چودھری کی رال ٹپکی۔ بے پناہ خاندانی دولت کے علاوہ وہ غریب مزارعوں کا خون چوس کر بھی خوب کماتا تھا۔ اس کے باوجود اس کی دولت کے لیے ہوس کم نہیں ہوتی تھی۔ اس کی بدنیتی کا دوزخ ہمیشہ ھل من مزید کا نعرہ ہی لگاتا رہتا تھا چنانچہ ڈیوڈ نے مزید بزنس کی بات کی تو اس کا ہوس پرست ذہن فوراً آنے والی مزید دولت کا اندازہ لگانے لگا۔

''ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمہارا ایک جوتوں کا کارخانہ بھی ہے۔ ہم تمہارے اس کارخانے میں ایک لیب بنانا چاہتے ہیں۔ اس لیب میں افیم سے ہیروئن تیار کی جائے گی۔ اس کام کے لیے ہم اپنے دو ایکسپرٹس کو بھجوائیں گے۔ ہمارے وہ ایکسپرٹس پہلے سے ہی ایک علاقے میں کام کر رہے ہیں لیکن

اب وہاں حالات بہت مخدوش ہو چکے ہیں۔ دہشت گردی کے خلاف آپریشن میں فورس ان علاقوں میں داخل ہو چکی ہے۔ دوسری سرکاری ایجنسیاں الگ پیچھے لگی رہتی ہیں۔ منشیات کے معاملے میں ان علاقوں کی بدنامی اتنی زیادہ ہو چکی ہے کہ وہاں رہ کر خود کو نظروں سے بچانا مشکل ہو گیا ہے۔ اسی لیے ہم یہ نیا سیٹ اَپ تیار کر رہے ہیں۔" ڈیوڈ کی اس مختصر بریفنگ نے چودھری پر بہت سے عقدے کھول دیے۔

اسے سمجھ آنے لگا کہ ڈیوڈ نے اس کا انتخاب کیوں کیا ہے۔ پیر آباد سے متصل جنگل اپنے خصوصی جغرافیائی، ارضی اور موسمی حالات کی وجہ سے اس قابل تھا کہ وہاں آسانی سے پوست کی کاشت کی جا سکے۔ وہاں سبزہ بھی تھا اور نہر کا رواں پانی بھی۔ اس کے علاوہ خاصا طویل پہاڑی سلسلہ الگ تھا۔ ڈیوڈ کے ماہرین نے چھوٹی موٹی جینیاتی تبدیلیاں کر کے آرام سے وہاں پوست کے پودے کو کاشت کے قابل بنا لیا تھا۔ بے حد خفیہ طریقے سے کاشت کی گئی اس فصل سے آرام سے افیم حاصل کی جاتی اور پھر اس کے جوتوں کے کارخانے میں ہیروئن بننے کے عمل سے گزر جاتی۔ اگر اس عمل کے دوران کسی قسم کی ناگوار بو وغیرہ پیدا بھی ہوتی تو جوتوں کے ایک بڑے کارخانے میں جہاں چمڑا رنگنے کا کام بھی ہوتا تھا، اس بُو کو الگ سے شناخت کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ پھر کارخانے کی وجہ سے جو کور ملتی وہ الگ تھی۔ برسوں سے کام کرتے ایک کارخانے پر کون شک کر سکتا تھا کہ وہاں ہیروئن کی تیاری جیسا مہلک اور خطرناک کام ہو رہا ہے۔ وہ قومِ یہود کے اس نمائندے کی ذہانت اور منصوبہ سازی پر دل ہی دل میں اش اش کر اٹھا۔ وہ ایسے تباہ کن دماغ کے مالک تھے جب ہی تو اپنی تھوڑی سی تعداد کے باوجود دنیا پر چھائے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ امریکا جیسی سپر پاور بھی ان کے اثر سے محفوظ نہیں تھی۔

"اس کام میں میرے لیے بہت خطرات ہیں۔ اگر کسی وقت سرکاری ایجنسیوں کی نظر پڑ گئی تو میں تباہ ہو جاؤں گا۔ میری خاندانی عزت اور نیک نامی داؤ پر لگ جائے گی۔" اپنے بھاؤ بڑھانے کے لیے اس نے فوری طور پر ہامی بھرنے کے بجائے خدشات کا اظہار شروع کر دیا۔ اس طرح وہ اپنے حصے میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنا چاہتا تھا۔ ہیروئن جیسا زہر کہاں کہاں پھیلے گا اور کس کس کی زندگیاں برباد کرے گا، اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ دولت کا ایسا وفادار پجاری تھا جس کی نظریں اپنی مایا دیوی سے ہٹ کر دائیں بائیں کہیں بھی نہیں پڑتی تھیں۔ وہ ہمیشہ اس دیوی کے قدموں میں ہی سر جھکائے رکھنے کو زندگی کی معراج سمجھتا تھا۔ یہ سوچے بغیر کہ زندگی کا دورانیہ ہے ہی کتنا طویل۔ خصوصاً اس جیسے آدمی کے لیے جو تیزی سے ادھیڑ عمری کی منازل طے کرتا ہوا بڑھاپے کی طرف گامزن تھا۔ یوں تو موت کا کوئی وقت معین نہیں اور وہ اپنا وار کرنے پر آئے تو ماں کی کوکھ میں پلتے بچے سے لے کر گبرو جوان تک کسی سے رعایت نہیں کرتی لیکن انسان کو عمر کی منازل طے کرتے ہوئے بھی موت کا خیال ذرا مشکل سے آتا ہے، پر بڑھاپے میں تو سب ہی اس کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں اور ہمیشہ یہ خوف دامن گیر رہتا ہے کہ جانے کب موت جسم سے روح کو جھپٹ کر لے جائے اور زندگی کا سارا ہنگامہ پل بھر میں معدوم ہو جائے... مگر وہ چودھری افتخار عالم تھا جو زندگی کے ایک ایک لمحے سے کیف و نشاط نچوڑ لینا چاہتا تھا اور شاید دولت کا کیف ہر شے سے بڑھ کر تھا۔ یہ انسان کے پاس ہو تو وہ سمجھتا ہے دنیا اس کی مٹھی میں ہے۔ چودھری بھی یہ سوچے بغیر کہ وہ چاہے اپنی مٹھی میں ساری دنیا کی دولت سمیٹ لے آخرکار خالی ہاتھ ہی یہاں سے رخصت ہو گا، اپنے لیے دولت کے انبار جمع کرنے میں مصروف تھا۔ دولت کے اس ڈھیر میں مگن اسے تیزی سے ختم ہوتی عمر کی نقدی کا احساس ہی نہیں تھا۔

"خطرات میں تم پہلے سے ہی گھرے ہوئے ہو۔ تمہاری عزت داؤ پر لگنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ تم اپنے آدمیوں کی مدد سے پوست کاشت کروا رہے ہو۔ کبھی اس جرم میں بھی پکڑے گئے تو جان چھڑانا مشکل ہو گا لیکن یہ تم بھی جانتے ہو اور ہم بھی جانتے ہیں کہ تمہارے ملک میں یہ مشکل دولت سے آسان ہو جاتی ہے۔ اس لیے تمہارے حق میں بہتر ہے کہ زیادہ سے زیادہ دولت کماؤ اور عیش کرتے رہو۔ کبھی پکڑے بھی گئے تو دولت کے بل بوتے پر آسانی سے بچ نکلو گے۔" ڈیوڈ نے اس کی چال میں پھنسنے کے بجائے نپا تلا جواب دیا۔

"تو پھر یہ دولت واقعی زیادہ ہونی چاہیے۔ اس بار تمہیں مجھ سے پہلے سے زیادہ پر سٹیج پر معاملات طے کرنے ہوں گے۔" چودھری نے اپنی کوشش ترک نہیں کی اور چاہا کہ ڈیوڈ کی بات پکڑ کر اپنے لیے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کر لے۔

"نہیں، اس بار تمہیں وہ قبول کرنا ہو گا جو ہم تمہیں دیں۔ پہلی بار ہم نے تمہارا بہت خیال کیا تھا لیکن اب گیم ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اگر تم نے ہمارے ساتھ تعاون نہیں کیا تو ہم خود تمہارے خلاف مخبری کر دیں گے۔ اب تم یہ سوچ لو کہ تمہارے پاس بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہمارا کوئی آدمی سامنے نہیں ہے۔ ہمارا تھوڑا بہت مالی نقصان ہو گا جسے برداشت کر کے ہم پھر دوبارہ کہیں اور نیا سیٹ اَپ جما لیں گے لیکن تم اور تمہارے آدمی پکڑے جائیں گے۔ بہر حال، ان باتوں سے تم یہ نہیں سمجھو کہ تم ہمارے ساتھ معاملہ کر کے گھاٹے میں رہو گے۔ ہم معاوضہ اپنی مرضی کا دیں گے لیکن وہ اتنا ہو گا کہ تم خوش رہو گے۔" چودھری کو اس کی پوری اوقات بتانے کے بعد ڈیوڈ نے آخر میں ایسی بات بھی کہہ دی کہ اس کی اشک شوئی ہو سکے۔

"دھمکیاں مت دو ڈیوڈ صاحب! ابھی تم خود کہہ چکے ہو کہ ہمارے ملک میں دولت کے بل بوتے پر بچ نکلنا کچھ ایسا مشکل نہیں ہے... اور جہاں تم اتنا کچھ جانتے ہو، وہاں یہ بھی ضرور جانتے ہو گے کہ میرے پاس دولت کی پہلے بھی کمی نہیں ہے۔"

"لیکن تم اس دولت میں اضافہ تو چاہتے ہو نا اور ہمارا ساتھ تمہاری دولت میں کئی ملین کا اضافہ کرے گا۔" چودھری کی ناراضی کی پروا کیے بغیر ڈیوڈ نے ترت جواب دیا اور یہ جواب ایسا تھا کہ چودھری کا منہ بند ہو گیا۔ وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ اگر ڈیل ڈیوڈ کی مرضی سے ہوئی، تب بھی وہ نقصان میں نہیں رہے گا۔

"اوکے، یہ بتاؤ کہ کام کب سے شروع کرنا ہے؟ کارخانے میں لیبارٹری قائم کرنے کے لیے وہاں کنسٹرکشن کا کام بھی تو کرنا ہو گا۔" اس نے ایک طرح سے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔

"ان تمام معاملات کے لیے میرا آدمی آ کر تم سے مل لے گا۔ وہی تمہیں بتائے گا کہ کیا اور کس طرح کرنا ہے۔ تمہیں بس اس سے تعاون کرنا ہو گا۔" اس کے ہامی بھرتے ہی ڈیوڈ کا لہجہ ایک بار پھر تحکمانہ ہو گیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارے آدمی کو ویل کم کہنے کے لیے تیار ہوں۔" چودھری نے جواب دیا۔

"گڈ! مجھے تم سے یہی امید تھی۔" ڈیوڈ نے اسے شاباشی دے کر سلسلہ منقطع کر دیا اور چودھری اپنے غیر ملکی آقا کی پچکار سن کر آنے والی دولت کے تصور سے مسکرانے لگا۔ اس کے حساب سے آج کے بُرے دن میں اسے یہ پہلی ایسی خوش خبری ملی تھی جو اس کے لیے نفع بخش تھی... اور بھلا انسان وہ بھی پستی میں گرا ہوا انسان کہاں جانتا ہے کہ وہ جس شے کو اپنے لیے خیر سمجھ رہا ہے وہی سب سے بڑا شر ہے۔

☆☆☆

"بس بھئی، اب رک جاؤ۔ چلتے چلتے پیروں میں درد ہو گیا ہے۔ تھوڑی دیر اور چلے تو میں بے ہوش ہو کر گر جاؤں گی۔" وہ تینوں مسلسل سفر میں تھے۔ پکڑے جانے کے خوف نے انہیں مجبور کر دیا تھا کہ وہ جلد از جلد جتنا ممکن ہو، اتنی دور نکل جائیں چنانچہ وہ اپنی تھکن کی پروا کیے بغیر کبھی دوڑ کر اور کبھی چل کر فاصلہ بڑھانے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ ان کا یہ سفر تقریباً بے سمت تھا اور اسلم اپنے اندازوں کی بنیاد پر اب تک راہ کا تعین کرتا رہا تھا۔ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد اب جا کر انہیں کچھ سکون ہوا تھا کہ ان کا تعاقب نہیں کیا جا رہا ہے اور اب وہ قدرے محفوظ ہیں۔ شاید تحفظ کا ہی احساس تھا جو للی کی زبان پر اپنی تھکن کا تذکرہ آ گیا تھا اور اس نے کچھ دیر رکنے کی استدعا کی تھی۔

"اگر تم بے ہوش ہو کر گر گئیں تو یہ میرے لیے بڑا خوشی کا مقام ہو گا۔ میں سوچوں گا کہ بڑی مصیبت سے آسانی سے جان چھوٹی اور خس کم جہاں پاک کہہ کر ہاتھ جھاڑتا ہوا آرام سے آگے بڑھ جاؤں گا۔" اسلم نے اپنے قدم روکے بغیر اسے بے مروتی سے جواب دیا۔

"مجھے معلوم ہے تم ایسا نہیں کر سکو گے کیونکہ چاہے میں تمہیں جتنی بھی بُری لگتی ہوں لیکن تمہارا دل اتنا بُرا نہیں ہے کہ ایک انسان کو اس تنہا و ویران جگہ پر بے ہوشی کی حالت میں چھوڑ کر جانے پر آمادہ ہو جائے۔" اس کی بے مروتی کو خاطر میں لائے بغیر للی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور خود اطمینان سے دھپ کر کے ایک پتھر پر براجمان ہو گئی۔ اس کی اس حرکت پر اسلم رک کر اسے غصے سے گھورنے لگا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ کوئی اتنی لڑنے جھگڑنے والی بات نہیں ہے۔ ہم خطرے سے کافی دور نکل آئے ہیں اور کچھ دیر یہاں رک کر آرام کر سکتے ہیں۔" اب تک خاموش تماشائی بنی ماہ بانو نے ان کے درمیان مداخلت کرتے ہوئے جھگڑے کو ختم کرنے کی کوشش کی اور خود بھی للی کے قریب ہی ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔

"اگر آپ دونوں خواتین کا یہی اصرار ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ ہم یہاں رک جاتے ہیں اور کچھ پیٹ پوجا کا بندوبست کرتے ہیں ورنہ تو میرا خیال تھا کہ کچھ وقت اور گزر جائے تو پھر کہیں رکیں گے اور رات کا کھانا کھا کر سو جائیں گے۔ ابھی تو دن کی تھوڑی روشنی باقی ہے۔" اسلم گویا ہتھیار ڈالتے ہوئے خود بھی قریب ہی ٹک گیا اور اپنی رائفل ایک جانب پڑے پتھر سے ٹکا دی۔

"اگر ایسی بات ہے تو پھر چلو چلتے ہیں۔ جہاں اتنی ہمت کی ہے تھوڑی دیر اور برداشت کر لیں گے۔" اس کی

توجیہہ سن کر للی فوراً کھڑی ہوگئی لیکن اب اسلم کی توجہ بھٹک چکی تھی۔ وہ اردگرد کی ہر شے کو چھوڑ کر ماہ بانو کے پیروں کی طرف متوجہ تھا۔ شفاف رنگت والے بھرے بھرے سے پاؤں اس نے ابھی ابھی جوتوں سے باہر نکالے تھے اور طویل مسافت کے گواہ چھالوں کو نرمی سے اپنی مخروطی انگلیوں سے سہلا رہی تھی۔ اس کے چھالوں کو دیکھ کر اسلم کا دل تڑپ گیا۔ ماہ بانو لڑکی تھی جسے وہ ہمیشہ ہتھیلی کا چھالا بنا کر بہت پیار سے رکھنا چاہتا تھا لیکن عجیب ہی بات تھی کہ وہ آبلہ پا بیٹھی تھی اور وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔

''اب خود جم کر بیٹھ گئے ہو۔ میں کہہ رہی ہوں کہ چلو تو تمہیں سنائی ہی نہیں دے رہا۔'' للی کی نظروں نے یہ سارا منظر اچھی طرح دیکھا تھا چنانچہ لہجے میں حسد کی آگ سمو کر تیز لہجے میں اس سے بولی۔

''نہیں، اب رہنے دو۔ اب جب ہم رک ہی گئے ہیں تو ذرا سا وقت اور کیا دیکھنا۔ تم لوگ آرام کرلو۔ میں کھانے کے لیے کچھ لاتا ہوں۔ صبح ہم ذرا جلدی چل پڑیں گے۔''

نہایت معقولیت سے سفر دوبارہ شروع کرنے سے انکار کرتا ہوا وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا اور چہرے پر ذرا سی غصے کی سرخی لیے کھڑی للی کی طرف دیکھ کر پہلے مسکرایا اور پھر آسمان پر نظر دوڑاتا ہوا پُرسوچ انداز میں بولا۔ ''لگتا ہے یہاں کہیں قریب ہی پانی کا کوئی ذخیرہ ہے۔ اگر تم ان پرندوں کو غور سے دیکھو تو اندازہ ہوگا کہ یہ ایک ہی سمت میں رخ کررہے ہیں۔'' للی نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا لیکن دل میں اس سے اتفاق کیے بغیر نہیں رہ سکی۔ دن بھر اڑانیں بھرتے پنچھی شام ڈھلے اپنے مساکن میں واپس لوٹ رہے تھے اور واقعی ایک مخصوص سمت میں اتر رہے تھے۔

''چلو تم بھی کیا یاد کرو گی۔ آج تمہیں کسی پرندے کا مزے دار سا گوشت خود بھون کر کھلاتا ہوں۔ ایسا زبردست ذائقہ ہوگا کہ زندگی بھر بھول نہیں سکو گی۔'' لہجے کو خوش گوار بناتے ہوئے وہ اپنی رائفل اٹھا کر اس سمت میں آگے بڑھ گیا اور وانستہ اس جانب دیکھنے سے گریز کیا جہاں ماہ بانو بیٹھی تھی۔

وہ برسوں سے للی کو جانتا تھا اور اس کا خوب مزاج آشنا تھا اس لیے سمجھ سکتا تھا کہ اس کا زیادہ التفات ماہ بانو کے لیے للی کے دل میں نفرت کو بڑھا دے گا اور وہ اس کی دشمن بن جائے گی۔ ہم سفروں میں سے کسی کو بھی دشمن بنا کر چلنا بڑی نادانی کی بات تھی، سو وہ یہ نادانی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اونچے نیچے ناہموار راستے پر پیر جما کر چلتا ہوا وہ آگے بڑھا تو ایک چھوٹے سے ٹیلے کی اوٹ میں پہنچ کر اس کے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ یہاں ایک کافی بڑے گڑھے میں اچھا خاصا پانی جمع تھا۔ یہ یقیناً بارش کا پانی تھا جس میں ڈھیروں کائی اگ آئی تھی لیکن اس کے باوجود پانی کا یہ ذخیرہ پرندوں کی پیاس بجھانے کے لیے کارآمد تھا۔ اب بھی وہاں کئی پرندے جمع تھے اور کنارے پر بیٹھ کر وقتاً فوقتاً اپنی چونچیں پانی میں ڈبو کر پانی پی رہے تھے۔ وہ نہایت خاموشی سے ایک جگہ ٹک گیا اور اپنی رائفل کو سنگل شاٹ پر سیٹ کر کے سانس روکے ایک صحت مند بطخ نما پرندے کا نشانہ باندھنے لگا۔ وہ لوگ جن حالات میں ڈیرے سے نکلے تھے، اپنے ساتھ زیادہ کھانے پینے کا سامان نہیں لا سکے تھے۔ خوراک کے نام پر ان کے پاس چنے، گڑ کی ڈلیاں اور بس پانی ہی موجود تھا چنانچہ یہ ضروری تھا کہ جہاں شکار کا موقع مل سکے، وہاں اس سے استفادہ کیا جائے۔ ڈیرے سے اتنی قلیل خوراک کا ذخیرہ لے کر وہ نکلا بھی اسی بھروسے پر تھا اور اب رائفل سے نشانہ باندھے اپنی نشانہ بازی کی مہارت کا مظاہرہ کرنے ہی والا تھا۔ جیسے ہی اس کا منتخب کیا ہوا پرندہ فوکس ہوا، اس نے رائفل کی لبلبی دبا دی۔ انسان اور اس کی ایجادات کی آوازوں سے محروم پہاڑوں کا یہ ویران سلسلہ جہاں پرندوں کی چہچہاہٹ کے سوا کچھ نہیں سنائی دیتا تھا، رائفل کے اس اکلوتے فائر سے گونج اٹھا۔ یک دم ہی وہاں ایک ہلچل سی مچ گئی اور برسوں بلکہ شاید صدیوں سے بغیر کسی انسانی مداخلت کے وہاں سکون سے بسنے والے پرندے گھبرا کر شور مچاتے ہوئے فضا میں چکرانے لگے۔ وہ رائفل چھوڑ کر خود اپنی جگہ سے اٹھ کر تیزی سے اس پرندے کی طرف بھاگا جو اس کی گولی کا نشانہ بن کر زخمی ہوا تھا اور بُری طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔ پرندے کو اس کے سر سے پکڑ کر اس کے گلے پر چھری پھیر کر حلال کرنے کی نیت سے اس نے اپنے پیر کی طرف ہاتھ بڑھایا تاکہ وہاں بندھا خنجر نکال سکے لیکن ایک آواز پر بُری طرح بدک کر پلٹا۔ کسی نے بہت زور سے اسلم کہہ کر پکارا تھا اور پکارنے والی آواز مردانہ تھی اس لیے اس کا اس طرح بھڑکنا سمجھ آتا تھا۔

پلٹتے ہی اس کی نظروں نے ایک بہت ہی خوفناک منظر دیکھا۔ اس کے سامنے للی اور ماہ بانو ساتھ ساتھ کھڑی تھیں اور ایک رائفل کی نال نے انہیں اپنی زد میں لے رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ سے پھڑکتے ہوئے پرندے کی گردن چھوٹ گئی اور اس نے بے بسی سے اس سمت دیکھا جہاں اس کی رائفل پڑی تھی۔

حادثات وسانحات کی شکار... پناہ کی تلاش میں سرگرداں ماہ بانو کی داستانِ حیات کے واقعات اگلے ماہ پڑھیے

# انوکھے چور

محمد عفان آزاد

مثل مشہور ہے زندہ ہاتھی لاکھ کا اور مرا ہوا سوا لاکھ کا... انہوں نے بھی اسی مثل پر عمل کیا اور خوب پھل پایا... لیکن ہر برے کام کا ایک انجام ضرور ہوتا ہے۔ انہیں بی اپنے کیے کا حساب اسی دنیا میں چکانا تھا اور آخر وہ دن آ ہی گیا۔

**ان مجرموں کا احوال جن کی آنکھوں پر ہوس زر نے پٹیاں باندھ دی تھیں**

صبح سویرے کا وقت تھا۔ بیلے گیٹس اس وقت سینٹ لیوک اسپتال کے تہ خانے سے باہر آرہا تھا۔ اس کی کمر پر پلاسٹک کے کئے بڑے بڑے سیاہ تھیلے لدے ہوئے تھے۔ وزن اس کی جسمانی طاقت سے کہیں زیادہ تھا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے، زینے پر قدم رکھتا ہوا اوپر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے سیٹی بجانے کے انداز میں منہ کھول رکھا تھا لیکن وہ سیٹی نہیں بجا رہا تھا بلکہ اسے اضافی آکسیجن کی ضرورت تھی۔ ناک کے ذریعے ملنے والی آکسیجن اس کے پھیپھڑوں کے لیے ناکافی ثابت ہو رہی تھی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ منہ کے ذریعے لمبی لمبی سانسیں بھر رہا تھا۔

بیلے گیٹس اسپتال کا نہایت مصروف ملازم تھا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ چوکیدار

سے لے کر آپریشن تھیٹر میں سامان کی ترسیل تک، تقریباً ہر قسم کے فرائض سرانجام دے لیتا تھا۔ اس وقت بھی وہ سرجری کے دوران میں استعمال شدہ اشیا کو بھٹی میں جلانے کے لیے لے جا رہا تھا۔ اس کی کمر پر لدے تھیلوں میں کئی ایسے جسمانی اعضا بھی شامل تھے، جنہیں سرجری کے ذریعے جسم سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ اس کی کمر پر لدے ایک تھیلے میں ٹانگ تھی جو بدستور اس کی کمر میں چبھ رہی تھی۔ یہ شوگر کے اس مریض کی تھی جس کا آپریشن گزشتہ رات ہی کیا گیا تھا۔

بیلے کو سینٹ لیوک اسپتال میں صفائی ستھرائی کے کاموں کے لیے بھرتی کیا گیا تھا۔ تنخواہ معمولی تھی اور اُسے زیادہ سے زیادہ کمانے کی خواہش۔ میں رفتہ رفتہ وہ اپنے کام کے علاوہ بھی کئی اور کام سرانجام دینے لگا۔ یوں تین سال کے مختصر عرصے میں اس کی آمدنی میں اچھا خاصا اضافہ ہو چکا تھا لیکن اس کے باوجود بھی اس کی کوشش ہوتی تھی کہ جہاں سے اور جیسے بھی سہی، کچھ پیسے مل سکتے ہیں تو فوراً حاصل کر لے۔

ویسے تو بیلے ایڈمنسٹریٹر کے حکم پر ہر وہ کام کرنے کو تیار ہو جاتا تھا جس میں اسے اضافی پیسے ملنے کا آسرا ہوتا تھا لیکن اسے سب سے مناسب کام مُردہ خانے میں پوسٹ مارٹم کا لگتا تھا۔ اس کی وجہ اس کے دوسرے ساتھیوں کے نزدیک شاید یہ تھی کہ پوسٹ مارٹم کے بعد لاش کو ورثا کے حوالے کرنے کے دوران میں اسے بھاری بھرکم ٹپ بھی مل جایا کرتی تھی۔

پوسٹ مارٹم کی گئی لاشوں کو ٹانکے لگانے کا کام نہایت ہی تکلیف دہ تھا، جسے عملہ صرف مجبوری میں ہی سرانجام دیتا تھا۔ بیلے میں کام سیکھنے کی بھی خاصیت تھی۔ اس نے از خود صرف چند روز میں ہی لاشوں میں ٹانکے لگانے کا کام سیکھ لیا تھا۔ اس کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے ایڈمنسٹریٹر نے مستقل طور پر اس کام کے لیے اس کی ڈیوٹی لگا دی تھی۔ اس سے پہلے تھامس یہ کام کرتا تھا مگر وہ... ٹریفک کے ایک حادثے میں مر چکا تھا۔ وہ اس کام میں بیلے کا اُستاد بھی تھا۔ پوسٹ مارٹم کے بعد اُس کی لاش پر بھی بیلے نے ہی ٹانکے لگائے تھے۔ تھامس کی موت کے بعد اسپتال کے دوسرے پیرامیڈیکل اسٹاف میں سے کوئی بھی اس کام کو کرنے پر رضامند نہیں تھا۔ یہ بیلے کی خوش نصیبی تھی کہ تنخواہ میں اچھے خاصے اضافے کے ساتھ یہ کام بھی اسے مل گیا۔ جب وہ اپنی ڈیوٹی کرنے کے بعد گھر جا چکا ہوتا تھا، تب بھی اسے ایمرجنسی کی صورت میں واپس بلوا کر یہ کام کروایا جاتا تھا۔ ایمرجنسی میں گھر سے ڈیوٹی پر طلب کیے جانا عام طور پر ملازمین کو پسند نہیں آتا ہے لیکن وہ اس لیے خوشی خوشی دوڑا چلا آتا کہ اس صورت میں اسے ڈبل اوور ٹائم مل جاتا تھا۔

بیلے تہ خانے میں رات کو آپریشن تھیٹر سے آنے والے کچرے کو علیحدہ علیحدہ تھیلوں میں باندھ رہا تھا، تب اسے ایڈمنسٹریٹر نے انٹر کام پر بتایا کہ وہ جلد از جلد فارغ ہو کر پہنچے۔ پوسٹ مارٹم روم میں ایک لاش کو ٹانکے لگانے تھے۔ یہ شخص علی الصبح فوت ہوا تھا۔ اسے رات دیر گئے دل کا دورہ پڑنے پر اسپتال پہنچایا گیا تھا لیکن اس کی بیوہ کو شک تھا کہ کہیں کسی نے اسے زہر تو نہیں دے دیا ہے، اسے لیے پوسٹ مارٹم کیا گیا۔ اب وہ کٹی پھٹی لاش ٹانکے لگوانے کے لیے مُردہ خانے میں بیلے کی منتظر تھی۔ ایڈمنسٹریٹر کا حکم سنتے ہی وہ تیزی سے کام نمٹانے میں جُت گیا۔ جلدی جلدی کام ختم کرنے کے چکر میں اس نے اپنی قوت سے زیادہ بوجھ پیٹھ پر لاد لیا اور اب لڑکھڑاتے ہوئے باہر جا رہا تھا۔

صبح کے ساڑھے چھ بج رہے تھے جب وہ مُردہ خانے پہنچا۔ اُس وقت پوسٹ مارٹم کرنے والا ڈاکٹر، مرحوم کے معدے سے نکلنے والے نمونوں کو لیبارٹری بھجوانے کے لیے تیار کر رہا تھا۔

''ٹانکے لگانے کے بعد لاش کو سرد خانے منتقل کروا دینا اور یہاں کی اچھی طرح صفائی کر کے ہر چیز قرینے سے لگا دینا۔'' ڈاکٹر رابرٹ نے بیلے کو دیکھ کر حکم دیا۔

''بہت بہتر...'' اس نے اِرد گرد دیکھتے ہوئے نہایت فرمانبرداری سے کہا۔ ''مرنے والے کے ورثا کب آئیں گے۔ انہیں اطلاع کروا دی ہے۔'' اس نے الماری سے ٹانکے لگانے کا سامان نکالتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں...'' اس نے جواب دیا۔ ''جب تک ورثا کے حوالے میت نہ کر دی جائے، تم یہیں رہنا۔ ویسے وہ بھی تب تک آ ہی جائیں گے۔'' ڈاکٹر رابرٹ مُردہ خانے کا انچارج اور پوسٹ مارٹم کا ماہر تھا۔ اس کی ہدایت پر اس طرح کے سارے کام بیلے ہی کرتا تھا، اس لیے اس نے بھی تفصیل سے ہر بات اسے سمجھا دی۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ مختصر سا جواب دے کر اپنے کاموں میں لگ گیا۔

اس کے بعد وہ گھنٹا بھر تک بہت ہی مصروف رہا۔ وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا لیکن اس کے باوجود نہایت انہماک سے کاموں میں لگ گیا۔ سب سے پہلے اس نے لاش کا نہایت اچھی طرح معائنہ کیا۔ دستانے والے ہاتھ کٹے ہوئے



پیٹ کے اندر ڈال کر اعضا کو دیکھا۔ اس وقت وہ یہاں تنہا تھا۔ اس لیے نہایت تسلی سے اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد اس نے تمام ٹانکے لگائے۔ اس کے بعد لاش کو سرد خانے میں رکھنے کے لیے چلا گیا۔ واپس آ کر پوسٹ مارٹم ٹیبل کو صاف کیا اور تمام آلات کو جراثیم کش دوا ملے، کھولتے پانی سے دھو کر انہیں قرینے سے الماری میں رکھا اور پھر صفائی ستھرائی میں مصروف ہو گیا۔

پوسٹ مارٹم روم ایسا صاف ستھرا ہو چکا تھا کہ جیسے یہاں کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور پھر دستانے اتار کر منہ ہاتھ دھونے کے لیے واش روم میں چلا گیا۔

ویسے تو آج اس کی ڈیوٹی صبح آٹھ بجے ختم ہو جاتی تھی لیکن یہ اوور ٹائم تھا۔ اسے یقین تھا کہ جب تک لاش ورثا یا تدفین کرنے والوں کے حوالے نہیں کر دی جاتی، تب تک اسے ڈیوٹی پر ہی رہنا ہوگا۔

وہ واپس آیا تو خاصا تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ آتے ہی اس نے ڈاکٹر رابرٹ کی میز کا رُخ کیا۔ وہاں اس کے لیے ایک کاغذ چارٹ بورڈ پر چسپاں تھا۔

''مسٹر ہیڈرک کی لاش ایش برگ کے سپرد کی جائے۔ ورثا نے اطلاع دی ہے کہ دس گیارہ بجے تک کمپنی کی ایمبولینس میت لینے کے لیے پہنچے گی۔ میت ان کے حوالے کر دی جائے اور رسید لے لی جائے۔ ڈاکٹر رابرٹ۔''

''اوکے...'' اس نے یہ پڑھ کر خود کلامی کی اور سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر اپنا موبائل فون اٹھا کر کسی کا نمبر ملانے لگا۔

''ہاں مطلب کی چیز ہے، تم لے لینا۔'' دوسری طرف سے فون اٹینڈ ہوتے ہی اس نے کہا۔ ''کل شام کو تمہاری طرف چکر لگاتا ہوں۔ رقم تیار رکھنا۔'' لمحہ بھر تک دوسری طرف کی بات سننے کے بعد اس نے بائے کہہ کر فون بند کیا اور قمیص کی جیب میں رکھ لیا۔

''لگتا ہے کہ اب لنچ اور ناشتا ایک ساتھ کرنا ہوگا۔'' اس نے ایک بار پھر خود کلامی کی اور گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا دی۔ صبح کے نو بج رہے تھے۔ بیلے کو اب ایش برگ کمپنی کی ایمبولینس کے آنے کا انتظار تھا۔

☆☆☆

''ہیلو رالف... ڈیوڈ ہیڈرک بول رہا ہوں۔'' فون کرنے والے نے اپنا تعارف کروایا اور جواب کا انتظار کیے بغیر پوچھا۔ ''تم نے میرے انکل پر کام شروع کر دیا ہے؟''

''ابھی نہیں۔'' رالف نے جواب دیا۔ ہیڈرک کی لاش کا پوسٹ مارٹم ہوئے تین چار گھنٹے گزر چکے تھے، میت اس کے یہاں منتقل کی جا چکی تھی جب اسے مرنے والے کے بھتیجے کا فون ملا۔ وہ تجہیز و تکفین کرنے والی کمپنی رالف ایش برگ کا مالک تھا۔ دوپہر کا وقت ہو رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ شہر کے مضافات سے ایک میت کی تدفین کے بعد واپس دفتر کی طرف لوٹ رہا تھا۔

''کیا وجہ ہے؟'' ڈیوڈ نے سوال کیا۔ ''تم جانتے ہو کہ کل شام تدفین کا وقت طے کیا جا چکا ہے۔'' اس کے لہجے سے پریشانی عیاں تھی۔

''جب تک بعض ضروری کاغذات پر دستخط نہ ہو جائیں، تب تک ہم کام شروع نہیں کر سکتے۔'' رالف نے سکون سے جواب دینا شروع کیا۔ ''جیسا کہ میں نے آج صبح آپ کی آنٹی سے بھی کہا تھا کہ میں گھر آ جاتا ہوں، وہیں کاغذی کارروائی نمٹا لیتے ہیں۔''

''میں نے اپنے وکیل سے بات کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ قانون کے مطابق کسی بھی میت کی تجہیز و تکفین کے لیے اس طرح کی کاغذی کارروائی کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی، جیسا کہ آپ نے آنٹی کو بتایا تھا۔'' ڈیوڈ نے اس کی بات سن کر کہا۔

''قانونی نکتہ نظر سے تو یہ بات بالکل درست ہے۔''

''تو پھر کیا قباحت ہے؟'' ڈیوڈ نے رالف کی طرف سے تصدیق کیے جانے پر کہا۔ ''آنٹی بتا رہی تھیں کہ تم اس طرح کی باتیں کر کے اُن سے مزید پانچ ہزار ڈالر کی ادائیگی کا مطالبہ کر رہے تھے۔''

''یہ ہماری جائز فیس ہے اور میں نے آپ کی آنٹی سے صرف اپنی فیس کا ہی مطالبہ کیا ہے۔'' رالف نے ڈیوڈ کے اعتراض پر وضاحت کی۔ ''یہ بھی تو دیکھیے کہ ہمیں میت پر کتنی محنت کرنا پڑتی ہے۔ یوں سمجھیں کہ اسے کامیک سرجری سے گزارنا پڑتا ہے، تب کہیں جا کر وہ قابلِ دید ہوتی ہے۔'' رالف کا لہجہ ایسے کاروباری کی طرح تھا جو کسی طور پر بھی نہ تو گاہک کو چھوڑنا چاہتا ہے اور نہ ہی اپنے دام کم کرنے پر آمادہ نظر آتا تھا۔

''آنٹی نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ نہ تم اُن کے گھر آؤ گے اور نہ ہی وہ میت کو دیدہ زیب بنانے کے لیے اتنی بھاری رقم خرچ کر سکتی ہیں۔'' ڈیوڈ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''وہ بے چاری پہلے ہی شدتِ غم سے نڈھال ہیں اوپر سے تم

اُن سے اتنی زیادہ رقم اینٹھنے کے چکر میں ہو۔''

''سر، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہمارا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے۔'' اس نے یہ الزام سن کر کہا۔ ''آپ میری بات سمجھنے کی تو کوشش کریں...''

''دیکھیے... جو کچھ آپ کر رہے ہیں، وہ غیر اخلاقی ہے۔'' ڈیوڈ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''آپ میری بات سمجھ نہیں رہے ہیں۔'' اس نے فوراً جواب دیا۔

''اب مجھے سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' ڈیوڈ نے خشک لہجے میں کہا۔

''میں آپ کو دفتر پہنچ کر فون کرتا ہوں اس وقت راستے...''

''اب اس کی قطعی ضرورت نہیں۔'' ڈیوڈ نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''ہم نے یہ کام آپ سے نہ کروانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اس لیے برائے مہربانی میت کو ہاتھ لگانے کی کوشش مت کرنا۔ ہم نے مورگلین کوائیل سے بات کرلی ہے۔ ان کی گاڑی انکل کی میت کو لے جانے کے لیے آپ کے دفتر پہنچنے والی ہی ہوگی۔'' ڈیوڈ نے اپنی بات مکمل کی۔

''جیسے آپ کی مرضی۔'' رالف نے جواب دیا۔ ''ویسے بھی ہماری ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ ورثا کو مطمئن کیا جائے۔''

''بہت بہتر... بائے۔'' یہ کہہ کر ڈیوڈ نے فون بند کردیا۔

ڈیوڈ کے فون کے تقریباً آدھا گھنٹے... بعد 'مورگلین کوائیل تجہیز و تکفین چیپل' کی ایمبولینس کا ڈرائیور ایوان پارکر میت کو لے جانے کے لیے رالف کے ادارے پہنچ چکا تھا۔ رالف بھی چند لمحے پہلے ہی واپس پہنچا تھا۔ اس نے کچھ دیر تک ڈرائیور کو انتظار گاہ میں بٹھائے رکھا اور خود اپنے دفتر میں گیا۔

''ہیلو... فوراً کمرے میں آؤ۔'' دو منٹ بعد اس کا ماتحت کمرے میں موجود تھا۔ رالف نے اس سے سرگوشیوں میں کوئی بات کی اور پھر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''لاش ڈرائیور کے حوالے کرکے رسید لے لو۔''

''بہت بہتر۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔ دس منٹ بعد ہیڈرک کی لاش ایش بورگ کے سرد خانے سے مورگلین کوائیل کی ایمبولینس میں منتقل کی جاچکی تھی۔ ایوان پارکر نے لاش کی منتقلی کے کاغذات ڈیش بورڈ میں رکھے اور عمارت سے باہر نکلنے کے لیے ایمبولینس ریورس کرنے لگا۔

☆☆☆

دوسرے دن صبح کے دس بج رہے تھے۔ سراغرساں سارجنٹ سائرس آبرن اپنے کمرے میں بیٹھا ایک فائل دیکھ رہا تھا۔ اسے دروازے پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ دروازے پر اس کا باس لیفٹیننٹ سیواگ کھڑا اس کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ یہ اس کے لیے غیر معمولی بات تھی۔ جب بھی اسے ضرورت محسوس ہوتی تھی وہ سائرس کو اپنے کمرے میں طلب کرلیتا تھا۔ آج تک وہ ایک دو بار ہی اس کے کمرے میں آیا تھا۔ یہی اس کی حیرانی کی وجہ تھی۔ ''لگتا ہے کوئی خاص بات ہوگئی ہے۔'' وہ اپنے دل میں سوچتا ہوا کھڑا ہوگیا۔

''کیا یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ اس بار کیا ہوا ہے؟'' اسے کھڑا ہوتے دیکھ کر وہ آگے بڑھا اور میز کے سامنے پہنچ کر سائرس سے پوچھنے لگا۔

''شاید نہیں...'' سائرس نے کہا۔ ''ایک شہری کا قتل، کل رات سامنے والے سٹی ہال اسکینڈل...'' اس نے اپنی دانست میں وہ جرائم گنوانے شروع کردیے جو اس کے خیال میں سیواگ کے یہاں آنے کی وجہ بنے تھے۔

''ان کی تفتیش تمہارے پاس نہیں ہے۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں ان سب باتوں کی نفی کرتے ہوئے کہا۔ ''سٹی پولیس ڈپارٹمنٹ کو آج صبح ایک فون ملا ہے۔ تجہیز و تکفین کرنے والے ایک ادارے کا کہنا ہے کہ اس کے پاس ایک لاش کفنانے کے لیے بھجوائی گئی ہے، جس کا پوسٹ مارٹم ہوچکا ہے لیکن انہیں شک ہے کہ معاملہ کچھ اور بھی ہے۔''

''کیسا معاملہ؟'' سائرس نے چونکتے ہوئے کہا۔

''یہی معلوم کرنا تمہارا کام ہے۔'' سیواگ نے ایک کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اس پرچے پر تمام تفصیلات اور پتا درج ہے، جاؤ اور جا کر معاملے کی تفتیش کرو۔''

''او کے سر!'' سائرس نے اس کے ہاتھ سے کاغذ لیتے ہوئے کہا۔

آدھے گھنٹے بعد سائرس تجہیز و تکفین کے لیے شہر بھر میں معروف ادارے مورگلین کوائیل کی عمارت کے سامنے اپنی گاڑی پارک کررہا تھا۔ یہاں کل دوپہر ہیڈرک کی لاش تجہیز و تکفین کے لیے پہنچائی گئی تھی۔ ادارے کا مالک مارٹن مورگلین نامی ایک ادھیڑ عمر شخص تھا جو گزشتہ بائیس سالوں سے اس شعبے میں یہ ادارہ چلا رہا تھا۔ چند منٹ بعد سائرس اس کے سامنے



بیٹھا ہوا تھا۔

''اب بتائیے معاملہ کیا ہے؟'' رسمی کلمات کے بعد اس نے مارٹن کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے نوٹس لینے کے لیے نوٹ بک اور پینسل نکال لی تھی۔

''ہوا یہ... کل ایک شخص نے ہم سے رابطہ کیا۔'' مارٹن نے بات شروع کی۔

''کیا نام تھا اس کا؟'' سائرس نے قطع کلامی کی۔

''ڈیوڈ ہیڈرک...'' مارٹن نے سامنے رکھے ہوئے رائٹنگ پیڈ کو اٹھا کر اس پر لکھے نام کو دیکھ کر بتایا۔

''شکریہ... آگے بتائیے۔'' سائرس نے نام نوٹ بک میں لکھا۔

''ڈیوڈ کے مطابق وہ اپنے انکل کے کفن دفن کے لیے ہماری خدمات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ فیس طے ہوجانے کے بعد اس نے مجھے بتایا کہ لاش اس وقت ایش بورگ کے سرد خانے میں ہے۔ ہم نے ایمبولینس بھیج کر لاش منگوالی۔''

''آپ نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ لاش اسپتال میں ہونی چاہیے تھی؟'' مارٹن کی بات سن کر اس نے سوال کیا۔

''جی ہاں...'' مارٹن نے دوبارہ بات شروع کی۔ ''پوچھا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ طے شدہ رقم سے زیادہ معاوضہ طلب کررہے ہیں۔ اس لیے انہوں نے ایش بورگ کی خدمات لینے سے انکار کردیا ہے۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''پہلے تو ڈیوڈ نے کہا کہ کل شام چار بجے تدفین ہوگی لیکن گھنٹا بھر بعد اس نے فون کرکے کہا کہ پروگرام میں تھوڑا سا ردوبدل ہوا ہے، اس لیے تدفین پرسوں سہ پہر ہوگی۔'' مارٹن تفصیل سے اسے سارا معاملہ سمجھا رہا تھا۔ ''پروگرام میں تبدیلی سے ہمیں بھی تھوڑا وقت مل گیا۔ ہم نے طے کیا کہ آج صبح سے کام شروع کیا جائے گا۔'' یہ کہہ کر وہ سانس لینے کو ٹھہرا۔ ''آج صبح جب مس ٹریانگ نے لاش کو سرد خانے سے نکال کر کام شروع کیا تو انہوں نے کچھ عجیب سی چیز نوٹ کی۔ اس نے مجھے بلایا۔ واقعی معاملہ کچھ سمجھ سے باہر تھا اس لیے میں نے پولیس کو فون کرکے اطلاع دی۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔

''ایسی کیا بات تھی جو آپ دونوں پریشان ہوگئے؟'' سائرس نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ اس بارے میں آپ مس ٹریانگ سے ہی بات کریں تو زیادہ بہتر ہوگا۔'' مارٹن نے کہا اور انٹر کام اٹھا کر کسی کو آنے کے لیے کہا۔

''یہ کون ہیں؟'' اس نے ریسیور رکھا تو سائرس نے سوال کیا۔

''ہمارے ہاں بطور ٹیکنیشن کام کرتی ہیں۔ میت کی تیاری سے پہلے اس کو نہلانے اور کیمیکل لگانے کی ذمے داری ان کی ہے۔'' مارٹن نے جواب دیا۔ اتنی دیر میں کمرے میں ایک لڑکی داخل ہوئی۔ ''لیجیے... یہ ہیں مس ٹریانگ۔'' مارٹن نے تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ ہیں سراغرساں سارجنٹ سائرس آبرن۔'' اس نے دونوں کا تعارف کروایا۔

''ہائے۔'' لڑکی نے اس کی طرف دیکھ کر کہا اور میز پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کی عمر بیس بائیس سال ہوگی۔ چہرے مہرے سے ایشیائی لگ رہی تھی۔ اس نے سادہ سی پتلون اور شرٹ پہن رکھی تھی۔ چہرہ میک اپ سے عاری تھا۔ ہاتھ، کان، ناک وغیرہ میں اس نے زیور نام کی کوئی چیز نہیں پہن رکھی تھی۔ چہرہ تاثرات سے عاری اور سپاٹ تھا۔

''پلیز بیٹھیے!'' سائرس نے خالی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا لیکن اس نے شکریہ کہہ کر بیٹھنے سے انکار کردیا۔

''مس ٹریانگ آپ انہیں بتائیں گی کہ ہوا کیا ہے؟'' مارٹن نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں...'' مس ٹریانگ نے مارٹن کی بات سن کر بتانا شروع کیا۔ ''صبح کے آٹھ بج رہے تھے جب میں ورک روم میں گئی۔ وہاں مسٹر ہیڈرک کی میت رکھی ہوئی ہے، جسے تدفین کے لیے تیار کرنا تھا۔ مسٹر ہیڈرک کی فیملی کی خواہش تھی کی تدفین کے لیے میت کو تیار کرکے تابوت کو سربہ مہر کردیا جائے۔ مسٹر ہیڈرک کے اہل خانہ کے مطابق مرحوم کی خواہش تھی کہ مرنے کے بعد ان کا چہرہ کوئی نہ دیکھے۔''

''اس لحاظ سے ہمیں ان کی لاش پر بہت زیادہ کام نہیں کرنا تھا۔'' مارٹن نے مس ٹریانگ کی قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن پھر بھی ایسی لاش جس کا پوسٹ مارٹم ہوچکا ہو، اس پر کچھ خاص قسم کے کیمیکل لگانے پڑتے ہیں تاکہ اسے کچھ عرصے کے لیے محفوظ رکھا جاسکے۔ اس لیے ہمیں لاش کا اچھی طرح معائنہ کرنا پڑتا ہے۔ اسی دوران یہ بات سامنے آئی ہے۔'' مارٹن نے بات مکمل کرتے ہوئے مس ٹریانگ کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی سر ہلا کر تائید کی۔

''جب میں نے میت کا معائنہ شروع کیا تو دیکھا کہ جسم کو جہاں جہاں سے چیرا گیا تھا، وہاں وہاں ٹانکے لگانے کے بعد،

اس کے اوپر خاص قسم کا واٹر پروف ٹیپ لگا دیا گیا تھا۔'' مس ژیانگ نے ایک بار پھر اپنا بیان شروع کیا۔ ''عام طور پر اسپتال والے ایسا نہیں کرتے۔ میرے لیے یہ غیر معمولی بات تھی۔ اسی لیے میں چونک گئی۔ میں نے گہری نظروں سے لاش کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ درمیانی حصے کے چیروں کو مختلف رنگ اور ساخت کے دھاگے سے سیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ باقی جو ٹانکے لگائے گئے تھے ان میں نائیلون کی باریک دوڑی استعمال کی گئی تھی۔''

''نائیلون کی دوڑی کس جگہ استعمال کی گئی ہے؟'' سائرس نے یہ سن کر اس سے سوال کیا۔

''جسم کے دائیں اور بائیں حصے کو سینے کے لیے۔'' اس نے جواب دیا اور خاموش ہوگئی۔

''ذرا اس مختلف قسم کی سلائی اور دھاگے کے بارے میں کچھ اور بتائیے جو آپ جانتی ہیں۔'' سائرس آبرن نے اسے خاموش ہوتا دیکھ کر سوال کیا۔

''جی ہاں...'' مس ژیانگ نے کہنا شروع کیا۔ ''جسم پر لگے ٹانکوں میں گہرے نیلے رنگ کا دھاگا استعمال کیا گیا ہے لیکن جو دوسرے چیرے ہیں، ان کو سینے میں نہایت نفیس، باریک اور بے رنگ ڈوری استعمال کی گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ نائیلون کی نہایت ہی باریک ڈور ہے۔ غور سے دیکھنے پر ہی وہ نظر آتی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔

''کیا میں لاش دیکھ سکتا ہوں؟'' سائرس نے سوال کیا۔

''بالکل۔'' یہ کہتے ہوئے مارٹن کھڑا ہوگیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ ورک روم میں موجود تھے جہاں کمرے کے وسط میں اسٹیل کی سفید ٹرالی پر ہلکے سبز رنگ کی چادر کے نیچے ہیڈرک کی لاش رکھی ہوئی تھی۔ سائرس نے چادر الٹ کر لاش کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ مس ژیانگ نے جو باتیں بتائی تھیں، وہ سب سو فیصد درست تھیں۔ کوئی بھی شخص ٹانکوں کو دیکھ کر بتا سکتا تھا کہ وہ دونوں ٹانکے، دو مختلف ماہرین نے لگائے تھے۔

کچھ دیر تک وہ لاش کا ہر زاویے سے جائزہ لیتا رہا۔ اس نے اپنے ڈیجیٹل کیمرے سے اُن حصوں کی مختلف زاویوں سے کئی تصاویر بنائیں، جہاں ٹانکے لگے ہوئے تھے۔ جب اس نے ان تصاویر کو دیکھا تو حیرت انگیز طور پر پیٹ کے دائیں بائیں نائیلون کی ڈور سے جو ٹانکے لگائے گئے تھے، وہ اتنے باریک اور ماہرانہ نفاست سے لگائے گئے تھے کہ اگر چیرے کے ساتھ خون کی ہلکی سی سرخ لکیر کا اشارہ نہ ہوتا تو یہ بتانا مشکل تھا کہ مرنے والے کے اس حصے پر بھی نشتر چلا ہوگا۔

ورک روم سے واپسی پر جب وہ ان دونوں سے اجازت لینے والا تھا، تب اس نے یہ بات ان دونوں کو بھی بتائی اور تصویریں بھی دکھائیں۔ وہ بھی اس سے متفق تھے۔

''مجھے یقین ہے کہ آپ کا شک درست ہے۔ اس کے پیچھے کچھ مجرمانہ مقاصد ضرور پوشیدہ ہیں۔'' اس نے مس ژیانگ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ وہ مسکرادی۔

''اب اس لاش کا کیا کرنا ہے؟'' اسے جاتا دیکھ کر مارٹن نے سوال کیا۔

''دفنانا ہے لیکن کب، اس بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''یہ اب پولیس کیس ہے۔ ہمیں لاش سے ہی اپنی تحقیقات کو آگے بڑھانا ہوگا۔ جب تک تفتیش مکمل نہیں ہوجاتی، تب تک میت کو سردخانے میں رکھا جائے گا۔''

''کیا میں ان کے ورثا کو اس بارے میں بتادوں؟'' مارٹن نے سوال کیا۔

''اگر آپ مناسب سمجھتے ہیں تو ایسا ضرور کیجیے لیکن بہتر یہ ہوگا کہ آپ مجھے ان کے گھر کا پتا اور فون نمبر دے دیں۔ میں خود ان سے ملنا چاہتا ہوں۔'' سائرس نے سنجیدگی کہا۔ یہ سنتے ہی مارٹن نے سامنے رکھے کاغذات میں سے ایک فائل نکالی اور پھر ایک چٹ پر ڈیوڈ ہیڈرک کا پتا اور فون نمبر لکھ کر اس کی طرف بڑھادیا۔

''بہت شکریہ...'' سائرس نے چٹ کو بغور پڑھتے ہوئے کہا اور... پھر اگلے ہی لمحے اُن دونوں کو گڈ بائے کہتا ہوا باہر نکل آیا۔

سائرس آبرن واپس اپنے دفتر پہنچا تو اس کی نوٹ بک میں مرنے والے سے متعلق ابتدائی معلومات درج تھیں۔ اس نے اپنی ابتدائی تفتیش کی رپورٹ لکھنا شروع کی:

''متوفی کا نام گرینز ہیڈرک تھا، عمر چھپن سال۔ وہ شہر میں ایک چھوٹی سی تعمیراتی کمپنی کا ملک تھا۔ پرسوں رات وہ ایک بار میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ موجود تھا، جہاں اچانک اسے دل کا دورہ پڑا۔ جس کے بعد اسے سینٹ لیوک اسپتال لایا گیا۔ اسی اسپتال میں دورانِ علاج اس کا انتقال ہوگیا۔ ڈاکٹرز نے دل کے دورے کی تصدیق کی ہے تاہم اس کی بیوہ کو شبہ تھا کہ کہیں اسے زہر دے کر تو نہیں مار دیا گیا جس پر لاش کا پوسٹ مارٹم کیا گیا۔ رپورٹ ابھی تک نہیں ملی ہے۔ میت کو تدفین کے لیے تیار کرنے کی غرض سے پہلے ایش بورگ لایا گیا لیکن چند گھنٹوں کے بعد لاش کو مورگلین کوائیل چیپل



ہارموٹانک ٹوتھ پیسٹ سے منہ، مسوڑھے اور دانت بہترین صاف ہوتے ہیں

ہارموٹانک ٹوتھ پیسٹ سے خون، پیپ، بدبو، درد، پان، نسوار، سگریٹ کے داغ ختم

صرف ایک بار کے استعمال سے بھی آپ واضح فرق محسوس ہوگا۔ ایک دن چھوڑ کر ایک دن ضرور استعمال کریں

دانت اور حفاظتی تہہ:
دانتوں پر ایک قدرتی سخت، مضبوط اور چمکدار حفاظتی تہہ Hard Enamel ہوتی ہے جو سخت خوراک کے چبانے پر رگڑ سے دانتوں کو خراب ہونے سے بچاتی ہے جب ہم کھانا کھاتے ہیں تو کھانے کے کچھ ذرات دانتوں کے خلاء میں پھنس جاتے ہیں اور پھر ان کے گلنے سڑنے سے نہ صرف منہ میں بدبو ہوتی ہے بلکہ اس عمل میں حفاظتی تہہ بھی متاثر ہوتی ہے جس سے حفاظتی تہہ بھی گل جاتی ہے اور پھر اس جگہ پر ایک نہایت چھوٹا سا خلا بن جاتا ہے اس طرح اس خلاء میں مختلف اقسام کے بیکٹیریا اور وائرس پرورش پانے لگتے ہیں جن کو عام زبان میں کیڑا لگنا بھی کہتے ہیں۔ پھر یہ خلا بڑا اور گہرا ہونا شروع ہو جاتا ہے حتیٰ کہ دانتوں کی جڑوں یعنی مسوڑھوں تک پہنچ جاتا ہے۔ جس سے مسوڑھے بھی گلنا سڑنا شروع ہو جاتے ہیں۔ جس سے مسوڑھوں سے خون اور پیپ آنا اور درد شروع ہو جاتا ہے۔ اور پھر یہ پیپ یا خون اگر معدے میں پہنچ جائے تو وہاں پر بھی یہ مختلف پیچیدہ اور خطرناک امراض کا سبب بن جاتا ہے۔ مسوڑھے، جبڑے اور ذائقے کی حسیات بھی متاثر ہوتی ہے۔ اسی لیے دانتوں کے امراض کو مرضوں کی ماں ام الامراض بھی کہتے ہیں۔ جب مسوڑھے متاثر ہو جائیں تو پھر مسوڑھوں سے خون پیپ کے ساتھ ساتھ منہ سے بدبو آنا شروع ہو جاتی ہے۔ اور ٹھنڈا یا گرم شدت سے محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح کھٹا میٹھا بھی شدت سے محسوس ہوتا ہے اور دانتوں میں درد شروع ہو جاتا ہے۔ جس کا ازالہ تو بعض بلکہ اکثر اوقات داڑھ دانت نکلوانا ہوتا ہے۔ جس سے چہرے کے خدوخال میں بھی فرق آتا ہے اور انسان وقت سے پہلے بوڑھا دکھائی دینے لگتا ہے۔ دانتوں کے امراض ام الامراض سے بچنے کیلئے انتہائی ضروری ہے کہ ان کی بہترین حفاظت کی جائے۔ لہٰذا جب بھی کھانا کھائیں تو بعد میں خلال کر کے دانتوں کے بیچ والے خلا کو اچھی طرح صاف ضرور کریں کہ ان میں کوئی ذرہ پھنسا نہ رہ جائے۔ دانتوں کی بہترین صفائی ہی دانتوں کی بہترین حفاظت ہے۔ اگر کھانا نہ بھی کھایا جائے تو بھی منہ میں تیار ہونے والا لعاب دہن سے بھی ایسے مادے دانتوں کے درمیان میں جمع ہوتے رہتے ہیں جو دانتوں اور مسوڑھوں کو خراب کر سکتے ہیں اور منہ سے بدبو آنے کا سبب بنتے ہیں۔

الارم:
منہ سے بدبو آنا دراصل ایک الارم ہے کہ اپنے دانت، منہ اور مسوڑھے صاف کر لیں، خلال کریں یا برش، منہ کی صفائی یعنی Mouth Wash بھی ضروری ہے۔

صحت اور زندگی:
سانس اور نبض اپنی رفتار جبکہ قد اور وزن عمر کے ساتھ خوراک پر انحصار کرتے ہیں ان کا قریب معیار (Level of Suger & Blood Pressure) وغیرہ ہی معیار صحت ہے اور معیاری صحت ہی معیاری زندگی ہے۔

خوراک کی اہمیت:
طلب مقدار معدہ کا تیسرا حصہ معیاری خوراک سانس اور نبض کا چلانے کے ساتھ ساتھ معمولی عبادات کی ادائیگی قد اور وزن کی بہتری کیلئے درکار توانائی پیدا کرنے کیلئے کافی ہے اور اگر معدے کے تین کا دوسرا حصہ بھی بھریں تو روزمرہ کے کام کاج محنت مشقت کیلئے کافی ہے۔ اس سے آگے یعنی تینوں حصے بھریں تو موٹاپا، بلڈ پریشر، شوگر، جوڑوں کا درد وغیرہ بلکہ ان کے بگڑنے کیلئے ہر وقت تیار ہیں۔ غرض ہم جو بھی کھاتے ہیں وہ ہماری زندگی یعنی سانس اور نبض چلانے اور معمولی عبادات کی ادائیگی روزمرہ کے کام کاج محنت، مزدوری اور مشقت کیلئے ضروری توانائی مہیا کرنے پر خرچ ہوتا ہے۔ فاضل خوراک بصورت فضلہ خارج ہو جاتی ہے اگر اس پر بھی غور کریں تو صاف نظر آتا ہے کہ ہم کتنی خوراک زائد خوراکی کر کے فضلہ کی شکل میں خارج کرتے ہیں۔ یاد رہے جو خارج ہوتی ہے وہ ضرور کچھ نہ کچھ کر کے خارج ہوتی ہے۔ یعنی توانائی ساتھ میں کچھ امراض بھی دیتے جائیں گے۔ غرض جو جتنا زیادہ فضلہ اخراج کرتا ہے اس کو اتنے ہی زیادہ امراض کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

دانت اور خوبصورتی:
دانت اور مسوڑھوں کی صحت انسانی صورت اور صحت پر کتنی اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ اس طرح سے بخوبی لگ سکتا ہے کہ دانت نکلنے سے قبل تقریباً سبھی بچوں کی شکل ایک جیسی ہوتی ہے۔ دانتوں سے انسانی صورت، صحت، سیرت اور شخصیت میں نمایاں فرق آتا ہے۔ مسوڑھے اور دانت صحت مند نہ ہوں تو خوبصورتی اور شخصیت بھی متاثر ہوتی ہے کہ انسان کھل کر اپنا مقصد، مدعا بیان نہیں کر پاتا۔ اور نہ ہی مقام خوشی پر کھل کر خوشی کا اظہار کر سکتا۔ بلکہ دانتوں کی تکلیف اور بدبو کی وجہ سے شرما کر رہ جاتا ہے۔ جس سے اس کی شخصیت بلحاظ سماجی اور سیاسی ترقی پیچھے رہ جاتی ہے۔

اثرات مسائل دندان:
دانتوں کے مسائل میں مبتلا شخص آواز اور چہرے کے مناسب اتار چڑھاؤ سے دوسروں کو متاثر اور مطمئن نہیں کر پاتا۔ بالالفاظ دیگر ابلاغ و تفہیم کے سنہرے طریقوں سے واقف نہیں ہو پاتا اور اپنے خود ساختہ طریقہ کار پر الگ تھلگ زندگی گزارنے لگتا ہے۔ نیز دانتوں کے مسائل کے اثرات چہرے کے خدوخال پر بھی پڑتے ہیں۔ چہرے پر معمولی فرق سے ایک صورت دوسری سے جدا ہوتی ہے۔ کوئی بہت خوبصورت تو کوئی عام صورت۔ یاد رہے جسم کا فرق چھپ سکتا ہے مگر چہرے کا نہیں اور دانتوں کا تو گمگشت کی اوٹ سے بھی آواز کی لہروں سے ظاہر ہو جاتی ہے۔

دانت اور شخصیت:
اگر منہ، مسوڑھوں اور دانتوں کی صحت اچھی ہو تو آواز بھی ہر دلعزیز لہروں کے ساتھ نکلتی ہے۔ صحت مند منہ، مسوڑھوں اور دانتوں والے اسی وجہ سے بڑے اعتماد اور اطمینان سے بات کرتے ہیں۔ لوگ ان کی باتوں کو توجہ سے سنتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں جب بات کرتا ہے تو اس کے منہ سے موتی سے جھڑتے ہیں۔ اسی وجہ سے صحت مند منہ، مسوڑھوں اور دانتوں والے افراد کامیاب اور فاتحانہ زندگی گزارتے ہیں۔

ذاتی تجربہ:
خود دانتوں کے مسائل بھگتے اور لوگوں کو مبتلا دیکھا تو جستجو ہوئی کہ اس کا کوئی موثر حل ہونا چاہیے۔ غرض مختلف برانڈ آزمائیں مگر بے فائدہ۔ بالآخر خود تحقیق شروع کی اور مندرجہ بالا تمام باتوں اور مندرجہ بھی جو خوف طوالت تحریر نہ ہوسکیں کو مدنظر رکھ کر عمل تحقیق آگے بڑھا تو قدرت نے انعام کیا اور ایسا پیسٹ بنانے میں کامیاب جو کہ مندرجہ بالا تمام مسائل کا حل ثابت ہوا اس کا نام تجویز ہوا ہارموٹانک ٹوتھ پیسٹ۔

طریقہ استعمال ہارموٹانک ٹوتھ پیسٹ:
عام ٹوتھ پیسٹ سے کافی کم یعنی اگر صبح شام کرنا ہو تو گندم کے آدھے دانے کے برابر اور اگر ایک بار روزانہ کرنا ہو تو گندم کے ایک دانے کے برابر روزانہ ہارموٹانک ٹوتھ پیسٹ برش پر لگا کر داڑھ، دانتوں، باہر اور اوپر یعنی تینوں اطراف میں لگا کر تین یا پانچ منٹ بعد دانتوں میں اندر، باہر اور اوپر تینوں اطراف میں اچھی طرح برش کریں اور ساتھ ہی گالوں کے اندر زبان کے نیچے اوپر اور تالو بھی برش کرنے کے بعد اچھی طرح کلیاں کرلیں۔ ہارموٹانک ٹوتھ پیسٹ کم از کم ہفتے میں دو بار یا ایک دن چھوڑ کر ایک دن ضرور لگائیں۔

ہارموٹانک ٹوتھ پیسٹ کے فوائد:
ہارموٹانک ٹوتھ پیسٹ کے استعمال سے دانت، داڑھ اور مسوڑھوں سے پیپ، خون اور بدبو آنا ختم، درد، ٹھنڈا، گرم، کھٹا میٹھا لگنا بند، سگریٹ، پان اور نسوار کے داغ اور بدبو ختم، زبان کے ذائقے بحال۔ ہارموٹانک ٹوتھ پیسٹ منہ، مسوڑھوں اور دانتوں کی صفائی کے ساتھ ساتھ Mouth Wash بھی کرتا ہے۔ جو کہ آپ کو باقاعدہ محسوس بھی ہوگا یعنی آپ رہیں گے سارا دن تر و تازہ اور خوش و خرم جیسے ابھی ابھی برش کیا ہو۔ دانتوں کی بہترین صفائی تو ہارموٹانک ٹوتھ پیسٹ ہی کرتا ہے۔

تیار کردہ: اے۔ کے۔ کاسکو پانڈ، مینگورہ (سوات)
042-37666818
0300-9486848

نوٹ: ہارموٹانک ٹوتھ پیسٹ حقوق (پیکنگ، ڈیزائن، بروشر، مونوگرام، کیلی گرافی، ٹریڈ مارک وغیرہ) بحق رفیق شاکر محفوظ ہیں 0946-723586

منتقل کر دیا گیا جس کی وجہ فیس کی رقم میں کمی بیشی بتائی جاتی ہے۔ لاش کا معائنہ کرنے والی ٹیکنیشن نے مرحوم کے جسم پر درد طرح کے ٹانکے دیکھے، جس کے بعد اس نے پولیس کو مطلع کیا۔ ابتدائی تفتیش کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ممکن ہے کہ جس بات پر شبہ کیا گیا ہے، وہ واقعی کسی مجرمانہ کارروائی کا پتا دیتے ہوں۔ اس کے لیے مزید تفتیش کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لیے سینٹ لیوک اسپتال میں لاش کا پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر، متوفی کے اہلِ خانہ اور ایش بورگ کے مالک سے سوال و جواب اور پوسٹ مارٹم رپورٹ کی ضرورت ہوگی۔ نیز ضرورت اس بات کی ہے کہ جب تک تفتیش مکمل نہیں ہو جاتی، لاش کو سرکاری مُردہ خانے میں محفوظ کروانے کے علاوہ تاحکمِ ثانی تدفین روک دیے جانے کے احکامات جاری کروائے جائیں تاکہ اصل صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے تفصیلی تحقیقات شروع کی جاسکیں۔''

آدھے گھنٹے بعد سائرس اپنی رپورٹ لیفٹیننٹ سیواگ کو بھجوا چکا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے اسے طلب کر لیا۔ وہ اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور رپورٹ پر نظریں گڑائے کچھ سوچ رہا تھا۔ ''میرا خیال ہے کہ تمہاری بات میں وزن ہے۔'' اس نے رپورٹ پر سے نظر اٹھا کر سائرس کو ستائشی انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں فوراً اس کیس پر کام شروع کر دینا چاہیے۔ ممکن ہے کہ اس کے پیچھے کوئی ایسا سنگین جرم پوشیدہ ہو جو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ ہو۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' سائرس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ سیواگ بہت سخت، خشک مگر قابل افسر تھا۔ اس نے سائرس کے بیان کردہ نکات کو سنجیدگی سے لیا تھا۔

''تم فوراً کام شروع کر دو۔ میں تدفین کو روکنے اور لاش کی سرکاری اسپتال کے مُردہ خانہ میں منتقلی کے عدالتی احکامات لیتا ہوں۔''

''ممکن ہے کہ ہمیں لاش کا دوبارہ پوسٹ مارٹم بھی کروانا پڑے۔'' سائرس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں... تمہیں جس قسم کی مدد کی ضرورت پڑی، وہ مہیا کر دی جائے گی۔'' اس نے سائرس کو یقین دلایا اور وہ شکریہ کہہ کر واپس اپنے کمرے میں چلا آیا۔

اگلے دو گھنٹے کے اندر اندر مجسٹریٹ نے تدفین روکنے اور لاش کی مورگلین کوائیل سے سرکاری اسپتال منتقلی کے احکامات جاری کر دیے۔ دوسری طرف سائرس نے مرحوم کے بھتیجے کو فون کر کے مختصر طور پر صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ انہیں اس بارے میں مارٹن پہلے ہی آگاہ کر چکا تھا۔ وہ خاصا پریشان تھا۔ سائرس نے اس سے اور مرحوم ہیڈرک کی بیوہ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی، وہ فوراً ملنے پر تیار ہو گئے۔ کچھ دیر بعد وہ ہیڈرک کے گھر پر بیٹھا ہوا تھا۔

ڈیوڈ جواں سال سول انجینئر تھا جبکہ ہیڈرک کی بیوی ایلن کی عمر باون سال تھی۔ وہ سادہ سی گھریلو عورت تھی۔ ان دونوں کی شادی کو تیس برس گزر گئے تھے۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی اسی لیے اس نے اپنے بڑے بھائی کے بیٹے کو گود لے لیا تھا۔ اس وقت سیاہ ماتمی لباس میں ملبوس ایلن شدید صدمے سے دوچار تھی۔ روتے روتے اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔

''فی الحال کچھ کہنا مشکل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ سب شبہ ہو اور معاملہ بالکل صاف ہو لیکن پھر بھی جب تک تفتیش مکمل نہیں ہو جاتی، آپ لوگوں کو ہم سے تعاون کرنا ہوگا۔'' سائرس کو یہ دونوں بے گناہ لگ رہے تھے۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ جو کچھ ہوا ہے، یہ دونوں بھی اس سے بالکل لاعلم ہیں۔ اس لیے اس نے ان کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔

جب وہ ان کے گھر سے نکلا تو سہ پہر ہو چکی تھی۔ اسے ایش بورگ کے مالک سے ملنا تھا۔ وہ اسے فون کر کے اپنی آمد سے مطلع کر چکا تھا۔ جب وہ پہنچا تو رالف اس کا منتظر تھا۔

''تمہارے خیال میں ایسی کیا بات ہوئی تھی کہ ہیڈرک کی فیملی نے لاش کو ایش بورگ سے مورگلین منتقل کروا دیا؟'' رسمی کلمات کے بعد اس نے رالف سے سوال کیا۔ اس وقت وہ اس کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ ساٹھ سال کا لمبوترے چہرے اور دُبلے پتلے جسم کا شخص تھا۔ اس کے چہرے مہرے سے ہی عیاری اور کاروباری چالاکی ٹپک رہی تھی۔ سائرس کو وہ پہلی ہی نظر میں نہایت کائیاں شخص محسوس ہوا۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں اس بارے میں۔ یہ تو اس کے گھر والے ہی بہتر بتا سکتے ہیں۔'' رالف نے گول مول جواب دیا۔

''جب لاش تمہارے پاس بھیجی جا چکی تھی تو اس کا مطلب ہے کہ ورثا اور تمہارے درمیان فیس وغیرہ کے معاملات پہلے ہی سے طے ہو چکے ہوں گے۔'' یہ کہہ کر وہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

''جی ہاں... ایسا ہی ہوا تھا۔''

''سوال یہ ہے کہ جب سب کچھ طے ہو چکا تھا تو پھر میت کو دوسری جگہ کیوں منتقل کیا گیا؟'' سائرس نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔



''میں پھر یہی کہوں گا کہ یہ بات اس کے اہلِ خانہ ہی زیادہ بہتر بتا سکتے ہیں۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔ ''جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں نے جب لاش کا معائنہ کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ اس پر طے شدہ فیس سے تھوڑی زیادہ لاگت آئے گی۔ یہ بات میں نے ان سے کہی۔ ہوسکتا ہے کہ یہی وجہ ہو کہ انہوں نے مجھ سے کیا گیا معاہدہ منسوخ کر دیا۔''

''اس کا مطلب یہ کہ لاش کی منتقلی کا معاملہ فیس سے جُڑا ہوا ہے۔'' سائرس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''ویسے بڑی عجیب بات ہے کہ تم میت کو دیکھنے سے پہلے فیس طے کر لیتے ہو اور اس کے بعد مزید کا مطالبہ کر دیتے ہو۔''

''عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔'' یہ سنتے ہی وہ چونک گیا اور فوراً کہنے لگا۔ ''مجھے بتایا گیا تھا کہ میت درست حالت میں ہے اور اس کا انتقال بیماری کے باعث ہوا ہے لیکن جب میں نے لاش کا جائزہ لیا تو اس کا تفصیلی پوسٹ مارٹم کیا جا چکا تھا۔ کئی جگہوں پر بڑے بڑے ٹانکے لگائے گئے تھے۔ ایسے میں لاش کو خاص انداز سے تیار کیا جاتا ہے۔ ویسے اگر پوسٹ مارٹم نہ ہوا ہوتا تو شاید میں فیس میں اضافے کی بات نہیں کرتا۔'' رالف کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ سائرس کی ہر طریقے سے تسلی کرنا چاہتا ہے۔

''ہیڈرک کوئی غریب آدمی تو نہیں تھا۔ اس کی کمپنی ٹھیک ٹھاک کام کر رہی تھی لیکن مجھے تعجب ہے کہ اس کی کمائی ہوئی رقم میں سے تھوڑا سا اس کی میت کو سجانے سنوارنے پر خرچ کرنے سے اس کی بیوی کیوں کترائی۔'' سائرس نے کہا۔ ''تعجب کی بات ہے کہ تھوڑی سی رقم کے لیے وہ اپنے شوہر کی میت کو اِدھر سے اُدھر گھماتی پھر رہی ہے۔'' سائرس کے لہجے سے افسوس ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ جو کچھ ہوا شاید اس کے پیچھے مرحوم کی بیوہ کی کنجوسی کا عمل دخل تھا۔

''آفیسر...'' رالف نے کہا۔ ''یہ دنیا پیسے کی ہے۔ جب مرنے والے پر خرچ کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہو تو کیوں خرچ کیا جائے۔ ویسے بھی مرنے کے بعد دولت اس کی تو رہی نہیں پھر اس پر کوئی کیوں خرچ کرے گا۔''

''شاید یہی بات ٹھیک ہے۔'' سائرس نے اپنی نوٹ بک بند کرتے ہوئے کہا۔ بظاہر وہ یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اس کی باتوں سے مطمئن ہو چکا ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ ہیڈرک کی بیوہ سے مل چکا تھا۔ وہ پہلی ہی نظر میں اسے نہایت شفیق، وفادار اور محبت کرنے والی عورت محسوس ہوئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ فیس میں اضافے کے مطالبے سے تنگ آ گئی ہوگی تبھی اس نے سرے سے اس سے معاملے کو ختم کرنے میں بہتری سمجھی۔ اس کے سوا سے کوئی دوسری وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

''ویسے وہ کون سے کاغذات تھے، جن پر تم بیوہ کے دستخط لینے کی بات کر رہے تھے؟''

''کون سے دستخط؟'' رالف نے نہایت تعجب خیز لہجے میں اُلٹا اس سے ہی سوال کر دیا۔

''ڈیوڈ بتا رہا تھا کہ تم نے فیس میں اضافے کے علاوہ کچھ کاغذات پر دستخط لینے کی بات بھی کی تھی اس سے۔''

''جی نہیں... ایسی تو کوئی بات نہیں کی۔'' اس نے نہایت اعتماد سے جھوٹ بولا۔ ''شاید اسے سننے میں کچھ مغالطہ ہوا ہے۔ میں نے تو اس سے ایسی کوئی بات کی ہی نہیں تھی۔'' اس نے نہایت مکاری سے اسے جھٹلا دیا۔

''ہوسکتا ہے۔'' سائرس نے بے پروائی سے کہا اور نوٹ بک بند کر کے جیب میں رکھی۔ وہ اسے جتلانا چاہتا تھا کہ یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔ ''ہاں... اکثر ایسے مواقع پر لوگ صدمے میں یہ بھول جاتے ہیں کہ کس نے کون سی بات کہی تھی۔''

''ہاں ہاں... ہوسکتا ہے کہ دستخط کی بات اسپتال والوں نے کی ہو۔ وہ یہ بھول گئے اور کہہ دیا کہ میں یہ کہہ رہا تھا۔'' رالف دل میں بہت خوش ہو رہا تھا کہ جو بات اسے کہنی چاہیے تھی، وہ سائرس نے خود اپنے منہ سے کہہ دی تھی۔

سائرس بظاہر تو وہ رالف سے متفق نظر آ رہا تھا لیکن وہ اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ ڈیوڈ نہ تو نشے باز ہے نہ ہی بے وقوف۔ وہ خوامخواہ ایسی بات کیوں کہے گا جو رالف نے کہی نہ ہو۔ اسے لگا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے، جسے وہ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے، لیکن کیوں... یہ بات ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آ سکی تھی لیکن کب تک... اسے یقین تھا کہ بہت جلد سچ کھل کر سب کے سامنے آ جائے گا۔

''شکریہ آپ کا۔'' جب وہ واپسی کے لیے اٹھا تو اس نے رالف سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے کہ جیسے وہ مطمئن ہو چکا ہے۔ رالف اسے مطمئن دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

''میری مدد کی جب بھی ضرورت پڑے گی، میں حاضر ہوں۔'' اس نے میز پر سے اپنا وزیٹنگ کارڈ اٹھا کر اس کی جانب بڑھایا۔

''میرا خیال کہ اب آپ کی مدد کی کوئی ضرورت پیش نہیں

آئے گی۔''

''اگر آپ یہ سمجھتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی ہوگا۔'' سائرس کی بات سُن کر وہ اور مطمئن ہوگیا۔ رالف برسوں سے تجہیز و تکفین کا کام کررہا تھا لیکن ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اسپتال سے پوسٹ مارٹم کر کے بھیجی گئی کسی لاش کے بارے میں کوئی پولیس سراغرساں اس سے سوال و جواب کرنے کے لیے پہنچا تھا۔ اس بات نے اسے پریشان کردیا تھا لیکن سائرس جس طرح مطمئن ہو کر لوٹ رہا تھا، اس سے رالف کی پریشانی بھی ختم ہوگئی تھی۔

جب وہ رالف کے پاس سے اٹھا، اس وقت تک شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ وہ سیدھا سینٹ لیوک اسپتال پہنچا۔ اس نے دوپہر کو ہی فون کر کے اسپتال کے ایڈمنسٹریٹر کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کردیا تھا۔ وہ بھی پولیس معاملے کا سن کر کافی گھبرا گیا۔ اس نے ہر ممکن تعاون کی یقین دہانی کروائی تھی۔ وہ اب اس سے ملنے کے لیے ہی یہاں پہنچا تھا۔ وہ پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھنا اور ڈاکٹر رابرٹ سے ملنا چاہتا تھا۔

''آیئے آیئے... میں آپ کا ہی انتظار کررہا تھا۔'' کمرے میں پہنچ کر جب سائرس نے اپنا تعارف کروایا تو ایڈمنسٹریٹر نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے آپ کا کام ترجیحی بنیادوں پر کروادیا تھا۔'' اس نے سائرس کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ویسے معاملہ کیا ہے؟'' اس کے لہجے سے حیرت کا اظہار ہورہا تھا۔

''ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔'' اس نے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ دیکھتے ہوئے کہا۔ رپورٹ کے مطابق مرنے والے کی موت دل کے دورے سے ہی ہوئی تھی اور اس کے معدے سے ملنے والی اشیا کے نمونوں میں نہ تو کسی زہر کا پتا چلا ہے اور نہ ہی کسی زہریلی چیز کی موجودگی ثابت ہوئی ہے۔ البتہ اس نے شراب ضرور پی رکھی تھی لیکن یہ بھی اتنی مقدار میں نہیں تھی کہ موت کا سبب بن سکتی۔ رپورٹ کے مطابق پوسٹ مارٹم میں صرف معدے اور خون کے نمونے لیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ جسم کے دیگر اعضا کی نہ تو ضرورت تھی اور نہ ہی انہیں چھیڑا گیا تھا۔

رپورٹ پڑھتے ہوئے بھی سائرس کا ذہن اب تک کی گئی تفتیش کے نتائج میں الجھا ہوا تھا۔ وہ اس وقت بھی کئی سوالوں کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کررہا تھا لیکن اس گتھی کا کوئی سرا اب تک اس کے ہاتھ نہیں لگ سکا تھا۔

اس کا دماغ اب بھی مس ژیانگ کی باتوں میں اُلجھا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ لاش کا صرف ایک پوسٹ مارٹم ہوا ہے۔ اس لحاظ سے اس پر واقعی ایک ہی انداز کے ٹانکے لگے ہونے چاہیے تھے۔ یہ درست ہے تو پھر لاش پر دو مختلف انداز کے ٹانکے کس نے، کب، کہاں، کیوں اور کیسے لگائے؟

''ڈاکٹر رابرٹ سے ملاقات کے لیے درخواست کی تھی۔'' اس نے رپورٹ پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے کہا۔

''ویسے تو ان کی ڈیوٹی رات بارہ بجے شروع ہوتی ہے لیکن آپ نے کہا تھا تو میں نے انہیں بلوالیا ہے۔ وہ منتظر ہیں۔ ابھی بلواتا ہوں۔'' ایڈمنسٹریٹر نے انٹر کام اٹھاتے ہوئے۔

''ٹھہریے...'' سائرس نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت وہ کہاں ملیں گے؟''

''پوسٹ مارٹم روم میں موجود ہیں۔''

''بہتر ہے کہ میں وہیں ان سے مل لوں۔'' یہ کہتا ہوا سائرس کھڑا ہوگیا۔

''جیسے آپ کی مرضی۔'' ایڈمنسٹریٹر نے انٹر کام ریسیور واپس رکھا۔ ''آیئے... میں آپ کو اُن کے پاس لیے چلتا ہوں۔''

''یہ ہیں ڈاکٹر رابرٹ اور یہ پولیس سراغرساں سارجنٹ سائرس آبرن۔'' ایڈمنسٹریٹر نے کمرے میں پہنچ کر مسکراتے ہوئے اُن دونوں کا تعارف کروایا۔ ''آپ باتیں کریں، میں چلتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ باہر جانے کے لیے پلٹا لیکن چلتے چلتے اچانک رک گیا۔ ''اگر میری ضرورت ہے تو رک جاؤں؟'' اس نے سائرس کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی نہیں... اب آپ کی ضرورت نہیں، آپ جاسکتے ہیں۔ تعاون کے لیے بہت بہت شکریہ۔'' سائرس نے کہا تو وہ واپس چلا گیا۔

''جی ڈاکٹر رابرٹ...'' سائرس اس کی طرف مڑا اور اپنی بات شروع کی۔ ''یہ پوسٹ مارٹم آپ نے ہی کیا تھا؟'' اس نے رپورٹ اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں... آج صبح ہی کیا تھا۔'' ڈاکٹر نے اس کے ہاتھ سے رپورٹ لے کر دیکھتے ہوئے بتایا۔

''پوسٹ مارٹم کے لیے کن کن اعضا کو نکالا گیا تھا؟''

''کسی بھی اعضا کو نہیں نکالا گیا تھا۔ صرف معدے سے نمونے لیے گئے وہ بھی مرحوم کی بیوہ کی درخواست پر ورنہ پوسٹ مارٹم کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔''



''کیوں ضرورت نہیں تھی؟'' سائرس نے چونکتے ہوئے سوال کیا۔

''اس لیے کہ قوانین کے تحت دورانِ علاج مرنے والے مریض کا پوسٹ مارٹم ضروری نہیں۔ صرف خاص ضرورت کے تحت ہی یہ کیا جاتا ہے، جیسا کہ اس کیس میں۔'' اس نے رپورٹ کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اوہو... تو یہ بات ہے۔'' سائرس نے حیرت سے کہا۔

''اگر مسز ایلن ہیڈرک تحریری طور پر درخواست نہ کرتیں تو ہم اُن کی میت بنا پوسٹ مارٹم کے اُن کے حوالے کردیتے۔''

''کیا میں وہ دھاگا دیکھ سکتا ہوں جس سے پوسٹ مارٹم کے بعد ٹانکے لگائے جاتے ہیں۔'' سائرس نے اچانک سوال کر کے بات کا رُخ بدل دیا۔

''جی ہاں...'' یہ سن کر وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور سائرس کو بھی اٹھنے کا شارہ کیا۔ ''یہ لیجیے۔'' اس نے الماری کھولی۔ وہاں گہرے نیلے رنگ کے موٹے دھاگے کی بہت ساری گٹھیاں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ سب ایک ہی رنگ اور ایک ہی موٹائی کے دھاگے تھے۔

''اس کے علاوہ کسی اور قسم یا دوسرے رنگ کا دھاگا بھی استعمال کرتے ہیں... میرا مطلب ہے کہ جیسے نائیلون کی نہایت باریک ڈور وغیرہ۔'' سائرس نے دھاگے کی ایک گٹھی کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

''جی نہیں...'' اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''پوسٹ مارٹم کے لیے عام طور پر تمام اسپتال یہی دھاگا استعمال کرتے ہیں۔''

''کیا یہ میں اپنے پاس رکھ سکتا ہوں۔'' اس نے دھاگے کی ایک گٹھی اسے دکھاتے ہوئے پوچھا۔

''بالکل رکھ سکتے ہیں۔'' ڈاکٹر رابرٹ نے مسکرا کر کہا۔ وہ جانتا تھا کہ پولیس تفتیش کررہی ہے اس لیے اس نے فوراً ہامی بھرلی۔

''پوسٹ مارٹم کے بعد ٹانکے بھی آپ خود ہی لگاتے ہوں گے۔'' اس نے دھاگے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں... یہ کام نچلے درجے کا ایک اسٹاف کرتا ہے۔''

''کون ہے وہ۔'' یہ سن کر وہ چونکا اور ڈاکٹر رابرٹ کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''بیلے گیٹس... بہت سخت شخص ہے۔''

''تو آپ نگرانی کرتے ہوں گے۔'' یہ سن کر وہ مسکرایا۔

''کہہ سکتے ہیں۔'' ڈاکٹر رابرٹ نے کہا۔ ''اصولی طور پر تو اسے میری نگرانی میں ہی ٹانکے لگانے چاہئیں لیکن کوئی بھی ڈاکٹر اس کام کی نگرانی نہیں کرتا ہے۔ ہر جگہ کوئی بھی جونیئر پیرامیڈیکل اسٹاف یہ کام کرسکتا ہے۔ ہمارے ہاں بیلے یہ کام سرانجام دیتا ہے۔ آج صبح مسٹر ہیڈرک کی لاش پر بھی اسی نے ٹانکے لگائے تھے۔''

''ہوں...'' ڈاکٹر کی بات سُن کر سائرس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے ڈاکٹر۔ اب میں چلتا ہوں۔'' اس نے دھاگے کی گٹھی کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھتے ہوئے کہا اور اس کی طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھادیا۔

☆☆☆

شام کے سات بج رہے تھے۔ سائرس ریستوران میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ تفتیش کے چکر میں آج وہ لنچ بھی نہیں کرسکا تھا۔ اس لیے جب وہ ڈاکٹر رابرٹ سے ملنے کے بعد باہر نکلا تو وہ فوراً ریستوران کی طرف چل پڑا۔ کھانے کے بعد اس نے اسٹرانگ کافی منگوائی اور نہایت سکون سے بیٹھ کر آج دن بھر میں پیش آنے والے واقعات کو ازسرِنو اپنے دماغ میں دُہرانا شروع کردیا۔

ہیڈرک کو زندہ حالت میں اسپتال لایا گیا تھا۔ آئی سی یو میں اس کی موت ہوئی۔ جس کے بعد لاش پوسٹ مارٹم روم منتقل ہوگئی۔ پوسٹ مارٹم کی درخواست مرحوم کی بیوہ نے کی تھی اس لیے سائرس نے اسے ہر قسم کے شبہے سے بالاتر قرار دے دیا۔ اس کے بعد رہ گیا ڈاکٹر رابرٹ، جس نے پوسٹ مارٹم کیا۔ اس کے مطابق اس نے صرف معدے سے نمونے لیے تھے اور اس کے پاس جو رپورٹ تھی، وہ اس بات کی تصدیق بھی کرتی ہے۔ اس لیے پہلا مشتبہ ڈاکٹر رابرٹ اور ٹانکے لگانے والا بیلے گیٹس ٹھہرا۔ پوسٹ مارٹم کے کچھ دیر بعد لاش سرد خانے سے ایش بورگ کے ہاں منتقل ہوئی۔ اس نے کاغذات والی بات کی نفی کر کے خود کو مشکوک ٹھہرادیا تھا۔ یہاں سے لاش مورگلین کے ہاں پہنچی۔ انہوں نے تو خود پولیس کو اطلاع دی۔ اس لیے وہ بھی غیر مشکوک ٹھہرے۔ اس لیے جو کچھ ہوا تھا، اس کے پیچھے صرف تین نام تھے: رالف، ڈاکٹر رابرٹ اور بیلے گیٹس۔ لاش کے ساتھ اگر کچھ ہوا تھا تو اس کے بارے میں یہ تینوں یا ان میں سے ایک یا دو افراد ضرور اس بارے میں سچ جانتے تھے یا اس کام میں شامل تھے۔

ڈاکٹر رابرٹ نے سائرس کو ٹانکے لگانے والا دھاگا دکھایا

تھا اور اس وقت ایک نمونہ اس کی جیب میں بھی موجود تھا۔۔ اس کا رنگ گہرا نیلا تھا۔ مس ژیانگ کا بھی یہی کہنا تھا کہ زیادہ تر ٹانکے گہرے نیلے رنگ کے دھاگے سے ہی لگائے گئے تھے۔ ڈاکٹر رابرٹ نائیلون ڈور کے استعمال کی تردید کر چکا تھا۔ اس لیے اب اس بات کا جواب تلاش کرنا تھا کہ بے رنگ نائیلون کی ڈوری سے جو ٹانکے لگائے گئے، وہ کس نے لگائے، کہاں لگائے اور اس کی وجہ کیا تھی؟ ایک بات تو صاف ظاہر ہو چکی تھی کہ پوسٹ مارٹم کے بعد بھی لاش کو چیر پھاڑ گیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ ایسا کرنے کا مقصد کیا تھا اور یہ کام کس جگہ کیا گیا تھا؟

سائرس کافی پیتے ہوئے نہایت انہماک سے کیس کی کڑی سے کڑی ملائے جا رہا تھا۔ کئی سوالوں کے جوابات اسے مل گئے تھے۔ صرف دو تین سوال ایسے تھے، جن کے جوابات باقی تھے۔ ان کے ملنے کے بعد کیس حل ہو جاتا۔ کھانے کے بعد اس کا دماغ کافی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد جب وہ شکم سیر ہو کر باہر نکلا تو خاصا مطمئن تھا۔ اسے یقین تھا کہ سارے دن کی دوڑ دھوپ رنگ لے آئی تھی۔

وہ سیدھا اپنے دفتر پہنچا اور اب تک کی گئی تفتیش کی مکمل رپورٹ تیار کر کے لیفٹیننٹ سیواگ کے کمرے میں رکھ آیا۔ اس کے بعد اس نے اسپتال فون کیا۔ انہیں عدالتی احکامات مل گئے تھے۔ اس نے لاش کے فوری پوسٹ مارٹم کی درخواست کی۔

''ہمیں اس کے لیے تحریری طور پر درخواست چاہیے ہوگی۔'' ڈاکٹر بائرن نے اس کی بات سُن کر کہا۔ ''اگر آپ ہمیں اپنی درخواست فیکس کر دیں تو آج رات کسی بھی وقت پوسٹ مارٹم کر لیا جائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' سائرس نے کہنا شروع کیا۔ ''میں کچھ ہی دیر میں آپ کو تحریری درخواست فیکس کے ذریعے بھجوا رہا ہوں۔''

اگلے دس منٹ کے اندر اندر اسپتال کو مسٹر ہیڈرک کی لاش کا دوبارہ فوری طور پر پوسٹ مارٹم کیے جانے کی درخواست مل گئی۔ سائرس نے اس درخواست میں پوسٹ مارٹم کے حوالے سے چند باتوں کا بطورِ خاص دھیان رکھنے کی بھی استدعا کی تھی۔

ان کاموں سے فارغ ہونے کے بعد سائرس نے لمبی سے جمائی لی۔ اس پر شدید تھکن طاری ہو چکی تھی۔ نیند کا غلبہ ہو رہا تھا۔ ویسے اب اس سارے کیس کا دارومدار دوبارہ کیے جانے والے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ پر منحصر تھا۔ اسے یقین تھا کہ اب کل دوپہر تک اس کے پاس کرنے کو کوئی خاص کام باقی نہیں بچا ہے۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ سے وہ ویسے بھی خاصا تھک چکا تھا۔ اس لیے دفتر سے نکلا اور گھر جا کر بستر پر لیٹا تو کپڑے تبدیل کرنے کا بھی ہوش نہ رہا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ خراٹے لے رہا تھا۔

☆☆☆

صبح کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ اچانک اس کا موبائل فون بجا تو سائرس ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔

''سیواگ بول رہا ہوں۔''

''سر...''

''کہاں ہو۔ ابھی تک آفس کیوں نہیں پہنچے۔''

''سر ابھی پہنچتا ہوں۔'' سائرس نے گھبرا کر کہا۔ ''وہ کل بہت تھک گیا تھا بس اسی لیے شاید آنکھ نہ کھل سکی۔'' اب وہ پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔

''کوئی بات نہیں۔'' سیواگ نے نرمی سے کہا۔ ''میں نے تمہاری رپورٹ پڑھ لی ہے۔ تم نے بہت تیزی سے اور بہت اچھا کام کیا ہے۔''

''شکریہ سر!'' یہ سن کر سائرس نے اپنے باس کی قطع کلامی کی۔

''سنو...'' سیواگ نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''کچھ دیر پہلے ڈاکٹر بائرن کا فون آیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ لاش کا دوبارہ پوسٹ مارٹم کر لیا گیا ہے۔ تم نے جن باتوں کی طرف اشارہ کیا تھا، پوسٹ مارٹم میں ان باتوں کا بطورِ خاص خیال رکھا گیا ہے۔ رپورٹ آج دوپہر کے بعد مل جائے گی۔ تم آرام سے ناشتا کرو اور پھر تیار ہو کر اسپتال نکل جانا اور رپورٹ لیتے ہوئے دفتر چلے آنا۔''

''ٹھیک ہے سر!'' یہ سنتے ہی سائرس کی وہ چستی کہیں غائب ہو گئی جو باس کا فون ملتے ہی اس کے جسم میں دوڑ گئی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ اس رپورٹ کے بعد یہ کیس حل ہو جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی کہانی اس کے پیچھے ضرور چھپی ہوئی ہے۔''

''مجھے بھی یہی لگتا ہے۔''

''ٹھیک ہے تم رپورٹ لے کر دفتر پہنچو تو سہی، پھر دیکھتے ہیں کہ اس کے پیچھے کیا کچھ ہے۔'' یہ کہہ کر سیواگ نے فون رکھ دیا۔ سائرس نے بھی فون رکھتے ہوئے گہری سانس لی اور ایک بار پھر بستر پر لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔



دن کے بارہ بجے تھے جب سائرس بستر سے اٹھا، ناشتا کیا اور نہا دھو کر جب وہ اسپتال جانے کے لیے اپنی گاڑی میں بیٹھا، اس وقت دن کے ڈیڑھ بج چکے تھے۔ آدھا گھنٹے کے بعد وہ استقبالیہ پر کھڑے ہو کر ڈاکٹر بائرن کے متعلق پوچھ رہا تھا۔

''میرے لیے بھی بڑے ہی تعجب کی بات ہے۔'' کچھ دیر بعد وہ ڈاکٹر بائرن کے کمرے میں بیٹھا ہوا دوبارہ کیے جانے والے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ پڑھ رہا تھا۔ رپورٹ پڑھنے کے بعد اس نے نہایت افسردگی سے کہا۔

''مجھے بھی بڑی حیرت ہوئی ہے کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔'' ڈاکٹر نے بھی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''خیر... جو کچھ ہونا تھا، وہ ہو چکا لیکن یہ بھی خدا کا شکر ہے کہ حقیقت سامنے آ گئی۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ لیفٹیننٹ سیواگ اور سراغرساں سائرس پولیس چیف کے سامنے بیٹھے ہوئے اسے ساری صورتِ حال سے مطلع کر رہے تھے۔

''تم فوراً آپریشن کی تیاری کرو۔'' پولیس چیف نے صورتِ حال سننے کے بعد کہا۔ ''یہ معاملہ آج شام سے پہلے ہی ختم ہو جانا چاہیے۔''

''بہتر سر!'' یہ کہتے ہوئے وہ دونوں کھڑے ہو گئے۔

''اور ہاں مسٹر سائرس...'' پولیس چیف نے اچانک اسے مخاطب کیا۔ ''میرے خیال میں یہ ایک انوکھا کیس ہے۔ تم نے جس طرح اس معاملے کو نہایت مختصر سے وقت میں سلجھایا ہے، اگر یہ کامیابی سے اختتام پذیر ہو گیا تو تمہیں اس کے اعتراف میں خصوصی ترقی کا انعام دیا جائے گا۔''

''شکریہ سر!''

''وش یو گڈ لک... جاؤ آپریشن کی تیاری کرو۔'' پولیس چیف نے مسکراتے ہوئے انہیں جانے کا اشارہ کیا۔

☆☆☆

شام کے سات بج رہے تھے جب وہ پولیس اسٹیشن پہنچا۔ رالف، ڈاکٹر رابرٹ اور بیلے کیٹس کو پولیس نے گرفتار کر لیا تھا اور اب ان سے تفتیش کی جا رہی تھی۔

''کچھ پتا چلا؟'' جیسے ہی وہ اندر پہنچا اسے اپنا ایک پرانا دوست مل گیا۔ وہ بھی ملزمان کی گرفتاری کے آپریشن میں شریک تھا۔ ''ابھی تو نہیں لیکن امید ہے کہ ایک دو گھنٹے میں معاملہ بالکل صاف ہو جائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ سراغرساں جارج کے کمرے کی طرف چل دیا جو گرفتار ملزمان سے تفتیش کر رہا تھا۔ اس نے کافی منگوائی اور سکون سے بیٹھ کر رسالے کی ورق گردانی میں مصروف ہو گیا۔

''ارے تم کب یہاں پہنچے؟'' گھنٹا بھر بعد جارج کمرے میں داخل ہوا اور اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔

''یہ چھوڑو، کام کی بات بتاؤ۔'' سائرس نے کہا۔

''یہ تو بڑے ہی کمینے نکلے۔''

''وہ تینوں یا ان میں سے صرف ایک یا دو؟'' سائرس نے سوال کیا۔

''نہیں... وہ بے چارہ ڈاکٹر رابرٹ تو بالکل بے قصور ہے۔ ہم اسے گھر جانے کی اجازت دے رہے ہیں مگر وہ رالف اور بیلے نہایت ہی گھٹیا انسان نکلے۔ انہیں انسان کہنا بھی آدمیت کی توہین ہے۔'' یہ کہتے ہوئے جارج کا چہرہ غصے سے تمتمانے لگا... اور پھر جو کچھ اس نے سائرس کو بتایا، وہ اس کی توقعات کے عین مطابق تھا لیکن پھر بھی وہ اس کے دماغ کی سوچ تھی جو غلط بھی ہو سکتی تھی مگر جب اس کے خیالات کی تصدیق خود ملزمان کے اعتراف سے ہوئی تو اسے بھی ان دونوں پر سخت غصہ آنے لگا۔

ایک گھنٹے کے بعد اخبار نویسوں کے سامنے بیٹھے ہوئے رالف اور بیلے اپنے مکروہ گناہوں کا پردہ چاک کر رہے تھے۔

☆☆☆

رالف نے اعتراف کیا تھا کہ وہ پچھلے پانچ سالوں سے اپنے ہاں تجہیز و تکفین کے لیے لائی جانے والی لاشوں کے مختلف اندرونی اعضا نکال کر فروخت کرنے کا مکروہ دھندا کر رہا تھا۔ خود کو بچانے کے لیے وہ حفظِ ماتقدم کے طور پر بعض ایسے سادہ کاغذات پر لواحقین سے دستخط لے لیتا تھا، جس کے تحت اگر وہ کبھی پکڑا بھی جاتا تو اس پر کوئی الزام نہیں لگتا۔ اس دھندے میں اس کے ساتھ شہر کے چند ایسے سرجن بھی شریک تھے جو مختلف جسمانی اعضا اس سے خریدتے تھے۔ رالف کا کام صرف انہیں لاش تک رسائی دینا تھی، باقی کام وہ خود کر لیتے تھے۔ یہ سب ماہر سرجن تھے اور غیر قانونی طور پر قائم اپنے نجی اسپتالوں میں گردے، جگر اور آنکھوں کی پیوند کاری کرتے تھے۔ اس کام میں بس ایک قباحت تھی اور وہ تھی لاش کی عمر۔ لاش جتنی زیادہ نئی ہوتی، اعضا اتنے ہی زیادہ بہتر حالت میں ملتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انہوں شہر کے مختلف اسپتالوں کے پوسٹ مارٹم روم اور مردہ خانوں میں خدمات انجام دینے والے پیرامیڈیکل اسٹاف کی خدمات بھی حاصل کر رکھی تھیں، جس کے عوض انہیں بھاری معاوضہ ادا کیا جاتا

تھا۔ یہلے بھی رالف کے اُنہی کارندوں میں سے ایک تھا۔ انہی لوگوں کی مدد سے رالف نے کئی بار مُردہ خانوں سے لاشیں چوری چھپے نکال کر ان کے بھی اعضا نکالے تھے۔ جو سرجن یہ اعضا نکالتے تھے، وہ بعد میں نہایت نفاست سے ماہرانہ انداز میں ٹانکے لگا دیتے تھے۔ ویسے بھی جو میتیں ایش بورگ کے ہاں پہنچائی جاتی تھیں، تابوت میں لٹانے کے بعد اس بات کا کوئی خطرہ باقی نہیں رہتا تھا کہ کوئی ان کی چوری پکڑ سکتا ہے۔ اس لیے وہ بڑے مزے سے اپنا کام کیے جا رہے تھے۔ یہ اب بھی نہ پکڑے جاتے اگر ہیڈرک کی میت ان کے پاس تجہیز و تکفین کے لیے نہ پہنچتی۔

ہوا یہ کہ کچھ عرصہ پہلے رالف نے ہیڈرک کی کمپنی سے کچھ تعمیراتی کام کروایا تھا۔ رالف کا خیال تھا کہ اس نے بل سے تین ہزار ڈالر زائد وصول کیے تھے۔ چنانچہ جب اس کی میت اس کے پاس پہنچی تو وہ اسے پہچان گیا۔ اس نے اپنے تین ہزار ڈالر بمع سود وصول کرنے کی ٹھانی مگر بات نہ بن سکی۔ اسی دوران سرجن بھی پہنچ چکے تھے۔ انہیں گردوں کی اشد ضرورت تھی۔ انہوں نے لاش کا معائنہ کیا۔ خون کا گروپ اور ٹشو میچنگ ان کی ضرورت کے عین مطابق تھے۔ انہوں نے گردے نکالے اور لے گئے۔ اس دوران مین ہیڈرک کے بھتیجے نے اضافی رقم دینے کے بجائے لاش لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ خاموش ہو گیا۔ ویسے بھی اسے ہیڈرک کی لاش سے بھاری رقم تو مل ہی گئی تھی۔ اس لیے اس نے بھی ضد نہ کی لیکن بُرا ہو مس ژیانگ کا جس نے بھانڈا پھوڑ دیا اور یوں رالف کے ذرا سے لالچ نے ان سب کے گناہوں کا پول کھول دیا۔

☆☆☆

جس وقت پولیس اسٹیشن میں بیٹھے ہوئے رالف اور یلے اپنے گناہوں کا اعتراف کر رہے تھے، عین اس وقت پولیس اس سنگین جرم میں شامل اُن سرجنز... اور دیگر ملزمان کی گرفتاری کے لیے چھاپے مار رہی تھی، جن کے نام اور پتے انہوں نے پولیس کو بتائے تھے۔ اگلے چند گھنٹوں میں وہ سب پکڑے جا چکے تھے۔

رات گئے جب سائرس گھر لوٹ رہا تھا کہ اسے لیفٹیننٹ سیواگ کا فون ملا۔ ''فوراً دفتر پہنچو۔'' اس نے چھوٹتے ہی کہا اور جواب سنے بغیر فون رکھ دیا۔

جب وہ سیواگ کے کمرے میں پہنچا تو پولیس چیف بھی وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''مبارک ہو۔'' اس نے آگے بڑھ کر سائرس کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد وہ تینوں بیٹھے ہوئے کافی پی رہے تھے۔ ''یہ بتاؤ تمہیں کیسے شک ہوا کہ لاش کے اعضا نکالے گئے ہیں؟'' کافی پیتے ہوئے پولیس چیف نے اس سے سوال کیا۔

''ٹانکوں سے...'' سائرس نے جواب دیا۔

''ٹانکوں سے۔'' پولیس چیف نے حیرت سے اس کی بات دُہرائی۔

''جی ہاں... مورگلین میں ہیڈرک کی لاش کا معائنہ کرنے کے بعد میں نے تین اسپتالوں کا دورہ کیا اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ جسمانی اعضا نکالنے اور پوسٹ مارٹم کیے جانے کے بعد لگائے گئے ٹانکوں میں کیا فرق ہوتا ہے۔ بس... یہیں مجھے پتا چلا کہ زندہ انسان کو لگائے گئے ٹانکے اور پوسٹ مارٹم کے بعد چیرا سینے میں کیا فرق ہوتا ہے۔ جب واپس آ کر میں نے ہیڈرک کی لاش کی تصاویر کو کمپیوٹر پر ڈاؤن لوڈ کر کے دیکھا تو یہ فرق وہاں صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ ایک ٹانکے دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ انہیں کسی اناڑی نے لگایا ہے اور دوسرے ٹانکوں کی نفاست بتا رہی تھی کہ انہیں کسی ماہر سرجن نے لگائے ہیں۔''

''بہت اچھے... اچھا نکتہ ہے۔'' لیفٹیننٹ سیواگ نے بھی یہ سن کر تعریف کی۔ ''اسی لیے شاید تم نے بطور خاص تاکید کی تھی کہ ان ٹانکوں اور گردوں کا دوسرے پوسٹ مارٹم میں بطور خاص جائزہ لیا جائے۔''

''ایسا ہی تھا۔'' سائرس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر رابرٹ کے مطابق پوسٹ مارٹم معدے کے لیے کیا گیا تھا مگر اس کی کمر سے تھوڑا نیچے کی طرف دائیں بائیں کس لیے کٹ لگائے گئے تھے؟ بس اسی سوال کا جواب جاننے کے لیے میں نے ڈاکٹرز سے یہ درخواست کی تھی۔''

رات کافی ہو چکی تھی۔ پولیس چیف جانے کے لیے اٹھا تو وہ بھی ان کے ساتھ باہر نکل آیا۔ جب وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ رہا تھا تو پولیس چیف نے کہا۔ ''کل صبح میرے دفتر آ کر اپنی ترقی کا لیٹر لے جانا۔'' یہ سنتے ہی اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ زندگی میں پہلی بار اسے کارکردگی کی وجہ سے ترقی مل رہی تھی، ورنہ اب تک تو اس کی کارکردگی پر دوسرے افسر ہی ترقی پاتے رہے تھے۔

''بہت شکریہ آپ کا۔'' اس نے لیفٹیننٹ سیواگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ بہت سخت باس ہی نہیں، ایمان دار افسر بھی تھا۔



# مخمل کے کانٹے

کاشف زبیر

بصیرت اور بصارت کی دولت ہر شخص کو ودیعت نہیں ہوتی--- کچھ لوگ اپنے سامنے رونما ہونے والے واقعات دیکھتے ہیں--- انہیں پرکھتے ہیں--- اور نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں--- مگر صاحبِ بصیرت اس حقیقت سے ایک نئی سمت میں جانے کی کوشش کرتے ہیں--- اور اس حقیقت کی تہ میں پوشیدہ حقائق کو کھوج لیتے ہیں--- دانائی رکھنے والے ایک بزرگ کے تجرباتِ زندگی کا نچوڑ---

**نسل در نسل ایک ہی پیشے سے وابستہ خاندان کا دلچسپ احوال**

''برخوردار ہر خطرناک چیز حسین ضرور ہوتی ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا ہتھیاروں میں بھی ایک طرح کا حُسن جھلکتا ہے۔'' مسٹر بون گلیڈن نے اپنے نوعمر پوتے جانسن گلیڈن کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ لیکن اس کی توجہ دور ساحل پر اڑتے ہوئے سی ایگل پر تھی۔ وہ چند منٹ پہلے ہی اس بوٹ میں سوار ہوئے تھے جو کیپ ٹاؤن سے روانہ ہونے والی تھی۔ ان کی

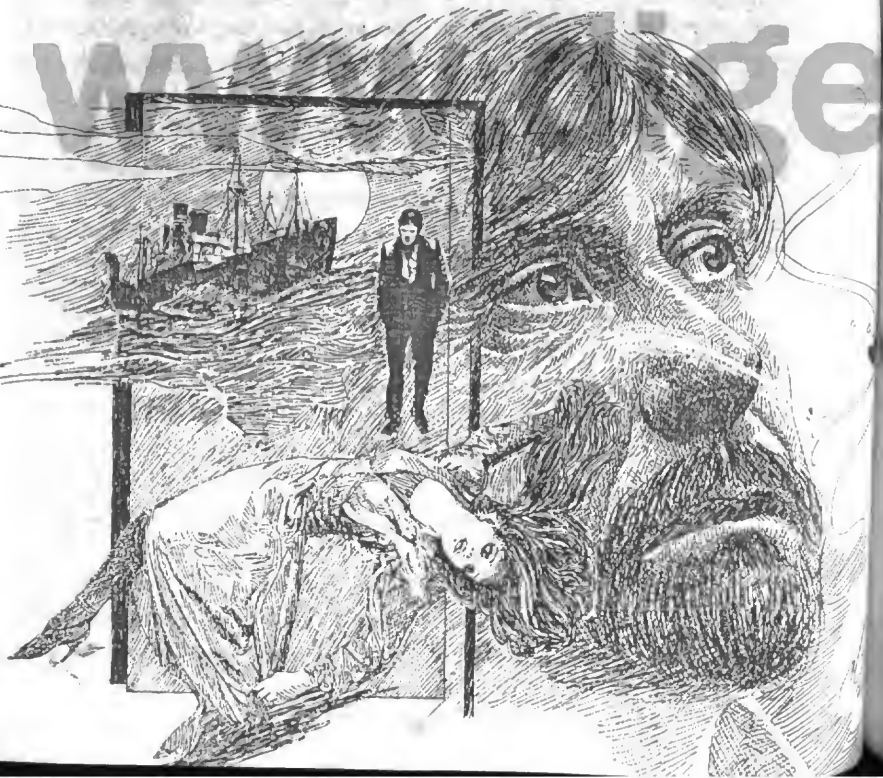

منزل لندن تھی۔ جانسن عرف جونی کی عمر سترہ برس تھی لیکن مسٹر بون نے اسے تین مہینے پہلے پہلی بار دیکھا تھا۔ جب وہ اپنے بیٹے اور بہو کی ایک حادثے میں موت کی وجہ سے جنوبی افریقہ آئے تھے۔ جونی ماں باپ کی ایک ہی اولاد تھا۔ جس دن اس کے ہائی اسکول کا نتیجہ نکلنے والا تھا اس سے دو دن پہلے اس کے ماں باپ تقریب میں شرکت کرنے کے لیے جوہانسبرگ سے روانہ ہوئے تھے اور راستے میں ان کی بس ایک پل سے دریا میں جا گری تھی۔ اس حادثے میں سات دوسرے لوگوں کے ساتھ جونی کے ماں باپ بھی جاں بحق ہو گئے تھے۔

مائیکل گلیڈن صرف بیس سال کی عمر میں جنوبی افریقہ آ گیا تھا اور یہاں اس نے نوکری کر لی۔ پھر یہیں شادی کی اور واپسی کا راستہ بھول گیا۔ بیس سالوں میں وہ صرف ایک بار انگلینڈ آیا جب اس کی ماں کا انتقال ہوا تھا۔ اس کی بیوی میریاں بننے والی تھی اس لیے وہ سفر نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے بعد مائیکل دوبارہ لندن نہیں آیا اور نہ ہی کبھی مسٹر بون جنوبی افریقہ آئے تھے۔

جونی صدمے میں تھا۔ ماں باپ کا بیک وقت بچھڑنا اس کے لیے بہت اندوہناک تھا۔ ایسے میں اگر اسے مسٹر بون کا سہارا نہ ملتا تو شاید وہ خود کو اتنی جلدی سنبھال نہیں پاتا۔ مسٹر بون دو سال پہلے ریٹائر ہوئے تھے اس لیے ان کو وقت کی کمی کا مسئلہ نہیں تھا انہوں نے سکون سے یہاں کے سارے معاملات نمٹائے تھے۔ اسکول انتظامیہ نے جونی کے لیے الگ سے تقریب منعقد کی تھی کیونکہ اس نے پورے اسکول میں تیسری پوزیشن حاصل کی تھی۔ جب اس نے اپنی سند وصول کی تو تالیاں بجانے والوں میں مسٹر بون بھی شامل تھے۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد بھی طویل سفر کرنے والے افراد بحری جہازوں کا سہارا لینے پر مجبور تھے کیونکہ ابھی ہوائی سفر کا چلن عام نہیں ہوا تھا۔ اس لیے مسٹر بون نے واپسی کے سفر کے لیے ایک اعلیٰ درجے کی اسٹیم بوٹ میں ایک کیبن بک کرایا۔ مائیکل کے تمام واجبات مل چکے تھے۔ مسٹر بون نے بیٹے کا مکان اور دوسری چیزیں بھی فروخت کر دیں اور سوائے چند یادگار چیزوں کے کچھ اور ساتھ نہیں لے جا رہے تھے۔ مسٹر بون کے خیال میں سب سے بڑی یادگار تو خود جونی تھا۔ ان چند مہینوں میں وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ جس وقت وہ بوٹ میں سوار ہوئے تو ساحل پر سانپوں کا تماشا دکھانے والا موجود تھا۔ وہ زہریلے سانپ کو حلق سے پیٹ میں اتار لیتا تھا اور پھر اسے کچھ دیر پیٹ میں رکھ کر باہر نکالتا تھا۔ مسٹر بون نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ہر خوفناک چیز کو خوب صورت کہا تھا۔ ان کے خیال میں ان کے پاس تجربہ تھا اور وہ مرنے سے پہلے یہ تجربہ اپنے پوتے میں منتقل کر دینا چاہتے تھے۔ بیٹا تو صرف بیس سال کی عمر میں ان سے دور چلا گیا تھا اور اس وقت وہ خود بھی بہت مصروف رہتے تھے۔ گھر اور اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے ان کے پاس بہت کم وقت بچتا تھا۔ یہی وجہ تھی مائیکل کبھی ذہنی طور پر ان سے قریب نہیں رہا تھا۔ لیکن بیٹے کو کھونے کے بعد ان کی تمام تر محبت کا مرکز پوتا تھا... اور وہ اپنی پچھلی غلطیوں پر شرمندہ تھے۔

''تمہارے معاملے میں یہ غلطی نہیں کروں گا۔ میرا سب کچھ مجھ سمیت صرف تمہارا ہے۔''

جونی بھی اداس ہو گیا۔ ماں باپ کی اچانک موت نے اسے جنوبی افریقہ سے بیزار کر دیا تھا اس لیے جب مسٹر بون نے اس سے لندن چلنے کو کہا تو وہ فوراً راضی ہو گیا۔ وہ وہاں جونی کو کسی اچھے کالج میں داخل کرانا چاہتے تھے۔ جہاں پڑھ کر وہ اپنے خاندانی پیشے میں آئے۔ گلیڈن خاندان چھ نسلوں سے ایک ہی پیشے میں تھا۔ ہر نسل اسی پیشے کو اپناتی رہی تھی۔ حد یہ کہ جنوبی افریقہ آنے کے بعد مائیکل نے بھی اسی پیشے کا انتخاب کیا تھا۔ مسٹر بون نے جونی سے اس بارے میں بات نہیں کی تھی لیکن انہیں امید تھی کہ وہ اپنے خاندانی پیشے کا انتخاب کرے گا۔ ویسے وہ جس پیشے کا بھی انتخاب کرتا، مسٹر بون اس کی خوشی میں خوش تھے۔ شاید بیٹے کے بعد ان کو احساس ہوا تھا کہ اصل اہمیت رشتوں کی ہوتی ہے، پیشے کی نہیں۔

کہنے کو یہ اسٹیم بوٹ تھی لیکن یہ اچھا خاصا بڑا بحری جہاز تھا جس میں تین عرشے تھے۔ سب سے اوپر فرسٹ کلاس کا عرشہ تھا۔ یہاں درجۂ اول کے مسافروں کے لیے کیبن تھے۔ اس کے بعد سیکنڈ کلاس کا عرشہ تھا۔ یہاں دوسرے درجے کے کیبن اور مشترکہ رہائشی ہال تھا۔ تیسرا عرشہ تھرڈ کلاس تھا اور اس میں صرف مشترکہ رہائشی ہال تھا۔ تھرڈ کلاس کے مسافروں کو سیکنڈ کلاس عرشے پر آنے کی اجازت نہیں تھی لیکن سیکنڈ کلاس والے فرسٹ کلاس کے عرشے پر آ سکتے تھے۔ رواج کے مطابق پہلے فرسٹ کلاس والے بوٹ پر سوار ہوئے تھے اور اب سیکنڈ کلاس کے مسافر آ رہے تھے۔ تب جونی نے اس خوب صورت اور نوعمر لڑکی کو دیکھا جو ایک چھوٹا بیگ تھامے آ رہی تھی۔ اس نے سفید اسکرٹ اور پھولدار بلاؤز پہنا ہوا تھا اور اس کے اوپر سرخ رنگ کا مخملیں کوٹ تھا لیکن اس سے بلاؤز اور اسکرٹ دونوں جھلک رہے تھے۔ سر پر سرخ رنگ کا ہیٹ تھا اور اس پر اچھا لگ رہا تھا۔ لڑکی بڑی



حسین اور نازک اندام تھی۔ جونی نے اس کے آس پاس دیکھا، وہ جاننا چاہتا تھا کہ لڑکی کس کے ساتھ آئی ہے لیکن اسے کوئی ایسا فرد نظر نہیں آیا جو لڑکی کے ساتھ ہو۔ وہ اکیلی تھی۔ کچھ دیر بعد ایک نوجوان دوسروں کو دھکے دیتا ہوا پیچھے سے آیا اور اس نے بے تکلفی سے لڑکی کا بازو تھام لیا۔ جونی کو مایوسی ہوئی۔ لڑکے کا انداز بتاتا تھا کہ وہ اس کا بھائی نہیں ہے۔ جونی کا خیال تھا کہ دادا اسے نہیں دیکھ رہے ہوں گے لیکن انہوں نے اچانک کہا۔

''تمہیں پہلے ہی سوچ لینا چاہیے تھا کہ اس عمر کی لڑکی اکیلے سفر نہیں کر سکتی۔''

''جی دادا جان۔'' جونی نے کھسیا کر کہا۔

''ویسے لڑکی اتنی بھی کم عمر نہیں ہے۔''

''نہیں دادا جان میرا خیال ہے یہ ابھی اٹھارہ برس کی بھی نہیں ہوئی ہے۔'' جونی نے یقین سے کہا۔

''میں دعوے سے کہتا ہوں، یہ کم سے کم بیس سال کی ہے۔''

جونی کو دادا کی بات سے اتفاق نہیں تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا لڑکا لڑکی سے بالکل بھی میچ نہیں کر رہا تھا۔ اس کا انداز عامیانہ اور نچلے طبقے والا تھا۔ جب کہ لڑکی اپنی حرکات اور رکھ رکھاؤ سے اوپری طبقے کی نظر آتی تھی۔ جونی سوچنے لگا کہ ان دونوں کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟ کیا وہ اس کا شوہر تھا۔ لیکن وہ اس کا شوہر نہیں تھا کیونکہ جونی نے لڑکی کو کیبن والے حصے کی طرف جاتے دیکھا جب کہ لڑکا مشترکہ ہال کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے لڑکی کو اس کا چھوٹا سا سوٹ کیس لا کر دیا تھا اور شاید باقی سامان بوٹ کے ویئر ہاؤس میں جمع کرایا تھا۔ لڑکے کے شانے سے ایک چھوٹا اور سستا بیگ لٹک رہا تھا جب کہ اس کا لباس بھی عام سا تھا۔

''برخوردار یہ سفر بہت طویل ہے اور تمہارے پاس سوچنے کے لیے بہت وقت ہوگا۔'' مسٹر بون نے اس کا شانہ ہلایا۔ ''اب میس کی طرف چلو، مجھے بھوک لگ رہی ہے۔''

مسٹر بون بھوک کے کچے تھے حالانکہ انہوں نے ہوٹل سے روانہ ہونے سے پہلے ڈٹ کر ناشتا کیا تھا اور ایک بجے سے پہلے انہیں پھر بھوک لگ رہی تھی۔ جونی ان کے ساتھ فرسٹ کلاس کے میس میں آیا۔ لنچ کا آغاز تھا اس لیے وہاں رش نہ ہونے کے برابر تھا اور انہوں نے سکون سے لنچ کیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد مسٹر بون کو قیلولہ کرنے کی عادت ہو گئی تھی اس لیے وہ کیبن کی طرف چلے گئے اور جونی دوبارہ عرشے پر آ گیا۔ جون کا مہینہ تھا اور جنوب کی طرف سے یخ بستہ ہوا چل رہی تھی۔ جونی نے اگر بھاری اوور کوٹ نہ پہن رکھا ہوتا

کچھ دن ہوئے، مجھے اسلام آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ پچیس برس پہلے سیکریٹریٹ کی نیم تاریک گمراہ داریاں دیکھ کر جو وحشت مجھے ہوتی تھی، وہ اب دہشت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ باخبر لوگ ان راہ داریوں کو CORRIDORS OF POWER کہتے ہیں۔ میں اس کا ترجمہ ''غلام گردشِ غلامانِ بادشاہ گراں'' کرتا ہوں۔ ہمارے دوست اور کرم فرما الطاف گوہر صاحب اسلام آباد کو ''ہوس گاہ'' کہتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہوس گاہ کی اصطلاح انہوں نے بوسہ گاہ کی وضع پر بنائی ہے جسے میرؔ نے شعر میں استعمال کیا ہے۔ سو یہ بوسہ گاہ عوام و خواص پیشانی و رخسار سے اترتی اب بادشاہ گروں کے پائے مبارک پہ آ کے ٹھہر گئی ہے۔

تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ کچھ دن ہوئے اسلام آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ پوچھنے والوں نے ہم سے جس انداز سے کراچی کا حال پوچھا، اس میں پرسشِ احوال یا پُرسے سے زیادہ بازپرس کا رنگ تھا۔ جو سوال بھی وہ کرتے تھے اس میں ان کے اپنے جواب کی آمیزش تھی۔ انداز میں جھنجلاہٹ۔ کوئی ڈیڑھ سو برس پہلے غالبؔ نے کہا تھا۔

نہ پوچھ حال اس انداز، اس عتاب کے ساتھ
لبوں پہ جان ہی آ جائے گی جواب کے ساتھ

لیکن جواب پر ہی اصرار ہے تو فیضؔ صاحب کی زبانی عرض ہے:

یہ خونِ خاک نشیناں تھا، رزقِ خاک ہوا
ایسے بھی سراغ رساں ہیں جنہیں مقتول کے قتل میں خود مقتول ہی کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ گویا:

وہی قتل بھی کرے ہے، وہی لے قصاص الٹا

سیاست نگری کی اِک جھلک یوسفی کے پُرمزاح قلم سے

تو وہ یقیناً کانپ رہا ہوتا۔ سیکنڈ کلاس کے مسافروں کے بعد ان تھرڈ کلاس کے مسافر بوٹ پر سوار ہو رہے تھے اور اس موقع پر ہنگامے اور افراتفری کا منظر تھا۔

جونی اکیلا تھا لیکن کچھ دیر بعد اسے اپنے برابر میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اور اس نے سر گھما کر دیکھا اور سرخ کوٹ والی لڑکی کو کچھ ہی دور ریلنگ سے ٹیک لگا کر حیران ہوا۔ وہ کب وہاں آئی، اسے بالکل پتا نہیں چلا۔ سردی سے اس کے ہونٹ اور گال سرخ ہو رہے تھے۔ تیکھے نقوش اور نیلی آنکھوں کی وجہ سے وہ دور سے دیکھنے میں کم عمر لگتی تھی لیکن قریب سے دیکھنے پر جونی کو دادا کے اندازے کی داد دینا

پڑی۔ وہ بیس کے آس پاس تھی۔ اسے اپنی طرف متوجہ پا کر وہ مسکرائی۔

''آج موسم بہت سرد ہے۔''

''ہاں ہوا تیز ہے۔'' جونی نے اس کی تائید کی پھر بولا۔ ''میں نے تمہیں آتے دیکھا تھا۔ میں سمجھا کہ تم اکیلی ہو؟''

''میرے ساتھ ایڈم ہے۔'' لڑکی نے ایڈم سے رشتہ بتانے سے گریز کیا۔ ''میرا نام سیلا ہے سیلا مورگن، ہم جوہانسبرگ سے آئے ہیں۔''

''جانسن گلیڈن۔'' جونی نے اپنا تعارف کرایا۔ ''ہم لندن جا رہے ہیں۔''

''ہم؟'' سیلا کا انداز سوالیہ تھا۔

''میں اور میرے دادا۔'' جونی نے وضاحت کی۔ ''تم اور ایڈم کہاں جا رہے ہو؟''

''ہم مراکش میں اتر جائیں گے۔'' سیلا نے کہا اور اسی لمحے اس نے ایک طرف دیکھا اور پھر اس سے معذرت کرتی اس طرف بڑھ گئی۔ یہ سیکنڈ کلاس کا عرشہ تھا لیکن جونی دیکھ نہیں سکا کہ وہ کس کے پاس گئی ہے۔ سیلا بلاشبہ انگریز تھی اور ایڈم بھی سفید فام تھا۔ تب وہ مراکش کیا کرنے جا رہے تھے۔ لڑکی سفید فام ضرور تھی لیکن وہ یہاں کی رہنے والی نہیں تھی۔ اس کا لہجہ ذرا مختلف تھا۔ وہ کہیں باہر سے آئی تھی۔ پھر جونی نے محسوس کیا کہ وہ دادا کے انداز میں انگریزی بول رہی تھی تو کیا وہ انگلینڈ سے آئی تھی؟ جونی اپنے کیبن میں آ گیا تھا جہاں مسٹر بون قیلولہ کر کے اب ایک کتاب دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے جونی کے چہرے سے بھانپ لیا کہ وہ کسی الجھن میں ہے۔ ''کیا بات ہے برخوردار؟'' انہوں نے کتاب ایک طرف رکھ دی۔ ''کچھ پریشان لگ رہے ہو؟''

جونی نے سوچا اور پھر انہیں سیلا سے ہونے والی گفتگو سنا دی۔ مسٹر بون نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ ''سیلا مورگن ایک نوجوان کے ساتھ سفر کر رہی ہے جس کا نام ایڈم ہے لیکن اس سے اپنا رشتہ نہیں بتایا اور پھر از خود تمہاری طرف آ گئی۔''

''زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنے ساتھی کے ہمراہ مراکش میں اتر جائے گی۔''

''نہیں... نہیں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ تمہاری طرف کیوں آئی؟''

''کیوں کیا کوئی لڑکی میری طرف نہیں آ سکتی؟'' جونی نے خفا ہو کر کہا تو مسٹر بون مسکرانے لگے۔

''برخوردار، ابھی تم نے دنیا بہت کم دیکھی ہے۔''

''اگر میں نے دنیا کم دیکھی ہے تو اس لڑکی نے اتنی ہی عمر میں کون سی دنیا دیکھ لی ہے۔''

مسٹر بون سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ ''میرے بچے میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، عورت کی ذہانت یا اس کی خطرناکی کو کبھی اس کی عمر سے مت ناپنا۔''

''آپ کا مطلب ہے وہ کسی خاص وجہ سے مجھ سے ملی ہے؟''

مسٹر بون نے کتاب دوبارہ اٹھا لی۔ ''اب تم نے اپنی ذہانت استعمال کرنا شروع کر دی ہے۔''

''لیکن دادا جان وہ بھلا مجھ سے کیوں ملنے لگی؟''

''برخوردار میں بھلا کیسے بتا سکتا ہوں کہ وہ تم سے کیوں ملی ہے۔ یہ بات تو تمہیں خود جاننا ہوگی۔''

''آپ کا مطلب ہے میں معلوم کرنے کی کوشش کر سکتا ہوں؟'' جونی خوش ہو گیا۔

''ہاں لیکن دو باتوں کا خیال رکھنا... ایک تو اس کے ساتھ اس کے کیبن میں مت جانا اور دوسرے اس سے کسی قسم کا کوئی لین دین مت کرنا۔''

''میں خیال رکھوں گا۔'' جونی نے باتھ روم کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ شام قریب تھی اور اسے امید تھی کہ فرسٹ کلاس کے باتھ روم میں سیلا آئے گی۔ وہ تیار ہو کر باہر آیا تو سورج ڈوب چکا تھا اور جنوب سے چلنے والی ہوا مزید سرد ہو چکی تھی۔ اسٹیم بوٹ کھلے سمندر میں پہنچ گئی تھی لیکن دور زمین پر کچھ روشنیاں ابھی نظر آ رہی تھیں۔ جونی تفریح گاہ میں داخل ہوا۔ ایک طرف بار تھا اور اس کے ساتھ تنہا کونوشی کا کمرا تھا اور ایک طرف بال روم تھا۔ آکسٹرا فی الحال ہلکی دھنیں بجا رہا تھا کیونکہ محفل ابھی جمی نہیں تھی۔ سیلا کو وہاں موجود نہ پا کر اسے مایوسی ہوئی۔ وہ ایک طرف بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے کچھ خیال آیا اور وہ وہاں سے اٹھ گیا۔ وہ سیڑھیاں اتر کر سیکنڈ کلاس کے عرشے پر آیا اور اس نے تفریح گاہ میں جھانکا تو وہاں کچھ رونق نظر آئی۔

سیلا یہاں بھی نہیں تھی البتہ ایڈم ایک معمولی درجے کی لڑکی کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔ اس نے سیلا کے کیبن کی طرف جانے کا سوچا لیکن پھر اسے دادا کی ہدایت یاد آ گئی۔ وہ ایک میز پر بیٹھ گیا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد سیلا تفریح گاہ میں داخل ہوئی اور اس نے فوراً ہی جونی کو دیکھ لیا... لیکن اسے حیرت ہوئی جب وہ اسے مکمل طور پر نظر انداز کر کے بار کی طرف بڑھ گئی۔ بار کے سامنے زیادہ تر اکیلے اور اوباش قسم کے لڑکے اور مرد جمع تھے اس لیے جب سیلا وہاں پہنچی تو ہر نظر اس پر جم

گئی۔ سیلا نے برانڈی کا گلاس لیا اور بار کے ساتھ موجود بالکونی کی طرف بڑھ گئی۔ یہاں سے سمندر کا نظارہ بہت اچھا لگتا تھا لیکن باہر بہت سردی تھی۔ سیلا شیشے کا دروازہ کھول کر باہر چلی گئی اور فوراً ہی جونی نے بار کے سامنے موجود ایک تنومند نوجوان کو اس کے پیچھے جاتے ہوئے دیکھا۔ جونی کو یاد آیا بالکونی کی طرف جاتے ہوئے سیلا اس کے بہت پاس سے گزری تھی تقریباً اسے چھوتے ہوئے۔ کیا اس نے لڑکے کو کوئی اشارہ کیا تھا؟

لڑکا بالکونی میں داخل ہوا۔ شیشے کے پیچھے سے باہر کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔ لڑکے نے جاتے ہی بے تکلفی سے سیلا کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اس نے پلٹ کر لڑکے کو تھپڑ مار دیا۔ لڑکے نے پھر کر اس کی کلائی پکڑ لی تھی۔ یقیناً اس کی گرفت سخت تھی کیونکہ سیلا کے چیخنے کی آواز بار کے اندر تک سنائی دی تھی۔ سب کے ساتھ ایڈم بھی چونک گیا۔ اس وقت جونی اٹھنے کا ارادہ کر رہا تھا لیکن پھر وہ بیٹھا رہا۔ اس نے ایڈم کو اٹھ کر تیزی سے بالکونی کی طرف جاتے دیکھا۔ اس دوران میں سیلا لڑکے کو ایک اور تھپڑ مار چکی تھی، اس بار لڑکے کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے سیلا کو مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن اس سے پہلے ہی ایڈم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کے گھونسا جڑ دیا۔ لڑکے نے سیلا کو چھوڑ دیا اور ایڈم کے ساتھ گتھم گتھا ہو گیا۔ جب تک جہاز کا عملہ پہنچ کر ان دونوں میں بیچ بچاؤ کرتا، وہ لڑکے کے منہ پر کئی زوردار مکے رسید کر چکا تھا اور اس کے منہ اور ناک سے خون جاری ہو گیا تھا۔ اس کے مقابلے میں ایڈم کو کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔ لڑکے کو دو افراد نے پکڑ لیا لیکن وہ بری طرح بپھرا ہوا تھا اور ایڈم کو گالیاں دے رہا تھا۔ جونی بھی دوسروں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ ایڈم نے کہا۔

''تم بہت بکواس کر رہے ہو لیکن میں تمہارا حلیہ پہلے ہی بگاڑ چکا ہوں۔''

''تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔'' لڑکے نے بازاری انداز میں کہا۔ اس کا تعلق یقیناً کسی گھٹیا خاندان سے تھا۔ ''تمہاری اس ماں کو بھی...''

اس کی باقی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ ایڈم نے پھرتی سے اس کے منہ پر ایک اور مکا مارا۔ اس دوران میں جہاز کا سیکنڈ آفیسر بھی پہنچ گیا.... اور دونوں کو ساتھ لے گیا۔ جونی دیکھ رہا تھا۔ سیلا بھی ان کے ساتھ گئی تھی لیکن سیکنڈ آفیسر نے اسے گرفتار نہیں کیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد تفریح گاہ کا ماحول چند منٹ بعد دوبارہ معمول پر آ گیا۔ جونی پیتا نہیں تھا اس لیے اس نے اپنے لیے صرف سوڈا لیا تھا۔ آدھے گھنٹے انتظار کے بعد بھی سیلا اور ایڈم نہیں آئے تھے البتہ مار کھانے والا لڑکا کچھ دیر بعد مرہم پٹی کرا کے آ گیا تھا۔ جونی باہر نکلا۔ یخ بستہ ہوا کی وجہ سے وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ جونی ٹہلتے ہوئے کشتیوں والے حصے کی طرف آیا۔ اگر بوٹ میں کوئی ہنگامی صورتِ حال پیش آتی تو مسافران کشتیوں میں بیٹھ کر اپنی جان بچا سکتے تھے۔ اچانک پاس ہی سے جونی کو کسی کے تیز بولنے کی آواز آئی۔ وہ جلدی سے کشتی کی آڑ میں ہو گیا۔ چند لمحے بعد سامنے سے دو سائے نمودار ہوئے۔ یہ سیلا اور ایڈم تھے۔ وہ جونی سے کچھ ہی دور ریلنگ کے ساتھ رک گئے۔ ایڈم غصے میں تھا۔ اس کا اندازہ جونی کو اس کے لہجے سے ہو گیا تھا۔

''تمہیں کیا ضرورت تھی اس سے الجھنے کی؟''

''اس نے بدتمیزی کی تھی۔'' سیلا بولی۔ ''مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا اور میں نے اسے تھپڑ مار دیا۔''

''تھپڑ مار دیا۔'' ایڈم طنزیہ انداز میں بولا۔ ''تمہیں احساس ہے ہم مشکل میں پڑ سکتے ہیں۔''

''تم کیا چاہتے ہو میں اس جاہل شخص کی حرکتیں برداشت کرتی۔'' سیلا نے تنک کر کہا۔

''بہرحال اب اس سے محتاط رہنا... مجھے یہ شخص بہت کینہ پرور لگ رہا ہے۔''

''تم بھی محتاط رہنا۔'' سیلا بولی۔ ''وہ تمہارے بارے میں دھمکیاں دے رہا تھا۔''

''وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' ایڈم نے اعتماد سے کہا اور پھر وہ دونوں آگے بڑھ گئے۔ جونی وہاں سے نکل آیا اور واپس اپنے حصے میں آ گیا۔ کچھ دیر وہ تفریح گاہ میں رہا اور پھر کیبن میں آ گیا۔ مسٹر بون ڈنر کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ انہوں نے ریسمی ڈنر جیکٹ زیب تن کر لی تھی۔ انہوں نے جونی کی طرف دیکھا۔

''تم کہاں تھے؟''

''میں سیکنڈ کلاس کے عرشے پر گیا تھا۔''

''یعنی تم ان کے پیچھے گئے تھے۔ کچھ معلوم ہوا؟''

جونی نے سیلا اور ایڈم کے متمول نوجوان سے جھگڑے کے بارے میں بتایا۔ مسٹر بون نے غور سے اس کی بات سنی۔

''تمہیں یقین ہے کہ جب تک سیلا اس کے پاس سے گزر کر بالکونی کی طرف نہیں گئی تھی تب تک اس نوجوان نے اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔''

''توجہ تو دی تھی کیونکہ سب کی توجہ سیلا پر تھی۔ میں نوٹ



نہیں کر سکا کہ وہ پہلے سے اس کی طرف متوجہ تھا یا نہیں لیکن یہ بات یقینی ہے جب وہ بالکونی کی طرف گئی تب ہی نوجوان بھی اس کے پیچھے گیا تھا، اس سے پہلے اس نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔''

''یعنی تمہاری توجہ بھی سیلا پر تھی۔'' مسٹر بون نے ہیٹ سر پر رکھا اور وہ کیبن سے نکل آئے۔ آٹھ بجے میس میں خاصی رونق تھی مگر یہ سیکنڈ کلاس والی رونق نہیں تھی۔ ڈنر کے بعد مسٹر بون نے برانڈی لی اور کچھ دیر ماحول سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

''برخوردار کیا خیال ہے... نیچے کے عرشے کا ایک چکر نہ لگا لیا جائے؟''

''کیوں نہیں دادا جان۔'' جونی بولا۔ وہ دونوں اٹھ کر نیچے گئے جہاں کی رونق اس وقت عروج پر تھی۔ تفریح گاہ سے قہقہوں اور شور کا طوفان امنڈ رہا تھا اس لیے مسٹر بون نے اس طرف جانے سے گریز کیا اور جونی کے ساتھ کشتیوں والے حصے کی طرف بڑھ گئے۔ جونی نے اشارے سے بتایا۔

''میں نے یہاں کھڑے ہو کر ان کی باتیں سنی تھیں۔''

''وہ کوئی خاص باتیں نہیں تھیں۔'' مسٹر بون بولے۔

''اچھا مجھے تو لگ رہا ہے کہ وہ خاص باتیں تھیں۔ ایڈم کی باتوں سے لگ رہا ہے کہ وہ کسی مشکل کی وجہ سے اس بوٹ پر موجود ہیں۔''

''میں نے کہا نا یہ اہم بات نہیں ہے۔'' مسٹر بون نے کہا اور ٹہلتے ہوئے آگے بڑھے اور پھر ان کی نظر کشتیوں کے درمیان دراز شخص پر گئی۔ انہوں نے کوٹ سے لائیٹر نکال کر جلایا اور جھک کر اس آدمی کو دیکھا، اتنے میں جونی بھی آ گیا۔ آدمی کے سینے میں ایک چھوٹا چاقو دستے تک اترا ہوا تھا اور وہ یقیناً مر چکا تھا کیونکہ چاقو عین دل کے مقام پر پیوست تھا۔ اس کے کوٹ پر معمولی سا خون پھیلا ہوا تھا۔ جونی نے بے ساختہ کہا۔

''میرے خدایہ تو ایڈم ہے۔''

مسٹر بون نے اس کی گردن پر ہاتھ رکھا اور کچھ دیر بعد بولے۔ ''اسے مرے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے، شاید ایک گھنٹے پہلے ہی قتل کیا ہے۔''

''ہمیں بوٹ کے کپتان کو اس کی اطلاع دینی چاہیے۔'' جونی نے کہا۔ تیز ہوا کی وجہ سے لائیٹر بار بار بجھ رہا تھا اس لیے مسٹر بون نے اسے بند کر دیا اور کھڑے ہو گئے۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو، ہمیں کپتان کو اطلاع کرنی چاہیے۔''

وہ کپتان برج کی طرف آئے جہاں کپتان اور دوسرے اعلیٰ افسران کے لیے کیبن تھے۔ مسٹر بون نے ایک بیل بوائے سے کہا کہ وہ کپتان سے ملنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس نے انکار کر دیا۔ ''شام سات بجے کے بعد کوئی کپتان سے نہیں مل سکتا ہے۔''

''ایمرجنسی ہے۔'' مسٹر بون نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''بوٹ میں ایک قتل ہو گیا ہے۔''

قتل کا سنتے ہی بیل بوائے تیزی سے حرکت میں آیا اور اس نے کپتان کے کیبن کا دروازہ پیٹ ڈالا۔ کپتان باہر آیا اور مسٹر بون کی بات سنتے ہی اس نے اپنے دوسرے افسران کو جمع کرنے کا حکم دیا اور خود ان کے ساتھ کشتیوں والے حصے کی طرف روانہ ہو گیا۔ کپتان نے لاش کا معائنہ کیا اور اس دوران میں مسٹر بون پائپ سلگانے کی کوشش کرتے رہے۔ اس حصے میں ہوا کچھ زیادہ ہی تیز تھی اس لیے ان کی کوشش ناکام جا رہی تھی۔ کپتان لاش دیکھ کر ان کے پاس آیا اور پہلے تو تعارف کرایا گیا۔ پھر اس نے مسٹر بون اور جونی سے سوالات کیے۔ وہ یہ سن کر چونکا کہ مقتول کا قتل سے کچھ دیر پہلے ہی ایک نچلے درجے کے نوجوان سے جھگڑا ہوا تھا۔ اس دوران میں بوٹ کا دوسرا عملہ آ گیا اور لاش اٹھانے کے ساتھ کپتان نے ان کو سیلا اور اس نوجوان کو بھی لانے کا حکم دیا جس سے ایڈم کا جھگڑا ہوا تھا۔ پھر وہ مسٹر بون کی طرف متوجہ ہوا۔

''میں اس تعاون پر آپ کا شکر گزار ہوں لیکن کیا آپ میرے ساتھ چلنا پسند کریں گے؟''

''کیوں نہیں۔'' مسٹر بون نے اپنی جیبی گھڑی دیکھی۔ ''ابھی میرے سونے میں کچھ وقت ہے۔''

## پاکستان بچانے کا طریقہ

اشیا: ایک کلو سچائی، آدھا کلو اتحاد، آدھا کلو بھائی چارہ، آدھا کلو نیک نیتی، 250 گرام دیانت داری اور ڈھائی سو گرام خلوص۔

ترکیب: ان سب چیزوں کو خیالات کی ہانڈی میں ڈال کر ایمان کی آگ پر پکنے دیں۔ امن کے چمچے سے اس وقت تک ہلاتے رہیں جب تک اس میں سے انسانیت کی خوشبو نہ آنے لگے۔ جیسے ہی اس کی شکل حب الوطنی کی کھچڑی کی طرح آپس میں ملنے لگے تو یقین کیجیے کہ پاکستان بچ گیا اور بانی پاکستان کی یاد تازہ ہو گئی۔

پرہیز: دشمن پر اعتبار، لالچ کی مٹھاس، غصے کی مرچ، بے حیائی کا سرمایہ، ظلم کی انتہا، حسد کی آگ، جھوٹے وعدے، بے رحمی کی حد اور لوٹوں کا انتخاب۔

چکوال سے صبا مرزا اینڈ انفال مرزا کا نسخۂ کیمیا

کپتان جارج ان کو افسران والے لاؤنج میں لے آیا۔ کچھ دیر میں سیلا اور وہ نوجوان بھی وہیں آ گئے۔ نوجوان کو سیکنڈ کلاس کے بار سے لایا گیا تھا اور اس کی حالت بتا رہی تھی اس نے خاصی پی رکھی ہے۔ وہ اس طرح بلائے جانے پر کچھ فکر مند تھا۔ کپتان نے سیلا کی آمد سے پہلے اس سے کچھ سوالات کیے۔ سوالات کا مرکز اس کی گزشتہ ڈیڑھ گھنٹے کی مصروفیات تھیں۔ نوجوان کارمین بیراڈ کا کہنا تھا کہ وہ اس دوران میں ایک بار ہوا خوری کے لیے باہر نکلا تھا لیکن وہ زیادہ دیر باہر نہیں رہا تھا کیونکہ باہر بہت زیادہ سردی تھی۔ پھر کپتان نے ایڈم سے جھگڑے کی وجہ پوچھی۔

''ارے وہ... لڑکی شاید پاگل ہے، اس نے مجھے بالکونی میں آنے کا اشارہ کیا اور جب میں اس کے پیچھے گیا اور اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی تو پھر گئی۔ اس نے مجھے تھپڑ مار دیا پھر دوسرا تھپڑ مارا اور اس دوران میں اس کا بد معاش ساتھی آ گیا۔ تم دیکھ سکتے ہو اس نے میرا کیا حشر کیا ہے۔'' کارمین نے اپنے چہرے کی طرف اشارہ کیا۔

''اس لیے تم نے ایڈم کو قتل کر دیا۔'' کپتان نے سرد لہجے میں کہا۔

کارمین کو یہ الفاظ دھکے کی طرح لگے اور وہ لڑکھڑا کر ذرا پیچھے ہوا۔ اس نے بدحواسی میں کہا۔ ''قتل... میرے خدا بالکل نہیں۔''

''کسی نے ایڈم کو چاقو مار کر ہلاک کر دیا ہے۔''

کارمین کا چہرہ سفید پڑ گیا اسی دوران میں سیلا بھی وہاں آ گئی اور جب اسے ایڈم کی موت کا پتا چلا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے شک سے کارمین کی طرف دیکھا اور کپتان سے پوچھا۔ ''کیا اس نے ایڈم کو قتل کیا ہے؟''

''ابھی ہمیں کچھ نہیں معلوم ہے۔'' کپتان جارج نے جواب دیا۔

کپتان نے تفتیش کا معاملہ اپنے نائب کے سپرد کیا اور وہ سیلا اور کارمین سے سوال جواب کرنے لگا۔ مسٹر بون نے اپنا تحریری بیان دے دیا تھا، اس کے بعد انہیں اور جونی کو جانے کی اجازت مل گئی۔ جونی رکنا چاہتا تھا لیکن مسٹر بون نے اسے چلنے کا اشارہ کیا اور وہ بادلِ ناخواستہ ان کے ساتھ باہر آ گیا۔ اپنے کیبن کی طرف جاتے ہوئے جونی نے کہا۔ ''میں ان کی باتیں سننا چاہتا تھا۔''

''وہ سب بے کار کی باتیں ہیں برخوردار، تم نے دیکھا سیکنڈ آفیسر کتنے احمقانہ سوالات کر رہا تھا۔ وہ بھی اس قتل کے معمے کو حل نہیں کر سکے گا۔''

''آپ کے خیال میں ایڈم کو کس نے قتل کیا ہے؟''

''یہ سوال اتنا اہم نہیں ہے اصل چیز یہ ہے کہ اس قتل سے کون فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔''

''فائدہ؟'' جونی نے سوالیہ نظروں سے دادا کی طرف دیکھا۔ ''آپ کے خیال میں یہ قتل کسی فائدے کے لیے کیا گیا ہے؟''

''بالکل، میرا یہی خیال ہے۔''

''تب کارمین کے قاتل ہونے کا امکان کم ہے کیونکہ وہ صرف انتقام کے لیے ایڈم کو قتل کر سکتا ہے۔''

''بہ ظاہر ایسا ہی ہے لیکن یہ کہنا ابھی قبل از وقت ہوگا کہ کارمین قاتل نہیں ہے۔'' مسٹر بون نے کیبن میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ''اب اس معاملے کو صبح تک کے لیے اٹھا کر رکھا جائے تو بہتر ہوگا۔ آج ہم نے مصروف دن گزارا ہے اور میں تھکن محسوس کر رہا ہوں۔''

مسٹر بون نے کپڑے بدلے اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔ جونی کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر تو اپنے بیڈ پر بیٹھا رہا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ دادا گہری نیند سو گئے ہیں تو وہ خاموشی سے کمرے سے نکلا اور سیکنڈ کلاس کے عرشے پر آ گیا۔ اب وہاں سناٹا تھا اور ایڈم کے قتل سے مچنے والی ہل چل تھم گئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ سیلا ابھی تک واپس اپنے کیبن میں نہیں آئی ہوگی۔ وہ راہداری کے گوشے میں اس کا انتظار کرنے لگا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد وہ نمودار ہوئی۔ اس کی حرکت میں تیزی تھی اور شاید جلدی کی وجہ سے وہ جونی کو نہیں دیکھ سکی۔ وہ خود آگے بڑھا اور کیبن کے دروازے کے قریب اسے روک لیا۔ ''مس سیلا مورگن۔''

سیلا نے چونک کر اسے دیکھا اور رکھائی سے بولی۔ ''کیا چاہتے ہو تم؟''

''کیا ایڈم کا قاتل پکڑا گیا ہے؟''

''نہیں لیکن کپتان نے کارمین کو اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔'' وہ بولی اور اندر جانے لگی تو جونی نے اسے روک لیا، وہ جھنجلا گئی۔

''پلیز ابھی میرا موڈ نہیں ہے، میں بہت پریشان ہوں۔''

''میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔'' جونی نے کہا۔

''لیکن میں تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔''

''ٹھیک ہے... اس صورت میں مجھے کپتان سے بات کرنا پڑے گی اور یقین کرو وہ تمہیں ضرور بلائے گا۔''

سیلا اندر جاتے جاتے رک گئی۔ اس نے کچھ دیر سوچا اور پھر دروازے کھولتے ہوئے جونی کے لیے راستہ چھوڑ



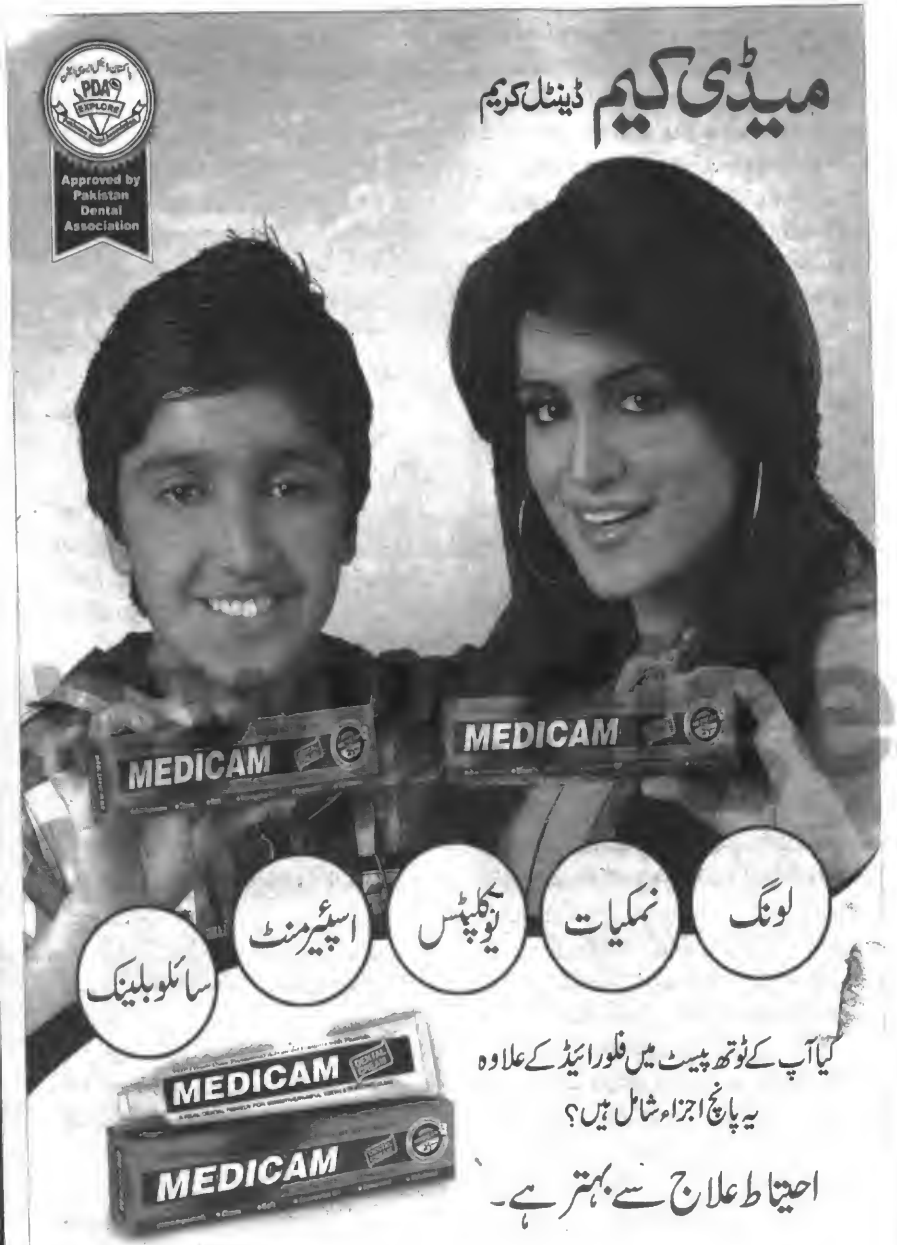

دیا۔ وہ اندر آیا، سیلا نے دروازہ بند کر دیا۔ یہ عام سا کیبن تھا، ایک چھوٹا سا بیڈ اور ایک طرف مختصر سی الماری تھی۔ اس کے ساتھ باتھ روم بھی نہیں تھا۔ سیلا نے اپنا سرخ کوٹ اتار کر کھونٹی پر ٹانگ دیا۔ نیچے اس نے پتلون اور اس کے ساتھ آدھی آستین کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ وہ جونی کی طرف مڑی اور اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولی۔

''کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''تم اور ایڈم دوست یا کسی تعلق کی وجہ سے نہیں بلکہ کسی مشترکہ مفاد کی وجہ سے اس بوٹ پر سوار ہوئے تھے، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

سیلا کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

''تمہارا تعلق یقیناً کسی اچھے خاندان سے ہے؟''

اس نے سر ہلایا اور کسی قدر تلخی سے بولی۔ ''میرا تعلق مشہور مورگن خاندان سے ہے اور میرا باپ جواہرات کی کانوں کا مالک ہے۔ میرے باپ کے پاس بھی ایک کان کے شیئرز تھے جو اس نے عیاشی میں اڑا دیئے۔ میں اپنی ماں کے ساتھ لندن میں رہی ہوں۔''

''ایڈم جرائم پیشہ تھا؟''

سیلا نے سر ہلایا۔ ''ہاں یہ بات چھپانے کا فائدہ نہیں ہے کیونکہ جلد کیپ ٹاؤن پولیس اس کے بارے میں تفصیلات مہیا کر دے گی۔''

''وہ چور تھا؟''

''ہاں۔''

''ہیرے چراتا تھا؟''

اس بار بھی سیلا نے مجبوراً سر ہلایا۔ ''ہاں لیکن تم یہ سب کیسے جانتے ہو؟''

''میں تمہیں بتا دوں گا مس مورگن لیکن ایک سوال کا جواب اور دے دو، کیا تم لوگ اس بوٹ پر ہیرے لے کر سوار ہوئے ہو؟''

سیلا اسے ایک ٹک دیکھ رہی تھی اور اس کی آنکھوں کی جھلملاہٹ بڑھ گئی تھی۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''جانسن تم مجھے اچھے لگے ہو، پلیز یہاں سے چلے جاؤ۔''

''اگر تم کہتی ہو تو چلا جاتا ہوں۔'' جونی دروازے کی طرف بڑھا اور اس نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا پھر پلٹ کر سیلا کی طرف دیکھا۔ ''ایڈم کو تم نے قتل کیا ہے۔''

یہ سوال نہیں تھا، جونی نے اسے بتایا تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ سیلا کے کیبن سے نکل آیا۔ جونی اپنے کیبن میں واپس آیا تو دادا جان بدستور خراٹے لے رہے تھے۔ اس نے کپڑے بدلے اور بستر میں گھس گیا۔ اگلی صبح ان کی آنکھ شور سے کھلی۔ جہاز رک گیا تھا اور تمام درجوں کے لوگ باہر نکل آئے تھے۔ مسٹر بون اور جونی بھی لباس بدل کر باہر آئے۔ پتا چلا کہ مس سیلا مورگن کے ساتھ جہاز کی ایک چھوٹی کشتی بھی غائب تھی اور اب سمندر میں ان دونوں کی تلاش جاری تھی۔

بوٹ اس وقت ننھے سمندر میں جنوبی افریقہ کی آخری بندرگاہ سے ذرا آگے موجود تھی۔ کپتان جارج خود موجود تھا۔ اس نے مسٹر بون کو دیکھا تو ان کی طرف آیا۔ اس نے معذرت خواہ لہجے میں کہا۔

''مسٹر گلیڈن میں کل رات آپ کو شناخت نہیں کر سکا تھا آپ کا تعلق یقیناً اس مشہور گلیڈن خاندان سے ہے جو گزشتہ چھ نسلوں سے قانون کا محافظ چلا آ رہا ہے۔''

''درست پہچانا مسٹر کپتان، لیکن میں ریٹائر ہو چکا ہوں اور میرے پوتے جانسن نے ابھی تک اپنے کیریئر کا فیصلہ نہیں کیا ہے۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے مسٹر گلیڈن اگر میں رات آپ سے مدد مانگ لیتا تو شاید وہ لڑکی فرار ہونے میں کامیاب نہ ہوتی۔''

''تمہیں افسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے فرار ہو کر پولیس کا کام آسان کر دیا ہے ورنہ وہ بوٹ پر رہتی تو اس کے خلاف شبہ تو کیا جا سکتا تھا لیکن کوئی ثبوت نہیں تھا کہ اپنے ساتھی کو اسی نے قتل کیا ہے۔''

کپتان جارج نے غور کیا اور پھر اس سے اتفاق کیا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مسٹر گلیڈن... لڑکی نے بہت ہوشیاری سے سارا منصوبہ بنایا اور اس پر عمل کیا لیکن وہ فرار کیوں ہوئی؟''

''شاید وہ خوف زدہ تھی کہ کوئی اس کا جرم پکڑ سکتا ہے۔'' مسٹر بون نے جونی کی طرف دیکھا۔ ''اس سے پہلے کہ وہ قانون کی گرفت میں آتی اس نے فرار میں عافیت بھی ہوگی۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' کپتان جارج نے سمندر سے واپس آنے والی موٹر بوٹس کی طرف دیکھا۔ ''وہ نہیں ملی ہے شاید ہمیں ایک گھنٹے میں یہاں سے روانہ ہونا پڑے۔''

کپتان جارج کے واپس جانے کے بعد مسٹر بون اور جونی کسی قدر ویران گوشے میں آ گئے۔ مسٹر بون نے کہا۔ ''تم رات کو کچھ دیر کے لیے باہر گئے تھے؟''

''آپ جاگ رہے تھے؟''

''نہیں بس ایک لمحے کے لیے آنکھ کھلی تھی۔ میں نے



دیکھا تم اپنے بستر پر نہیں ہو۔''

جونی نے اعتراف کر لیا۔ ''میں سیلا سے ملنے گیا تھا لیکن آپ اس سے کوئی غلط مطلب مت نکالیے گا، میں اس سے صرف بات کرنے گیا تھا اور بات کر کے فوراً واپس آ گیا تھا۔''

''تم نے اس کا جرم پکڑ لیا تھا؟''

''ہاں... اس نے کئی ایسی حرکتیں کیں جن سے وہ مشکوک ہو گئی تھی۔ اول اس نے پہلے مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی لیکن فوراً ہی اسے احساس ہو گیا کہ میں اس کا مطلوبہ لڑکا نہیں ہوں اس لیے وہ مجھ سے دور ہو گئی۔''

''اس کا مطلوبہ لڑکا کارمین تھا؟''

''بالکل وہ اس کے مطلب کا لڑکا تھا وہ اس پر آسانی سے ایڈم کے قتل کا شبہ ڈال سکتی تھی۔ اس کا مقصد خود کو شبے سے بالاتر رکھنا تھا۔''

مسٹر بون نے ستائشی انداز میں سر ہلایا۔ ''تم نے بالکل درست رائے قائم کی۔''

''لیکن اس قتل کو ثابت کرنا بہت مشکل تھا۔ کوئی گواہ نہیں تھا اور مجھے یقین ہے چاقو پر انگلیوں کے نشانات بھی نہیں ہوں گے، نیز کوئی اس چاقو کا تعلق سیلا سے ثابت نہیں کر سکے گا، میرا اندازہ ہے یہ کچن سے چرایا گیا ہوگا۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے برخوردار۔''

''اب ایک ہی طریقہ رہ گیا تھا کہ متوقع قاتل پر شبے کا اظہار کر دوں اگر اس کے دل میں چور ہوگا تو وہ فرار کی کوشش کرے گا اور ایسا ہی ہوا سیلا نے محسوس کر لیا کہ اسے گرفتار کیا جا سکتا ہے اس لیے اس نے فرار ہونے میں دیر نہیں کی۔ مجھے یقین ہے جلد یا کسی قدر دیر سے وہ پولیس کی گرفت میں آ جائے گی۔''

''ایسا ہی ہوگا میرے بچے... کوئی مجرم قانون سے زیادہ دیر چھپ نہیں سکتا ہے۔'' مسٹر بون نے یقین سے کہا۔

''میرا خیال تھا کہ تمہیں اپنے خاندان کے پیشے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے لیکن تم نے ثابت کر دیا ہے تم میں اپنے آباؤ اجداد کی ذہانت اور دلچسپی موجود ہے۔''

''جی دادا جان میں نے ہائی اسکول میں فیصلہ کر لیا تھا کہ میں پولیس میں جاؤں گا۔'' جونی نے کہا تو مسٹر بون کھل اٹھے۔ انہوں نے محبت سے پوتے کو گلے لگا لیا۔

''ویسے میں نے کیا کہا تھا عورت کی خطرناکی کا اندازہ اس کی عمر سے نہیں لگانا چاہیے۔''

جونی نے کچھ نہیں کہا، وہ مسکرا دیا۔ دادا اور پوتا اوپری گزشے کی طرف بڑھ گئے۔


دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 6,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 5,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں، ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جا سکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر میں نقد ادائیگی کر کے رسید حاصل کر سکتے ہیں

رابطہ: شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35802551 فیکس: 35895317

پہلا رنگ

# لمحے کا فیصلہ

احمد اقبال

تلاش وجستجو زندگی کی ہمہ رنگی کو تروتازہ اور رواں دواں رکھتی ہے... یوں تو ہر شخص کی زندگی کسی نہ کسی محور و مرکز کی جستجو میں رہتی ہے... مگر وہ اپنی کھوئی ہوئی متاع جاں کی تلاش میں بھٹک رہا تھا... اس کی یادیں اسے کسی پل چین نہیں لینے دیتی تھیں... وہ عمر کی تمام تر نقدی گم گشتہ یادوں کے طلسم کدہ میں گنوا بیٹھا...

**حسن وذہانت کی یکجائی کا شاخسانہ جس نے فرزانگی کو دیوانگی میں بدل ڈالا**

محبت کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے اور صرف ایک بار ہوتی ہے... اس قسم کے زبانی دعوے کرنے والوں میں اکثریت ان لوگوں کی ہوتی ہے جن کا اگر ہر ہفتے کوئی نیا اسکینڈل سامنے نہ آئے تو انہیں فکر لاحق ہو جاتی ہے کہ شاید ان کے پرستاروں میں کمی آگئی ہے۔ چنانچہ ایک شیڈول کے مطابق وہ ہر سہ ماہی میں ایک سچی محبت ضرور کرتے ہیں۔

اکثریت بہرحال میرے جیسے احمقوں کی ہے جو اس پہلی لڑکی کے دام نکاح میں گرفتار ہو جاتے ہیں جو ان کی زندگی میں بالکل ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرح آتی ہے اور ان کی ہر چیز پر غاصبانہ قبضہ کر لیتی ہے۔ عقل و ہوش... قوتِ فیصلہ... حواسِ خمسہ... دوست احباب... خاندانی رشتے اور دین و دنیا... اس حقیقت کا انکشاف بہت دیر سے ہوتا ہے کہ جب محبوبہ کی ڈولی اٹھتی ہے تو محبت کا جنازہ اٹھتا ہے۔

شامتِ اعمال مجھے بھی کشمیر کے ایک دور افتادہ قصبے میں لے گئی جہاں میں نہایت قلیل تنخواہ پر علم کی دولت بچوں میں تقسیم کرتا تھا۔ بہت محتاط رہنے کے باوجود میری نظر ایک نہایت روایت پرست اور تنگ نظر قبیلے کے سردار کی لڑکی سے لڑ گئی۔ قصور میرا نہیں تھا۔ اس کا بڑا بھائی میرا شاگرد تھا اور نالائقی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ اپنی انتہائی کوشش کے باوجود میں کسی گدھے کو انسان بنانے پر قادر نہیں تھا۔ اس کے والد ماجد نے جو قبیلے کے سربراہ تھے، قصوروار مجھے ٹھہرایا کہ میں نے اسے پوری توجہ نہیں دی۔ ان کا برخوردار کند ذہن ہو... ناممکن... حکم ہوا کہ میں ہر شام اسے ڈیرے پر آکے ٹیوشن پڑھاؤں۔

اس سے فائدہ کچھ نہیں ہوا۔ ہاں مغرب کے بعد دو گھنٹے حویلی میں سر کھپانے کے عوض مجھے پُرتکلف چائے اور پھر رات کا کھانا ملنے لگا اور میری تعظیم میں اضافہ ہوا کیونکہ میرا آنا جانا حویلی میں تھا... لیکن اس کے بعد وہ ہوا جو میرے لیے غیر متوقع ضرور تھا مگر ناممکن نہیں تھا۔ سردار کی حسین و جمیل بیٹی نے مجھے پردے کے پیچھے سے دیکھا اور پھر اپنی جھلک دکھلائی۔ اس کے بعد ہماری محبت نہایت فلمی انداز میں پروان چڑھی۔ قیمتی کتابوں میں رقعے اِدھر سے اُدھر گئے۔ پھر چوری چھپے ملاقاتوں کی نوبت آئی۔ خاندانی طور پر اس کی نسبت اپنے عم زاد سے طے تھی جو عمر میں اس سے دگنا تھا۔ خوفناک داڑھی مونچھوں کا مالک تھا اور اعلیٰ تعلیم یافتہ یعنی بری طرح فیل تھا جبکہ لڑکی نے میٹرک پاس کیا تھا۔

موقع پاتے ہی ہم فرار ہو گئے۔ عقل مندی میں نے یہ کی کہ اپنے کسی دوست کو شریک راز نہیں کیا اور نہ اپنے گھر



والوں کو بتایا۔ ہمارے پاس میٹرک کی سند ہماری بلوغت کا ثبوت تھی۔ ایک نکاح خواں نے خاصی بڑی رشوت لے کر ہمارا نکاح رجسٹر کیا اور ہم نے یہ نکاح نامہ اپنی اپنی بلوغت کی اسناد کے ساتھ ایک مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر کے قانونی تحفظ حاصل کیا اور پھر روپوش ہو گئے۔ ہمیں معلوم تھا کہ قانونی تحفظ کی اہمیت صرف کاغذی ہے۔ لڑکی کا باپ اس ڈیتھ اسکواڈ کی قیادت کر رہا تھا جس میں اس کا سابق منگیتر اور بڑا بھائی سب شامل تھے۔ ان کے پاس کلہاڑیاں، کلاشنکوف تک ہمارے قتل کے سب اسباب تھے۔

ایک سال تک ہم خوف سے اپنے ٹھکانے بدلتے رہے۔ آج اس شہر میں تو مہینہ بھر بعد دوسرے شہر یا قصبے میں نام بدل بدل کے رہائش اختیار کرتے رہے۔ ظاہر ہے ان حالات میں جو کام میں نے کیا، عارضی تھا اور درحقیقت وہی سرمایہ ہمارے کام آرہا تھا جو ہم ساتھ لائے تھے۔ کفایت شعاری کے باوجود یہ کم ہو رہا تھا۔

یہ کہنے کی بات نہیں، سمجھنے کی بات ہے۔ ان حالات میں فلموں... اور کہانیوں کی وہ محبت کیسے زندہ رہ سکتی تھی جس میں مرد آسمان کے تارے توڑ کر مانگ میں سجانے کی بات کرتا ہے تو عورت جھونپڑی میں محل کی خوشیاں دیکھتی ہے... ہم مسلسل فرار سے عاجز آگئے تھے... مستقبل کے اندیشوں

میں مبتلا تھے اور بات بات پر لڑنے لگے تھے۔ دستِ تہِ سنگ آمد، پیمانِ وفا ہے۔ فیض کے اس مصرعے کے مطابق اب محبت ایک مجبوری تھی۔ وہ ہتھکڑی تھی جس نے ہم دونوں کو جکڑ رکھا تھا لیکن اس کی چابی کہیں کھو گئی تھی۔

ان دنوں ہم شہر سے باہر فلیٹوں کے ایک ایسے کمپلیکس میں مقیم تھے جہاں ہنوز آبادی کے آثار مفقود تھے۔ پچاس فلیٹوں کے اس بلاک میں مشکل سے پانچ آباد تھے۔ ظاہر ہے وہ ہم جیسے مجبور لوگ تھے۔ بجلی، پانی، گیس کی سہولت تھی مگر قریب ترین ٹرانسپورٹ کے لیے ایک میل دور جانا پڑتا تھا۔ وہ بھی کچے راستے پر چل کے۔

مسافرت کے یہی ایام تھے جب میری سابق محبوبہ اور موجودہ گھر والی نے مجھے یہ روح فرسا خبر سنائی کہ وہ مجھے محبت کی پہلی ٹرافی عطا کرنے والی ہے... اس کا دل رکھنے کے لیے میں نے والہانہ بلکہ والدانہ خوشی کا اظہار حلق سے بطخ جیسی آوازیں نکال کے اور وحید مراد اسٹائل میں بیوی کو اٹھا کے گول گول رقص بھی کیا اور وہ شرمائی بھی... مگر اس کے بعد مسائل میں نئے مسائل کا اضافہ ہوا جو بیوی کے حجم کے ساتھ بڑھتے گئے۔

اس بستی میں بہت سی عمارات بڑی سست روی سے زیرِ تکمیل تھیں... کام کرنے والے مزدور بھی انہی میں رہائش پذیر تھے چنانچہ ایک کیفے ڈی پھونس وجود میں آ گیا تھا۔ ایک عمارت کے گراؤنڈ فلور میں رہنے والے نے باہر والے کمرے میں آٹا، چاول، دال مسالے رکھ کے باہر بقلم خود لکھ دیا تھا سپر گرینڈ جنرل اسٹور... کبھی کبھی ایک گوشت فروش تخت پر بکرے لٹکائے نظر آ جاتا تھا... اچھی بات مجھے صرف یہ لگی کہ میری بلڈنگ کے گراؤنڈ فلور پر ''شانِ خدا میٹرنٹی ہوم'' موجود تھا۔ دو میں سے ایک کمرے کو جنرل وارڈ کا نام دے دیا گیا تھا۔ لیبر روم ساتھ ہی کچن میں تھا۔ ایک ٹن کی ڈریکولا ٹائپ لیڈی ڈاکٹر دوسرے کمرے میں اپنے ڈھائی کلو کے نحیف و نزار شوہر نامدار کے ساتھ رہتی تھی جو اس کا اسسٹنٹ بھی تھا۔ مجھے عورت کے ڈاکٹر ہونے پر شک تھا جو جائز تھا۔ بعد میں ثابت ہوا کہ وہ ایک برطرف شدہ مڈوائف تھی... لیکن میں اس کی کوالی فکیشن کو چیلنج کرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ وہ مجھ سے میرا شناختی کارڈ یا ہمارے شادی شدہ ہونے کا ثبوت مانگ لیتی تو ہماری اصلیت سامنے آ جاتی۔ ہم جہاں رہتے تھے ایک نئے فرضی نام کا استعمال کرتے تھے۔

پھر اچانک ایک روز میں نے ایک شخص کو اپنے پڑوس والے فلیٹ کا دروازہ کھولتے دیکھا۔ میں نے فوراً اسے جا لیا۔

مسکراتے ہوئے میں نے اپنا ہاتھ بڑھا کے کہا۔ ''ہیلو! میں ڈاکٹر علی رضا ہوں... آپ کا پڑوسی۔''

وہ چونک کے پلٹا اور مشتبہ نظروں سے میرا جائزہ لے کر بولا۔ ''تم... ڈاکٹر ہو؟'' اور مجھ سے ہاتھ ملائے بغیر اندر گھس کے اپنا دروازہ بند کر لیا... میں نے سخت خفت محسوس کی۔

پڑوس آباد ہونے کی ساری خوشی خاک میں مل گئی، میں نے اپنی اس بے عزتی کا اپنی بیوی سے ذکر تک نہیں کیا۔ مجھے اس کا موقع ہی نہیں ملا کیونکہ میرے گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے مجھے مطلع کیا کہ اسے دوپہر سے درد اٹھ رہے ہیں۔ غالباً وقت آ گیا ہے کہ میں اسے نیچے لے جا کے شانِ خدا میٹرنٹی ہوم میں داخل کرا دوں۔

اسے ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔ شام کو میں اسے سہارا دے کر نیچے لے گیا اور اس خوفناک خاتون کے سپرد کر دیا جو خود کو لیڈی ڈاکٹر کہتی تھی۔ اس نے معائنے کے بعد تصدیق کر دی کہ وہ شبھ گھڑی آ گئی ہے جس کا مجھے یقیناً بے چینی سے انتظار تھا اور اللہ نے چاہا تو صبح تک میں کم سے کم ایک بچے کا باپ ضرور بن جاؤں گا۔

اس رات میں اکیلا تھا اور غالباً خوش بھی تھا کہ میری کوئی کوشش تو کامیاب ہوئی۔ تنہائی میں دل کے بہلانے کو بہت سے خیالات آ رہے تھے جو خوابِ حسرت کی طرح تھے مثلاً یہ کہ دروازے پر دستک ہو اور میں جا کے دیکھوں تو ماہ نور بلوچ اپنی ساحرانہ ادائے دلبری اور ہوشربا ملبوس میں مجسم دعوت نامہ بنی کھڑی ہو... اس وقت اچانک دستک ہوئی تو میں اچھل پڑا۔ خوابوں کو یوں تعبیر مل سکتی تو پھر ماہ نور ہی کیوں... میں کترینہ کیف کا تصور کرتا... اس خیال سے میرا دل بیٹھ گیا کہ یہ شان خدا میٹرنٹی ہوم والی نہ ہو جو اپنی صورت کو مزید بگاڑ کے شہرۂ آفاق ڈائیلاگ بولے کہ... ہم ماں اور بچے میں سے ایک کی جان بچا سکتے ہیں... یا کہے کہ مبارک ہو آپ نے تو چوکا مار دیا ہے۔

میں نے دروازہ کھولا تو وہ مجھے دھکیلتا ہوا سیدھا اندر آ گیا۔ یہ میرا نیا پڑوسی تھا جس نے کچھ دیر پہلے سخت بداخلاقی کا مظاہرہ کیا تھا... کسی تمہید کے بغیر اس نے کہا۔ ''مجھے تم سے اکیلے میں کچھ بات کرنی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''اس وقت گھر میں میرے سوا کوئی نہیں ہے لیکن پہلے تم اپنا تعارف تو کرا دو۔''

وہ ایک کرسی پر بیٹھ کے مجھے گھورنے لگا۔ ''تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا... نہ تم ڈاکٹر ہو اور نہ تمہارا نام علی رضا ہے؟''

زمین میرے پیروں کے نیچے سے نکل گئی لیکن میں اعتماد کے ساتھ کھڑا رہا۔ ''کون الو کا پٹھا کہتا ہے؟''

''ایک شخص آیا تھا اس کے موڈ سے اندازہ ہوتا تھا کہ تم اسے مل جاتے تو وہ ضرور تمہیں قتل کر دیتا۔''

میں نے ہکلا کے کہا۔ ''مگر کیسے... میرا مطلب ہے... کیوں؟''

اس نے مجھے گھورنا جاری رکھا۔ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ اس وقت تم اپنی بیوی کو لے کر نیچے گئے ہوئے تھے۔ شان خدا میٹرنٹی ہوم میں... تمہارے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ وہ دروازہ کھلا دیکھ کے میرے فلیٹ میں گھس آیا اور چلانے لگا۔ ''اوئے غلام علی بے غیرت... سامنے آ... کدھر چھپ گیا ہے؟''

''ک... کو... کون تھا وہ؟'' میرے حلق سے بیٹھی ہوئی آواز نکلی۔

میری حالت سے اس نے تیر کے نشانے پر لگنے کا اندازہ کر لیا۔ وہ مسکرایا اور اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ ''میں ڈاکٹر شیرازی ہوں۔ آغا سلطان شیرازی... سب مجھے ڈاکٹر شیرازی کہتے تھے... میرا مطلب ہے کہتے ہیں... میں ایک نامور سرجن ہوں۔''

''ڈاکٹر شیرازی؟'' میں اسے دیکھتا رہا۔ ویسی ہی شک بھری نظر سے جیسے اس نے مجھے دیکھا تھا۔

''تمہیں یقین کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ دراصل اس وقت میرا حلیہ کچھ ایسا ہے اور تم خود بھی ڈاکٹر نہیں ہو... ہر سینئر ڈاکٹر سرجن اور اسپیشلسٹ میرے نام سے واقف ہے۔''

میں نے کہا۔ ''وہ... وہ کون تھا جس کی تم بات کر رہے تھے؟''

وہ بولا۔ ''گھبراؤ نہیں... میں نے اسے کچھ بھی نہیں بتایا۔''

''اس کا نام... اور حلیہ...؟''

وہ بولا۔ ''وہ تھا کوئی چھ فٹ قد کا... ڈاکوؤں جیسی گھنی داڑھی اور مونچھیں... خون اس کی آنکھوں میں اترا ہوا تھا اور اس نے اندر آنے کے بعد ایک خطرناک ریوالور بھی نکال لیا تھا مگر میں نے اس کو ڈانٹا کہ تم کون ہو جو میرے گھر میں اس طرح گھس آئے ہو... جانتے نہیں میں کون ہوں؟ میری دھمکی سے وہ کچھ گھبرایا اور اس نے ریوالور جیب میں ڈال کے کہا۔ معاف کرنا... مجھے پتا چلا تھا کہ وہ سور کا تخم ادھر رہتا ہے۔ میں نے اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے بیٹھنے کو کہا اور پوچھا کہ تم کس کو قتل کرنے آئے تھے؟ وہ بولا کہ اسی کو جو میری گھر والی کو بھگا کے لے آیا ہے۔''

''حرامزادہ... جھوٹ بولا اس نے۔''

ڈاکٹر شیرازی مسکرایا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تم اسے جانتے ہو... وہ تمہاری ہی تلاش میں تھا۔ تم اس کی بیوی کو بھگا کے نہیں لائے؟''

''لاحول ولاقوۃ... کیا میں صورت سے ایسا لگتا ہوں اور پھر مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں ایسے خطرناک آدمی کی بیوی کو بھگا کے مروں... یہ سو فیصد میری اکلوتی... قانونی اور شرعی بیوی ہے۔''

''آخر کوئی بات تو ہوگی؟''


فرح ناز کا شعری مجموعہ

خزاں میں پھول



کتابی شکل میں شائع ہوگیا ہے

ملنے کا پتا:

حسین نیوز ایجنسی کراچی فون: 021-32763140

احمد حسین نیوز ایجنسی لاہور فون: 042-37352265

اشرف نیوز ایجنسی راولپنڈی فون: 051-5531610

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

''بات... بات کیا ہو سکتی ہے... یہ ہو سکتا ہے کہ وہ میری بیوی کا سابقہ منگیتر ہو... اس کے چاچے دا پتر... لیکن وہ بکواس کرتا ہے اگر ایسا کہتا ہے... اس کی کوئی باقاعدہ منگنی نہیں ہوئی تھی ممکن ہے خود وہ ایسا چاہتا ہو یا کوئی بات ہوئی ہو خاندان میں۔''

''میں سمجھ گیا... تمہیں... پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس نے پوچھا کہ یہ فلیٹ نمبر گیارہ ہے... میں نے کہا کہ ہاں... لیکن یہاں تو میں رہتا ہوں سال بھر سے... وہ بے وقوف آدمی چکر میں آگیا... بولا کہ کسی نے غلط بتایا مجھے... تمہارا پڑوسی کون ہے... میں نے کہا کہ کوئی بھی نہیں... ساتھ والے دونوں فلیٹ خالی پڑے ہیں۔ اس نے کہا کہ اچھا غلطی ہوئی معاف کرنا... آج وہ مل جاتا تو اس کی لاش پڑی ہوتی ادھر... خیر، میں بھی ہمت ہارنے والا نہیں ہوں... سال بھر سے ان کی تلاش میں ہوں... جہاں ملے دونوں کو گولی مار دوں گا۔ میں نے کہا کہ تمہاری جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا۔ اس لیے تمہاری غیرت کو للکارا ہے... مجھے بتاؤ کہ وہ کہیں نظر آئے یا اس کے بارے میں کوئی اطلاع دینی ہو تو کہاں دی جائے۔ اس نے کہا کہ میرا نام لکھ لو... اور موبائل فون نمبر... بس اپنا نام بتا کے بولنا کہ شکار مل گیا ہے... میں آجاؤں گا... احمق آدمی نے مجھ سے میرا نام پوچھا ہی نہیں اور چلا گیا...'' اس نے کاغذ کے ایک پرزے کو میری ناک کے سامنے لہرایا۔ ''یہ ہے اس کا نام اور نمبر۔''

اب اعترافِ جرم کے سوا چارہ نہ تھا۔ میں نے کہا۔ ''تھینک یو ویری مچ ڈاکٹر شیرازی... آپ نے میری جان بچالی۔ یہ آپ کا احسان ہے۔ میں آپ کو سب کچھ بتا دیتا ہوں لیکن پہلے بتائیں آپ کیا پئیں گے؟''

''اگر کافی ملے تو... بلیک...''

''نو پرابلم... میں بہت اچھی کافی بناتا ہوں۔ اس کے بعد ہم اطمینان سے بیٹھ کے باتیں کر سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

اس نے میری ساری بات توجہ سے سنی لیکن بعض اوقات مجھے یوں لگتا جیسے وہ ذہنی طور پر غیر حاضر ہے... بالآخر میں نے پوچھ لیا۔

''میں نے اپنے بارے میں تمہیں سب کچھ بتا دیا... کیونکہ تم نے میری مدد کی تھی، اب تمہاری باری ہے... ابھی تک میں سمجھ نہیں پایا کہ تم کیا ہو؟ کیا وہ سب سچ ہے جو تم نے اپنے بارے میں کہا؟''

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''میری بھی ایک ایسی ہی کہانی ہے۔ شاید ہم ایک ہی کشتی کے دو مسافر ہیں۔''

میں کچھ نروس ہوا۔ ''کیا مطلب ہے آخر اس بات سے تمہارا؟''

''میں فارسی تو نہیں بول رہا ہوں... ہمیں اس مشکل وقت میں ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیے۔''

میں نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ ''یعنی تم بھی میری طرح کسی مشکل میں ہو مان لیا تم نے؟''

''ہاں... اگر ایسا نہ ہو، تو کیا میں یہاں تمہارا پڑوسی ہوتا... میری کوٹھی ہے کراچی میں اور میں ایک بہت بڑے اسپتال میں شام کے وقت کلینک بھی کرتا تھا۔ وہ اسپتال کلفٹن میں ہے اور یونیورسٹی بھی ہے۔ تمہارے پاس میں اسی لیے آیا ہوں کہ مجھے تمہاری مدد چاہیے۔''

''میرے حالات سے واقف ہونے کے بعد... اس سے پہلے میں نے تم سے پڑوسی بن کے بات کرنے کی کوشش کی تھی تو تم نے مجھے منہ نہیں لگایا۔''

''دیکھو، تمہاری طرح میں بھی مجبور ہوں۔''

''تم مجھے بلیک میل کرنے آئے ہو؟''

وہ سر ہلانے لگا۔ ''ہرگز نہیں... ایک مجبور اگر دوسرے مجبور کے کام آئے۔''

''ڈاکٹر شیرازی! مجھے ایک سال ہو گیا۔ میں دربدر ہوں پہلے چھ مہینے تو خوف سے ہمارا یہ حال تھا کہ ہم ایک مہینے سے زیادہ تک کسی ایک شہر میں نہیں گزار سکتے تھے۔ ہماری زندگی ایک مسلسل فرار تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ میری بیوی کا قبیلہ جس کا سردار اس کا باپ ہے ہمارے تعاقب میں ہوگا۔ کسی نے ہمیں کہیں بھی دیکھ لیا۔ وہ اپنے سردار کو مطلع کیے بغیر خود بھی ہمیں مار دے گا۔ ان کے نزدیک ہم کارو اور کاری تھے۔ چھ مہینے بعد ہم کراچی آگئے اور یہاں کے مضافات میں کرائے پر رہے۔ کبھی کسی فلیٹ میں تو کبھی جھگی میں... کراچی ہر سمت سے آئے ہوئے انسانوں کا ایک سمندر ہے۔ یہاں ہر قوم اور ہر ملک کا ہر زبان بولنے والا آباد ہے... پاکستان کے ہر صوبے سے پٹھان، پنجابی... سرائیکی... سندھی اور بلوچی ہی نہیں... یہاں کثیر تعداد میں بنگالی اور بہاری ہیں... برما کے اور گوا کے لوگ ہیں... پارسی اور عیسائی ہیں... یہاں کے مضافات... کچی آبادیاں اور ناجائز طور پر تعمیر کردہ بستیوں میں رہنے والوں کی تعداد کل آبادی کا نصف نہیں تو ایک تہائی ضرور ہوگی... ڈیڑھ کروڑ



میں کم سے کم پچاس لاکھ بے نام و نشان ہیں... ان میں ہمیں تلاش کرنا اتنا ہی مشکل ہوگا جتنا بھوسے کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنا... اب ہم نے یہ فلیٹ بھی شہر سے باہر لیا تھا۔ ایک تو اس کا کرایہ بہت کم تھا۔ دوسرے یہاں کسی کے ہماری تلاش میں پہنچنے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ کراچی میں چھوٹے بڑے فلیٹوں کی تعداد اگر لاکھوں میں نہیں تو ہزاروں میں ضرور ہے اور ان میں بسنے والے ایک دوسرے کے لیے ہمیشہ اجنبی ہی رہتے ہیں خواہ انہیں ساتھ رہتے ہوئے دس سال ہو جائیں... اسی آسرے پر ہم نے چھ ماہ اس جگہ گزار دیے۔''

''لیکن خوف نے تمہارا پیچھا نہیں چھوڑا؟''

''ہاں اور دیکھ لو... پیچھا کرنے والے بالآخر یہاں بھی پہنچ ہی گئے۔ میرا خیال تھا کہ ایک سال ہو گیا... ممکن ہے وہ ہمیں بھول گئے ہوں لیکن دیکھ لو... وہ یہاں بھی پہنچ ہی گئے۔ قسمت نے ساتھ دیا ورنہ آج ہم مارے جاتے۔ میرے گھر والے تو شاید ہمیں معاف بھی کر دیں یا عاق کر کے مطمئن ہو جائیں... لیکن میری بیوی کا باپ اور اس کا منگیتر ملک الموت بنے پھر رہے ہیں۔ وسائل ہوتے تو ہم اس ملک سے بھی نکل جاتے۔ اب دیکھو اس عشق کا انجام کیا ہوتا ہے۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''میرا تو کچھ نہیں رہا دوست... ایک عورت کے عشق نے میرے جیسے ڈاکٹر کا یہ حال کر دیا جو تم دیکھ رہے ہو۔''

''مگر یہاں تم اکیلے ہو... وہ عورت کہاں ہے؟''

''میں بتاتا ہوں... میرا یہ حال ایک بار نہیں دو بار ہوا۔''

میں نے ڈائیلاگ مارا۔ ''محبت تو بس ایک ہی بار ہوتی ہے۔''

''سچ ہے... یہ بھی ایک ہی محبت تھی جو ایک ہی عورت سے دو بار ہوئی لیکن دونوں بار یک طرفہ رہی... صرف میری طرف سے... مسکراؤ نہیں... ایک عورت نے کیا حال کر دیا ہے تمہارا... دھوبی کا کتا بنا دیا ہے تمہیں، نہ گھر کا نہ گھاٹ کا... برطانیہ کا ایک بادشاہ تھا ایک معمولی عورت کے لیے اس نے تخت چھوڑ دیا تھا جو دو بار کی طلاق یافتہ تھی۔ تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے... یہ سب تو قصے ہیں... لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کے۔''

میں نے سر ہلا کے اس کی تائید کی۔ ''بالکل ٹھیک کہا تم نے عورت سب کچھ کر سکتی ہے... اور کرا بھی سکتی ہے۔''

''جب میں میڈیکل کے فائنل ایئر میں تھا تو کم سے کم ایک درجن کلاس فیلوز... ہونے والی ڈاکٹرز میرے چکر میں تھیں۔ میں نے ان سے شادی کے جھوٹے وعدے کیے اور جب انہوں نے خود کو میرے حوالے کر دیا تو میں مکر گیا... صرف یہی نہیں میرے دوسرے کلاس فیلوز بھی محبت کے نام پر یہی کھیل کھیلتے تھے۔ صرف لڑکیاں گھر بسانے کے چکر میں ماری جاتی تھیں۔ لڑکے شادی کا سوچتے بھی نہیں تھے اور وہ اچھے عزت دار گھروں کی اچھی لڑکیاں تھیں... مگر لڑکے کرتے ہیں دل لگی اور لڑکیاں بنا لیتی ہیں دل کی لگی... پتا نہیں انہیں اتنا شوق کیوں ہوتا ہے گھر بسانے کا... لڑکے اس جھمیلے سے بھاگتے ہیں۔ نرسوں کی تو بات ہی مت پوچھو۔ وہ ہر بننے والے ڈاکٹر پر ڈورے ڈالتی ہیں۔ شہد کی مکھیوں کی طرح چمٹتی ہیں اور یہ جانتے ہوئے کہ کامیابی کے مقابلے میں ناکامی کے امکانات بہت زیادہ ہیں... پھر بھی وہ جال پھینکتی ہیں اور کچھ کسی ڈاکٹر کو پھانس بھی لیتی ہیں... کہنے کا مطلب یہ ہے دوست... کہ ایسے عشق کے تجربات تو بہت کیے... اللہ معاف کرے... میں کوئی اناڑی نہیں تھا... پروفیشنل

بذریعہ ڈاک
خواتین و حضرات گھر بیٹھے داخلہ لیں

| | | | |
|---|---|---|---|
| انگلش لینگویج کورس | ایئر ہوسٹیس | ہوم اکنامکس | بیوٹی پارلر کورس |
| ریفریجریشن ایئر کنڈیشننگ | ایئر ٹکٹنگ | بوتیک فیشن | آنکھوں کی نرسنگ |
| ریڈیو ٹی وی ایئر کنڈیشن مکینک | الیکٹریشن | ڈرافٹس مین | الیکٹرانک مکینک |
| اسکول ٹیچنگ میتھڈ | صحافت | فوٹو گرافی | انٹیریئر ڈیکوریشن |
| ہومیوپیتھک ڈاکٹر | شمسی توانائی | مہر سازی | سلمنگ بیوٹی |
| مولوی فاضل | لائبریرین | کمپیوٹر | کوکنگ بیکنگ |
| ایگریکلچر | میڈیکل لیب | آئل پینٹنگ | ڈینٹل ٹیکنیشن |
| پولٹری ڈیری فارمنگ | ٹی وی ریپئرر | فلاور میکنگ | پبلک ہیلتھ انجینئر |

اسلام آباد اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر 1237
جی پی او اسلام آباد

کھلاڑی تھا مگر ہر فرعون راموسیٰ... ایک لڑکی بلکہ شادی شدہ عورت نے میرا یہ حال کر دیا۔''

☆☆☆

''میں نے ہاؤس جاب مکمل کر لیا تھا اور اس زمانے میں نوکری کر رہا تھا... اسپتال ایک بہت بڑے ڈاکٹر کا تھا جس نے اپنی کاروباری ذہانت سے کام لیتے ہوئے اپنے اسپتال کو کسی فائیو اسٹار ہوٹل سے زیادہ منافع بخش بنا لیا تھا۔ جنرل وارڈ... سیمی پرائیویٹ اور پرائیویٹ وارڈ کے علاوہ اس نے وی آئی پی روم الگ بنا رکھے تھے۔ اسپتال ہمیشہ مریضوں سے بھرا رہتا تھا۔ شام کو شہر کے بہت سے نامی گرامی ڈاکٹرز او پی ڈی میں بیٹھتے تھے تو وہاں بھی بہت رش ہوتا تھا۔ وہاں میرے جیسے نوآموز کی بھلا کیا حیثیت ہوتی۔ میرے جیسے تنخواہ داروں کو وارڈ میں آرایم او بنا دیا جاتا تھا۔ ڈیوٹی بھی دن میں تو کبھی رات میں۔ تنخواہ کسی کلرک کے برابر... ڈنڈے داری ڈاکٹر کی... ہر مریض کے لیے دوا صرف اسپیشلسٹ تجویز کرتے تھے۔ اس علاج میں رد و بدل کی ہمیں اجازت نہ تھی۔ وارڈ میں ہمارا کام یہ ہوتا تھا کہ وقتی ریلیف کی دوا دے دیں۔ اور نرسوں پر نظر رکھیں۔ چنانچہ یہ دوسرا کام میں زیادہ دلچسپی سے کرتا تھا۔ اپنے کام سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور ہوتی بھی کیسے... زیادہ سے زیادہ میں کسی کو بخار کم کرنے کی دوا دے سکتا تھا یا بلڈ پریشر کنٹرول کرنے کی۔

وہ اپنے شوہر کے ساتھ وی آئی پی روم میں تھی۔ وہ نہ ہوتی تو وہاں حسین ترین نرسوں میں سے کسی کی ڈیوٹی لگائی جاتی۔ ضرورت پڑنے پر وہ نرس یا مجھے کیا اسپتال کے مالک کو بھی طلب کرتی تو وہ ریس کے گھوڑے کی طرح دوڑا آتا۔ اس کے شوہر کو وہی امراض لاحق تھے جو عیاش اور عمر رسیدہ اور بھاری بھرکم رئیسوں کو ہو جاتے ہیں۔ اس کا جگر خراب تھا... دل کے پہلے بائی پاس میں ایک اسٹنٹ (STUNT) پڑ چکا تھا۔ اب دوسری شریان بلاک تھی میں اس کا نام نہیں لوں گا لیکن وہ صرف نام کا رئیس نہیں تھا۔ وہ دوسرا دل لگوانے کے لیے یورپ اور امریکا بھی جا سکتا تھا۔

اب اسے میری شامتِ اعمال ہی سمجھو کہ میری ڈیوٹی بطور خاص وہاں لگا دی گئی۔ وی آئی پی روم میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اسپیشلسٹ ڈاکٹر دن میں دس بار اس کی رپورٹس دیکھنے آتے تھے اور ضرورت پڑنے پر وہ کسی کو بھی کال کر سکتا تھا۔ میرا وہاں کیا کام... میں تو ڈرتا تھا کہ خوامخواہ کی کوئی مصیبت نہ گلے پڑ جائے... میں اسے پیراسیٹامول جیسی بے ضرر دوا دوں اور اسے ہو جائے زیادہ کھانے سے الٹی... تو میری چھٹی...

ہونی کو بھلا کون ٹال سکتا ہے۔ وی آئی پی وارڈ کے دو حصے تھے۔ بڑے حصے میں وی آئی پی مریض اپنے دی آئی پی مرض اور اس کا ''معاون خصوصی'' مکمل لگژری اور پرائیویسی کے ساتھ قیام پذیر رہ سکتے تھے۔ معاون خصوصی بھی بیوی... سیکریٹری... دوست کوئی بھی ہو سکتی تھی۔ دوسرے نسبتاً مختصر حصے میں ملازم۔ ڈیوٹی نرس اور ڈاکٹر تمام وقت مستعد رہتے تھے۔ درمیانی دروازہ بند رہتا تھا لیکن ملازمین کو سونے اونگھنے گپ لگانے یا باہر جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔

پہلی رات ہی بوریت اور احساسِ ذلت سے میرا حال خراب ہو گیا۔ میرے ساتھ وڈیرے رئیس کا ایک خاندانی ملازم تھا جو مجھ سے ایسے بات کرتا تھا جیسے میں اس کے ملازموں کا بھی ملازم ہوں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا جب وہ افیم جیسی کوئی گولی کھا کے کچھ دیر اونگھتا رہا اور پھر فرش پر گٹھڑی بن کے سو گیا۔

اب اس کمرے میں میرے ساتھ ایک غریب اور مظلوم قسم کی نرس رہ گئی جو مجھے آہوئے صیاد دیدہ کی طرح پُرخوف نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ بلاشبہ وہ پرکشش تھی اور اپنی سانولی رنگت کے باوجود اس کے نقش تیکھے تھے۔ میں اپنی جگہ سے حرکت بھی کرتا تو وہ سہم جاتی تھی۔

پریشان ہو کے میں نے کہا۔ ''آخر کیا پرابلم ہے تمہاری؟ کیا میں درندہ ہوں کہ تمہیں کھا جاؤں گا؟''

''تم نہ سہی... دوسرے تو ہیں۔'' اس نے اندر کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے کہا۔ ''کیا پہلے بھی تم وی آئی پی وارڈ میں ڈیوٹی دے چکی ہو؟''

اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ ''مجھے تجربہ ہے۔''

''اوہ...'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''خیر اس کی طرف سے فکر نہ کرو وہ اپنی دل بستگی کا سامان اپنے ساتھ لایا ہے۔''

''میں تو اپنے بچے کے لیے پریشان ہوں... وہ بیمار ہے۔''

میں نے حیرانی سے کہا۔ ''کہاں ہے وہ بچہ... اسی اسپتال میں؟''

''نہیں... وہ گھر میں ہے اور میرا شوہر ایک اخبار کے دفتر میں چپراسی ہے۔ رات کی ڈیوٹی کرتا ہے۔''



''گھر میں بچے کا خیال رکھنے والا اور کوئی نہیں؟''

''میری ساس ہے... چڑیل... اسے رات کے وقت ویسے بھی کچھ نظر نہیں آتا اور بچہ مرتا ہے تو مر جائے... وہ کچھ نہیں کرے گی۔''

میں نے خفگی سے کہا۔ ''پھر تمہیں کیا ضرورت تھی ڈیوٹی پر آنے کی؟''

اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

''مجبوری سب کراتی ہے ڈاکٹر صاحب... میرا شوہر رات کی ڈیوٹی روز نہیں کرتا۔ ہفتہ، اتوار کو اوور ٹائم کے دگنے پیسے ملتے ہیں۔ میں بھی یہی کرتی ہوں... دو دن پرائیویٹ وارڈز میں ڈیوٹی دینے کے دو ہزار مل جاتے ہیں... کم سے کم۔''

''جو مریض کے بل میں ڈالے جاتے ہیں... لیکن...''

اس نے نظر جھکا لی۔ ''وہ بھی ڈیوٹی سمجھی جاتی ہے ڈاکٹر صاحب... اگر میرے شوہر کو یہ بات معلوم ہو جائے تو وہ مجھے قتل کر دے... مگر میں اس سے جھوٹ بولتی ہوں کہ ڈیوٹی میں نے اپنی مرضی سے نہیں لی... میں انکار نہیں کر سکتی تھی اور اضافی آمدنی کے لیے میں نے اسے بتایا ہے کہ اسپتال والے اوور ٹائم الاؤنس لگاتے ہیں۔''

مجھے سخت دکھ ہوا۔ یہ کتنا مقدس پیشہ سمجھا جاتا ہے لیکن غربت اور معاشی مجبوری میں آدمی کیا نہیں کرتا... آپ اسے لالچ بھی کہہ سکتے ہیں... اچھی آمدنی سے ہی سب کچھ ملتا ہے... معیارِ زندگی... بچوں کو تعلیم... معاشرے میں عزت... گاؤں اور چھوٹے قصبے ابھی اس قسم کے اخلاقی سمجھوتوں سے دور ہیں۔ یہ صرف شہروں میں ضروری ہو جاتا ہے جہاں غربت کا احساس امارت کو اپنے سامنے پا کے شدت اختیار کر جاتا ہے... مجھے ایک لمحے کے لیے شک ہوا کہ شاید یہ بھی بیوی کی خوش فہمی ہو گی... شوہر کو اوور ٹائم کی حقیقت معلوم ہو گی... مگر اس لیے بھی غیرت کو نظریۂ ضرورت کے تحت پسِ پشت ڈال دیا ہے۔

میں نے ہمدردی سے کہا۔ ''دیکھو... تم چاہو تو گھر جا سکتی ہو یہاں کی فکر مت کرو... یہ میری ذمے داری ہے... تمہاری غیر موجودگی سے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہو گا... تم جاؤ۔''

وہ میرا شکریہ ادا کر کے نکل گئی تو میں نے فرش پر بے سدھ پڑے بڈھے کو دیکھا اور نرس کی خالی ہونے والی کرسی پر پیر پھیلا کے سر کو پیچھے لگا دیا۔ میں سخت فرسٹریشن کا شکار تھا۔ وہ نرس کیا، خود میں مجبور تھا۔ میں اس دن پر لعنت بھیجتا تھا جب اماں ابا کی خواہش پر میں نے ڈاکٹر بننے پر رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ اس سے تو بہتر تھا کہ میں کسٹم میں کلرک ہوتا... ایکٹر بن جاتا... کرکٹ کھیلتا رہتا... فرسٹ کلاس میں اچھی پرفارمنس دیتا تو قومی ٹیم میں آ جاتا۔

فرسٹریشن میں ایسے خیالوں کے ساتھ سہانے سپنے بھی آتے تھے۔ میں سوچتا تھا کہ وظیفہ مل جائے تو میں اسپیشلائز کرنے باہر جاؤں اور پھر لوٹ کے نہ آؤں... کسی ارب پتی صنعت کار یا ایمگزی کی اکلوتی بیٹی سے میری آنکھ لڑ جائے خواہ اس کی ایک ہی آنکھ ہو... کوئی امریکی نیشنلٹی رکھنے والی لڑکی جیسی چیز مل جائے... کالی، پیلی، موٹی، بھدی، طلاق یافتہ جیسی بھی ہو... کوئی بہت دولت مند بیوہ مجھ پر مر مٹے... مقصد پورا ہونے کے بعد دنیا اپنی... اور اپنی مرضی... کباڑ مال کو نکال پھینکو... جیسا کہ فرما گئے ہیں اپنے علامہ صاحب کہ... جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو...

میں نیم خوابیدہ تھا کہ کسی نے میرے پیر دل پر تھپکی دی۔ میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا تو میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ ایک لمحے کے لیے مجھے لگا کہ یہ بھی خواب ہی ہے لیکن یہ تاثر فوراً ہی ختم ہو گیا۔ وہ منتظر تھی کہ میں اپنے پیر سمیٹ لوں تو وہ میرے مقابل دوسری کرسی پر بیٹھ جائے۔ زیادہ شاعری اور لفاظی لاحاصل ہے... وہ میرے تصور سے زیادہ حسین تھی۔ اسے تم میرے دماغ کا فتور سمجھ سکتے ہو یا میری نظر کا... حسن تو دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے۔ اب اسے ہی دیکھ لو... شہزادہ چارلس کو اسے ڈائنا جیسی حور شمائل کے مقابلے میں وہ مسز پارکر زیادہ اچھی لگی۔

خیر... جب وہ سامنے بیٹھ گئی تو میں نے درمیانی دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ بند تھا۔ وہ میرے اندیشوں کو سمجھ کے مسکرائی۔ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ مرا نہیں تو صبح تک سوتا رہے گا۔''

میں حیران رہ گیا کہ وہ اپنے شوہر کے بارے میں کس قسم کے الفاظ استعمال کر رہی ہے۔ ''یہ آپ اتنے یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتی ہیں؟''

''اس لیے کہ ہر رات میں ہی اس کے ساتھ سوتی ہوں۔'' اس نے پھر انگریزی میں بڑے سکون سے کہا۔ ''ایک نرس بھی یہاں۔''

میں نے کہا۔ ''اس کا شوہر یہاں جنرل وارڈ میں داخل تھا۔ وہ میرے کہنے پر اسے دیکھنے گئی ہے۔''

اس نے اطمینان سے سر ہلایا۔ ''یہ بڈھا افیم کھاتا ہے۔ اسے رئیس کی مرضی کے خلاف زیادہ سے زیادہ منگوا دیتی ہوں۔ کیا یہ صحیح ہے کہ مقدار بڑھتی جائے تو بالآخر ایک

حد آجاتی ہے جب نشہ نہیں ہوتا... نیند نہیں آتی مگر موت آجاتی ہے؟''

میں نے کہا۔ ''یہ صحیح ہے... لیکن آپ کیوں مارنا چاہتی ہیں اسے؟''

''یہ کیسا فضول سوال ہے... ایسے لوگوں کی زندگی کس کام کی جو دوسروں کا عذاب ہوں... مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ دیکھا تو تم بیزار بیٹھے تھے۔ میں ادھر آگئی۔''

''آپ نے بہت اچھا کیا... لیکن دیکھیے... میں یہاں ڈیوٹی پر ہوں اور ملازم ہوں اس اسپتال کا۔''

اس نے میری بات سنی ہی نہیں۔ ''انتظام تو پورا ہے یہاں... اب مجھے طلب محسوس ہورہی ہے کافی کی... تم پیو گے؟''

اس کی بے تکلفی نے ایک طرف مجھے پریشان کیا... تو دوسری طرف ایک انوکھے احساس سے دوچار کردیا تھا۔ ناقابلِ یقین طور پر جیسے میرے خواب کو تعبیر مل گئی تھی۔ کوہ قاف کا وجود ہو نہ ہو... ایک پری وہاں سے اتر کے میرے سامنے آبیٹھی تھی۔ مجھ پر نشہ سا طاری ہورہا تھا۔

''تمہیں تو نہیں آتی ہوگی چائے بنانا بھی... میں بناتی ہوں کافی۔'' وہ اٹھی اور اس نے کارنر ٹیبل پر الیکٹرک کیتل کا پلگ لگا دیا۔ ''آخر ایسے کب تک بت بنے رہو گے تم... کوئی بات کرو۔''

میں نے خود کو سنبھال کے کہا۔ ''میری تو سمجھ ہی نہیں آتا کہ کیا کہوں؟''

''کیوں؟ باتیں کرنا نہیں آتی تمہیں؟'' وہ میری طرف پلٹ کے مسکرائی۔

''یہ بات نہیں۔''

''ابھی تک تمہارے دل سے ڈر گیا نہیں... میرے یقین دلانے کے باوجود... یار ڈرنا تو مجھے چاہیے... میں خود چل کے یہاں آئی کیوں... غیرت کی باسی کڑی میں ابال آیا تو شوہر مجھے قتل کردے گا... تمہاری بے گناہی تو ثابت ہے... تم مجھے جانتے ہی نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''خاتون! میں ڈرتا کسی سے نہیں... لیکن حیرت کی انتہا نے مجھے گنگ کردیا تھا۔ اس میں برا ماننے والی تو کوئی بات ہی نہیں کہ میرے عقل و ہوش کو مغلوب کرنے میں سب سے پہلا کمال آپ کے اس حسنِ بے مثال کا ہے... جھوٹ میں بھی بولتا ہوں لیکن میں کہوں کہ آپ جیسی حسین عورت میں نے پہلے خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی... تو یہ سچ ہوگا۔''

اس نے سب سن کے بھی میری طرف نہیں دیکھا اور بولی۔ ''چینی؟''

میں نے کہا۔ ''دو چمچے... دوسری حیران کرنے والی بات آپ کی اتنی اچھی انگریزی ہے اور آپ کا دلنشیں اندازِ گفتگو... آپ یقیناً کیمبرج سسٹم کی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں گی... پھر حیرت یا افسوس اور دکھ ہے اس پر کہ آپ اس شخص کی بیوی ہیں... جو عمر میں آپ کے باپ سے بڑا ہوگا۔''

میں نے ہاتھ سے اندر کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے کچھ کہے بغیر کافی کا مگ میرے سامنے رکھ دیا۔ ''میں سن رہی ہوں۔''

میرا حوصلہ مزید بڑھ گیا۔ ''آپ کی یہ جرأت بھی حیرت انگیز ہے... آپ کو ذرا خوف نہیں... میرے عقل و ہوش سلامت نہیں رہے تو کیا میرا قصور ہے؟''

وہ ہلکی سی زیرلب مسکراہٹ کے ساتھ خاموش بیٹھی کافی پیتی رہی... ایسا لگتا تھا کہ میری کسی بات کا اس نے برا نہیں مانا اور حسن کا خراج تحسین وصول کرنے کی وہ عادی ہے۔

''میں نے صرف اے لیول پڑھا ہے... جب رئیس کا پہلا بائی اس ہوا تو یہ لندن گیا تھا... اس کے دل میں اسٹنٹ (STUNT) وہیں ڈالا گیا تھا... دو سال پہلے۔''

''یہ ایک عام سا آپریشن ہے جو پاکستان کے کسی بھی شہر میں کوئی بھی ہارٹ سرجن کرسکتا ہے... لاہور، کراچی... اسلام آباد۔''

''جو لندن یا امریکا جانا افورڈ کرسکتا ہو... وہ یہاں کیوں علاج کرائے... ایسا تو سب ہی کرتے ہیں... بیوروکریٹ... سیاست داں... جنرل... اور وہ سب جن کے پیچھے یہ میڈیا والے پڑے رہتے ہیں۔ میں اپنے ماموں کے ساتھ لندن میں تھی... انہوں نے ہی میری پرورش کی تھی... میں پیدائش سے پہلے یتیم ہوچکی تھی... ڈاکو میرے باپ کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ انہوں نے تاوان میں بہت بڑی رقم طلب کی... اس پر سودا ہوسکتا تھا... لیکن ماموں کے اوپر تک مراسم تھے۔ انہوں نے اعلیٰ حکام سے مدد لی... میرا باپ مارا گیا... پھر دو ماہ بعد میں نے اپنی ماں کی جان لے لی... وہ یہاں آگئی تھی... آپریشن کی ضرورت پڑی تو اسے کراچی لے گئے... میں راستے میں ہی پیدا ہوگئی مگر وہ مرگئی۔''

''پھر آپریشن کے لیے کس نے کہا تھا؟''

''مجھے نہیں معلوم... ماموں نے میری ذمے داری



لے لی... میرے لیے اپنی بیوی کو بھی طلاق دے دی... وہ مجھے گھر میں رکھنے پر تیار نہیں تھی۔ ماموں لندن چلے گئے اور وہاں ایک میم سے شادی کرلی... ماموں ڈاکٹر نہیں تھے لیکن اسپتال کی انتظامیہ میں شامل تھے۔ وہ ہر پاکستانی کو خصوصی توجہ دیتے تھے۔ باہر اپنے ہم وطن زیادہ اچھے لگتے ہیں۔ رئیس یہاں وہی آئی پی ہے... وہاں مریض صرف مریض ہوتا ہے۔ اس نے ماموں سے شکایت کی کہ بابا ادھر تو نرس بھی ہم کو گھاس نہیں ڈالتی... ماموں نے اسے گھاس ڈالی تو وہ خوش ہوگیا اور بعد میں شکریہ ادا کرنے... دس ہزار پونڈ کی صورت میں... گھر آیا تو مجھ پر عاشق ہوگیا اور مجھ سے شادی کا مطالبہ کر بیٹھا۔ ولایتی ممانی بھی مجھ سے بالاں تھی کہ آخر کب تک ان کی ذمے داری بنی رہے گی... ممکن ہے اور بھی کوئی انڈر اسٹینڈنگ قسم کی ڈیل ہوئی ہو... قصہ مختصر... ماموں نے نکاح پڑھوا کے مجھے تیسری بیوی کے طور پر رئیس کے حوالے کردیا اور وہ مجھے یہاں لے آئے۔''

''اور تم نے اس ڈیل کو کیسے قبول کرلیا؟''

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ ''پورا کیس یہ ہے کہ مجھے جھوٹ بول کے پاکستان بھیجا گیا۔ کہا گیا کہ میرے ماں باپ کی کچھ پراپرٹی ہے... میں اس کا قبضہ لوں اور بیچ کے واپس آجاؤں... وہاں جاکے میں پھنس گئی... پراپرٹی جو تھی وہ ماموں نے پہلے ہی ٹھکانے لگادی تھی۔ رئیس نے مجھے قید کرلیا اپنی حویلی میں... ماموں کچھ دن بعد آئے اور ''ولی'' بن کے میرا نکاح پڑھواتے ہی لوٹ گئے۔ کسی نے مجھے بتایا کہ میں ولی کی مرضی کے خلاف نہیں جاسکتی۔ بالغ ہونے کے باوجود... وہ رئیس کے علاقے کا کوئی بہت بڑی ..... پگڑی والا مولانا تھا جو مجھے یہ بات سمجھانے آیا تھا اور مجھ سے گالیاں کھا کے مسکراتا ہوا چلا گیا۔ اینڈ ڈیٹ از ڈیٹ ڈاکٹر شیرازی۔''

میں سحر زدہ بیٹھا تھا۔ ''ابھی تک تم نے اپنا نام نہیں بتایا؟''

''شہر بانو... عملی طور پر رئیس کے پاس اس وقت دو ہی بیویاں ہیں... پہلی خاندانی بڑی بیگم عمر میں اس سے ایک سال بڑی ہے۔ وہ گوشت کا چلتا پھرتا پہاڑ ہے... قرآن شریف اس نے بچپن میں پڑھا تھا... اس کے چار بیٹے تھے۔ دو خاندانی لڑائی میں مارے گئے... دو جیل گئے اور رہا ہوئے تو باپ نے انہیں باہر بھیج دیا ورنہ دشمن انہیں بھی نہ چھوڑتے... چار بیٹیاں قبیلے میں ہی بیاہی گئیں۔ رئیس نے دس بارہ سال پہلے چینی ایکسپورٹ کی تھی۔ پھر امپورٹ کی... کراچی میں اچھا آفس قائم کیا تھا ایک سیکریٹری رکھ لی تھی۔ وہ دوسری بیوی بنی اور خاصا مال سمیٹ کر بھاگ گئی۔''

میں نے ہمت کر کے کہا۔ ''کیا تم بھی یہی سوچ رہی ہو؟''

''نہیں... مال کی کوئی بات نہیں... رئیس کے لیے بیوی کا بھاگ جانا بڑی بے عزتی کی بات ہے... جو وہ آج تک بھولا نہیں... اس عورت کو آج بھی تلاش ضرور کیا جارہا ہے مگر اب اس کے ملنے کے امکانات ختم ہوگئے ہیں... ہوشیار عورت تھی۔ جانتی ہوگی کہ کتے اس کی بو سونگھتے پھریں گے... ایسی غائب ہوئی کہ کتے اپنے زخم چاٹ رہے ہیں... میں یہ رسک نہیں لے سکی۔''

''تو پھر... خوش رہنا سیکھ لو... مجبوری کے ساتھ۔''

''یہ بات شہر کے ایک پڑھے لکھے ڈاکٹر کو کہنی نہیں چاہیے۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی... پھر بیٹھ گئی۔ ''تم نے شادی کرلی ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ابھی تک خواب دیکھ رہا ہوں کہ تم جیسی کوئی مل جائے۔''

''یعنی زندگی خوابوں کے سہارے گزارو گے... اور کیا خواب ہیں جناب کے؟'' وہ تلخی سے بولی۔

''خواب بہت ہیں... اعلیٰ پیشہ ورانہ تعلیم... عزت شہرت دولت کے لیے جدوجہد... شادی کا کیا ہے... سب کی ہوجاتی ہے۔''

''خوابوں کی تعبیر پانے کے لیے اب تک تم نے کیا جدوجہد کی ہے؟''

میں نے کہا۔ ''جدوجہد کیا کروں... کیسے کروں... کہاں کروں... خالی ہاتھ تو کچھ نہیں ہوسکتا... ورنہ یہ نوکری کیوں کررہا ہوتا؟''

''اسپیشلائزیشن کے لیے تمہیں کتنی رقم چاہیے... ابتدا میں؟'' وہ سوچتے ہوئے اور مجھے گھورتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا۔ ''ابتدا میں کم سے کم بیس لاکھ... اس کے بعد آدمی کماتا ہے اور پڑھتا رہتا ہے... سب نے ایسے ہی کیا ہے۔''

''اکثر لوگ واپس نہیں آتے۔''

''مگر میں آنا پسند کروں گا... یہاں کمائی زیادہ ہے... اور عزت شہرت بھی... میں یہاں ایک اسپتال بنالوں تو پیسہ ہی پیسہ۔''

''ہاں... ایجوکیشن اور ہیلتھ سیکٹر میں لوگ سب سے زیادہ کمارہے ہیں... یہ میری نہیں... دنیا کی رائے ہے...

خیر، میں کچھ سوچتی ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''کیا... کس کے بارے میں؟''

وہ جاتے جاتے رکی۔ ''بھئی تمہارے بارے میں اور کس کے بارے میں... اگر تمہیں یہ موقع فراہم کر دیا جائے...''

میرا دماغ چکرانے لگا۔ ''آپ موقع دیں گی مجھے؟''

وہ مسکرائی۔ ''یس... میں ایسا کر سکتی ہوں لیکن یہ ایک ڈیل ہوگی... اگر میں تمہاری مدد کروں گی تو تم میری کرو گے۔''

''کیسی مدد؟'' میں نے خشک حلق کو تھوک نگل کر تر کیا۔

''بتاؤں گی۔'' وہ بڑی ادا سے مسکرا کے پلٹی اور دروازہ کھول کر اپنے شوہر کے کمرے میں غائب ہوگئی۔ اس وقت رات کے دو بجے تھے۔ میں صبح تک جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ آخر وہ مجھ سے کس قسم کی مدد چاہتی ہے؟ کیا وہ مجھ سے کہے گی کہ میرے شوہر سے میرا پیچھا چھڑا دو... پیچھا چھڑانے کا طریقہ اسے مارنے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے... اس چکر میں خود میں مارا جاؤں گا... شہر بانو کا کیا ہے... اس پر تو الزام نہیں آسکتا... وہ اپنے حسن کا جادو چلا کے مجھے استعمال کرنا چاہتی ہے... کیا میں اتنا پاگل ہوں؟

لیکن پاگل تو میں ہو چکا تھا صبح جب ایک لیڈی ڈاکٹر نے مجھ سے چارج لیا اور مجھے گھر جانے کی اجازت ملی تو آرام کرنے اور سو کے تھکن دور کرنے کے بجائے میں جاگتا رہا اور صرف اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ دل اور دماغ میں شدید کشمکش جاری رہی۔ میرے دماغ میں منطقی سوالات کی بھرمار تھی۔ شکوک وشبہات تھے اور خطرے کی گھنٹی تھی جو بند ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ شہر بانو... کیا اس کا یہی نام تھا... آخر وہ کیا چاہتی تھی مجھ سے... اور صرف مجھ سے کیوں؟ اپنے حسن وشباب کی تباہ کن قوت کا جادو چلا کے وہ مجھ سے قتل کرانا چاہتی تھی۔ اپنی محبت کے جال میں پھنسا کے مجھے استعمال کرنا چاہتی تھی۔ اگر وہ اتنا پیسہ میرے سامنے پھینک سکتی تھی تو اس کا دسواں بیسواں حصہ خرچ کر کے یہ کام کسی اور سے لے سکتی تھی۔ خود اس کے لیے کیا مشکل تھا۔

لیکن شکوک وخدشات کی یلغار کرتے بادلوں میں سے اچانک اس کے خورشید حسن کا شعلہ ابھرتا تھا اور میں اس کے تصور میں ڈوب جاتا تھا۔ اس کے پیکر کے خدوخال اور اس کی مسحور کر دینے والی زیرلب شرمیلی مسکراہٹ کے خیال میں کھو جاتا تھا۔ جاتے وقت اس نے کس ادا سے بل کھا کے کہا تھا۔ بتاؤں گی... عقل کو مات ہو جاتی تھی۔ سارے منطقی سوالات دھواں بن کے اڑ جاتے تھے اور میں عہد کر لیتا تھا کہ اس کے لیے سب کچھ کروں گا... جان دینا تو معمولی بات ہے۔

شام کو میں نہا دھو کے اپنا بہترین لباس پہن کے اور وہ خوشبو لگا کے جس کا نام تھا ''سیکس ایبل'' رات کی ڈیوٹی کا چارج لینے پہنچا تو مجھے جسمانی تھکن کا احساس تک نہ تھا۔ خیال تھا تو صرف اس کا... ایک تبدیلی مجھے یہ نظر آئی کہ وہ مخبوط الحواس ایفی خادم خاص جو مجھے ذلیل کرنے کے سوا کچھ نہیں کرتا تھا وہاں نہیں تھا۔ ڈیوٹی نرس وہی تھی اور وہ بار بار میرا شکریہ ادا کرتی رہی۔ رات دس بجے میں نے اسے پھر اجازت دے دی کہ وہ گھر جا کے اپنے بیمار بچے کو توجہ دے۔ گزشتہ رات میں وقت گزارنے کے لیے ایک رسالہ پڑھ رہا تھا۔ وہ مجھے نہیں ملا۔ میں اکیلا بیٹھا کرسی پر پہلو بدلتا رہا اور بے چینی سے درمیان کے دروازے سے اس کے آفتاب حسن کے طلوع ہونے کا انتظار کرتا رہا۔

اچانک اس نے دروازے کو تھوڑا سا کھول کے سر نکالا اور بڑی رکھائی سے مجھے طلب کیا۔ ''ڈاکٹر شیرازی... ذرا ادھر تو تشریف لائیے۔''

میں اندر گیا تو رئیس نے بڑی نخوت سے بلکہ حقارت سے مجھے دیکھا۔ ''تم ہی ہو ڈاکٹر شیرازی... بڑی شکایت ہے بیگم صاحبہ کو تم سے۔''

میں نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ ''جی...؟''

شہر بانو نے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ ''جی کیا؟... یہاں آپ ڈیوٹی کرنے آتے ہیں یا سونے... اور ایسے رسالے پڑھنے۔'' اس نے رسالہ جو میں پڑھ رہا تھا اٹھا کے دکھایا مجھے جواب کا موقع دیے بغیر اس نے بولنا جاری رکھا۔ ''رات میں نے چیک کرنے کے لیے دروازے سے جھانکا تو جناب کرسی پر پیر پھیلائے سو رہے تھے۔ یہ رسالہ گود میں رکھے اور وہ حرام خور نوکر جس کو یہاں رکھا گیا تھا کہ ضرورت پڑے تو چائے ہی بنا دے وہ فرش پر خراٹے لے رہا تھا۔ اسے تو میں نے بھیج دیا ہے واپس گھر... آپ کو بھی شکر ہے کے ساتھ نہیں شکایت کے ساتھ واپس کر دیتی لیکن آپ کی لیاقت کی سب تعریف کرتے ہیں اس لیے آپ کو ایک موقع اور دیتی ہوں۔''

میں دم بخود اس کی الزام تراشی سنتا رہا۔ وہ اپنے شوہر کو امپریس کرنے کے لیے مجھے ڈانٹ رہی تھی۔ رسالہ وہ خود اپنے پڑھنے کے لیے بعد میں اٹھا کے لے گئی ہوگی۔ نرس کی



غیر موجودگی کا اس نے حوالہ تک نہیں دیا تھا لیکن اس خادم خاص سے میری گلوخلاصی کرا دی تھی جو ہماری خلوت میں مخل نہ ہونے کے باوجود ایک خطرہ تھا۔

''بس اب جائیے... کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔'' اس نے بڑی درشتی سے کہا۔ ''آج سوتے پائے گئے تو میں خود ایم ایس سے بات کروں گی۔ رئیس چاہیں تو وزیر صحت سے کہہ کے تمہیں نوکری سے نکلوا سکتے ہیں۔''

میں واپس آ کے کرسی پر بیٹھ گیا۔ احساسِ ذلت کے ساتھ مجھے یہ خیال بھی تھا کہ شہر بانو نے صرف اپنی شوہر سے محبت اور فرض شناسی ثابت کرنے کے لیے یہ ڈراما کیا تھا۔ بڑی صفائی سے اس نے خادم خاص کے کانٹے نکال دیا تھا اور مجھے اجازت دے دی تھی کہ میں نرس کو اپنے طریقے سے رخصت کر دوں تاکہ ہمیں مکمل خلوت میسر آسکے۔ شہر بانو حسن و ذہانت کی دودھاری تلوار تھی۔ اپنا مطلب نکالنے کے لیے وہ مجھے استعمال کرنا چاہتی تھی مگر میری عقل تو چلی گئی تھی گھاس چرنے... اور میں گدھا اس کے ہاتھوں استعمال ہونے پر بھی خوش تھا۔ اس کے اشارۂ ابرو پر قتل کرنے کے لیے بھی تیار تھا۔ کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا...

آدھی رات کے بعد وہ ایک نئی آب وتاب کے ساتھ جلوہ نما ہوئی... اس نے جو لباس اپنے لیے منتخب کیا تھا، وہ اس کے پیکرِ شباب کی ساری رعنائی کو بڑے قاتل انداز میں سامنے لاتا تھا۔ لباس جس کا مقصد ستر پوشی سمجھا جاتا ہے فیشن کے نام پر کس طرح تشہیر کے اسباب پیدا کرتا ہے... یہ آج کے میڈیا پر فیشن ڈیزائنر سمجھاتے رہتے ہیں... مگر میں اسے دیکھ کے سمجھا۔

وہ میرے مقابل خاموشی سے آ بیٹھی... میری خاموشی کو اس نے میری ناراضی پر محمول کیا اور بولی۔ ''دیکھو شیرازی! کچھ ویز پہلے میں نے جو بھی کہا تھا...''

میں نے کہا۔ ''اس کا میں نے برا نہیں مانا... ایک مقصد تھا آپ کا۔''

''رائٹ، آج ہم زیادہ آزادی کے ساتھ باتیں کر سکتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''کل رات آپ نے کہا تھا کہ...''

''تم کہو... جب ہم ایک دوسرے کے رازدار... مددگار اور دوست ہیں تو پھر آداب اور تکلفات کی ضرورت نہیں۔''

''او کے... تم نے کہا تھا کہ میری مدد کرو گی... اگر میں تمہاری مدد کروں... یہ مدد کیا ہوگی... آج کھل کے بتا دو۔''

''کچھ اندازہ ضرور کر لیا ہوگا تم نے؟''

''ہاں... لیکن میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔''

وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ ''میرا پلان نیا نہیں... لیکن خدا نے ہر کام کے لیے وقت مقرر کیا ہے اور جلدی میں کام خراب بھی ہو جاتا ہے چنانچہ میں بھی موقع کے انتظار میں تھی۔ اور کافی سوچا میں نے... کل رات تم سے مل کے میں نے اس پلان میں ایک تبدیلی کی... شاید تم اسے پسند کرو... یہ میں بتا چکی ہوں کہ رئیس کے ساتھ میری شادی دھوکے سے کر دی گئی... لیکن اس کے بعد میرے لیے اس قید شریعت سے آزاد ہونا تو ممکن تھا... رئیس کی قید سے نکلنا ناممکن تھا... میرا صرف جنازہ ہی باہر جا سکتا تھا۔''

''میں اس کارِ خیر میں تمہاری کیسے مدد کر سکتا ہوں؟''

اس نے میرے طنز کو نظر انداز کر دیا۔ ''شیراز... میں واپس لندن جانا چاہتی ہوں... تم رئیس سے میری جان چھڑاؤ۔''

''وہ کیسے؟''

''علاج کے نام پر اس کا قتل کر دو... اس طرح کہ موت طبعی نظر آئے... اس کے دل کی جو حالت ہے... اس میں یہ ہو سکتا ہے اور ایک ڈاکٹر مشتبہ بہتر سمجھتا ہے کہ یہ کام کیسے کیا جائے... کہ کسی کو شک نہ ہو... اور اگر خدانخواستہ ہو... تو پوسٹ مارٹم رپورٹ میں بھی اس کا پتا نہ چلے... کیا میرا یقین غلط ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں... لیکن کوئی ڈاکٹر ایسا نہیں کرے گا۔''

''تم کرو گے۔'' اس نے پورے اعتماد سے کہا۔

''میں رئیس کا معالج نہیں ہوں... اور یہاں ایک سے بڑھ کر ایک ہارٹ اسپیشلسٹ ہے... شک مجھ پر ہی جائے گا۔''

اس نے اپنا نازک گورا اور مخملی ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ''سنو... اس کا بندوبست میں کروں گی... میں نے رئیس کو قائل کر لیا ہے کہ اس بار وہ اسپتال سے واپس گھر جائے تو کسی اچھے قابل ڈاکٹر کو بھی ساتھ لے جائے... جو حویلی کے اندر ہی رہے... خدانخواستہ ایمرجنسی ہو تو فوراً سنبھال لے... میری تشویش کو محبت سمجھتے ہوئے اس نے یہ انتظام مجھ پر چھوڑ دیا ہے... اس کے سامنے تمہیں ڈانٹنا ایک ضرورت تھی... یہ جتانے کے لیے تھا کہ میں تمہیں کنٹرول کر

سکتی ہوں... اس سے پہلے میں رئیس کو کئی بار بتا چکی تھی کہ یہ رات والا ڈاکٹر بہت قابل ہے... سب مانتے ہیں... جب میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کی بات کروں گی تو وہ کہے گا کہ جیسی تمہاری مرضی۔''

''لیکن اسپتال والے مجھے کہاں جانے دیں گے؟''

''لعنت بھیجو اسپتال پر... جتنی تنخواہ تمہیں یہاں ملتی ہے وہاں اس سے دگنی ملے گی... رہائش... کھانا پینا سب ہمارے ساتھ... یہ تمہارے مستقبل کا سوال ہے... اور میرے مستقبل کا بھی... جواب مجھے لگتا ہے کہ ایک ہو گیا ہے۔'' اس نے نظر جھکا کے ایک شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

شہر بانو کی اس ادا نے مجھے دیوانہ کر دیا۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کے چوم لیا۔ ''مجھے یقین نہیں آتا کہ میں اتنا خوش قسمت بھی ہو سکتا ہوں۔''

اس نے میری جسارت کا برا نہیں مانا۔ ''شیراز... مجھے یہ ملاقات بھی تائید ایزدی لگتی ہے... شاید تقدیر ہمیں اسی طرح ملانا چاہتی تھی۔ لندن میرا گھر ہے تم بھی اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن ہی جانا چاہتے ہو... اگر میں کہوں کہ میرے گھر میں مہمان نہیں... میری جان و دل کے مالک بن کر رہو... تو کیا تم قبول کرو گے... جب میرا سب کچھ تمہارا ہو جائے گا تو یہ مدد کا معاملہ نہیں رہے گا... میں خود چاہوں گی کہ تمہارا نام ہو... تم ایک مایۂ ناز پاکستانی سرجن بنو... ہم عیش کے ساتھ لندن میں رہیں... وہاں سب سے زیادہ ڈاکٹر کماتے ہیں یا وکیل... ڈاکٹر تم اب بھی ہو... چار پانچ سال میں تم اسپیشلائز کر لو گے... تب تک میں تمہیں سپورٹ کروں گی... رہنے کا کوئی مسئلہ نہیں... ایک چھوٹا سا فلیٹ ہے میرا... اگر تم اجازت دو گے تو میں کچھ عرصہ ماڈلنگ کر لوں گی... مجھے آفرتھی دو ایڈ بھی چلے تھے میرے جو اتفاق سے رئیس نے دیکھ لیے... ادھر میرے ماموں کو ماڈلنگ پر سخت اعتراض تھا۔ انجام یہ ہوا کہ میری شادی اس دائمی مریض خرد ماغ بڈھے سے ہو گئی... اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرو... یہ ہم دونوں کے مفاد میں ہے... ہم ایک دوسرے کے ساتھ اچھی زندگی گزار سکتے ہیں... خوش رہ سکتے ہیں... اسے غلط نہ سمجھنا... یو آر ہینڈسم... تم خوش ذوق ہو اور ذہین... تم مجھے پسند بھی کرنے لگے ہو... میں تمہاری ذہانت سے متاثر ہوں...''

مشہور تو یہی ہے کہ خوشامد کا ہتھیار مغرور سے مغرور عورت کو تسخیر کر لیتا ہے... میرے ساتھ الٹا ہوا... اس نے مجھے بانس پر چڑھا دیا اور میں خوشی سے دیوانہ ہو کے چڑھ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں عرض مدعا کرتا یا اسے حاصل کرنے کے لیے کوئی چکر چلاتا شہر بانو نے خود کو زندگی بھر کے لیے میرے حوالے کر دیا۔ ایک ساتھ میرے نام خوش نصیبی کی دو لاٹریاں نکل آئیں۔ ایک خوش حال کامیاب مستقبل... اور شہر بانو... عقل تو میری تخنوں سے بھی نیچے اتر گئی تھی۔ مجھے خیال تک نہ آیا کہ یہ فتنہ ساماں عورت مجھے الو بنا رہی ہے۔ مجھے استعمال کرنا چاہتی ہے... اس کے پاس حسن و شباب کی ایسی غارت گر طاقت تھی کہ وہ کسی بھی مرد سے کوئی بھی کام لے سکتی تھی اور وہ مرد بعد میں قتل کے مجرم کی حیثیت سے پھانسی چڑھ جاتا تب بھی آخری سانس نکلنے تک اپنی خوش قسمتی پر نازاں رہتا۔

قصہ مختصر... وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئی۔ جو مجھے الو بنا سکتی تھی اس کے لیے ایک کاٹھ کا الو شو ہر کیا چیز تھا... اس کے سامنے وہ مجھے اپنا ملازم سمجھتی اور میرے ساتھ بڑی سختی سے پیش آتی۔ بعض اوقات میری بے عزتی پر خود اس کا شوہر معذرت کرتا کہ ڈاکٹر صاحب... ولایت کی پڑھی ہوئی بیوی ہے میری... بعض اوقات بدلحاظ ہو جاتی ہے آپ برا مت ماننا... اور میں کہتا کہ انہیں آپ کی بہت فکر رہتی ہے... اس لیے میری معمولی کوتاہی بھی برداشت نہیں ہوتی حالانکہ میں خود آپ کا ہر وقت خیال رکھتا ہوں... یہ میرا فرض ہے لیکن آپ بھی بڑے بھائی کی طرح میرا خیال جو رکھتے ہیں۔

بس ہم مل کے یونہی رئیس کو چکر دیتے رہے اور اس کی آنکھوں میں دھول جھونکتے رہے... حویلی کے اندر ملاقات کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ خود شہر بانو نے بتا دیا تھا کہ ایسا کرنا خطرناک ہوگا... ملازمین کی آنکھیں ہر وقت نگرانی کرتی ہیں... میرا بے تابی سے برا حال تھا۔ وہ پوری کوشش کر کے میرے آتشِ شوق کو ہوا دیتی رہی تھی اور ساتھ ہی یہ بھی کہتی رہتی کہ صبر... بس تھوڑے دن کی بات ہے... پھر لندن میں ہم ہوں گے اور پوری زندگی کے ساتھ...

اب میں کیا بتاؤں... اس مختصر عرصے میں میرا کیا حال ہو گیا تھا۔ میں اس کے عشق کی دلدل میں اتنا اتر چکا تھا کہ نکلنے کی جتنی کوشش کرتا اتنا ہی اندر دھنس جاتا تھا۔ اپنی باتوں سے اور اپنائیت کے انداز سے اس نے مجھے یقین دلا دیا تھا کہ یہاں سے نکلنے کے بعد ہم ایک نئی جنت آباد کریں گے جس میں ہر دن کامیابی کا نیا سورج بن کے طلوع ہوگا اور ہر رات عیش و راحت کا نیا پیغام لائے گی۔

ابھی صرف ڈیڑھ مہینہ گزرا تھا لیکن مجھے لگتا تھا کہ



ڈیڑھ سال بلکہ ڈیڑھ صدی بیت چکی ہے۔ میرے لیے وہ ہجر کی آزمائش کے دن تھے۔ میں دن کو اس کی قربت چاہتا تھا مگر وہ نظر نہ آتی تھی۔ رات کو اس کے لیے تڑپتا تھا اور وہ آتی تھی تو مجھے اور تڑپانے کے لیے... وہ کہتی تھی کہ یہ خطرے سے خالی نہیں... رئیس کی بڑی بیوی رات بھر مستقل چکر لگاتی رہتی ہے اور ملازم جاگتے رہتے ہیں... میں زیادہ سے زیادہ اسے پیار کر سکتا، اس سے میرے اندر کی آگ اور بھڑک اٹھتی تھی۔ ایک بار میں نے اس سے یہ کہہ دیا تو اس نے میرے لیے ایک عورت کا بندوبست کر دیا۔ وہ بائیس سال کی صحت مند اور قبول صورت ملازمہ تھی جو سب کے کام آتی تھی اور ہر کام کرتی تھی، اسے میں شہر بانو کے متبادل کے طور پر کیسے قبول کرتا لیکن بھوکا آدمی اس امید میں کب تک بھوک کو برداشت کر سکتا ہے کہ بہت جلد اسے پلاؤ قورمہ اور حلوا ملے گا... میں نے بھی سوکھے چنے چبا کے گزارہ کر لیا۔

ڈیڑھ ماہ بعد اس نے مجھے گرین سگنل دیا کہ بس اب دکھاؤ اپنا کمالِ ہنر... ڈاکٹر کا ہنر مرض سے لڑنا اور مریض کی جان بچانا سمجھا جاتا ہے... میں نے اس ہنر سے مریض کو ختم کر دیا اور ایسے کہ سب دیکھتے رہ گئے۔ میں نے دورہ پڑنے پر رئیس کو جو انجکشن لگائے ان کے کارٹن وہی تھے جو ایسے دورے میں استعمال ہونے والی دوا کے ہوتے ہیں مگر اندر کچھ اور تھا جو مریض کے جسم میں گیا۔ آکسیجن... مصنوعی طریقے سے سانس کی بحالی... دل کی دھڑکن بحال کرنے کے لیے الیکٹرک شاک... میں نے سب کے سامنے بہت محنت کی... یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ دوسری دنیا سے لوٹ کر نہیں آ سکتا۔

اس کے بعد وہ ہوا جس کے بارے میں کبھی میں نے سوچا تک نہیں تھا۔ مجھے بڑی بیگم نے حکم دیا کہ صبح ہونے سے پہلے میں اپنا سامان اٹھاؤں اور واپس شہر چلا جاؤں۔ میرے واجبات وہیں ادا کر دیے جائیں گے۔ اب یہاں میرا کوئی کام نہیں اور حویلی میں سوگ ہے... مرنے والی بیوی عدت میں کسی نامحرم کا چہرہ دیکھنے کا گناہ نہیں کر سکتیں... یہ ان کی روایات کی توہین کے مترادف ہوگا جو خاندان کے بڑے برداشت نہیں کریں گے۔

میں بحث یا انکار کیسے کرتا... ملازم میرا سامان اٹھا کے گاڑی میں بھر چکے تھے۔ بڑی بیگم گھر کے اندر حاکم تھی اور خود شہر بانو نے بتایا تھا کہ اندر اسی کا حکم چلتا ہے۔ غالباً وہ پہلے بھی حویلی میں میری موجودگی کے خلاف تھی مگر رئیس کی وجہ سے مجبور تھی۔ ہو سکتا ہے اسے میرے اور شہر بانو کے درمیان خاموش تعلق کا احساس بھی ہو۔ آخر وہ بھی عورت تھی۔ میری شہر بانو سے آخری ملاقات یا کوئی بات کرنے کی درخواست کا انجام یہ ہوتا کہ خادم دھکے دے کر یا اٹھا کر مجھے باہر پھینک آتے۔

اس صورتِ حال کا میں نے سوچا ہی نہ تھا۔ شہر پہنچ کے تو میں جیسے پاگل ہو گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اسپتال کی انتظامیہ نے میری جگہ کسی اور کو دے دی تھی اور وہ مجھے واپس لینے پر تیار نہ تھے۔ اسی ہمدردنس کے ذریعے مجھے پتا چلا کہ رئیس کی بڑی بیوی نے میرے خلاف بہت زہر افشانی کی تھی کہ تم نے یہ کس جنگلی کو بھیج دیا ہے اس ولایتی فاحشہ کے کہنے پر... مجھے تو مویشیوں کا ڈاکٹر ہونا چاہیے تھا... رئیس کی اس نئی نویلی بیوی کے آگے نہیں چلتی اور میری رئیس کے آگے ورنہ... وغیرہ وغیرہ...

اس سے بڑا مسئلہ شہر بانو سے رابطے کا بن گیا۔ نہ میرے پاس اس کا موبائل نمبر تھا اور نہ اسے گھر کے فون پر بلانے کا رسک لیا جا سکتا تھا۔ میرے ایما پر اس بے چاری نرس نے کوشش بھی کی تھی مگر کال ریسیو کرنے والے بدخو رونے نام پوچھا۔ پھر کام اور بس... اس لیے دہرا عذاب تھا... خیال فرقت لیلے و فرقت لیلے... شہر بانو سے جدائی کے ساتھ اس کے سارے وعدے بھی خواب و خیال کی بات ہو گئے۔ اس کے ساتھ لندن جانے... اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور وہیں گھر بسانے کے سارے منصوبے بھی اب دیوانے کا خواب لگتے تھے۔

ایسے میں سارا وقت امید دینے والا صرف ایک خیال تھا کہ جیسے بھی ممکن ہوگا وہ خود راستہ نکالے گی۔ خود آئے گی۔ خود رابطہ کرے گی... اسے تو میرا فون نمبر بھی معلوم ہے۔ لیکن کیا عدت کے چار ماہ دس دن پورے کیے بغیر قدم باہر نکال سکے گی یا کسی نامحرم سے بات کر سکے گی... بڑی بیگم اس پر کسی سخت گیر جیلر کی طرح نظر نہیں رکھے گی۔

یونہی تڑپتے جلتے کڑھتے اور اپنی بے وقوفی پر پچھتاتے ایک مہینہ گزر گیا تو میری عقل ٹھکانے آ گئی۔ اب مجھے یہ خیال پریشان کرنے لگا کہ خود شہر بانو نے مجھے دھوکا دیا تھا۔ الو بنایا تھا... میرا استحصال دو طرح سے کیا تھا... ایک وعدۂ وصل سے... دوسرے اعلیٰ تعلیم کے لیے سپورٹ کے نام پر... اور میری دونوں کمزوریوں نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا تھا... اگرچہ میری عقل اس عورت کی عیاری اور فریب کاری پر مجھے ہکساتی تھی کہ وہ نظر آئے تو اسے قتل کر دوں

مگر دل تھا کہ مچل جاتا تھا... کیا پتا وہ مجبور ہو... وہ بھی اتنی ہی بے قرار ہو لیکن کچھ کر نہ پا رہی ہو... بڑی بیگم اب گن گن کر اس سے بدلے لے رہی ہو... آئی تھی بڑی سوکن بن کے... میرا اقتدار کون چھین سکتا ہے... میں خاندانی ہوں... میرے جوان بچے ہیں جو رئیس کے وارث ہیں...

میں نے اب نئی ملازمت کی تلاش شروع کر دی تھی اور بالآخر جان پہچان سے مجھے ایک اچھے اسپتال میں رکھ لیا گیا۔ جو میڈیکل یونیورسٹی بھی تھا۔ یہاں بھی مجھے ایک اسسٹنٹ پروفیسر کا معاون رکھا گیا۔ میری تنخواہ پہلے کے مقابلے میں دگنی مقرر ہوئی اور مجھے کہا گیا کہ میں اپنا اکاؤنٹ نمبر دوں جہاں میری تنخواہ ہر ماہ جمع ہو جائے۔ میں اپنا اکاؤنٹ نمبر ہی بھولا ہوا تھا... اس کے لیے میں بینک گیا تو مجھ پر جیسے حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا... برانچ منیجر نے مجھے ویلکم کہا کہ ڈاکٹر صاحب بہت دن بعد درشن ہوئے... مجھے چائے پلائی اور پھر اکاؤنٹ اسٹیٹمنٹ میرے ہاتھ میں تھما دی۔ اس میں میری توقع کے مطابق دس بیس ہزار تھے لیکن بیلنس پچیس لاکھ سترہ ہزار شو کر رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''آپ کو یقین ہے کہ یہ اسٹیٹمنٹ میری ہے... میرا مطلب ہے اس میں کوئی غلطی نہیں؟''

''بے شک کمپیوٹر بھی غلطی کر جاتے ہیں... آپ کو کیا شک ہے؟''

میں نے کہا۔ ''یہ پچیس لاکھ روپے اکاؤنٹ میں کیسے آئے؟''

اس نے کہا۔ ''میں ابھی معلوم کر کے بتاتا ہوں۔''

دس منٹ بعد اس کے ایک اسسٹنٹ نے وہی چیک میرے سامنے رکھ دیا جس پر میرا نام تھا اور پچیس لاکھ کی رقم تھی۔ یہ پندرہ دن پہلے جمع کرایا گیا تھا اور اس کے نیچے خود شہر بانو کے دستخط تھے۔ اس نے اپنا ایک وعدہ ایفا کر دیا تھا۔ میں دم بخود بیٹھا رہا اور منیجر مجھے حیرانی سے دیکھتا رہا کہ ڈاکٹر صاحب خوش ہونے کے بجائے پریشان کیوں ہو گئے؟

اس کے بعد کی کہانی مختصر ہے... شہر بانو صرف آزادی چاہتی تھی جس کے لیے تقدیر کا قرعۂ فال میرے نام نکلا... اس نے میری کمزوری کو بھانپ لیا۔ اپنے حسن و شباب کو چارے کے طور پر استعمال کر کے اس نے مجھے پھانسا۔ جو اس کے لیے اتنا ہی آسان تھا جتنا میرے لیے اس کے شوہر کو دوا کے نام پر زہر دے کر ہلاک کرنا... اس نے مجھے دہرے خواب دکھائے... ایک اپنی محبت کا اور اس زندگی کا جو مستقبل میں میری ہو سکتی تھی۔ دوسرے اعلیٰ تعلیم کے لیے مدد کا... دوسرے خواب کی تعبیر درحقیقت اس خدمت کا معاوضہ تھا جو میں نے اس کے لیے انجام دی... اسے رئیس کی قید سے رہائی دلانے میں صرف میری مدد کارگر تھی... ورنہ کسی طرح بھی وہ نجات حاصل نہیں کر سکتی تھی۔

مجھ سے محبت اسے کبھی نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی۔ یہ جال اس نے مجھے ٹریپ کرنے کے لیے بچھایا تھا۔ اگر وہ صاف کہتی کہ پچیس لاکھ تو اور میرے شوہر کو قتل کر دو تو میں کرائے کا قاتل بننے سے پہلے لاکھ بار سوچتا اور یقین ممکن تھا کہ انکار کر دیتا یا کسی کو بتا دیتا۔ اس نے پہلے مجھے جذباتی طور پر بے بس کیا پھر مجھے ایک خواب کی زنجیر سے باندھ دیا۔ وہ خوب صورت اور ذہین عورت تھی۔ لندن میں پلی بڑھی تھی۔ نہ جانے اس کے کتنے پرستار ہوں گے کسی ایک کے ساتھ اس نے بھی عہدِ وفا کیا ہوگا... زندگی گزارنے کا سوچا ہوگا لیکن تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا... شاید اب وہ اسی کے ساتھ باقی زندگی گزارے گی... آج نہ سہی کچھ عرصے بعد... آخر بڑی بیگم اسے کب تک باہر نہیں نکلنے دے گی۔ وہ برطانوی شہری ہے... سفارت خانے تک پیغام پہنچا سکتی ہے۔

تاہم اس نے احسان فراموشی نہیں کی تھی۔ اس نے میرا پورا معاوضہ ادا کیا تھا اور ایک پیغام بھی دے دیا تھا کہ آدمی کو پریکٹیکل ہونا چاہیے۔ جذباتی نہیں... زندگی میں پیسہ کام آتا ہے... محبت نہیں۔ یہ جیسے کی جا سکتی ہے ایسے ہی بھلائی بھی جا سکتی ہے... کچھ دن بعد میں نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا۔ پچیس لاکھ کی رقم نے میرے احساس کے زخموں سے بہنے والا خون روکنے میں بہت مدد کی۔ میں نے دوڑ دھوپ کی... پاسپورٹ کے حصول سے اعلیٰ تعلیم کے لیے داخلے تک کے سارے معاملات طے ہونے تک میں شہر بانو کو بالکل بھول چکا تھا اور اپنی خوش قسمتی پر نازاں تھا کہ تقدیر نے مجھے یہ موقع فراہم کر دیا جس کے لیے میرے جیسے ہاتھ پاؤں مارنے کے باوجود ناکام رہتے ہیں... انہیں کوئی شہر بانو نہیں ملتی۔

اس بات کو اٹھارہ سال گزر گئے۔ اعلیٰ تعلیم مکمل کر کے میں ایک کامیاب سرجن بن گیا اور پانچ سال لندن کے ایک بہت بڑے اسپتال میں کام کر کے وطن لوٹ آیا۔ یہ تجربہ میری کامیابی کا ضامن بنا اور بہت اچھی تنخواہ پر مجھے ایک بڑے اسپتال میں اسسٹنٹ پروفیسر رکھ لیا گیا۔ بہت جلد میں پروفیسر بن گیا۔ تنخواہ سے زیادہ مجھے پرائیویٹ پریکٹس کی آمدنی تھی۔ میں شام کو ایک نامور اسپتال میں آپریشن کرتا تھا جہاں صرف دولت مند ہی علاج کرا سکتے تھے۔

اب تم پوچھو گے کہ میں نے سب کچھ کیا تو شادی کیوں نہیں کی؟ تمہارے ذہن میں یہ خیال آنا بالکل فطری بات ہے کہ شہر بانو کے پیسے سے کامیابی خریدنے کے بعد کیا میں نے اسے بھلا دیا تھا؟ تو اس کا جواب ہے نو... یہ ممکن نہ ہو سکا... وہ بدستور میرے جذبات و خیالات کی دنیا پر اس طرح قابض رہی کہ کسی دوسری عورت کے خیال کا دل میں داخلہ ہی نہ ملا۔ میں نے اسے لندن میں قیام کے دوران میں بہت تلاش کیا۔ ہر ممکن ذریعے سے اس تک پہنچنے کی کوشش کی۔ میں نے اخبار میں اشتہاروں... پرائیویٹ سراغرساں کی خدمات حاصل کرلیں... کوچہ و بازار میں میری نگاہ اس کو تلاش کرتی رہی اور کئی بار مجھے دھوکا بھی ہوا۔ مجھے خفیف بھی ہونا پڑا... اسے نہ ملنا تھا... نہ وہ ملی۔

یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے... وہ دنیا میں ایک ہی عورت تو نہیں تھی۔ اس سے ہزار درجہ حسین اور پُرکشش ہوں گی لیکن وہ مجھے اسیر کرنے میں ناکام رہیں۔ دوستوں نے میرا مذاق اڑایا... میرا نام مجنوں رکھ دیا... کہا کہ اب تک وہ چار بچوں کی ماں بن گئی ہوگی اور کیا پتا زندہ بھی ہے یا نہیں... اس کی سوکن نے اسے بھی ٹھکانے نہ لگا دیا ہو۔

میرا خیال ہے شہر بانو اس کا اصل نام نہیں تھا۔ جو اس نے مجھے بتایا تھا۔ حویلی میں تو اسے چھوٹی بیگم صاحبہ ہی کہا جا سکتا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ لندن میں ہی نہ ہو۔ وہ نیویارک یا پیرس چلی گئی ہو... بس ایک اس کا تصور تھا کہ میرے ساتھ تھا... میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ عورت کا میری زندگی میں کوئی دخل نہ تھا۔ ایک جسمانی ضرورت پوری کرنے کے لیے نہ جانے میری زندگی میں کتنی آئیں اور گئیں... کچھ نے سنجیدگی سے میرے ساتھ رشتۂ ازدواج قائم کرنے کی پوری کوشش کی اور وہ اچھی عورتیں تھیں... حسین معزز اور تعلیم یافتہ لیکن دل ہی نہ مانے تو کوئی کیا کرے۔

عام خیال یہی تھا کہ میں دنیا سے جاؤں گا تو آفیشل ریکارڈ میں مجھے مرحوم کنوارا ہی لکھا جائے گا اور مجھے رونے والی یا میری موت پر آزادی کی خوشی کا لطف لینے والی نہ کوئی بیوہ ہوگی اور نہ میری اولاد... لیکن وہ اٹھارہ سال بعد مجھے پھر مل گئی... ایسے اچھلنے کی ضرورت نہیں... زندگی ایسے ہی حیرت انگیز اتفاقات کے مجموعے کا نام ہے... تمہاری بھی اور میری بھی...

ایک دن مجھے حیدرآباد سے ایک سیاسی شخصیت کا فون موصول ہوا جو اپنے علاقے کا بہت بڑا جاگیردار بھی تھا اور پیر بھی۔ صدیوں سے اس علاقے کے لوگ ان کے مرید تھے اور وہ ہر دور میں اس علاقے سے عوام کے نمائندے بھی انہی لوگوں کے ووٹ سے منتخب ہوتے تھے۔ اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس کے والد کو دیکھ لوں جو بہت سی ذاتی وجوہ کی بنا پر اسپتال آ کے اپنا معائنہ نہیں کرا سکتے۔ میں انکار کر سکتا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ اس کے بعد مجھ پر مختلف سمتوں سے دباؤ بڑھے گا۔ مجھے اوپر والوں کے فون آئیں گے یا کچھ لوگ خوش اخلاقی کے ساتھ مجھے زبردستی لے جائیں گے۔ اس کے علاوہ میں ذاتی طور پر بھی اشرف علی کو جانتا تھا۔ میرے تذبذب پر اس نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! ایسی کوئی ایمرجنسی نہیں... آپ کو جب فرصت ہو بتا دینا۔ گاڑی بھیج دی جائے گی۔''

اشرف علی باہر کا پڑھا ہوا اور موجودہ صوبائی اسمبلی کا رکن بھی تھا۔ زمینوں کے ساتھ ان کی فیملی نے باہر بھی جائدادوں میں کافی سرمایہ کاری کر رکھی تھی۔ اپنے ماتحتوں، نوکروں یا ہاریوں کے ساتھ ان کا رویہ کیسا بھی ہو... اپر کلاس کے جس حلقے میں ان کا اٹھنا بیٹھنا تھا وہاں وہ انتہائی مہذب اور معقولیت پسند رہتے تھے۔ ایک طرح سے یہ میرے لیے اعزاز کی بات تھی کہ اشرف نے میرا انتخاب کیا اور پھر خود مجھے فون کر کے یہ درخواست کی... یہاں تو ایسے فرعون صفت حکمراں طبقے سے تعلق رکھنے والے دولت مند افراد کی اکثریت ہے جو صرف حکم دینا جانتے ہیں اور حکم عدولی برداشت نہیں کرتے... اشرف کا کوئی پنے دار یا منشی بھی مجھے یہ پیغام دیتا تو اس کی اہمیت کم نہ ہوتی۔

اگلے دن ایک دیوپیکر سیاہ رنگ کی پراڈو آئی اور مجھے حیدرآباد لے گئی۔ لطیف آباد کے سب سے خوش حال اور پوش بلاک میں ایک محل جیسی کوٹھی تک میں دو گھنٹے میں پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا کہ حیدرآباد کی ہر سڑک پر ٹریفک پولیس والے اس گاڑی کو ہاتھ اٹھا کے سلام کرتے تھے یہ جانے بغیر کہ اندر کون بیٹھا ہے۔

یہ حویلی نہیں تھی۔ جدید طرز کا وسیع و عریض بنگلا تھا مگر روایتی انداز میں یہ حویلی ہی کہلاتی تھی۔ باغ کے دوسرے کنارے پر ایک مہمان خانہ تھا جس میں مجھے ٹھہرایا گیا۔ وہاں بھی دولت مندی کے لوازم پوری طرح فراہم کیے گئے تھے۔ خادم تھے جو میرے ایک اشارے پر اعلیٰ ترین شراب پیش کر دیتے اور فرمائش کرتا تو میری خلوت کو کسی خادمہ کے شباب سے آباد کرنے میں تکلف نہ کرتے۔ دوپہر کا کھانا میں نے اکیلے کھایا... کھانے کی میز پر دس افراد کے لیے دس قسم کے مرغن کھانے موجود تھے مگر میں نے صرف



دال چاول پر اکتفا کیا۔ ظاہر ہے باقی ''جھوٹا کھانا'' ملازموں نے مل کے کھایا ہوگا۔

اشرف میرے پاس شام کو آیا اور معذرت کی کہ دن بھر وہ حیدرآباد سے دور کسی کام میں الجھا ہوا تھا۔ ''والد صاحب کے ساتھ رات کا کھانا ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''اشرف علی صاحب! کیا مجھے یہاں دعوتیں اڑانے کے لیے بلایا گیا... جس کام کے لیے میں آیا ہوں...''

وہ ہنسا۔ ''دراصل والد صاحب بڑے موڈی آدمی ہیں۔ ان کی مرضی سے ہر کام کرتے ہیں... ساری ذمے داریاں انہوں نے مجھے سونپ دی ہیں خود حویلی سے ہفتے میں ایک بار نماز جمعہ کے لیے نکلتے ہیں تو ان کے مرید جمع ہو جاتے ہیں۔''

''باقی وقت وہ کیا کرتے ہیں؟''

''کچھ نہیں... آرام... کچھ کتابوں کا مطالعہ...'' حویلی کے معاملات کی نگرانی۔ کبھی چاہا تو حساب کتاب دیکھ لیا۔ پہلے باغ میں پوتوں کے ساتھ فٹ بال کھیلتے تھے۔ علاقے کے دورے بھی کرتے تھے لیکن نہ جانے کیوں آہستہ آہستہ ان کی ٹانگوں میں درد بڑھتا جا رہا ہے اور وہ واش روم بھی بڑی مشکل سے جاتے ہیں۔''

''ان کی عمر کتنی ہے؟ اور وزن کیا ہے؟''

''عمر تو زیادہ نہیں... ستر کے ابھی نہیں ہوئے... ہاں وزن کچھ زیادہ ہے... تقریباً ایک سو اسی کلو تھا پہلے۔''

''کیا یہ درد اچانک شروع ہوا؟''

''ہمیں تو اسی روز پتا چلا... جب انہوں نے بتایا... اپنی تکلیف کو وہ ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ ہم تو چاہتے تھے کہ وہ علاج کے لیے یورپ یا امریکا چلے جائیں مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ میں ان شراب پینے والے اور سور کھانے والے گوری چمڑی کے ڈاکٹرز... کو اجازت نہیں دے سکتا کہ اپنے ناپاک ہاتھ میرے جسم کو لگائیں۔ کیا پاکستان کے ڈاکٹر مر گئے ہیں کہ میں پھر ان کا محتاج بن کر جاؤں جنہیں ہم نے بڑی جدوجہد کر کے اس ملک سے نکالا تھا۔''

اپنی زندگی گزارنے کے ڈھنگ... اصول اور نظریات کے معاملے میں ہر شخص خود مختار ہے خواہ اس کی انتہا پسندی دوسروں کو پسند نہ ہو اور وہ اسے خبطی سمجھنے لگیں۔ ستر سال کی عمر میں جسے ہم بڑھاپے سے تعبیر کرتے ہیں یہ فرق اگلی نسل کو بہت نمایاں طور پر محسوس ہوتا ہے۔ اس سے جنریشن گیپ جیسے مسائل ہی جنم لیتے ہیں۔ اشرف علی کے اور اس کے پرانے وقتوں کے والد شرافت علی کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

مغرب کے بعد میں ان سے ملا تو شرافت صاحب ایک کنگ سائز مسہری پر نیم دراز تھے۔ میرے لیے ان کے قریب کرسی لگا دی گئی۔ اندازہ تو میں قائم کر چکا تھا لیکن ان کا تفصیلی معائنہ کیے بغیر میں علاج شروع نہیں کر سکتا تھا۔ انہوں نے گاؤ تکیے سے تھوڑا سا اٹھ کے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

میں نے کہا۔ ''شرافت صاحب... آپ نے مجھے طلب کیا... میری بڑی عزت افزائی ہے... لیکن میری وضاحت کو آپ گستاخی نہ سمجھیں... میں علاج اپنی مرضی سے کروں گا... آپ کی مرضی نہیں چلے گی۔''

وہ ہنسنے لگے۔ ''او بابا تم جو چاہو کرو... بے شک ہمارا پوسٹ مارٹم کر دو جیتے جی... ہم تو بس دعا کر سکتے ہیں تمہارے حق میں... تم سے نذرانہ کوئی نہیں لیں گے پیر ہونے کے باوجود... نذرانہ پیش کریں گے۔''

وہ خوش مزاج آدمی تھا۔ اپنی عمر اور پوزیشن کے باعث اس کے مزاج میں حاکمانہ نخوت آ گئی تھی چنانچہ میں نے اسے ڈیل کرتے ہوئے یہ خیال رکھا کہ اس کے احترام میں فرق نہ آئے... ہر ڈاکٹر مریضوں سے ملتا ہے اور خود ہی انسانوں کا مزاج شناس ہو جاتا ہے۔

شرافت صاحب کا مسئلہ بہت عام قسم کا تھا۔ مسلسل بیٹھے رہنے اور مرغن کھانوں سے اس کا وزن بڑھ گیا تھا۔ جسم کے لیے کسی قسم کی حرکت کی گنجائش نہ تھی۔ ہر کام نوکر کرتے تھے۔ خود اٹھ کے پانی پینا بھی گویا شان کے خلاف تھا... کہیں چار قدم بھی جانا ہو تو گاڑی حاضر... کوئی کھیل یا ایکسرسائز کرنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ نتیجہ یہ کہ غیر متحرک رہنے والے جوڑ جام ہو گئے۔ گھٹنوں میں درد رہنے لگا پھر کمر میں ریڑھ کی ہڈی کے مہرے متاثر ہوئے اور ایک ڈسک سلپ کر گئی۔ مہروں کے درمیان ایک گیپ آ گئی... پہلے اسے عرق النسا کا درد ہی کہا جاتا تھا جو بائیں ٹانگ میں اس حد تک بڑھ جاتا تھا کہ پوری ٹانگ کو مفلوج کر دیتا تھا۔

اگلے دن میں نے ایکسرے اور ایم آر آئی کے لیے اصرار کیا اور انہیں راضی کر لیا کہ وہ میرے ساتھ ایک مقامی اسپتال تک جائیں... ایکسرے کا انتظام گھر پر ہو سکتا تھا مگر ایم آر آئی کی مشین یا سی ٹی اسکین صرف اسپتال میں ممکن تھا۔ اسپتال میں انہیں وی آئی پی ٹریٹمنٹ کیسے نہ ملتا۔ میں نے ایک مقامی نیوروسرجن سے ڈسکس کیا اور فیصلہ کیا کہ پہلے فزیوتھراپی آزمائی جائے اور اس کے ساتھ دوائیں... اگر

فائدہ نہ ہوا تو پھر سرجری ناگزیر ہوگی۔

رات کو میں نے شرافت صاحب کو ان کے بیٹے کی موجودگی میں اپنی رائے سے آگاہ کر دیا... یہ سمجھایا کہ فزیوتھراپی کیسے ہوگی اور کون کرے گا... اس کی پروگریس رپورٹ... مجھے ملتی رہے گی... فزیوتھراپسٹ ہر شام آئے گا... میں ہر ہفتے لیکن میں ان سے، اشرف سے اور فزیوتھراپسٹ سے رابطے میں رہوں گا۔

شرافت صاحب نے ساری بات تحمل سے سنی۔ ''ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب... آپ جیسا کہو گے ویسا ہی ہوگا لیکن علاج کے دوران آپ یہاں موجود رہو گے... یہ سب خود...''

میں نے کہا۔ ''فزیوتھراپسٹ ڈاکٹر ہوتا ہے... اس کے علاوہ یہاں کا سب سے اچھا نیورو فزیشن روز آسکتا ہے۔''

وہ اپنی بات پر قائم رہے۔ ''میں تمہاری بات کر رہا ہوں... علاج بھی تم کرو گے نگرانی بھی... ورنہ مجھے علاج نہیں کرانا... اپنی فیس لو اور جاؤ... تمہارا بہت شکریہ کہ اپنا قیمتی وقت ہمارے لیے نکالا۔''

میں پریشان ہو گیا... ''شرافت صاحب... میرا اسپتال ہے میں وہاں سے غیر حاضر کیسے رہ سکتا ہوں؟''

''تم چھٹی لے سکتے ہو... وہاں اور ڈاکٹر بھی ہوں گے۔''

''مگر اتنی لمبی چھٹی... ممکن نہیں...''

''وہ ہماری ذمے داری... دو مہینے یا دو سال... کتنی چھٹی چاہیے تمہیں... کہو تو ادھر بلا کے وزیر صحت سے لکھوا دیں۔''

''یہ بات نہیں۔''

''پھر... تنخواہ کی فکر ہے؟'' انہوں نے خفا ہوئے بغیر پوچھا۔

''ہرگز نہیں... میں یہ کر سکتا ہوں کہ ہر روز آپ کو دیکھنے آجاؤں... شام کو آکے رات کو چلا جاؤں... اس طرح اس کام پر بھی اثر نہیں پڑے گا۔''

اشرف سر جھکائے کھانا کھاتا رہا... وہ جانتا تھا کہ ابا جی کی ضد کے آگے کسی کی نہیں چلتی... بالآخر مجھے ہی ان کی بات ماننا پڑے گی۔

''ہاں یا نہ... ایک بات بولو۔'' شرافت صاحب نے میری بات کاٹ دی۔

میں نے بے بسی سے اشرف کی طرف دیکھا تو اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلا کے مجھے اقرار کا پیغام دیا... میں نے ہار مان لی۔ ''جیسا آپ کا حکم! آپ کی ذمے داری میں نے لی ہے... میری ذمے داری آپ پر۔''

''ڈاکٹر صاحب... یہ بھی کوئی بتانے والی بات ہے... بس آج سے آپ ہمارے مہمان ہو... آپ کا حکم ہمارا حکم... حویلی میں سب آپ کے تابعدار۔''

اب میرے لیے سخت آزمائش کا دور شروع ہوا۔ میں نے انتہائی احتیاط سے فزیوتھراپی اور علاج شروع کیا۔ شرافت صاحب تو چاہتے تھے کہ سب کچھ حویلی میں ہو... جس مشین کی ضرورت ہو وہیں منگوالی جائے لیکن یہ ممکن نہیں تھا کیونکہ کچھ مشینیں بازار میں کیا یورپ، امریکا میں بھی فوری دستیاب نہیں ہوتیں۔ ان کے لیے آرڈر دے کر مہینوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ میں شرافت صاحب کو اپنے والد جیسا احترام دیتا تھا مگر بچوں کی طرح ٹریٹ کرتا تھا۔ میرے کہنے سے وہ رفتہ رفتہ ہر بات ماننے لگے تھے۔ میں انہیں لے کر مقامی اسپتال کے فزیوتھراپی سینٹر میں لے جاتا۔ باقی وقت گھر میں ان سے ایکسرسائز کراتا تھا اور ان کو حویلی کے باغ میں چکر لگواتا۔ ان کے اور پوتوں کے ساتھ فٹ بال کھیلتا۔ مقصد انہیں متحرک رکھنا تھا۔ ان کے درد کا احساس تو دواؤں نے مٹا ہی دیا تھا۔ وہ رفتہ رفتہ ایکٹو ہوتے گئے اور میں نے دو ہفتے میں ان کی حالت میں واضح فرق محسوس کیا۔

لیکن یہ دو ہفتے خود میرے لیے بہت مشکل ثابت ہوئے۔ میں ایک طرح سے شاہی خادم خاص ہو کے رہ گیا تھا۔ میری اپنی کوئی مصروفیت تھی اور نہ دلچسپی۔ اشرف تمام وقت باہر رہتا۔ رات کے وقت مہمان خانے میں کوئی میرے ساتھ نہیں ہوتا تھا اور سوائے ٹی وی میں فلمیں دیکھنے کے میرے لیے تفریح کوئی نہ تھی۔ ایک ملازم اور ایک ملازمہ ہمہ وقت میرے اشارے پر ہر چیز فراہم کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ حد یہ ہوتی کہ وہ ملازمہ جو خاصی جوان اور بھرے بدن والی عورت تھی، ایک رات خود میرے بیڈ روم میں آکے کھڑی ہو گئی۔ میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے تو اس نے اپنے سارے کپڑے اتار دیے... ظاہر ہے اسے کہا گیا تھا کہ خود کو مہمان کی مدارات کے لیے پیش کرو اور حکم کی تعمیل اس کا فرض تھا۔

حویلی سے مہمان خانے کا فاصلہ شاید دو سو گز ہوگا۔ ایک فصیل تھی جس نے دونوں کا احاطہ کر رکھا تھا۔ حویلی کے صدر دروازے تک ایک سڑک پر سرخ بجری جمی ہوئی تھی۔ یہی سڑک گھوم کے دوسرے دروازے سے باہر لے جاتی



تھی۔ ملازموں کی رہائش عقبی حصے کے آخر میں تھی۔ وہ باہر آنے جانے کے لیے فصیل کا کوئی پچھلا دروازہ استعمال کرتے ہوں گے۔ اس لیے ہی ایک دروازہ مہمان خانے کا تھا جو شمالی حصے کی فصیل میں بنا ہوا تھا۔

ایک رات میں بیزاری کے عالم میں ٹی وی پر کوئی انگلش فلم دیکھ رہا تھا کہ کسی نے پیچھے کا دروازہ بجایا۔ میری خدمت پر مامور ملازمہ اور ملازم رات بارہ بجے اجازت لے کر سونے کے لیے اپنے کوارٹر میں چلے جاتے تھے۔ میں خود ہی دروازہ کھولنے گیا۔ باہر بارش ہو رہی تھی اور تیز ہوا تھی۔ میں نے اپنے سامنے ایک نوعمر مقامی نوجوان کو دیکھا جو چادر پہنے کھڑا تھا۔ پھر بجلی چمکی تو میں نے ایک تانگے میں بیٹھی ہوئی کسی عورت کو دیکھا جس نے خود کو برقع میں چھپا رکھا تھا۔

میں نے کہا۔ ''کیا بات ہے... کون ہو تم؟''

نوجوان نے ہاتھ جوڑ کے مجھے سلام کیا۔ ''ہماری چھوٹی بیگم صاحبہ آپ سے ملنا چاہتی ہے ڈاکٹر صاحب... وہ بیمار ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کیا وہ مجھے جانتی ہے؟ خیر اسے اندر لا کے اس کمرے میں بٹھاؤ۔''

میں صرف نیکر اور بنیان میں تھا جو کسی بھی عورت کے سامنے جانے کے لیے نامناسب لباس تھا۔ کپڑے پہن کے جب میں مہمان خانے کے ڈرائنگ روم میں پہنچا تو وہ عورت دیوار کی طرف منہ کیے ایک تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے کھنکار کے اسے اپنی موجودگی کا احساس دلایا لیکن اس کے انہماک میں فرق نہ آیا۔

میں نے کہا۔ ''خاتون... آپ خود کو دکھانے آئی ہیں یا تصویر دیکھنے... اور آپ کو میرے بارے میں...''

وہ اچانک پلٹی تو میرا جملہ نامکمل رہ گیا۔ میں خود انتہائی حیرت سے پتھر کے بت میں تبدیل ہو گیا۔ اس نے برقع کی نقاب ہٹا دی تھی اور اب اس کا چہرہ میرے سامنے تھا۔ وہ شہر بانو تھی۔ میری نظریں اس پر جم کے رہ گئی تھیں اور حواس میرا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ میں نے جو دیکھا تھا، ناقابل یقین تھا۔ ناممکن تھا۔ اٹھارہ سال بعد شہر بانو مجھ سے ملنے کیسے آسکتی تھی۔ وہ لندن سے آئی تھی اور لندن جانا چاہتی تھی۔ پھر شاید کہیں اور چلی گئی تھی۔ میں نے ایک عمر اس کی تلاش ناکام کی نذر کر دی تھی۔

اس نے اچانک بڑے درشت لہجے میں کہا۔ ''ایسے کیا گھور رہے ہو مجھے... کیا تم نے پہلے کبھی کوئی عورت نہیں دیکھی؟''

میں ایک دم ہوش میں آگیا۔ ''شہر بانو... تم... شہر بانو ہو نا... تم نے پہچانا مجھے؟''

''یہ کیا بکواس ہے... کیا شہر بانو شہر بانو کی رٹ لگا رکھی ہے... کون ہے یہ شہر بانو...؟'' اس نے بڑی نخوت سے کہا۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو... میری زندگی گزر گئی تمہیں تلاش کرتے اور آج تم ملی ہو تو کہتی ہو، میں شہر بانو نہیں ہوں... تمہیں اندازہ نہیں...''

''یا میرے خدا... یہ میں کہاں آگئی؟'' اس نے بڑے انداز دلبری کے ساتھ ہاتھ اٹھا کے کہا۔ ''مجھے کیا معلوم تھا کہ واسطہ یہاں ایک پاگل سے پڑے گا... میں جا رہی ہوں۔'' وہ دروازے کی طرف مڑی۔

اچانک مجھے جیسے ہوش آگیا۔ ''ٹھہرو... آئی ایم سوری... تم پہلے میری بات سن لو... ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔''

اس کے انداز و اطوار میں عجیب غرور آمیز متانت تھی اور بے اعتنائی کا وقار تھا۔ یوں جیسے وہ کسی ڈاکٹر سے نہیں اپنے کسی ادنیٰ ملازم سے بات کر رہی ہے اور وہ مریض نہیں میری مالکن ہے... حیرت کی بات یہ ہے کہ میں نے اس کے اہانت آمیز رویے کا برا نہیں مانا۔

وہ رک گئی۔ ''کہو جو کہنا ہے... میرے پاس وقت کم ہے۔''

میں نے برہم ہو کے یہ نہیں کہا کہ بی بی تمہیں جلدی ہے تو جاؤ... تم اپنی غرض سے آئی تھیں... میں نے تو نہیں بلایا تھا تمہیں... لیکن میں نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ''خاتون! مجھے غلط فہمی نہیں ہوئی... دراصل جسے میں تلاش کرتا پھر رہا ہوں یعنی شہر بانو... اور آپ کی صورت میں مشابہت ناقابل یقین حد تک ہے... برا نہ مانیں تو میں پوچھوں آپ کا نام کیا ہے؟''

''اصل نام میں بتا نہیں سکتی... میری مجبوری ہے... تم نام کا کیا کرو گے؟''

میں نے عاجزی سے کہا۔ ''اچھا یہ تو بتا دیں... کیا آپ شہر بانو کی کوئی جڑواں بہن یا اس کی بیٹی ہیں؟''

''پھر وہی بے تکی باتیں... میں نے کہا نا میرا کسی شہر بانو سے دور کا بھی تعلق نہیں... اب آپ کام کی بات کریں گے یا میں جاؤں؟''

میں نے عاجزی سے کہا۔ ''آئی ایم سوری... فرمائیے آپ نے اس وقت کیسے زحمت کی؟ آپ کے ملازم نے کہا تھا؟''

"میں نے اسی لیے ملازم کو باہر بھیج دیا ہے کہ میں اس کے سامنے بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔"

"اچھا آپ تشریف رکھیے۔"

اس نے اپنی فطری متانت اور بے اعتنائی کا انداز برقرار رکھا۔ "میں بیٹھنے نہیں آئی... مجھے تم سے ایک کام تھا۔"

اب تک میں حساب لگا چکا تھا کہ وہ شہر بانو کی بہن ہرگز نہیں ہوسکتی... وہ تقریباً اسی کی ہم عمر نظر آتی تھی... بیٹی بہت کم عمر ہوتی اور وہ خود ہوتی تو اتنی جوان نظر نہ آتی۔

"ڈاکٹر... تمہاری خاموشی کا میں کیا مطلب لوں... تم میرا کام کرو گے یا نہیں... اگر معاوضے کی فکر ہے تو تم جتنا مانگو گے ملے گا۔"

اچانک جیسے مجھے ہوش آگیا۔ احساس ہوگیا کہ میں خوامخواہ اس کے سامنے بھیگی بلی بنا کھڑا ہوں اور وہ مجھے اپنے رویے سے مسلسل ذلیل کر رہی ہے۔ میں اتنا بڑا ڈاکٹر تھا۔ میری شہر میں کیا ملک میں عزت تھی اور وہ صرف ایک مریض... اسے کیا حق پہنچتا ہے کہ مجھے یوں بے عزت کرے۔

میں نے سنبھل کے کہا۔ "خاتون! اپنا مسئلہ بتائیے... اس کے بعد میں طے کروں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "میں ماں بن رہی ہوں... اس کی تصدیق ہوچکی ہے۔"

"یہ تو کوئی بیماری نہیں ہے۔"

"لیکن میں یہ رسک نہیں لے سکتی۔" اس نے کسی احساسِ پشیمانی کے بغیر کہا۔

"کیوں؟ شادی نہیں ہوئی ہے آپ کی؟"

اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے میرا سوال افسوسناک حد تک احمقانہ ہے۔ "میری شادی کو آٹھ سال ہوگئے۔ ابھی تک اولاد نہیں تھی۔"

"پھر تو یہ خوشی کی بات ہے۔"

"میرے لیے خطرے کی بات ہے... میرا شوہر کئی ماہ سے باہر ہے اس کے واپس آنے سے پہلے میں اس مصیبت سے نجات پانا چاہتی ہوں۔" وہ اعترافِ جرم کرتے ہوئے ذرا شرمسار نہ تھی۔

"اوہ... اب میں سمجھا۔"

"خدا کا شکر ہے کہ تم سمجھ گئے... اس بچے سے میری جان چھڑا دو۔ میں تمہیں منہ مانگے پیسے دوں گی۔"

مجھے سخت طیش آیا۔ "خاتون! آخر کیا سمجھ کے آپ نے ایسی بات کی۔ کیا میں ابارشن کر کے پیسا کمانے والا ڈاکٹر ہوں؟ میں اس ملک کا ایک نامور سرجن ہوں جسے شرافت علی نے بطور خاص کراچی سے بلایا ہے۔"

"وہ مجھے معلوم ہے... شرافت علی کو تمہارے علاج سے جتنا فائدہ ہوا ہے وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں... تمہارے لیے یہ معمولی کام ہے۔"

"شٹ اپ... میں ایسا نہیں کرسکتا... یہ جرم ہے۔"

اس نے حقارت سے سر جھٹکا۔ "خاک جرم ہے... ہر ڈاکٹر یہ کام کر رہا ہے... میں تمہیں اس کے دس لاکھ دوں گی... کراچی میں آکے۔"

"دس لاکھ کیا میں دس کروڑ میں بھی تمہارے گناہ کی پردہ پوشی کے جرم میں شریک نہیں ہوسکتا۔ اس سے کہو نا جس کا یہ کارنامہ ہے۔"

"اسی نے مجھے تمہارے پاس بھیجا تھا۔" وہ سکون سے بولی۔

"نام بتاؤ مجھے کمینے کا۔"

"اسے گالیاں مت دو... دس لاکھ کم ہیں تو بتاؤ۔"

میں نے برہمی سے کہا۔ "دیکھو... میں ایک سرجن ہوں... یہ کام تو یہاں کی معمولی دائی بھی کرلے گی۔"

"یہ رازداری کا معاوضہ تھا۔ تم کراچی میں ہو... میں وہیں آجاؤں گی... میں کوئی رسک نہیں لے سکتی۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں دس لاکھ پر تھوکتا ہوں۔"

وہ کھڑی مجھے گھورتی رہی۔ "چلو اپنی قیمت بتاؤ۔"

میں نے ایک گہری سانس لی اور اسے دیکھا۔ اگر وہ شہر بانو تھی تو آج میرے پاس یہ موقع تھا کہ میں اس سے اپنی زندگی بھر کی ناکامی کا انتقام لے سکوں... جس طرح اس نے مجھے استعمال کیا تھا اس کا بدلہ میں آج اسے استعمال کر کے لے سکتا تھا۔ کل میں عشق کے ہاتھوں مجبور تھا۔ آج وہ ضرورت کے ہاتھوں مجبور تھی اور اس کے باوجود پھر مجھے بے وقوف بنا رہی تھی۔

میں نے کہا۔ "معاوضہ دو گی تم؟ جو میں نے مانگا؟"

وہ چونکی۔ "کیا مطلب؟"

"مطلب صاف اور واضح ہے... یہ کام میں چٹکی بجاتے کر دوں گا... نہ تمہیں احساس ہوگا کسی تکلیف کا... نہ کسی کو معلوم ہوگا... لیکن اس سے پہلے تم میرے ساتھ رہو گی... تین دن... بولو منظور ہے؟"

اس نے دانت پیس کے شعلہ بار آنکھوں سے مجھے


بالآخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں

ماہنامہ سرگزشت کراچی

پرائم ایٹ بلز

ہر بک اسٹال پر پہنچ گیا

شمارہ اگست 2011ء کی جھلکیاں

**مکروہ:** اس شخص کی کتھا جس نے خدائی کا دعویٰ کیا اور آسمان پر مزید ایک چاند روشن کردیا۔

**21 سمبر 2012:** تمام پرانے کاہنوں کی پیش گویاں اس تاریخ کو دنیا فنا ہوجائے گی۔

**اہراموں کے اسرار:** کئی براعظموں میں واقع دیوہیکل عمارتیں دوسری دنیا کی مخلوق کی تعمیر کردہ ہیں؟

**گمشدہ سلطنت:** سمندر کے ٹھاٹھیں مارتے پانی تلے نظر آنے والا وہ عظیم الشان شہر کس نے تعمیر کیا؟

ان کے علاوہ: فلمی صنعت کی انسائیکلوپیڈیا جیسی "**فلمی الف لیلہ**" اور تیز ٹیمپو کی سرگزشت **سراب** دنیا بھر میں سب سے زیادہ اسرار بھرا خطہ "**برمودا**" جس کی پراسراریت اظہر من الشمس ہے۔ دورِ حاضر کے سب سے بڑے شعبدہ باز "**ڈیوڈ کوپر فیلڈ**" کا تذکرہ خاص اور ہزاروں سال قبل بنی گئی ایکڑز مین پر محیط پراسرار اشکال کا بیان جو صرف فضا سے مکمل نظر آتی ہیں۔

جاپان کے انوکھے جوگی کی روداد، دنیا کے سب سے مشہور پیش گویاں کرنے والے کا زندگی نامہ اور سرگزشت کے معیار کی آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، سچ بیانیاں وہ سب کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں آپ کو پڑھنا چاہیے

سطر سطر اسرار و تجسس کے پردوں میں لپٹی تحریریں

اگست 2011ء کے سرگزشت میں ملاحظہ کریں

دیکھا۔ ''ذلیل آدمی... آخر کیا سمجھا ہے تم نے مجھے؟ میں کوئی طوائف ہوں... تم میرے جسم کا سودا کررہے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں... اپنی قیمت میں نے بتادی... اب فیصلہ تم کرلو... ہاں یا نہ... اب فیصلہ تمہارے لیے مشکل نہیں ہونا چاہیے... آخر شوہر کے علاوہ بھی کوئی مرد تھا جس نے تمہیں استعمال کیا... اور تمہیں میرے پاس آنے پر مجبور کردیا... اب ایک کی جگہ دو مرد ہوں... کیا فرق پڑتا ہے۔''

وہ چہرے پر نقاب ڈال کے طوفان کی طرح دروازے کی طرف بڑھی۔ ''بہت بڑی غلطی کی میں نے یہاں آکے۔''

''اس سے بڑی غلطی تم پہلے کرچکی تھیں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

وہ دروازہ کھول کے نکلی اور بارش میں بھاگتی ہوئی تانگے تک گئی۔ پھر اچانک جیسے مجھے ہوش آگیا۔ دل نے کہا۔ دیکھ وہ جارہی ہے۔ عقل نے کہا۔ یہ کوئی اور ہے جس کی صورت اس سے ملتی ہے۔ دل پھر مچلا... کیا پتا یہ وہی ہو... تو نے اسے شہر بانو ہی سمجھا تھا کتنا عرصہ تو اس کی جستجو میں سرگرداں رہا... وہ پھر تیرے پاس آئی ہے تو اس کے ساتھ ایسی بے رخی... یہ بے اعتنائی... ایسا ذلت آمیز سلوک... عقل نے کہا کہ پہلے بھی وہ اپنی غرض سے آئی تھی۔ اس نے تجھے خریدا تھا... آج پھر وہ تیرے ضمیر کا سودا کرنے آئی تھی... یہ محبت نہیں تھی۔

قصہ مختصر... میں دیوانہ وار نکل کے تانگے کے پیچھے دوڑا... شدید بارش نے مجھے شرابور کردیا۔ میرے پیر کیچڑ میں بھر گئے۔ جوتے پہننے کا مجھے ہوش ہی نہ تھا۔ اردگرد ویرانی تھی۔ اور تیز ہوا کا شور... بادلوں کی گرج... درخت جیسے سر پٹخ رہے تھے اور آسمان رو رہا تھا... اس وقت کوئی مجھے دیکھتا تو دیوانہ سمجھتا۔

دو جگہ میں پھسل کے گرا اور پھر اٹھ کے دوڑا... میں کیچڑ میں لت پت ہوگیا تھا۔ میرا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور میں چلا رہا تھا... تانگا روکو... شہر بانو... میں تمہارے لیے سب کچھ کروں گا... مجھ ذلیل کو معاف کردو کہ میں نے تم سے تمہارا جسم مانگا... یہ محبت تو نہ ہوئی... ہوس نے مجھے دیوانہ کردیا تھا... میری یہ آواز صرف میرے کان سن رہے تھے۔

تانگا بھی آہستہ چل رہا تھا۔ موسم صاف ہوتا تو شاید گھوڑا سرپٹ دوڑتا اور میں اسے پکڑ نہ پاتا۔ ابھی میں تانگے سے پچاس قدم دور تھا کہ تانگا رکا اور کوچبان لڑکا کود کے میری طرف لپکا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ ''جاؤ ڈاکٹر صاحب... واپس چلے جاؤ۔''

میں نے کہا۔ ''شہر بانو... اپنی مالکن سے کہہ دو کہ میں اس کی مدد کروں گا... بلا معاوضہ۔''

اس نے کہا۔ ''میں کہہ دوں گا... لیکن ابھی تم جاؤ... اور ہمارے پیچھے مت آنا ورنہ میں گولی ماردوں گا اور صبح ادھر تمہاری لاش پڑی ہوگی۔''

''میں نہیں آؤں گا... بس اس سے پوچھو کہ وہ دوبارہ کب آئے گی؟''

اس نے کہا۔ ''میں آپ کو بتادوں گا۔''

''تمہاری مالکن کہاں رہتی ہے؟ یہ تو بتادو... اس کا شوہر کون ہے؟'' میں نے کہا۔

''اس کا پتا میں نہیں بتا سکتا... مالک کا نام ہے علی مراد... مگر تم نے کسی کے سامنے یہ نام لیا تو مارے جاؤ گے۔''

شہر بانو نے چلا کے کہا۔ ''جانو... سور کے بچے... ختم کر اسے... میں نے تجھے بکواس کرنے نہیں بھیجا تھا۔''

جانو الٹے پاؤں واپس گیا۔ ''ابھی مالکن غصے میں ہے... تم جاؤ... کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے بھی غصہ آجائے اور میں سچ مچ تمہیں گولی ماردوں۔''

میں وہاں بت بنا کھڑا رہا اور تانگا پھر چل پڑا۔ آہستہ آہستہ وہ رات کے اندھیرے میں محض ایک سایہ رہ گیا۔ بارش کے شور میں گھوڑے کی ٹاپ بھی دب گئی۔ اوپر سے برسنے والا پانی میرے وجود سے لپٹی ہوئی غلاظت اور کیچڑ کو دھو رہا تھا اور اندر سے میری روح کے زخموں سے خون بہہ رہا تھا جب کچھ نہ رہا تو میں پلٹا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اپنے گھر لوٹ آیا۔ غسل خانے میں جاکے میں نے اپنے وجود کو صاف کیا اور دوسرے کپڑے پہنے۔

اس وقت تک میری عقل ٹھکانے پر آچکی تھی۔ مجھے خود پر سخت غصہ تھا کہ میں نے اپنی خودداری اور عزتِ نفس کی پروا نہ کرتے ہوئے ایسی دیوانگی کا مظاہرہ کیا۔ وہ بھی اس عورت کے لیے جو کسی کا ناجائز بچہ ...... لیے پھر رہی ہے مگر میرے سامنے بڑی شوہر پرست بنتی ہے... فاحشہ... کسی دوسرے کے ساتھ سو سکتی ہے تو میرے ساتھ سونے میں کیا تھا... لعنت اس کے دس لاکھ پر... میں کیا بکاؤ مال ہوں۔

صبح تک میں دل و دماغ کی رسا کشی میں ٹوٹتا بکھرتا رہا۔ اب عقل کے دلائل بھی دونوں طرف تھے۔ وہ شہر بانو نہیں ہوسکتی... کیوں نہیں ہوسکتی... اٹھارہ سال اگر اس کی عمر پر اثر انداز نہیں ہوئے تو اس میں حیرانی کی کون سی بات



ہے... ماہ نور بلوچ کو دیکھو... یسی پاشا کو دیکھو جو نانی دادی ہیں مگر کامیاب ماڈل ہیں... لیکن یہاں کیسے آسکتی ہے۔ وہ تو لندن میں تھی۔ کیا لندن سے لوگ لوٹ کر نہیں آتے... اس کو وہاں علی مراد ملا... اس نے شادی کرلی اور واپس آگئی۔

وہ دن گزرا... رات آئی تو شہر بانو کے عشق کا آسیب پھر میری روح کو ڈسنے لگا۔ بالآخر میں نے ہار مان لی۔ تسلیم کرلیا کہ اس کا عشق وہ جادو ہے جس کا توڑ نہیں۔ جیسے بھی ہو مجھے اس سے رابطہ کرنا چاہیے... معلوم کرنا چاہیے کہ یہ علی مراد کون ہے کہاں رہتا ہے؟ میرے میزبان بڑے اثر رسوخ والے ہیں۔ وہ پتا چلا سکتے ہیں کہ اس کی بیوی کون ہے... کیا اس کا نام شہر بانو ہے... وہ کہاں سے آئی ہے... وغیرہ وغیرہ۔

لیکن جب میں نے شرافت علی سے پوچھا کہ یہ علی مراد کون ہے؟ تو اس کی صورت کے تاثرات بدل گئے۔

''تم اسے کیسے جانتے ہو ڈاکٹر صاحب؟''

میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے... میں اس کی بیوی کو بھی جانتا ہوں... کیا اس کا نام شہر بانو ہے؟''

شرافت صاحب کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ''ایسی بات کوئی اور کرتا تو ہم ادھر اس کو ننگا کرتے اور الٹا لٹا کے جوتے مارتے... مگر تم شہری لوگ ادھر کے دستور نہیں جانتے اس لیے معاف کیا... بابا کسی کی گھر والی کے بارے میں سوال کرنا بھی اس کی غیرت پر حملہ ہے... ہم کو کیا معلوم اس کی بیوی کون ہے اور اس کا کیا نام ہے... خبردار جو پھر کسی کے سامنے ایسی بات کی۔ تم کو یہ نام لینا بہت مہنگا پڑ سکتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میں معافی چاہتا ہوں۔''

''ایک بات بتاؤ ڈاکٹر... تم علی مراد کو نہیں جانتے... پھر اس کی بیوی کے بارے میں سوال کا کیا مطلب ہے؟''

''وہ میرا دوست یا واقف نہیں ہے لیکن علی مراد کو میں جانتا ہوں۔ جب میں لندن میں تھا تو ایک شخص ملا تھا۔ وہ اسپتال میں داخل تھا۔ اس کے ساتھ ایک عورت رہتی تھی تیمارداری کے لیے... اور اس نے بتایا تھا کہ وہ اس کی بیوی ہے... شہر بانو۔''

اچانک اشرف علی کا آنا میرے حق میں تائیدِ غیبی بن گیا ورنہ شاید پیر صاحب کا اگلا سوال یہ ہوتا کہ آج اچانک علی مراد کا نام تمہاری زبان پر کیوں آیا۔ اس کی بیوی کی یاد کیسے آگئی... اشرف نے باپ کی طبیعت کا حال پوچھا اور پھر زمینوں کے کسی مسئلے پر بات کرنے لگا۔ مجھے وہاں سے نکلنے کا موقع مل گیا۔ شام کو اشرف علی میری طرف آیا تو میں نے پوچھا کہ ''اباجی کا موڈ کیسا ہے؟''

''ٹھیک ہے۔'' وہ کچھ حیران ہوا۔

''انہوں نے میری شکایت تو نہیں کی؟ میرے بارے میں کچھ فرمایا۔''

''آخر معاملہ کیا ہے ڈاکٹر صاحب؟''

میں نے اسے اپنے سوال کے بارے میں بتادیا۔

''دراصل جب وہ لندن میں میرے زیرِ علاج تھا تو میں اس کی تیمارداری کرنے والی بیوی پر عاشق ہوگیا تھا۔ یہ بہت پرانی بات ہے۔ آج میں نے کچھ لوگوں کو علی مراد کا ذکر کرتے سنا تو خیال آیا کہ کیا یہ علی مراد وہی ہے۔''

اشرف نے تاسف سے سر ہلایا۔ ''اگر یہ علی مراد وہی تھا تب بھی تمہیں اباجی سے نہیں پوچھنا چاہیے تھا اور پھر اس کی بیوی کے بارے میں... شکر کرو کہ تم ان کے معالج ہو اور وہ تمہارے احسان مند ہیں۔ یہ علی مراد جس کا ذکر تم نے سنا آج کل دبئی کی جیل میں ہے۔ سنا ہے اس نے کسی کو قتل کردیا تھا۔ اب دیت کی رقم ادا کرکے وہ رہا ہوجائے گا۔ وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ بین الاقوامی اسمگلرز اور وہشت گردوں سے اس کے مراسم ہیں۔ تم کس شہر بانو کی بات کرتے ہو... پتا نہیں وہ کون تھی۔ وہ جہاں جاتا ہے کوئی شہر بانو اس کے پاس ہوتی ہے۔ تاہم یہ طے ہے کہ وہ اس کی بیوی نہیں ہوسکتی۔ اس کا ایک قلعہ نما گھر ہے جس میں پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ اندر کیا ہوتا ہے کیا نہیں... اس کی خبر کبھی باہر نہیں آسکتی۔ یہ یہاں کا دستور ہے۔ کوئی کسی کے گھر کی عورت کے بارے میں بات بھی نہیں کرسکتا۔''

میں خاموش ہوگیا۔ اشرف نے میری طرف سے مزید صفائی پیش کردی تو اس کے والد کا دل بھی صاف ہوگیا۔ میں زیادہ سعادت مندی سے ان کا علاج کرتا رہا اور ان کی حالت میں تیزی سے تبدیلی آئی۔ وہ آرام سے چلنے پھرنے لگے۔ میرے ساتھ سیر کو جانے لگے اور اپنے پوتوں کے ساتھ فٹ بال کھیلنے لگے۔ میں نے سرجری کے بغیر انہیں ٹھیک کردیا تھا اور وہ میری مہارت سے خوش تھے۔

میرے لیے تمام خطرات اور ناممکنات کو ذہن میں رکھنے کے باوجود شہر بانو کو بھلانا مشکل تھا۔ میں کسی کو بتا بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ میرے پاس کب آئی تھی اور کیوں... اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش بھی جان لیوا ثابت ہوسکتی تھی۔ میں نے اشرف سے بھی اس تانگے والے کا ذکر نہیں کیا تھا جس کا نام جانو تھا۔ سوال پھر یہ اٹھتا کہ میں اسے کیسے جانتا ہوں۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ اتنے بڑے اسمگلر اور دہشت گرد کی بیوی میرے پاس

ایک تانگے میں سوار ہو کے کیوں آئی تھی جس کے پاس ایک سے زیادہ قیمتی اور شان دار گاڑیاں ہوں گی۔ ظاہر ہے اس کا مقصد راز داری تھا۔ وہ جانو تانگے والا اس کا اتنا معتمد کیسے ہوا؟

علی مراد کا قلعہ نما گھر میں نے خود ہی تلاش کر لیا۔ اس کے حفاظتی انتظامات دیکھ کر اندازہ ہو جاتا کہ اندر داخل ہونے کی کوشش کرنا خودکشی کے مترادف ہوگا۔ شرافت علی کا خصوصی معالج اور مہمان ہونے کی وجہ سے گردونواح میں مجھے بڑی عزت اور شہرت ملی تھی۔ لوگ ہر جگہ مجھے دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوتے تھے اور سلام کر کے بڑی عقیدت سے مصافحہ کرتے تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان میں سے کبھی کسی نے مجھ سے نہ کسی بیماری کی بات کی اور نہ کوئی دوا پوچھی۔ شاید شاہی معالج سے علاج کی بات کرنا ہی وہاں گستاخی کے مترادف تھا۔

پھر اچانک ایک دن میں نے جانو کو دیکھ لیا۔ وہ تانگے میں کچھ سامان لے کر جا رہا تھا۔ مجھ سے نظر چار ہوتے ہی اس نے گھوڑے کو چابک ماری مگر میں دوڑ کے اس کے ساتھ جا بیٹھا۔ وہ گھبرا گیا۔

میں نے کہا۔ ''جانو! وہ جو اس رات تمہارے ساتھ آئی تھی؟''

''کون... آپ کو ضرور غلط فہمی ہوئی ہے...'' وہ ہکلایا۔

میں نے کہا۔ ''شرافت سے نہیں بتاؤ گے تو میں تمہیں پیر صاحب کی حویلی میں لے جاؤں گا اور ننگا کر کے الٹا لٹکا دوں گا۔ اتنے جوتے ماروں گا کہ تمہاری کھال اتر جائے گی... پھر اس پر نمک چھڑکوں گا۔''

وہ روہانسا ہو گیا۔ ''ڈاکٹر صاحب! خدا کے لیے اس بات کو بھول جائیں... ورنہ میرے ساتھ آپ بھی مارے جائیں گے۔''

''میں شہر بانو سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''یہ ناممکن ہے... بالکل ناممکن۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا میں تمہیں ایک رقعہ دیتا ہوں۔''

''میں نہیں لے جاؤں گا... آپ بے شک مجھے جان سے مار دو۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا میری بات تو کرا دو شہر بانو سے۔''

''میں کیسے بات کرا دوں جناب؟''

''تمہارے پاس اس کا فون نمبر ہوگا... موبائل فون نمبر... آخر ضرورت پڑنے پر وہ تمہیں کیسے طلب کرتی ہے؟''

''ان کے پاس ہے میرا نمبر۔''

''بکواس مت کرو... اپنا موبائل فون مجھے دو... اس میں شہر بانو کا نمبر ہوگا۔''

''وہ موبائل فون اس نے مجھ سے لے لیا تھا۔ یہ دوسرا ہے۔ آپ دیکھ لو۔''

اس کے بعد میں کیا کرتا... میں نے دھونس اور دھمکی کا حربہ بھی آزما لیا... جو بے اثر ثابت ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اسے شرافت علی کی حویلی کو سی آئی اے کے تفتیشی سینٹر کی طرح استعمال بھی نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے آخری حربہ آزمایا۔ ''دیکھو جانو... اگر تم میرا خط اس تک پہنچا دو یا میری اس سے بات کرا دو تو میں تمہیں... دس ہزار دوں گا... اچھا دگنے کر لو... بس... تم اپنا تانگا خرید لینا۔''

وہ اپنے سامنے خلا میں دیکھتا رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ پرلے درجے کا مکار اور عیار ایکٹر تھا۔ اس کی مسکینی پُرفریب تھی۔ اس نے اچانک چھلانگ لگائی اور تانگے سے کود کے سڑک پر کھڑا ہو گیا۔ گھوڑا بدکا اور دائیں بائیں دوڑتا کچے راستے سے ایک کھیت میں گھس گیا جب میں نے چھلانگ ماری تو دیکھا کہ جانو کے ہاتھ میں وہی بھیانک شکل والا پستول ہے جو اس نے ایک بار پہلے بھی مجھ پر تان لیا تھا۔

''جاؤ ڈاکٹر صاحب... اپنا راستہ پکڑو... جانو کے سامنے فالتو بات مت کرو... اگر گولی نکل گئی تو جانو کا کچھ نہیں بگڑے گا... تمہاری لاش ادھر پڑی رہ جائے گی... جانو تانگا لے کر نکل جائے گا۔''

میں پٹے ہوئے کتے کی طرح دم دبائے کھڑا رہا۔ جانو کو نہ ڈرایا جا سکتا تھا نہ خریدنا ممکن تھا۔ وہ شہر بانو کے لیے جان دے بھی سکتا تھا اور لے بھی سکتا تھا۔ میں نے اسے گھوڑے کو تھپکی دے کر تانگا سڑک پر لاتے اور روانہ ہوتے دیکھا۔

ایک بار پھر دل نے مجھے خوار کیا تھا۔ ایک معمولی تانگے والے کے ہاتھوں پاکستان کے ایک نامور سرجن کی عزت خاک میں مل گئی تھی۔ عشق کا حاصل خانہ خرابی... اور عشق بھی کیسا... محض ماضی کے ایک عکس سے... ایک یاد سے... ایک نام سے... جو پھر آسیب بن کے میرے اعصاب پر سوار ہو رہا تھا۔ شہر بانو حقیقت تھی یا خواب... عقل و نظر کا دھوکا تھی یا سراب... میں نہیں جانتا تھا۔

ابھی اس واقعے کو تین دن ہی گزرے تھے کہ ایک رات پھر طوفان آیا۔ سوتے میں مجھے یوں لگا جیسے کوئی میری خواب گاہ کی کھڑکی پر دستک دے رہا ہو۔ میں نے کچھ دیر غور کیا کہ کہیں یہ پتوں اور شاخوں کے ٹکرانے کی آواز تو نہیں مگر



دستک بہت واضح تھی۔ میں نے کھڑکی کے پردے ہٹا کے ایک پٹ کھولا اور پوچھا۔ ''کون ہے؟''

باہر سے پانی کی بوچھاڑ کے ساتھ آواز آئی۔ ''میں جانو ہوں ڈاکٹر صاحب۔''

میں نے کھڑکی بند کی اور دروازے سے باہر آیا تو وہ پانی میں کھڑا بھیگ رہا تھا۔ اس کا تانگا کچھ فاصلے پر موجود تھا۔ اس نے ایک بوری کو دوہرا کر کے سر پر ڈال رکھا تھا۔ ''جلدی چلیں ڈاکٹر صاحب... مالکن کی حالت خراب ہے... انہوں نے آپ کو بلایا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کیا ہوا ہے شہر بانو کو؟''

''آپ چل کے دیکھیں... اپنا دواؤں کا بیگ ساتھ ضرور لیں... دیر مت کریں۔'' وہ سخت نروس اور پریشان تھا۔

میں نے تیار ہونے میں دیر نہیں لگائی۔ اپنا میڈیکل ایڈ باکس لے کر میں تانگے میں بیٹھ گیا۔ میرے جسم پر وہی شب خوابی کا لباس تھا اور پیچھے بیٹھنے کے باوجود مجھ پر بارش کی بوچھاڑ پڑ رہی تھی۔ ہوا تیز تھی اور درخت جھوم رہے تھے۔ اڑنے والے پتے بجلی چمکنے سے جگنوؤں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ جانو میرے کسی سوال کا جواب نہیں دے رہا تھا۔ وہ میری طرف متوجہ ہی نہیں تھا۔ اس کا ایک ہاتھ مسلسل چابک برسا رہا تھا اور اس کی زبان نحیف و نزار گھوڑے کو تیز دوڑنے پر مجبور کرنے کے لیے گالیاں بک رہی تھی۔

معلوم نہیں وہ سفر کتنی دیر جاری رہا۔ بالآخر تانگا ایک جگہ رک گیا۔ جانو کود کر اترا اور آگے آگے چلنے لگا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ ہمارے آس پاس نیم کچے پکے گھر تھے جو سب تاریک پڑے تھے۔ نہ جانے وہ غریبوں کی کون سی بستی تھی۔ ایک جگہ رک کے اس نے دستک دی۔ اندر سے کسی نے کواڑ کھولے اور جانو نے پلٹ کے بے چینی سے کہا۔ ''آیئے ڈاکٹر صاحب۔''

اندر لالٹین روشن تھی۔ مختصر سے خستہ حال کمرے کے درمیان ... وہ ایک جھلنگا چارپائی پر بے سدھ پڑی تھی۔ اس کا رنگ لاش کی طرح سفید ہو رہا تھا اور مجھے شہر بانو کی اس حالت کا سبب بھی فوراً ہی معلوم ہو گیا۔ گدڑیوں کے بستر پر خون تھا۔ شہر بانو کے زیریں ملبوس پر خون تھا... جو خون صاف کیا گیا تھا وہ میلے کپڑے ایک کونے میں ڈھیر تھے۔ میں نے اس ڈھیر کو ہٹایا اور پھر وہیں رکھ دیا۔

کمرے میں موجود ادھیڑ عمر کی دو عورتوں میں سے ایک نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''جلدی کریں ڈاکٹر صاحب۔''

''اب میرے جلدی کرنے سے کیا ہوگا... کس نے کیا ہے یہ سب؟'' میں نے غصے سے پوچھا۔

اس عورت نے دوسری عورت کی طرف دیکھا۔ جواب خوف سے لرز رہی تھی۔ ''میرا... میرا کوئی قصور نہیں... میں نے پہلے بھی بہت کیس کیے ہیں... کیس خراب بھی ہو جاتے ہیں... میں نے بیگم صاحبہ کو بتا دیا تھا۔''

میں نے اس کے ہاتھ گھما کر چھانپڑ مارا۔ ''الو کی پٹھی... کیا ہے تو... دایہ... کس نے لائسنس دیا ہے تجھے ایسے قتل کرنے کا۔''

وہ پیچھے گر گئی۔ دوسری عورت نے فوراً کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! پہلے اسے بچاؤ۔''

مجھے بھی خیال آیا کہ بیکار باتوں میں وقت ضائع کرنے سے بہتر ہوگا کہ میں شہر بانو کے لیے جو بھی کر سکتا ہوں کروں۔ میں نے اسے فوراً انجکشن لگا دیا۔ اپنی ساری مہارت صرف کر دی لیکن وہ زندگی کی سرحد پیچھے بہت دور نکل گئی تھی اور موت کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ میری سر توڑ کوشش کے باوجود شہر بانو مر گئی۔

غصے اور پشیمانی سے میرا حال خراب ہو گیا۔ میرے ضمیر نے اس قتل کا سارا الزام صرف مجھ پر عائد کر دیا تھا۔ یہ تم ہی تھے ڈاکٹر جس کے پاس وہ بڑی امیدوں کے ساتھ سب سے پہلے مدد کے لیے گئی تھی۔ اس نے تمہیں اس قابل سمجھا تھا۔ ساری امیدیں تم سے وابستہ کر لی تھیں اور تمہیں راز داری کا بہت معقول معاوضہ بھی پیش کیا تھا مگر تم نے کیا کیا؟ تم نے اسے انکار کر دیا۔ اس ہوس کے پورا نہ ہونے پر جسے تم محبت کہتے چلے آئے ہو... وہ ان اناڑی جان لیوا دائیوں کے پاس نہ آتی تو کہاں جاتی؟ اس کو ڈر تھا اپنے شوہر کا... وہ اس کو زندہ گارڈ دیتا اور شہر بانو زندہ رہنا چاہتی تھی۔ اس کی آخری امید تم تھے۔ تم یہ آسانی اسے بچا سکتے تھے۔ تمہارے تجربہ کار ہاتھوں میں یہ کام ذرا بھی پُرخطر نہیں تھا۔ اس ہلاکت آفرینی کی طرف تم نے اسے دھکیلا۔

دونوں بوڑھی عورتیں آنسوؤں سے رو رہی تھیں لیکن یہ سب بیکار تھا۔ شہر بانو بالآخر مجھ سے اتنی دور چلی گئی تھی کہ اس جنم میں پھر مجھے نہیں مل سکتی تھی۔ اس بات پر میں سخت دکھی تھا کہ وہ مجھ سے اتنی نفرت کرتی تھی کہ خود کو میرے حوالے کرنے پر اس نے موت کو ترجیح دی تھی۔

میں نے ایک بڑھیا سے کہا۔ ''یہ ٹسوے بہانا چھوڑو... یہ تو مر گئی... اب تم کیا کرو گی؟ کیا بتاؤ گی اس کے شوہر کو؟ گھر والوں کو؟''

اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''ڈاکٹر صاحب! آپ میری شہزادی کو نہیں بچا سکے... مرنے کے بعد اس کی عزت آبرو بچالو۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ اس کی موت کا اصل سبب کیا تھا۔'' بوڑھی عورت نے کہا۔

''اس میں تمہاری مدد میں کیسے کرسکتا ہوں؟''

''ابھی تم جاؤ... تھوڑی دیر میں جانو پھر تمہیں لینے آئے گا... میرے سائیں کی گاڑی میں... تم ادھر ٹھہرو گے... صبح تک... میں اس کی خاص ملازمہ ہوں... میں بتاؤں گی کہ بی بی کی طبیعت بہت خراب ہے اور کراچی شہر سے پیر صاحب کے علاج کے لیے آنے والا بڑا ڈاکٹر اس کو بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ تم اس کی موت کی وجہ کچھ اور لکھو گے... تم ڈاکٹر ہو... تمہارے لیے کچھ مشکل نہیں۔''

میں نے غصے سے کہا۔ ''خبیث بڑھیا... تو مجھ سے اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے کہہ رہی ہے؟ اس کی موت کی ذمے دار تو بھی ہے... تجھے ضرور معلوم ہوگا کہ وہ سؤر کا بچہ کون تھا جو اس سے ملتا تھا۔ یا یہ اس سے ملنے جاتی تھی۔ یقیناً تو اس کی راز دار بنی ہوگی... نام کیا ہے اس کا جو شہر بانو کا قاتل ہے۔''

اس نے پھر ہاتھ جوڑ دیے۔ ''اب جانے دو ڈاکٹر صاحب! مرنے والی کا پردہ رہنے دو... یہ وڈے سائیں کی عزت کا سوال ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آخر تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بلایا؟''

جانو آہستہ سے بولا۔ ''بیگم نے منع کر دیا تھا۔ میں نے تو کہا تھا بعد میں آپ کو اپنی مرضی سے لایا تھا میں... اب چلیں۔''

جانو مجھے واپس مہمان خانے تک لایا اور لوٹ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ پھر نمودار ہوا لیکن اس بار وہ مرکزی دروازے سے ایک گاڑی میں آیا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ گاڑی علی مراد کے قلعہ نما گھر میں بھی بڑے پھاٹک سے اندر داخل ہوئی۔ مجھے ایک کمرے میں لے جایا گیا... یہ شہر بانو کی خواب گاہ تھی اس کی خادمہ خاص نے اتنی دیر میں لاش کو دھو دھلا کے صاف کر دیا تھا اور اس کے کپڑے بدل دیے تھے۔ اس کے بال بھی بنا دیے گئے تھے۔ وہ تکیے پر سر رکھے آنکھیں بند کیے گہری نیند میں نظر آتی تھی۔

اگر میں خود کو قصوروار نہ سمجھتا تو اس کی موت کے اسباب کو چھپانے کی سازش میں کبھی شریک نہ ہوتا۔ مجھے بہت رنج تھا کہ میرے انکار کے اور ناجائز مطالبے کے بعد ہی وہ ایک اناڑی دائی کے پاس جانے پر مجبور ہوئی تھی۔ ابھی تک حویلی میں سب سوئے ہوئے تھے۔ میں صبح ہونے تک وہاں موجود رہا۔ میں نے کچھ انجکشن خالی کر کے وہاں چھوڑے... کچھ دوائیں رکھ دیں ایک سرٹیفکیٹ بنا دیا جس پر شہر بانو کی موت کا وقت صبح چھ بجے لکھا گیا تھا۔ موت کا سبب خود میں نے ایجاد کیا تھا اور وہاں چھوڑی گئی دواؤں کے خالی پیک اور خالی انجکشن اس کی بیماری اور میرے علاج کا ثبوت تھے۔

یہ میرا احساسِ جرم تھا جس نے مجھے انشائے جرم سے روکا اور اخفائے جرم پر مجبور کیا۔ شہر بانو کی موت کا اصل ذمے دار اس کا وہ چاہنے والا تھا جو ابھی تک کہیں روپوش بڑے سکون سے بیٹھا تھا۔ اس کی راز دار خادمہ تھی اور جانو تھا۔ اس کے بعد میں آتا تھا جس نے اپنی مدد سے انکار کیا اور اسے ایک مریضہ کو علاج کی ایسی فیس بتا دی جو وہ ادا کرنے سے قاصر تھی۔ آخر میں وہ اناڑی دائی تھی جس نے اپنے اناڑی پن سے ابارشن کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جیسے اس نے پہلے بھی کئی عورتوں کو اتارا ہوگا اور رکھنے والوں نے ان سب کی عزت کا پردہ رکھا۔ یہ مجبوری کی رسم نبھائی۔

اگر میں خود کو بھی ذمے دار نہ سمجھتا تو سب سے پہلے اس کیس کی رپورٹ پولیس کو دیتا۔ میں کسی علی مراد کی پروا نہ کرتا کہ اس کی خاندانی ناک کٹ جائے گی۔ میں اس دلدل میں خود اپنی کمزوری سے اترا تھا اور پھنس گیا تھا۔

صبح سات بجے میں جانے ہی والا تھا کہ ایک خاصی تین اور رکھ رکھاؤ والی عورت اندر آئی۔ اس نے بھاری زیور پہن رکھا تھا اور اس کا انداز حاکمانہ تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بڑی بیگم ہے۔

''کیا ہوا ہے اسے؟'' اس نے اندر آتے ہی کمرے پر ایک نظر ڈال کے کہا۔

میں نے افسوس اور احترام کے ساتھ کہا۔ ''ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ میں نے بہت کوشش کی انہیں بچانے کی۔''

''میں نے پوچھا ہے کہ ہوا کیا تھا؟'' اس نے میری بات کاٹ دی۔

''وجہ میں نے ڈیتھ سرٹیفکیٹ میں لکھ دی ہے۔ میرے آنے سے پہلے ان کی حالت کافی بگڑ گئی تھی۔ اگر مجھے پہلے بلایا جاتا...''

وہ ایک دم ملازمہ کی طرف پلٹی۔ ''لطیف کو کیوں نہیں بلایا گیا؟ یہ کون ڈاکٹر ہے... حویلی میں کیسے آیا؟''

میں نے کہا۔ ''میں محترم شرافت علی کا علاج کرنے



قد چھوٹا ہے تو کیا ہوا؟
گروٹال®
جو ہے!
30 TABLETS CHEWABLE
GROTALL
ایک ماہ کی سپلائی صرف -/Rs.495
اگر آپ کی عمر 30 سال سے کم ہے تو گروٹال آپ کا قد بڑھا سکتی ہے!
HELPLINE
ملک بھر کے ہر اچھے میڈیکل سٹور، ہومیو پیتھک سٹور اور دواخانہ پر دستیاب
0334-4266244,0334-4266255
Email: toptreatments@gmail.com, Website: www.toptreatments.net
نہ ملنے کی صورت میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے

کراچی سے آیا تھا اور انہی کی حویلی میں مقیم ہوں۔"
خادمہ نے سر جھکا کے کہا۔ "ڈاکٹر لطیف کو فون کیا تھا۔ ان کا فون بند تھا۔ جب ملا تو انہوں نے کہا کہ وہ نواب شاہ میں ہیں۔"

بڑی بیگم کچھ دیر خاموش کھڑی رہی۔ پھر پلٹ گئی۔
"میں ابھی بتاتی ہوں علی مراد کو... وہ آ تو نہیں سکتا... مگر اسے معلوم ہونا چاہیے... اور اس سے بھی پوچھتی ہوں... لطیف سے... ابھی اس ڈاکٹر کو روکو۔"

میرے احتجاج کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ چھوٹی بیگم کی موت کی خبر حویلی میں پھیل گئی تھی اور شاید حویلی سے باہر بھی۔ کچھ لوگ چھوٹی بیگم کی تدفین کے انتظامات پر مامور کر دیے گئے تھے۔ میں بری طرح پھنس گیا تھا اور شرافت علی کو فون کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ڈاکٹر لطیف آ گیا۔

اس نے شہر بانو کی لاش دیکھی اور پھر مجھ سے ہاتھ ملایا۔
"میں ان کا فیملی ڈاکٹر ہوں۔ بدقسمتی سے رات نواب شاہ چلا گیا تھا۔ وہاں بھی ایک خاص مریض تھا۔"

میں نے کہا۔ "موت کی وجہ میں نے تفصیل سے لکھ دی ہے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں۔"
"ڈاکٹر شیرازی... میرے ساتھ آئیے۔" اس نے کہا اور مجھے گھر کے دوسرے کمرے میں لے گیا۔ ہم دو کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر لطیف مردانہ وجاہت کا نمونہ تھا اور شہر بانو کی موت سے زیادہ متاثر نظر نہیں آتا تھا۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں یہ خیال جم گیا کہ اس بچے کا باپ وہی تھا جس نے وجود پانے سے پہلے اپنی ماں کی جان لے لی۔ وہ انداز و اطوار سے ایک پُرکشش مرد تھا۔

"آپ نے بہت اچھا سرٹیفکیٹ بنایا ہے۔ میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے سب کی عزت رکھ لی۔"
میں نے برہمی سے کہا۔ "کیا مطلب ہے اس فضول بات کا؟ میں نے جو وجہ لکھی ہے..."
اس نے میری بات کاٹ دی۔ "میں اسے کہاں چیلنج کر رہا ہوں۔ میں خود بھی اس پر دستخط کروں گا... یو سی... میں ان کا فیملی ڈاکٹر ہوں جب تک میں تصدیق نہیں کروں گا، اس کا شوہر مطمئن نہیں ہوگا۔"
"وہ تو پڑا ہے جیل میں۔"
وہ چونکا۔ "ہاں... لیکن کچھ دن میں اسے رہائی مل جائے گی... جب وہ آئے گا تو سوال ضرور کرے گا کہ آخر اس کی بیوی کی اچانک موت کیسے ہو گئی... وہ شکی مزاج اور خطرناک آدمی ہے... لیکن آپ فکر نہ کریں... اسے مطمئن کرنا میرا کام ہے... دیکھیں... میں آپ کے سامنے اس پر دستخط کر رہا ہوں... اب اسے کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔"
میں نے بہت ضبط سے کام لیا اور کھڑا ہو گیا۔ "ڈاکٹر لطیف! کیا اب میں جا سکتا ہوں؟ کسی سے کہیں کہ مجھے واپس چھوڑ آئے۔"

یہ بڑی عجیب سچویشن تھی۔ میں ڈاکٹر پر شک کر رہا تھا کہ شہر بانو نے اس کے ساتھ مراسم کی قیمت اپنی جان دے کر ادا کی اور وہ خبیث مجھ پر شک کر رہا تھا کہ اس کی موت کا ذمے دار میں ہوں اور اب جان بوجھ کے موت کے اسباب کو چھپا رہا ہوں۔ الٹا وہ مجھ پر احسان کر رہا تھا کہ میرے جاری کردہ ڈیتھ سرٹیفکیٹ پر دستخط کر کے اسے سند عطا کر رہا ہے۔

"چلو میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں ڈاکٹر شیراز۔" اس نے فراخدلی سے کہا۔ "میری گاڑی اندر ہی ہے... یہ لوگ تو اپنے ہی چکروں میں ہیں۔"
میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ "کیسے چکر؟"
"بھئی... کفن دفن... اس کے شوہر کو اطلاع دینے کا مسئلہ۔"
میں نے پوچھا۔ "علی مراد کو اپنی بیوی سے بہت محبت تھی؟"
"کیوں نہیں ہوگی... ایسی بیوی نصیب والوں کو ملتی ہے۔"
میں نے کہا۔ "اس خاتون کا نام شہر بانو تھا؟"
اس نے ظاہری سکون اور اعتماد برقرار رکھا۔ "نہیں۔"
میں نے کہا۔ "کیا علی مراد کی اس سے ملاقات لندن میں ہوئی تھی؟"
"تم تو بہت کچھ جانتے ہو... ملاقات اور شادی لندن میں ہی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے وہ شادی کے معاملے میں سخت اور اصول پسند تھا... یعنی بیوی وہی ایک جو اس کے چچا کی بیٹی تھی۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ وہ ایک عورت پر اکتفا کرنے والا مرد تھا۔ ان کا کوئی حساب نہیں جو اس کی محبوبہ... گرل فرینڈ... داشتہ... سیکریٹری اور پی آر او وغیرہ کے عہدے پر فائز ہوتی تھیں... ایک مختصر مدت کے لیے... پھر ان کی جگہ نئی لے لیتی تھیں... یہ واحد عورت تھی جس کو اس نے اپنا لیا... خرید لیا... جو چاہو کہو۔"
"یہ کب کی بات ہے؟"
"تم کسی سراغ رساں کی طرح سوالات کر رہے ہو؟" وہ ہنس دیا۔ "یار! ہو گئے پندرہ سولہ سال۔"
"اس تمام عرصے میں وہ حویلی سے باہر نہیں نکلی؟"



"نکلی مگر اپنے شوہر کے ساتھ... یہاں کا دستور ہی ایسا ہے۔ پردہ کرنا لازمی ہے... عورت کی تمام ضروریات گھر میں پوری کر دی جاتی ہیں۔"
"پھر یہ کیسے ممکن ہوا... کہ اس نے کبھی غیر مرد سے مراسم استوار کر لیے... اور کیوں...؟"
وہ چونکا۔ "کیا مطلب؟"
"اس نے کسی اناڑی دائی سے ابارشن کرایا۔ جب مجھے بلایا تو کیس بگڑ چکا تھا۔ اس کا بہت خون ضائع ہو گیا تھا۔ دنیا کا کوئی ڈاکٹر اسے بچا نہیں سکتا تھا۔ اور پھر یہاں کیا تھا... نہ خون دینے کا انتظام۔"
وہ سیریس ہو گیا۔ "ڈاکٹر شیرازی! یہ بات دوبارہ اپنی زبان پر مت لانا... یہ علی مراد کو ماں کی گالی دینے سے زیادہ بُرا ہے۔"
"میں صرف حقیقت بتا رہا ہوں۔ گالی کسی اور نے دی ہے اس کی غیرت پر حملہ کسی اور نے کیا ہے... کسی ایسے شخص نے جس پر اسے اعتماد تھا جو اندر آ جا سکتا تھا... تم علی مراد کے فیملی ڈاکٹر ہو؟"
"میں اس کا کزن بھی ہوں۔"
"پھر تم ضرور اندازہ کر سکتے ہو... پندرہ سولہ سال میں اس کے دوسری بیوی سے بچے نہیں ہوئے۔"
"یہ اللہ کی مرضی۔" وہ غیر سنجیدہ لہجے میں بولا۔
"اور جب علی مراد دبئی جیل میں تھا تو اللہ کی مرضی بدل گئی... کیا بات ہے... ڈاکٹر لطیف... اگر تم بھی اسے نہیں جانتے جس نے محبت کا ناٹک رچا کے اس کی جان لی... تو پھر مجھے کہنا پڑے گا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو... تم چھپا رہے ہو۔"
"کیا؟ اور مجھے کیا ضرورت ہے جھوٹ بولنے کی؟"
"کیونکہ وہ تم خود ہو ڈاکٹر لطیف۔" میں نے چلّا کے کہا۔

اس نے گاڑی روک لی اور مجھے سرد سفاک نظروں سے دیکھنے لگا۔ "ڈاکٹر شیرازی! یہ تم نے اچھا نہیں کیا... میں تمہیں نکلنے کا راستہ دے رہا تھا۔ تم میرا راستہ روک رہے ہو، مجھ سے پنگا لینا تمہیں کتنا مہنگا پڑ سکتا ہے، اس کا اندازہ ہے تمہیں؟"
"جو سچ ہے وہ میری زبان پر آ گیا تو تم اسے مان کیوں نہیں لیتے... میں کون سا علی مراد کو بتانے جا رہا ہوں؟" میں نے تلخی سے کہا۔
"سچ وہ ہوگا ڈاکٹر شیرازی جو میں بتاؤں گا... میرے سچ کے چشم دید گواہ یہاں ہیں... جانو... اس کی خادمہ... وہ دائی... جب میں علی مراد کو بتاؤں گا کہ اس عرصے میں جب تم شرافت صاحب کے مہمان خانے میں تھے تو تم نے جانو کے ذریعے اس سے مراسم استوار کیے جسے کہ تم لندن سے جانتے تھے اور جانو اپنا جرم تسلیم کرے گا... خواہ یہ سچ بولنے پر اس کی گردن الگ کر دی جائے... اس کی خادمہ تفصیل سے بتائے گی کہ تم اس سے کیسے ملنے جاتے تھے... وہ بھی موت قبول کر لے گی... یو سی... یہاں ہمارے نمک خوار وہی کہتے ہیں جو ان سے کہلوایا جائے... اور اپنے باقی خاندان کو عتاب سے بچانے کے لیے وہ اپنی جان کی قربانی دیتے آئے ہیں۔"

بعد میں یہی ہوا۔ جیسے ہی ڈاکٹر لطیف مجھے شرافت صاحب کی حویلی کے دروازے پر چھوڑ کے گیا انہیں خبر ہو گئی اور انہوں نے مجھے باغ میں طلب کر لیا جہاں میں ان کے ساتھ ہر صبح ناشتا کرتا تھا۔
"آپ کدھر نکل گئے تھے ڈاکٹر صاحب! ہم ناشتے پر انتظار کرتے رہے؟" انہوں نے کہا اور خادم کو حکم دیا کہ میرے لیے ناشتا لائے۔

---

مزاح نگاروں کے قبیلے کے سرخیل حضرت ضمیر جعفری نے تجویز پیش کی ہے کہ ان کو مزاح نگاری کا ہلالِ جراَت ملنا چاہیے۔ وہ لکھتے ہیں:
اس کی نثر کا جادو جراَت، مسرت اور حیرت کے اجزا سے ترتیب پاتا ہے۔ جراَت جیسے چاندنی بی دروازے پر تلوار تانے کھڑی ہو۔ مسرت جیسے کھلی ہوئی کپاس کا کھیت ہنس رہا ہے اور حیرت جیسے گھوڑی نے زیبرا جنم دیا ہو۔
ہم مرشدی ضمیر جعفری سے نہ صرف کلی طور پر متفق ہیں بلکہ اتنا اضافہ کریں گے کہ گھوڑی کے ہاں زیبرا پیدا ہونے پر دیکھنے والوں اور خود گھوڑی کو تو تعجب ہوگا ہی، لیکن سب سے زیادہ گھوڑے کو ہوگا۔

میری کوریلی ایک مشہور فیمی نسٹ ہو گزری ہے۔ اس نے بڑے فخر سے کہا تھا کہ میں نے تمام عمر شادی نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے پاس تین Pets (پالتو جانور) ہیں، جو شوہر کا مکمل نعم البدل ہیں۔ ایک کتا ہے جو صبح سویرے سے غرانا شروع کر دیتا ہے۔ دوسرا، طوطا ہے جو سہ پہر ہوتے ہی رٹی رٹائی گالیاں بکنے لگتا ہے۔ تیسرا، ایک بلا ہے جو رات کو دیر سے گھر آتا ہے۔ محترمہ ہمارے سامنے یہ بات کہتیں تو ہم عرض کرتے کہ آپ نے شوہر کے نعم البدل کے طور پر جانور بھی پالے تو بدذات نر۔ پھر یہ بھی ہے کہ تینوں کے تینوں کھاؤ، اڑاؤ اور وارث ہاز ہیں، کماؤ ایک بھی نہیں۔

مشتاق یوسفی کا تجزیہ شوہر۔

میں نے کہا۔ ''آئی ایم سوری سر! مجھے ایک مریضہ کو دیکھنے کے لیے جانا پڑا... اس کی حالت نازک تھی لیکن میں اسے بچا نہیں سکا۔''

''تم علی مراد کے ڈیرے پر گئے تھے نا؟'' وہ بولے۔ ''کون بیمار تھا وہاں؟''

''اس کی دوسری بیوی۔''

''کمال ہے... اس حویلی میں تو باہر کا کوئی مرد نہیں جا سکتا خواہ وہ تم جیسا قابل ڈاکٹر ہو... یہ جو تمہیں چھوڑ کے گیا ہے ابھی... ڈاکٹر لطیف یہ کہاں مر گیا تھا؟''

میں نے کہا۔ ''وہ یہاں نہیں تھا۔ نواب شاہ میں تھا اور فوراً پہنچ نہیں سکتا تھا۔ ہوسکتا ہے اسی کے کہنے پر مجھے بلایا گیا ہو۔''

''ایسی کیا بیماری لاحق ہو گئی تھی اسے؟ علی مراد کی دوسری بیوی کو؟''

میں نے بہتر سمجھا کہ انہیں تمام حالات سے آگاہ کر دوں۔ انہوں نے میری بات توجہ اور تشویش کے ساتھ سنی اور بار بار افسوس سے سر ہلاتے رہے۔ ''بڑی غلطی کی تم نے ڈاکٹر شیرازی۔''

میں نے کہا۔ ''میں انکار کیسے کرتا۔ ڈاکٹر کا تو کام ہی جان بچانا ہوتا ہے۔''

''دیکھو... تم ادھر کے رسم و رواج کو نہیں جانتے اور تمہیں اس ڈاکٹر لطیف کا بھی پتا نہیں... میں اپنے منہ سے کوئی بری بات نہیں نکالتا... جو زبانِ خلق کہتی ہے وہ بتاتا ہوں... اگر اس نے دھمکی دی ہے کہ اپنا جرم تمہارے سر منڈھ دے گا تو وہ ایسا ضرور کرے گا... تم مارے جاؤ گے... تمہیں کوئی نہیں بچا سکے گا۔''

میں سخت مایوس اور پریشان ہوا۔ ''آپ بھی ایسا کہتے ہیں جناب... آپ کا یہاں اتنا اثر رسوخ ہے۔''

''بابا اثر رسوخ کیسا... اللہ کے نیک بندے میری عزت کرتے ہیں تو یہ خدا کی مہربانی ہے مجھ گناہ گار پر... میں ادھر کے بدمعاشوں اور شیطان کے چیلوں کو کنٹرول کرنے کی اتھارٹی نہیں رکھتا... یہ جو علی مراد ہے اس کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ وہ ایک عالمی دہشت گرد ہے... اس سے تمہیں صرف اوپر والا بچا سکتا ہے۔''

''ابھی تو وہ دبئی کی جیل میں ہے۔''

''ہاں... مگر آج کل میں وہ آنے والا ہے... ایسے لوگوں کو بھلا کون قید میں رکھ سکتا ہے... اس کے آنے سے پہلے تم جاؤ... جانے سے پہلے اشرف علی سے مل لینا۔'' وہ اٹھے اور اندر چلے گئے۔

اشرف علی سے میری ملاقات کچھ دیر بعد ہوئی۔ میری بات نے اسے بھی پریشان کر دیا۔ ''یار! ڈاکٹر صاحب... اب تم کیا کرو گے... وہ کل آ رہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''پتا نہیں اس کی اتنی دہشت کیوں سوار ہے سب پر... میں اپنی حفاظت کے لیے سیکیورٹی گارڈز رکھ لوں گا۔''

اشرف نے سر ہلایا۔ ''کوئی فائدہ نہیں... میں تمہیں دہشت زدہ کرنا نہیں چاہتا... خبردار کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں... تم گھر میں بیٹھ جاؤ چاروں طرف اینٹی ائرکرافٹ توپیں لگا کے... پھر بھی وہ چاہے تو تمہیں نشانہ بنا سکتا ہے۔''

''وہ کیسے... ایٹم بم ہے اس کے پاس...''

''یار ڈاکٹر صاحب... ملک کا حال تمہیں پتا ہے... دن رات ادھر سے خبریں آتی ہیں راکٹ داغنے کی۔ وہ جہاں چاہے تمہیں نشانہ بنا سکتا ہے۔''

''پھر... اب میں کیا کروں؟''

''اب کیا ہوسکتا ہے... تم نے پنگا لیا ہے۔ ڈاکٹر لطیف کے ساتھ۔ چوہا اگر سوئے ہوئے شیر کی مونچھ کا بال اکھاڑنے کی کوشش کرے گا تو اس کا کیا بنے گا؟''

مجھے ایک بہت بڑی رقم شکریے کے ساتھ پیش کی گئی اور رخصت کر دیا گیا کیونکہ شرافت صاحب کی صحت بھی بحال ہو چکی تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ میرا حویلی میں مزید قیام ضروری نہیں۔ بات ضرورت کی نہیں تھی۔ وہ کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے اور نہ بدنامی... میں سیدھا شہر آیا... اسپتال جا کے اپنا استعفیٰ پیش کیا اور یہاں آ گیا۔ مجھے نہ نوکری کی فکر تھی اور نہ آمدنی کی... پہلا مقصد اپنی جان بچانے کا تھا۔ میرے ایک وفادار ڈرائیور نے اس فلیٹ کا ذکر کیا تھا جو اس نے کئی سال پہلے بک کرایا تھا۔ اس نے مجھے چابی دے دی۔

میں نے شرافت علی سے فون پر پوچھا... شہر بانو کی تدفین کل ہی کر دی گئی تھی کیونکہ اس کی لاش کو اس گرم موسم میں علی مراد کے آنے تک رکھا نہیں جا سکتا تھا۔ علی مراد کل رہا ہو گا۔ شہر بانو کی موت کو بہت سے لوگ مشکوک قرار دے کر باتیں بنا رہے تھے۔ علی مراد نے اس ارادے کا اعلان کر دیا تھا کہ وہ یہاں آتے ہی لاش نکلوا کے اس کا پوسٹ مارٹم کرائے گا۔

خیر جو ہوا سو ہوا... آگے سوال میری زندگی کا ہے، اس خوف سے میں کب تک روپوش رہ سکتا ہوں... کہاں تک بھاگ سکتا ہوں کہ علی مراد مجھے قتل کر دے گا... آخر میں ایک



ڈاکٹر ہوں... مجھے اپنی زندگی اور اپنے پروفیشن دونوں سے پیار ہے... بہت سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ فرار یا انتظار والی پالیسی ہی غلط ہے۔ حملے سے پہلے دشمن پر حملہ کر کے اسے دہشت زدہ کرنے کی اصطلاح امریکا نے ایجاد کی تھی۔ PRE-EMPT اسٹرائیک۔ مجھے یہی کرنا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ دشمن مجھے تلاش کر سکے میں اسے ختم کر دوں۔ وہ دبئی جیل سے رہا ہو کے آ گیا ہے۔ قبر سے لاش نکلوا کے پوسٹ مارٹم کرنے کے لیے اسے عدالت سے اجازت لینا ہوگی... عدالت ایک میڈیکل بورڈ تشکیل دے گی، ممکن ہے اس کا وکیل پہلے ہی سب کچھ کر چکا ہو اور کل کارروائی ہو جائے۔''

☆☆☆

جب ڈاکٹر شیرازی کی یہ داستانِ عشق تمام ہوئی تو صبح کے چار بج رہے تھے لیلیٰ مجنوں سے چارلس اور کیمیلا پارکر تک عشق کی ہزار داستانوں کے ان گنت روپ میں ایک کہانی میری تھی۔ دوسری ڈاکٹر شیرازی کی۔ عشق کا حاصل خانہ خرابی... دونوں کا سبق یہی تھا لیکن اب میں سوچ رہا تھا کہ اس معاملے میں میرے جیسا مفرور و مطلوب، کمزور اور کم ہمت شخص بھلا کیا مدد کر سکتا ہے۔ میں علی مراد جیسے انٹرنیشنل دہشت گرد کو کیسے روک سکتا ہوں کہ وہ ڈاکٹر شیرازی کو قتل نہ کرے۔ مجھے کبھی اندیشہ نہ تھا کہ میرا اسر مجھ پر یوں کلہاڑی سے بم بندوق تک کسی بھی چیز سے حملہ کر کے مجھے سوئے عدم روانہ کر سکتا ہے... مجھے اس کا یقین تھا۔

نیند کا اب کوئی سوال نہ تھا۔ اس نے دقفے میں کافی کی پھر فرمائش کی تو میں کچن میں گیا اور کافی بناتے ہوئے سوچتا رہا کہ آخر اب یہ بن بلایا مہمان مجھ سے کیا مطالبہ کرے گا... کافی پیتے ہوئے اس کا دھیان نہ جانے کدھر تھا چنانچہ میں نے ہی پوچھا۔ ''ڈاکٹر شیرازی! میں نے تمہاری کہانی سن لی... لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ میں کس طرح تمہاری مدد کر سکتا ہوں... میں تو خود یہاں جان بچا کے چھپا ہوا ہوں۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ شہر بانو کی لاش کا دوبارہ پوسٹ مارٹم ہو... یہ جذباتی مسئلہ نہیں... بے حرمتی کا خیال اسے نہیں تو مجھے کیوں ہو؟''

''پوسٹ مارٹم سے تمہاری بے گناہی ثابت ہو جائے گی... ڈاکٹر لطیف کا جرم ثابت ہو جائے گا۔''

''یار تم بڑے بے وقوف آدمی ہو... اس سے ثابت ہو جائے گا کہ موت کے اسباب وہ نہیں تھے جو میں نے لکھے۔ اس کی موت کا سبب ابارشن بنا تھا۔ ابارشن میں نے کیا تھا اور پھر اپنے جرم کو چھپانے کے لیے بے بنیاد وجوہ کو موت کا سبب قرار دے دیا۔ میرا جاری کردہ ڈیتھ سرٹیفکیٹ ہی میرا ڈیتھ وارنٹ بن جائے گا۔''

''تم علی مراد کو روک سکتے ہو؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کیا وہ میرے روکنے سے رک جائے گا؟ پوسٹ مارٹم نہ ہو... اس کا تو بس ایک ہی طریقہ ہے۔''

''وہ کیا؟'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

''میں شہر بانو کی لاش غائب کر دوں۔''

کافی کا مگ میرے ہاتھ سے گر گیا۔ ''لاش، کیسے غائب ہوسکتی ہے؟''

وہ اطمینان سے بولا۔ ''میں اسے قبر سے نکال کے کہیں اور گاڑ دوں...''

''اگر تم ایسا کر سکتے ہو... تو ضرور کرو۔''

وہ بولا۔ ''مشکل یہ ہے کہ میں ایک سرجن ہوں۔ انسان کے جسم میں اندر جا کے خرابی کے اسباب نکال سکتا ہوں... اپنڈکس... خراب لبلبہ... جگر میں تلی... قبر کے اندر سے خراب لاش نکالنا میرے بس کی بات نہیں... میں کوئی گورکن نہیں بن سکتا۔ قبر کھودنا محنت طلب کام ہے... تم دیکھ سکتے ہو کہ اب میری عمر بھی پچاس کے لگ بھگ ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تم گورکن سے مدد لے سکتے ہو... مجھے معلوم ہے کہ میڈیکل کے اسٹوڈنٹ اور کچھ سفلی عمل والے ان سے مردے یا ان کے پارٹس لے جاتے ہیں۔''

''جب میں میڈیکل کا اسٹوڈنٹ تھا تو میرے پاس ایک شخص کا مکمل ڈھانچا تھا جو میرے کمرے کے ایک کونے میں ڈیکوریشن پیس کی طرح کھڑا رہتا تھا۔ میں اور میرے ساتھی لاوارث مرنے والوں کی لاش خرید لیتے تھے ورنہ گورکن سے فریش مردے حاصل کر لیتے تھے۔''

''پھر اب کیا مسئلہ ہے؟''

''یہ گورکن مجھے شہر بانو کی لاش نہیں نکال کر دے گا۔''

''پیسا سب کے انکار کو اقرار میں بدل سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''یار تم سمجھ نہیں رہے، وہ بھی علی مراد سے ڈرتا ہے... کیا پتا اسے پہلے ہی علی مراد کی طرف سے دھمکی دی جا چکی ہو کہ لاش نہ ملی تو خالی قبر میں اسے زندہ گاڑ دیا جائے گا... اس لیے یہ کام تم کرو گے۔''

میں پھر چلایا۔ ''میں... کیا تم پاگل ہو... کیسا سوچ کے

تم نے یہ بات کی؟''

وہ بولتا رہا۔ ''قبرستان ہم دونوں اکٹھے جائیں گے۔''

''بکواس بند کرو اور دفع ہو جاؤ۔'' میں چڑیا گھر کے شیر کی طرح دہاڑا۔

وہ مسکراتا رہا جیسے چڑیا گھر کے شیر کی دہاڑ پر ہنستے ہیں۔

تم مجھے انکار نہیں کر سکتے۔ تمہارے انکار کو اقرار میں بدلنے کے لیے مجھے کرنسی کی نہیں، ایک نمبر کے استعمال کی ضرورت پڑے گی۔ جو شخص تمہیں پوچھتا ہوا آیا تھا، وہ پھر آ سکتا ہے۔ وہ تمہارے خون کا پیاسا ہے... کیا میں اسے بلا لوں؟''

''خبیث آدمی... تم مجھے بلیک میل کر رہے ہو؟''

''کیا کروں... مجبوری ہے یہ بھی... گھی سیدھی انگلی سے نہ نکلے تو ٹیڑھی کرنی پڑتی ہے۔ اس وقت تم مجھے انکار کیسے کر سکتے ہو... تمہاری بیوی میٹرنٹی ہوم میں لیٹی ہوئی ہے ابھی تک اس نے کچھ نہیں کیا... رات گزر گئی... ہو سکتا ہے دن میں بھی انتظار فرمایئے کا سلسلہ چلتا رہے... فرض کرو وہ فارغ ہو گئی پھر بھی وہ دو دن تو اٹھ نہیں سکتی۔''

''ہاں... ڈاکٹر کہتی ہے سیزرین کیس ہے۔'' میں نے بے بسی سے اعتراف کیا۔

''تم اسے چھوڑ کے بھی نہیں بھاگ سکتے اور اٹھا کے بھی... کہ تمہاری گود میں بیوی ہو اور بیوی کی گود میں ایک بچہ... یا دو بچے... یہ کامیڈی فلم کا سین ہو سکتا ہے... عملی طور پر ممکن نہیں۔'' وہ بولتا رہا۔ ''رات کو ہم قبرستان جائیں گے... یہ طے ہے... اچھا ہے آج کا دن تم سو کے اپنی توانائی بحال کرو... تم چاہو تو میں شان خدا میٹرنٹی ہوم میں جا کے تمہاری بیوی کے بارے میں صحیح رپورٹ دے سکتا ہوں۔''

میں نے اس کی پیشکش قبول کر لی کیونکہ وہ بہرحال ایک کوالیفائیڈ سرجن تھا۔ خود ساختہ ڈاکٹر کی تو شنی گم ہو گئی۔ اپنی بیوی سے میں نے کہا کہ یہ بہت بڑے گائنی اسپیشلسٹ صرف تمہیں دیکھنے آئے ہیں۔ ڈاکٹر شیرازی نے معائنے کے بعد تصدیق کی کہ میں ایک نہیں دو بچوں کا باپ بنوں گا مگر شاید کل تک... ابھی اسے داخل ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ قبل از وقت جو درد اٹھتے ہیں وہ FALSE ہوتے ہیں۔ میں شان خدا میٹرنٹی ہوم کی نگراں پر برس پڑا کہ اس نے محض اسپتال کا بل بنانے کے لیے ایسا کیا تاہم اب میری بیوی کے لوٹ کر اوپر جانے اور کل پھر نیچے آنے میں تکلیف ہی تکلیف تھی۔

میں واپس آیا اور شام تک ہم دونوں سوتے رہے۔

ٹینشن کی وجہ سے مجھے نیند بھی ٹوٹ ٹوٹ کر آئی اور درمیان میں ایک بار ہم دونوں لنچ کے لیے کیفے ڈی پھونس بھر گئے... اب وہ مجھے ایک لمحے کے لیے اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اور میں نئی نویلی دلہن سے زیادہ مجبور اور بے بس تھا۔ شام ہونے پر ہم نیچے اترے۔ اس نے اپنے فلیٹ میں سے صرف ایک بیلچہ لیا جو غلاف میں لپٹا ہوا کسی ستاری گٹار جیسا لگتا تھا اور ہم موسیقاروں کی جوڑی جو کہیں پر فارم کرنے جا رہے ہوں۔

ایک ٹیکسی نے ہمیں حیدر آباد سے کچھ پہلے اندھیری سڑک پر اتار دیا۔ ہم کچھ دور پیدل گئے۔ جو کچے راستے پر دائیں جانب چل پڑے۔ کوئی آدھے گھنٹے کی مسافت پر ایک قبرستان کے آثار نمودار ہوئے۔ یہ کچھ مکلی کے تاریخی قبرستان جیسا تھا۔ کچھ قبریں اونچی اونچی تھیں۔ میرا خوف سے برا حال تھا۔

اس نے کہا۔ ''یار حوصلہ رکھو... بس آج کی رات ہے۔''

میں نے جل کے کہا۔ ''پھر ہم دونوں ہی قبر میں یا جیل میں۔''

''بس... تم بھی آزاد اور میں بھی۔''

''اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ تم بعد میں بھی مجھے بلیک میل نہیں کرتے رہو گے؟''

اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ ''جنٹلمین پرومس اس کے علاوہ مجھے ضرورت کہاں ہو گی... اچھا ہم اس جگہ پہنچ گئے ہیں۔''

میں نے مردہ آواز میں کہا۔ ''اگر گورکن نے دیکھ لیا... پھر؟''

''وہ ستر سال کا بوڑھا ہے۔ بیوی مر گئی... لڑکا یہ کام نہیں کرنا چاہتا تھا... چھوڑ کے چلا گیا۔ سر شام اپنی کوٹھری میں سو جاتا ہے۔ وہ کوئی نشہ کرتا ہے۔ غالباً ہیروئن... یہاں کی مٹی بھربھری ہے... تمہیں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی... چکنی مٹی سخت ہوتی ہے۔'' وہ قبروں کے درمیان سے گزرتا گیا۔

میں نے کہا۔ ''لاش کو نکال کے تم کیا کرو گے۔ گھر لے جاؤ گے؟''

وہ بولا۔ ''کسی نئی کھدی ہوئی قبر میں دفن کرنا بہتر ہو گا۔ بڑھاپن میں قبریں کھود کے مرنے والوں کے لیے تیار رکھتا ہے۔ مگر وہ قبرستان کا دوسرا کنارہ ہے... باقی کام میں کر لوں گا... تم فکر مت کرو۔''

اس کا دایاں ہاتھ مستقل اپنی پتلون کی جیب میں تھا اور وہ مجھے سے کچھ فاصلے پر چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب مجھے



شک پڑتا تھا کہ اس کے پاس کوئی ریوالور ہے اور میں نے کوئی بے وقوفی کی تو وہ مجھے گولی مارنے میں دیر نہیں لگائے گا۔ مجھے اپنی بیوی کا خیال آتا تھا اور اپنے دو ہونے والے بچوں کا تو عقل سمجھاتی تھی کہ جیسے بھی ہو، یہ کام کرو اور اپنی جان چھڑاؤ۔

بالآخر وہ ایک قبر کے پاس رک گیا جس کے قریب ہی ایک پرانا برگد کا درخت تھا۔ چوڑے تنے والا دور تک پھیلا ہوا۔ اس نے بیلچہ میرے ہاتھ میں دیا۔ ''لو... دیر مت کرو... اس کام میں دو تین گھنٹے ضرور لگ جائیں گے۔''

جب میں نے بیلچہ اٹھایا تو سر اٹھا کے خدا سے معافی بھی مانگی کہ میں یہ گناہ اپنی مرضی سے نہیں کر رہا ہوں اے غفور الرحیم... میرے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے مگر وہ بڑے آرام سے کھڑا تھا۔ اس کے لیے گلی سڑی ٹوٹی پھوٹی لاشیں کوئی وحشت ناک چیزیں نہیں تھیں۔ اس نے نہ جانے کتنے پوسٹ مارٹم کیے ہوں گے۔

مشکل سے دس منٹ بیلچہ چلا کے میرا تھکن سے برا حال ہو گیا ابھی میں نے صرف اوپر کی مٹی ہٹائی تھی۔ میں پانی پینے کے لیے رکا اور اس امکان کا جائزہ لیتا رہا کہ اچانک گھما کے بیلچہ اس کے سر پر ماروں مگر ہمت نہ ہوئی۔ اسی وقت شاید اللہ نے میری سُن لی۔

اچانک اس نے بیلچہ مجھ سے لے لیا۔ ''یار اتنی جلدی تھک گئے... آج کل کے نوجوان بھی بس دیکھنے ہی دیکھنے کے ہیں... لاؤ مجھے دو۔''

میں نے بیلچہ اسے دے دیا۔ اس وقت میری نظر نے ایک روشنی دیکھی جو چند سیکنڈ میں غائب ہو گئی۔ یہ غالباً کوئی گاڑی تھی جو کچھ فاصلے پر رکی تھی۔ پھر ایک سایہ سا تاریکی میں نمودار ہوا۔ ڈاکٹر بڑے جوش سے یہ ثابت کرنے میں لگا ہوا تھا کہ عمر میں مجھ سے زیادہ ہونے کے باوجود اس میں کتنا دم ہے۔ اسے کچھ پتا نہیں چلا اور میں اٹھ کے درخت کے پیچھے چھپ گیا۔

وہ سایہ ایک آدمی کا تھا جو آہستہ آہستہ قریب آ رہا تھا۔ وہ بالکل ڈاکٹر کے سر پر پہنچ گیا تو اسے پتا چلا، میں درخت کے تنے کے پیچھے چھپا ہوا دیکھ رہا تھا۔ یکلخت ڈاکٹر پلٹا اور اس نے کسی اجنبی کو دیکھا جو اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ حیرت انگیز پھرتی کے ساتھ اس نے اجنبی پر بیلچے سے وار کیا۔ ''علی مراد... تیری موت تجھے یہاں لائی ہے۔''

علی مراد ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ''میری یا تیری... مجھے پتا تھا تو یہی کرے گا... میں نے گورکن سے کہا تھا کہ ہوشیار رہے... اور مجھے فون کر دے۔''

ڈاکٹر شیرازی رک گیا۔ ''علی مراد پہلے میری بات سنو... پھر مجھے بے شک مار دینا۔''

''اب کہنے سننے کو کیا رہ گیا ہے؟'' علی مراد غرایا اور اس نے ریوالور سے نشانہ لیا۔

اس وقت دو کام ہوئے۔ درخت کے تنے کے پیچھے سے میں نے جست لگائی اور آخری کوشش کے طور پر ڈاکٹر نے بیلچہ گھما دیا۔ ممکن ہے علی مراد اس وار سے زندہ بچ پاتا مگر میں اس سے ٹکرایا تو اس کا توازن بگڑا۔ وہ آگے گیا اور بیلچہ اس کے ریوالور والے ہاتھ پر پڑا۔ ریوالور اس کی گرفت سے نکل کے دور جا پڑا۔

میں نے لپک کے ریوالور اٹھا لیا۔ یہ ایک لمحہ تھا جس میں میرے دماغ نے بالکل صحیح فیصلہ کیا جو کام علی مراد نہ کر سکا، وہ میں نے کر دیا۔ میں نے ڈاکٹر شیرازی کی کھوپڑی میں سوراخ کر دیا۔

علی مراد نے میری طرف دیکھا۔ ''تم نے میری جان بچائی... کیوں... تم تو اس کے ساتھ آئے تھے؟''

میں نے ریوالور اسے دے دیا۔ ''قتل میں نے کیا ہے... اب تم مجھے اس الزام سے بچا سکتے ہو۔''

اس نے میرے شانے پر تھپکی دی۔ ''میں تمہارا احسان مند ہوں... اور رہوں گا... آؤ میرے ساتھ۔''

میں نے جو فیصلہ کیا منطقی اور ایک لمحے کا فیصلہ تھا۔ اگر ڈاکٹر شیرازی زندہ رہتا تو میرے مستقبل کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔ ضرورت پڑنے پر وہ دوبارہ مجھے بلیک میل کرنے آ جاتا۔ اس نے ایک عورت کے لیے اس کے شوہر کا قتل کیا تھا اور اپنی طبی مہارت سے بچ گیا تھا۔ پھر اسی عورت کو اس نے اپنی ہوس پر قربان کر دیا تھا۔ دوبارہ اسی طبی مہارت کا غلط استعمال کر کے اس نے قانون کا خون کیا تھا۔ یہ سب اس نے خود مجھے بتایا تھا۔ ایک لمحے کا فیصلہ یہ تھا کہ اسے میں سزائے موت دے سکتا ہوں تو یہ غلط نہیں تھا۔

علی مراد انٹرنیشنل دہشت گرد یا اسمگلر ہو گا... اس کو پکڑنا یا سزا دینا میرا کام نہیں تھا۔ میں نے تو صرف یہ سوچا کہ وہ احسان کا بدلہ چکانا چاہے گا تو میں اس سے کہوں گا کہ مجھے اور میری بیوی۔ اور میرے دو بچوں کو صرف زندہ رہنے کی ضمانت چاہیے اور مجھے یقین تھا کہ وہ میری جان کے دشمن میرے سسرالی اور میرے رقیب... دونوں کا دماغ درست کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے... میرا ایک لمحے کا فیصلہ غلط نہیں تھا۔

# بے بس اختیار

پروین زبیر

مثبت اندازِ فکر اور مقصدِ حیات ہی دائمی زندگی کا ضامن بنتا ہے... اس کی زندگی بھی انسانیت کے رشتوں کو پروان چڑھانے... انہیں ان کے جائز حقوق دلوانے کے بھنور میں پھنس چکی تھی... اور وہ اس دلدلی بھنور سے نکلنا نہیں چاہتا تھا... اس بھنور میں اس کا مقصد پوشیدہ تھا... اور وہ ہر صورت اس سے منسلک رہنا چاہتا تھا...

**ایک بااختیار شخص کی داستاں جسے وقت نے ایک دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا**

اس کا چمکتا ہوا سخت رول بار بار ہوا میں بلند ہو کر شائیں کی آواز کے ساتھ قیدی کے جسم کے کسی حصے پر بجلی بن کر گر رہا تھا۔ قیدی کی اذیت بھری چیخیں اور دردناک آہ و فغاں جیل کی محدود فضا میں دور دور تک گونج رہی تھیں... وہ رکے بغیر قیدی پر اس طرح ڈنڈے برسا رہا تھا جیسے آج ہی اس کے جسم کا ہر عضو الگ الگ کر کے کتوں کے آگے ڈال دے گا۔

غصے اور وحشت میں پسینے پسینے، سرخ چہرہ اور جلتی آنکھیں لیے قیدی پر اس طرح تشدد کر رہا تھا جیسے یہ اس کی آسودگی کا سبب ہو... جیل میں ان دہشت ناک آوازوں کے سوا ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا... قیدی اپنی اپنی بیرکوں کی سلاخیں پکڑے... سُتے ہوئے چہرے لیے یہ آوازیں سن رہے تھے اور اپنے اندر کانٹوں کی طرح چبھتے خوف پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے۔

سینئر جیلر، حوالدار اور ایک اور پولیس افسر ایک طرف کھڑے خاموشی سے اپنے ''صاب'' کی اس وحشت کو سنجیدگی سے دیکھ رہے تھے۔ جیلر کو یہ فکر ہو رہی تھی کہ اگر اس بے پناہ تشدد سے قیدی مر گیا تو اسے کہاں کہاں جواب دہی کرنا پڑے گی اور وہ کیا کیا بہانے بنا سکتا ہے۔

ایسے میں ہی ایک سنتری نے سینئر جیلر کو اشارے سے باہر بلایا۔

''صاحب جی! وہ سزائے موت کا قیدی پہنچ گیا ہے... وہ انتظار کر رہے ہیں۔'' اس کی بات سن کر سینئر جیلر نے اسے جانے کا اشارہ کیا اور تیز قدم اٹھاتا دوبارہ اندر داخل ہوا۔

''سر! وہ سزائے موت کے قیدی کو لے آئے ہیں... آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' سینئر جیلر نے انتہائی ادب سے ''صاب'' کے کان میں سرگوشی کی تو وہ زمین پر پڑے بے حال قیدی کو گھورتے ہوئے پلٹے اور باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

''یہ کیا ہے؟'' اپنے آفس میں داخل ہوتے ہی نظر کونے میں پڑی کچھ کتابوں اور کاغذوں پر پڑی تو انہوں نے اپنے اردلی سے پوچھا۔

''سر! یہ آنے والے قیدی کا سامان ہے۔'' اردلی نے دبی آواز میں ''صاب'' کو آگاہ کیا تو وہ اور بھڑک اٹھے۔ چیخ کر کچھ کہنا چاہا تھا کہ اردلی نے صاف ستھرے کرسٹل کے گلاس میں یخ بستہ پانی نہایت ادب سے ان کے سامنے پیش کر دیا۔ انہوں نے سپاہی کو گھورتے ہوئے پانی کا گلاس اٹھا کہ منہ سے لگایا اور غٹ غٹ کر کے پی گئے۔ گلاس کو واپس طشتری میں پٹختے ہوئے وہ آفس سے باہر نکلے تو ان کے دو جونیئر ان کے پیچھے پیچھے تھے۔

''کہاں ہے وہ باسٹرڈ؟'' انہوں نے قدم بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''چیکنگ روم میں ہے سر۔'' ان میں سے ایک نے جواب دیا تو وہ اسی رعب اور دبدبے سے کھٹ کھٹ کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ بائیں جانب گھومتے ہی نیم تاریک



لمبی بیرک کے پہلے کمرے سے باہر آنے والا پولیس افسر ٹھٹک کر وہیں رک گیا۔ کھٹاک سے سیلوٹ کیا تو انہوں نے دہاڑتے ہوئے اسی سے پوچھا۔

''کہاں ہے وہ سور کا بچہ؟''

''سور اور اس کے بچے کا تو پتا نہیں... پر میں یہاں ہوں۔'' کمرے کے ایک نیم تاریک گوشے سے آواز آئی تو انہوں نے مڑ کر دیکھا اور نظر جیسے جم کر رہ گئی۔

ہلکے رنگ کی میلی سی جینز پر مٹیالے سے رنگ کا ڈھیلا ڈھالا کُرتہ پہنے... آنکھوں پر ریم لیس چشمہ لگائے وہ اطمینان سے دیوار سے ٹیک لگائے زمین پر بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ میں کوئی کتاب تھی اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔

سزائے موت کے قیدی کے تصور سے بالکل مختلف... بھاری بھرکم جثہ، سرخ گھورتی آنکھیں... اور ان آنکھوں میں جھلکتی فریاد... کہ خدا کے لیے مجھے موت سے بچا لو۔

اب تک انہوں نے جو ایک سو سات مجرم پھانسی پر لٹکائے تھے، ان میں سے ننانوے فیصد اسی حلیے اور اسی حالت میں ہوتے تھے لیکن اس نئے قیدی نے ان سارے تصورات کو باطل کر دیا تھا۔ جیل سپرنٹنڈنٹ کو پہلی نظر میں اسے دیکھ کر ایک جھٹکا سا لگا۔

''یہ جیل ہے... تمہارے باپ کی سسرال نہیں ہے جو اس طرح مزے اڑا رہے ہو۔'' انہوں نے لہجے میں غصہ اور طنز سموتے ہوئے کہا اور اس کے ہاتھ سے سگریٹ چھین لی۔ فوراً ہی مجرم کا نرم سا ہاتھ آگے بڑھا اور اس کی کلائی آہنی

گرفت سے پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے نرمی سے اپنی سگریٹ جیل سپرنٹنڈنٹ کے ہاتھ سے واپس لے لی... پھر ایک لمبا کش لے کر بولا۔

''میری اپنی ہے... جیل میں اسمگل ہو کر نہیں آئی... آپ لیں گے؟'' اس نے پیکٹ ان کی طرف بڑھایا تو وہ قہر آلود نظروں سے اسے گھورتے رہے۔ جیل کا عملہ اور ساتھ لانے والے پولیس افسر اور سپاہی پر یکلخت سناٹا سا چھا گیا... ایسے میں سپرنٹنڈنٹ نے اپنا رول گھما کر اپنے ہاتھ پر مارا... شاید اسے تول کر وہ اگلا وار پوری قوت سے قیدی پر کرنا چاہتے تھے... وہ کچھ آگے بڑھے ہی تھے کہ اسے لے کر آنے والا پولیس افسر آگے بڑھ کر ان کے اور قیدی کے درمیان آگیا۔

''نو سر! ابھی یہ ہماری کسٹڈی میں ہے... اس لیے آپ اسے زدوکوب نہیں کر سکتے۔'' اس پولیس افسر نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو وہ سمجھ گئے کہ انہیں اس وقت خاموش رہنا ہوگا تاہم انہوں نے قیدی کو گھورتے ہوئے کہا۔

''پھانسی کی سزا ہو گئی ہے... لیکن ابھی بھی مستی گئی نہیں ہے۔''

''ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جن کی مستی پھانسی کی سزا سن کر چلی جائے... ہماری مستی تو کچھ اور ہی ہے جو آپ جیسے وردی پوش غلاموں کی سمجھ میں آنے والی نہیں ہے۔'' اس نے دیدہ دلیری سے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا تو آس پاس کھڑے لوگوں پر ایک سکتہ سا طاری ہو گیا۔ وہ اندر سے دہل گئے' یہ سوچ کر کہ اب اس قیدی کی خیر نہیں ہے... صاحب کے تھک جانے تک ان کا بید قیدی کے جسم پر برستا رہے گا اور ابھی اس کی ساری منہ زوری خاک میں مل جائے گی۔

سپرنٹنڈنٹ نے جلتی ہوئی نظر اس پر ڈالی تو وہ بھی انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مسکراتی، بے باک نظروں سے... نہ جانے کیوں ان کی بید برسانے کی آرزو ان کے اندر کہیں سرد ہو گئی۔ وہ اسے گھورتے ہوئے سینئر جیلر سے مخاطب ہوئے۔

''چیکنگ کے بعد ہتھکڑی لگاؤ سالے کو... پھر دیکھتا ہوں میں...'' وہ دانت پیس کر غرائے تو قیدی کی آواز ان کے کانوں میں پڑی۔

''جیلر صاحب! دیکھنا ہی ہے... تو بغیر ہتھکڑی پہنائے دیکھیے... پھر دیکھتے ہیں... آپ کے ہاتھوں میں زیادہ دم ہے یا میرے سینے میں...''

سپرنٹنڈنٹ کے جذبات پر جیسے برف پڑ گئی۔ اصولی طور پر تو اس طرح کی گستاخی پر انہیں بھڑک جانا چاہیے تھا لیکن نہ جانے کیا ہوا کہ اپنے ماتحت عملے کے سامنے اس قسم کی بے عزتی کے باوجود انہوں نے اپنے اندر ابلتے آتش فشاں کو یخ بستہ ہوتے محسوس کیا۔ انہیں لگا کہ وہ اندر سے منجمد ہوتے جا رہے ہیں۔

ان کی پچیس سالہ ملازمت میں کبھی کسی قیدی میں اتنی جرأت نہیں ہوئی تھی کہ ان کے سامنے نظریں بھی اٹھا سکتا بلکہ ہمیشہ ان کی دہشت نے بڑے بڑے مجرموں کے پتے پانی کر دیے تھے... پر اس قیدی نے اپنے انوکھے برتاؤ اور رویے سے ان کے وجود میں دراڑیں سی ڈال دی تھیں لیکن... سالہا سال سے قیدیوں اور ماتحتوں کے ساتھ سخت ترین رویے نے ان کا جو رعب و دبدبہ قائم کیا تھا... وہ اسے ٹوٹنے نہیں دینا چاہتے تھے۔

''سر! چیکنگ شروع کروائیں۔'' قیدی کو لانے والے پولیس افسر نے انتہائی ٹھنڈے لہجے میں پوچھا تو وہ مضطرب انداز میں ہونٹ چباتے پولیس افسر کو گھورتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئے۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

پھر سینئر جیلر نے موٹا سا رجسٹر کھول کر صفحے پلٹتے ہوئے سپاہی کو اشارہ کیا اور چیکنگ کی کارروائی شروع ہو گئی۔ سپاہی نے بلند آواز میں پکارنا شروع کیا۔ ''قیدی نمبر 762، عبیر علی ہاشمی ولد نذیر علی ہاشمی...''

اب جیل جمعدار نے اس کا کرتہ اتارا اور اس کے بدن کا معائنہ کرتے ہوئے بڑبڑایا۔

گردن پر بائیں جانب سیاہ مسا... دائیں کاندھے کے نیچے گول سیاہ پیدائشی نشان... اور ''صاب!'' وہ چلایا۔

سینئر جیلر نے رجسٹر پر لکھتے لکھتے چونک کر سر اٹھایا۔ باقی سب لوگ بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''صاب! پیٹ پر زخم کا نشان... گولی کے زخم کا نشان...'' جمعدار ہیجان آمیز انداز میں چلایا۔

سپرنٹنڈنٹ سے رکا نہ گیا... وہ اپنا رول ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ پر مارتے ہوئے اٹھے اور قیدی کے نزدیک جا کر کھڑے ہو گئے... کچھ دیر اسے چبھتی ہوئی نظروں سے گھورتے رہے پھر اس کا بازو پکڑ کر ایک جھٹکے سے کھڑا کر دیا... سچ مچ اس کے پیٹ پر ایک تازہ بھرے ہوئے زخم کا نشان تھا۔ انہوں نے گھورتی ہوئی نظروں سے آنکھوں ہی آنکھوں میں سوال کیا۔

''چور ڈاکوؤں کی طرح جسم پر زخموں کے نشان لیے گھوم رہے ہو... اور اپنے آپ کو کوئی اونچی چیز سمجھتے ہو؟''



ریم لیس چشمے کے شفاف شیشوں کے پیچھے اس کی بھوری آنکھوں میں ابھرنے والی نرم مسکراہٹ اس کے ہونٹوں تک پھیلتی چلی گئی۔

''ہماری تحریک کے کچھ ساتھیوں کو پولیس نے گرفتار کر لیا تھا... انہیں چھڑانے کے لیے ہم نے تھانے پر حملہ کیا تھا... پولیس کی فائرنگ سے رائفل کی گولی میرے پیٹ میں لگی اور تین چار انچ اندر دھنس گئی۔'' اس نے وضاحت کی۔

''آپریشن کس اسپتال میں ہوا تھا؟'' سپرنٹنڈنٹ نے غرا کر وضاحت مانگی۔

''اسپتال؟ اسپتال میں کیسے ہو سکتا تھا؟ آلات میرے پاس تھے... ساتھی دوائیں لے آئے تھے... میں نے خود اپنا آپریشن کر کے گولی نکالی اور پٹی باندھ لی... میں خود سرجن ہوں۔'' اس کے نرم لہجے میں کہے گئے الفاظ نے وہاں موجود لوگوں کو ایک جھٹکا دیا۔ سپرنٹنڈنٹ نے چونک کر اس سے پوچھا۔

''تم ڈاکٹر ہو؟'' قیدی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پہلی بار جابر خان جیل سپرنٹنڈنٹ نے اپنے ذہن و دل میں بھڑکنے والی آگ کے شعلوں کو کمزور ہوتے ہوئے محسوس کیا اور سینئر جیلر نے اپنے پچیس سالہ سروس کیریئر میں پہلی مرتبہ کسی قیدی کے لیے نفرت کے بجائے عزت و احترام کا جذبہ محسوس کیا۔

پولیس افسر نے جیل سپرنٹنڈنٹ کو ایڑیاں جوڑ کر سیلیوٹ مارا۔

''سر! چیکنگ مکمل ہو گئی ہے۔ قیدی اب آپ کے حوالے ہے۔'' اس نے یہ کہتے ہوئے کاغذات دستخط کے لیے اس کے سامنے رکھ دیے۔

''سر! قیدی ایک معقول آدمی ہے... اگر اجازت ہو تو چند کتابیں اور کاغذات اسے لکھنے پڑھنے کے لیے دے دوں... اس نے مانگی ہیں۔'' پولیس افسر نے پوچھا۔

''کاغذ قلم نہیں... صرف کتابیں...'' انہوں نے اجازت دی اور کاغذات دستخط کر کے سینئر جیلر کی طرف بڑھا دیے... اور اپنے ماتحت عملے کی آنکھوں میں حیرت اور استعجاب کو نظر انداز کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔

☆☆☆

پتوں میں سرسرانے والی ہوا رک گئی... ہلکورے لیتی شاخیں ٹھہر گئیں اور ان پر بیٹھے پرندوں کی آوازیں بھی خاموش ہو گئیں... اس قبرستان کی سی خاموشی میں تارکول کی پکی سڑک پر بھاری بوٹوں کی آہٹیں ابھریں۔ جیل کے مین گیٹ پر تعینات حوالدار چاق و چوبند کھڑے ہو گئے۔ ''صاب'' کے نزدیک آتے ہی انہوں نے سیلیوٹ مارا اور پھرتی سے آگے بڑھ کر مین گیٹ کھول دیا اور وہ اسی رفتار سے رکے بغیر اندر داخل ہو گئے۔

آفس میں قدم رکھتے ہی انہوں نے پھانسی گھاٹ کے جیلر کو طلب کیا۔

''اس نئے قیدی کا ریکارڈ چیک ہو گیا؟''

''جی سر! سیشن جج نے سزا سنائی... ہائی کورٹ سے بھی کنفرم ہو چکی تھی... آج صبح یہ سپریم کورٹ سے کنفرمیشن بھی وصول ہو گئی ہے۔''

جیلر فائل سے ایک ایک صفحہ نکال کر اسے دکھاتا گیا۔ آخر میں سپریم کورٹ کے تصدیق شدہ آرڈر کو ہاتھ میں پکڑے انہوں نے غور سے پڑھتے ہوئے کچھ بڑبڑایا۔

''ہینگ ٹل ڈیتھ۔ اس کے گھر والوں کو خبر کر دو۔'' انہوں نے جیلر کو حکم دیا۔

''اس نے صدرِ مملکت سے رحم کی اپیل کے لیے درخواست لکھ دی ہے کیا؟'' انہوں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''نہیں سر! ابھی تو نہیں لکھی۔'' جیلر نے 'صاب' کو اٹھتے دیکھ کر فائل اٹھا لی۔ انہوں نے ٹیبل کی دراز سے چند سادہ کاغذ نکالے اور پھانسی گھاٹ کی طرف بڑھ گئے۔ سزائے موت کے قیدی کو صدرِ مملکت سے رحم کی درخواست کی اجازت دینا ان کے فرائضِ منصبی میں شامل تھا۔

''السلام علیکم جابر صاحب! کیسے ہیں آپ؟'' قیدی نے اپنی مخصوص نرم مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتے ہوئے پوچھا تو جابر صاحب کے اندر والے ''صاحب'' کو اس کا یہ اندازِ تخاطب بالکل پسند نہیں آیا۔ انہیں اپنے رتبے، اپنے عہدے اور اپنے رعب داب کی سخت توہین محسوس ہوئی انہوں نے قیدی کو گھورتے ہوئے حقارت سے مخاطب کیا۔

''قیدی نمبر 762! تم ایک سو آٹھویں قیدی ہو... جسے میں پھانسی پر لٹکانے والا ہوں۔'' ان کے انداز میں آسودگی اور خوشی کا پرتو محسوس کرتے ہوئے قیدی نے پوچھا۔

''آپ کو پھانسی پر لٹکانا بہت اچھا لگتا ہے؟''

''چور، ڈاکوؤں... قاتلوں، لٹیروں کو پھانسی پر لٹکانا میرے لیے آسودگی کا سبب ہے... میرے لیے یہ احساس بڑا خوش کن ہوتا ہے کہ میں نے معاشرے کو گندگی سے صاف کرنے میں اپنا حصہ ادا کر دیا ہے۔'' سپرنٹنڈنٹ نے عادتاً اپنا رول اپنے ہاتھ پر آہستہ آہستہ مارتے ہوئے جواب دیا تو قیدی کی مسکراہٹ ایک بے ساختہ ہنسی میں تبدیل ہو گئی۔

”پھر تو آپ غلطی پر ہیں جابر صاحب! اصلی گندگی کے ڈھیر کی طرف تو آپ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ رہے ہیں... جو اونچے اونچے ایوانوں میں گل سڑ رہے ہیں اور پورے ملک کی فضا کو مکدر کر رہے ہیں۔ میرے جیسے ہوا کے جھونکوں کو نابود کر کے خوش ہو رہے ہیں جو لوگوں کو بدبو کے ان منبعوں کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ قیدی نے سمجھانے کے انداز میں کہا تو سپرنٹنڈنٹ کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

”پولیس چوکی پر حملہ کر کے ایک انسپکٹر اور چار سپاہیوں کو مار دینے والے... اگر محض ہوا کے جھونکے ہوتے ہیں تو پھر تُف ہے ہم پر کہ ہم اپنے ساتھیوں کے قاتلوں کو ہوا کے جھونکوں کی طرح ہی نکل جانے دیں... تمہارے جیسے دو چار پھانسی پر لٹکیں گے تو باقی سب کے دماغ سے بغاوت کا یہ خناس خود بخود نکل جائے گا۔“

”آپ کے ساتھی اور آپ... اگر طبقۂ بدمعاشیہ کو ان کے کرتوتوں پر سزا دینے کا سوچ لیں... تو عدلیہ کا کام کتنا آسان ہو جائے... معاشرہ کتنا پُرسکون اور زندگی کتنی خوب صورت ہو جائے گی... کبھی سوچا آپ نے... کہ اپنی آنے والی نسل کو ایک اچھی دنیا بنا کر دینے میں آپ نے اپنے حصے کا کتنا کام کیا ہے... اور کیا بھی ہے یا نہیں؟“ قیدی کے لہجے میں یقین اور اعتماد کی ایسی سختی تھی کہ اس نے سپرنٹنڈنٹ کے اعتماد کی دیوار کو لرزا کر رکھ دیا۔

”ابھی وقت ہے... بول لو... بہت جلد پھانسی کا پھندا گلے میں ڈالے کھڑے ہو گے... لرزتی ٹانگوں کے ساتھ... جلاد کے لیور کھینچتے ہی پیروں کے نیچے سے زمین نکل جائے گی... لیکن تمہیں پتا ہے... تمہاری جان فوراً نہیں جائے گی... تم پھندے پر لٹکتے رہو گے... تڑپتے رہو گے... پھندا تنگ سے تنگ ہوتا جائے گا... آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں گی... تمہارے کھلے منہ سے زبان باہر لٹک جائے گی... یہی زبان جو اس وقت پٹر پٹر چل رہی ہے... اور تمہیں اس طرح لٹکتا، تڑپتا، پھڑکتا دیکھ کر مجھے... کتنی خوشی ہوگی... کتنی خوشی... اس کا اندازہ نہیں ہے تمہیں...“ جیل سپرنٹنڈنٹ نے دانت پیستے ہوئے اتنی نفرت سے کہا کہ قیدی کی آنکھوں میں حیرت ابھر آئی۔

”کیا اس قدر اذیت پسند ہو؟... آپ کی کوئی نفسیاتی گرہ ہے... یا کوئی پرانی چوٹ... جو دل پر لگی ہے... اور آج بھی تکلیف دے رہی ہے؟“ قیدی نے نرم لہجے میں کہا۔

”شٹ اَپ... میری چھوڑو... اپنی بات کرو... پھانسی کے پھندے پر جھول کر... اتنی اذیت اٹھا کر... تمہیں کیا ملنے والا ہے؟“ انہوں نے چیخ کر پوچھا۔

”میں ایک مقصد کی خاطر جان دے رہا ہوں... میں مطمئن ہوں... یہاں ایک مثال چھوڑ کر جاؤں گا... جو دوسروں کے لیے نقشِ قدم ثابت ہوگی... اور مجھے یقین ہے کہ وہاں اوپر بھی میرے ساتھ ناانصافی نہیں ہوگی... میں اس وقت بھی نہایت مطمئن ہوں اور میرے اندر آسودگی کا احساس موجود ہے۔“ قیدی نے ہموار لہجے میں اپنی بات ختم کی تو اس کے چہرے پر مکمل سکون اور اطمینان تھا۔ سپرنٹنڈنٹ غور سے اس کو دیکھ اور سن رہے تھے۔

”ہم م م م... تو کسی مقصد کے لیے لڑ رہے ہو؟ لیکن زندہ رہو گے تو جدوجہد کر پاؤ گے نا... مر گئے تو کہانی ختم...“ اس کی بات سن کر قیدی آہستگی سے ہنسا۔

”کسی بڑے مقصد کی لڑائی میں ایک آدمی کبھی کامیابی حاصل نہیں کرتا... یہ ایک مشترکہ جدوجہد ہوتی ہے... میرا کام یہاں تک تھا... اب دوسروں کی باری ہے... اور میری پھانسی... دوسروں کے لیے ایک مثال... ایک روشنی کا مینار ثابت ہوگی اور آپ یقین کریں کہ بہت سے لوگ میری تقلید کریں گے... ان کے لیے بھی یہ راہ مشکل نہیں رہے گی... آپ خوش ہو جائیے... بہت سے لوگ یہاں آپ کی تسکینِ ذوق کے لیے... اپنی ہتھیلیوں پر سر رکھ کر آئیں گے۔“

سپرنٹنڈنٹ غور سے قیدی کی باتیں سن رہے تھے... پھر ان کی آنکھوں میں چھائی وحشت رفتہ رفتہ ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح پُرسکون ہو گئی... انہیں اپنا فرض یاد آ گیا... انہوں نے ہاتھ میں پکڑے کاغذات اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی اس جذباتی سوچ سے ہٹ کر... عملی سوچ اختیار کرو... اور زندہ رہ کر اپنے مقصد کے لیے کام کرو... تمہارے پاس ابھی ایک موقع ہے... زندہ رہنے کی کوشش کرنے کا... تم صدرِ مملکت کے نام اپنے لیے رحم کی درخواست لکھ سکتے ہو۔“

قیدی نے کاغذات ہاتھ میں لے کر انہیں غور سے دیکھا... پھر ہلکی سی ہنسی کے ساتھ گویا ہوا۔

”کسی شاعر کا لکھا ہوا... فی الحال ایک مصرعہ مجھے یاد آ رہا ہے... پتا نہیں صحیح ہے یا نہیں... لیکن مفہوم کچھ یہی ہے۔

جس پہ مرتے ہیں اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں۔“

اس نے سادے کاغذ تہ کر کے ان کے کلف زدہ یونیفارم کی جیب میں ڈالے اور جیب تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

”جابر صاحب! انہیں اپنے پاس رکھیے... مجھے پھانسی پر لٹکانے کے بعد آپ کی پروموشن کی درخواست لکھنے کے کام آ جائیں گے۔“ قیدی کا طرزِ عمل انہیں آگ بگولہ کر دینے کا سبب بن سکتا تھا لیکن وہ اچنبھے میں کچھ جزبز ہو کر رہ گئے... ان کا خیال تھا پہلے پھانسی پر چڑھائے جانے والے ایک سو سات قیدیوں کی طرح... اسے بھی بے انتہا ڈرا اور خوف زدہ ہونا چاہیے تھا... ان کے قدموں میں لوٹیں لگانا چاہیے کہ وہ اسے بچانے کا کوئی نہ کوئی راستہ بتائیں۔

لیکن یہ ڈھیٹ... پتا نہیں کس مٹی کا بنا ہے... اس کے انداز سے تو لگتا ہے یہ پھانسی گھاٹ نہیں... اپنی سسرال میں آیا ہوا ہے... شاید اسے واقعی پھانسی کی اذیت کا اندازہ نہیں ہے۔

”تمہاری پھانسی میں صرف آٹھ دن باقی ہیں۔ خیال رکھنا کہ تمہارا غرور ٹوٹنے میں کہیں یہ وقت گزر نہ جائے... پھر پچھتانے کا بھی وقت نہیں ملے گا... سمجھے!“ انہوں نے قیدی کو ہدایت دی اور پہلی مرتبہ کسی قیدی کو چار چوٹ کی مار مارے بغیر... جھلاہٹ، غصے اور نفرت کے اظہار کے بغیر پھانسی گھاٹ کے جیلر کو ہدایات دیں۔

”دو دن بعد جس قیدی کو پھانسی ہونے والی ہے... اسے لا کر قیدی نمبر 762 کی برابر والی کوٹھری میں ڈال دو۔“ اور یہ ہدایت دے کر وہ کھٹ کھٹ جوتے بجاتے برآمدہ پار کر کے مین گیٹ سے باہر نکل گئے۔

برآمدے کے دونوں جانب بنی ہوئی بیرکوں سے جھانکتے قیدیوں کی آنکھوں میں حیرت صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ نہ وہ مار دھاڑ کی آوازیں... نہ وہ خود تخلیقی گالیوں کا شور... اور نہ ہی بیرک کی سلاخوں پر بجنے والے رول کی کٹ کٹ کی دہشت ناک آوازیں۔

”حیرت ہے۔“ ان سب نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوچا اور اطمینان کا ایک لمبا سانس لے کر اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔

☆☆☆

سات بجے الارم بجا اور ٹھیک ساڑھے سات بجے وہ ٹیرس پر آ کر اپنی راکنگ چیئر پر بیٹھ گئے... خانساماں نے چائے اور آج کا اخبار ٹرے میں رکھ کر نہایت سلیقے سے صاحب کی خدمت میں پیش کیا... صاحب نے اخبار میں جرائم والا صفحہ کھولا... سرخیوں پر نظر ڈالتے اور چائے کے گھونٹ لیتے رہے... چائے کی پیالی رکھ کر انہوں نے اخبار کے سارے صفحوں کی سرخیوں پر سرسری نظر ڈالی۔

”ربش۔“ بڑبڑاتے ہوئے انہوں نے اخبار کو سائڈ ٹیبل پر پٹخا اور کرسی پر جھولنے لگے۔ دور جیل کے طویل و عریض کمپاؤنڈ میں قیدی سبزیوں کی کیاریوں میں کام کرتے نظر آ رہے تھے۔

ان کے جھولنے کی رفتار میں اضافہ ہوتا رہا۔ سب جانتے تھے کہ ان کے اندر جوں جوں غصے کا درجۂ حرارت بڑھتا تھا ان کے کرسی پر جھولنے کی رفتار تیز سے تیز ہوتی جاتی۔

اگلے پورے گھنٹے وہ یہی سوچتے رہے کہ آج جیل میں داخل ہوتے ہی دہشت پھیلانے کا کون سا نیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ کس کو ڈنڈے رسید کیے جائیں... کس قیدی کو مرغا بنا کر لاتیں رسید کی جائیں... کس سپاہی یا حوالدار کی ماں بہن ایک کی جائے یا پھر کس جیلر کو کھری کھری سنائی جائیں۔

وہ انہی سوچوں میں گم تیزی سے کرسی پر جھول رہے تھے کہ سپاہی نے کسی قیدی کی ملاقات کے بارے میں بتایا۔

”سر! وہ قیدی کی بیوی اس سے ملنے آئی ہے۔“ اس نے بتایا۔

”ٹھیک ہے... بیٹھا رہنے دو ابھی اسے جیل کے باہر ہی۔“ انہوں نے یونہی بے خیالی میں کہا اور دوبارہ اپنی سوچوں میں ڈوب گئے۔ اب ان کا دھیان پھانسی والے نئے قیدی کی طرف مڑ گیا۔

”سالے کے دماغ میں پتا نہیں کس چیز کا خناس ہے... رحم کی اپیل کرنے کو ہی تیار نہیں ہے... اپیل کر دے تو شاید موت کی سزا عمر قید میں تبدیل ہو جائے... سیاسی بیک گراؤنڈ ہے... حکومت بدلے تو شاید چھوٹ بھی جائے... اتنا پڑھا لکھا ہے... ڈاکٹر ہے... اور جی دار بھی ہے... پر اتنی عقل کیوں نہیں آ رہی ہے اسے...“ ان کا لاڈلا السیشن کتا آ کر ان کی ٹانگوں سے لپٹا تو ان کے خیالات کی رو ٹوٹی... لیکن کتے کی گردن سہلاتے ہوئے پھر ذہن وہیں الجھ گیا۔

”جان بچانے کے لیے تو انسان تنکے کا سہارا بھی نہیں چھوڑتا... پھر یہ کیوں نہیں کرتا رحم کی درخواست؟“ وہ بڑبڑائے۔

عجیب بات تھی کہ قیدی کی بوندوں جیسی باتیں اور نرم ہوا کے جھونکوں جیسی مسکراہٹ نے ان کے سینے میں رکھے پتھر میں کچھ دراڑ سی ڈال دی تھی۔ اس کے نڈر اور دلیرانہ انداز نے... اس کے دل موہ لینے والے اطوار نے انہیں ایک عجیب سی کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا۔

www.digestpk.com

ان کی جابرانہ فطرت کہتی تھی کہ اس کی ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر اسے اتنا ماریں کہ بیدٹوٹ جائے اور ساتھ ہی اس کا غرور بھی... وہ ان کے قدموں میں لوٹے اور ان سے فریاد کرتا دکھائی دے... لیکن دل کہتا۔

''نہیں... ایسا ہمت والا... نڈر اور دلیر شخص... ذلیل کرنے کے لیے نہیں بلکہ احترام کرنے کے لیے ہوتا ہے... سراہے جانے کے قابل ہوتا ہے۔''

''سر! وہ عورت انتظار کررہی ہے۔'' سپاہی نے پھر انہیں سوچوں کے بھنور سے نکالا تو وہ بھنّا کر اٹھے... اس عورت کو دو چار گالیاں دے کر اور ایک آدھ لات رسید کر کے وہاں سے دفع کرنے کے ارادے سے باہر آئے۔

''کون ہے تو؟ کس سے ملنے آئی ہے؟'' انہوں نے ہتک آمیز انداز میں اس عورت کو مخاطب کیا جو ان کے برآمدے کی سیڑھیوں سے نیچے کھڑی دور نظر آنے والے جیل کے مین گیٹ کو تک رہی تھی۔

ان کی آواز سن کر وہ مڑی تو انہوں نے دیکھا وہ ستائیس اٹھائیس برس کی ایک لڑکی تھی... میلے ہوئے سوتی لباس میں وہ کچھ بیمار سی نظر آرہی تھی۔

''میرے شوہر کو پھانسی کی سزا ہوئی ہے... قیدی نمبر 762... عبیر علی ہاشمی... آپ لوگوں کی طرف سے آخری ملاقات کے لیے یہ خط ملا... تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ کراچی سے اتنی دور... یہاں اس دور افتادہ جیل میں محبوس ہے... میں اس سے ملنے آئی ہوں۔'' عورت کی آواز کمزور... لیکن لہجہ پُراعتماد تھا۔

''آج جمعہ ہے... اور جمعے کو کسی قیدی کی ملاقات نہیں آسکتی... چھٹی ہوتی ہے آج...'' انہوں نے جیلر کا مخصوص جملہ دُہرایا۔

''میں بہت دور سے اور بڑی مشکل سے آئی ہوں... اجازت نامہ ہے میرے پاس... صرف تھوڑی دیر...'' لڑکی نے اور بھی نہ جانے کیا کہہ کہہ کر منت سماجت کی کہ اسے صرف تھوڑی دیر کے لیے اپنے شوہر سے ملاقات کی اجازت دے دی جائے۔

وہ بے خیالی میں اس کی باتیں سنتے رہے پھر ایک شیطانی خیال نے انہیں بہکایا۔ انہوں نے گھورتی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

''ٹھیک ہے... جاؤ! مین گیٹ پر میرا انتظار کرو... میں دیکھتا ہوں کہ کچھ ہوسکتا ہے... یا نہیں۔''

قیدی کا غرور توڑنے کی بڑی اچھی ترکیب ان کے دماغ میں آگئی تھی۔

''جب بیوی کی حالت خراب دیکھے گا... تو خود ہی عقل ٹھکانے آجائے گی سالے کی... ڈھیر ہوجائے گا میرے قدموں میں... ساری اکڑفوں نکل جائے گی... پھر دیکھتا ہوں کیسے نہیں لکھتا رحم کی درخواست۔'' انہوں نے سر ہلایا اور واپس بنگلے کے اندر چلے گئے۔

☆☆☆

صبح سے دوپہر ہوگئی... چلچلاتی آگ برساتی دھوپ... دور دور تک کوئی سایہ نہیں تھا... درخت تھے لیکن سڑک کے دونوں جانب... جیل کے مین گیٹ کے نزدیک کوئی سایہ نہیں تھا... گیٹ کے نزدیک وزیٹرز روم میں بھی تالا پڑا ہوا تھا... اور باہر بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں تھی پر صاحب کا حکم تھا کہ مین گیٹ کے نزدیک رہو... کیا خبر کب ملنے کی اجازت آجائے۔

وہ سر پر آنچل اوڑھ کر دھوپ سے بچنے کی کوشش میں پسینے پسینے ہورہی تھی۔ گرمی اور دھوپ کی شدت سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا تھا۔ سورج سر پر آگیا تھا اور گرمی کی شدت سے اب کھڑے رہنا محال ہورہا تھا۔ کبھی کبھی لو کے تھپیڑے پڑتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے قدم ڈگمگا رہے ہوں اور وہ اب گری یا تب گری والی کیفیت میں ہو... نہ جانے کس حال میں آئی تھی کہ نہ کھانے کے لیے کچھ پاس تھا اور نہ پینے کے لیے پانی۔ گرمی کی شدت سے حلق میں کانٹے پڑنے لگے تو وہ گیٹ پر کھڑے حوالدار سے پانی مانگنے کے لیے آگئی... حوالدار بیچ سے اس کی بے بسی اور بے کسی دیکھ کر جل کڑھ رہا تھا۔ پھر ''صاب'' کی ہدایات نے اسے سخت جھنجلاہٹ میں مبتلا کردیا تھا۔

''بی بی! یہ جیل ہے... کوئی ہوٹل نہیں ہے کہ آپ نے آرڈر کیا اور چیز آپ کے سامنے حاضر... اور نہ ہی میں نے کوئی واٹر پلانٹ لگایا ہوا ہے جو مجھ سے پانی مانگ رہی ہو... جاؤ... اپنی جگہ پر جاکر انتظار کرو... صاب آجائیں تب ہی ملاقات ہوگی۔'' اس نے تلخ لہجے میں اس لڑکی سے کہا اور منہ پھیر کر کھڑا ہوگیا۔ لڑکی مایوس ہوکر اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی... واپس اپنی جگہ پر جاکر کھڑی ہوگئی۔

آخر چار بج گئے... ''صاب'' قیلولہ کرنے کے بعد وردی پہن کر اپنے اٹرکنڈیشنڈ کمرے سے باہر آئے... خانساماں نے آگے بڑھ کر یخ بستہ جوس کا گلاس صاب کی خدمت میں پیش کیا۔

پکی تارکول کی سڑک پر قدموں کی آہٹیں گونجیں...



پرندے خاموش ہوگئے... پتوں کے بجنے کی آوازیں تھم گئیں اور ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ اس خاموشی میں صرف بھاری بوٹوں کی آوازیں گونجیں... صاب کے مین گیٹ کے نزدیک پہنچنے پر حوالداروں کے سیلوٹ کی کھٹاک کی آواز گونجی اور گیٹ کھل گیا... وہ رکے بغیر اندر داخل ہوئے... عورت بے چین ہوکر آگے بڑھی... لیکن گیٹ فوراً ہی بند کر دیا گیا۔ وہ اپنی جگہ ٹھٹک کر تھم گئی۔

سپرنٹنڈنٹ صاحب نے سینئر جیلر کو آفس میں طلب کیا جس نے بہت ادب و احترام کے ساتھ عرض کیا۔

''سر! جیل مینوئل کے مطابق... پھانسی کا قیدی عام وزیٹرز روم میں نہیں... بلکہ سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں ہی ملاقات کرسکتا ہے اور اس ملاقات کی تفصیلی رپورٹ بھی تیار کرنا ضروری ہے کہ وہ کیا بات کرتا ہے اور کس کس کے لیے کیا کیا پیغامات بھجواتا ہے۔''

قیدی نمبر 762 کمرے میں داخل ہوا۔ بیوی کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک خوشی لہرائی۔ بیوی کے پیاس سے خشک ہوجانے والے ہونٹ ایک لمحے کو مسکراہٹ کے انداز میں کھنچے اور سکڑ گئے کیونکہ اس کی نظر شوہر کے پیروں پر پڑ گئی... ڈنڈا بیڑی کے زنگ آلود کھردرے حلقوں نے قیدی کے پیروں میں زخم ڈال دیے تھے اور ابھی جو وہ پھانسی گھاٹ سے چل کر اس کمرے تک آیا تو ان زخموں سے خون رسنے لگا تھا۔

''جابر صاحب! کیا ان کو بیٹھنے کے لیے کرسی مل سکتی ہے؟'' اس نے مڑ کر جیل سپرنٹنڈنٹ سے پوچھا تو نہ تو اس کی آواز میں کوئی تھرتھراہٹ تھی نہ ہی چہرے پر کوئی خوف... نہ ہی اس نے ان کے رعب و دبدبے سے متاثر ہوکر 'سر' یا 'صاب' کہہ کر مخاطب کیا بلکہ ان کا نام لیا تھا۔

جیل کے انسان، پرندے، کتے بلیاں... یہاں تک کہ بے جان چیزیں تک ان کی دہشت سے کانپتے تھے لیکن یہ عجیب لوگ ہیں... نہ تو وہ قیدی ان سے ڈرتا ہے... اور نہ ہی اس عورت پر ان کی دہشت کا کوئی اثر نظر آتا ہے... ان کا غصہ برحق تھا... چہرے کے عضلات تن گئے اور پیشانی پر رگ ابھر کر پھڑکنے لگی۔

''یہ جیل ہے... کوئی ہوٹل نہیں جہاں انہیں کرسی پیش کی جائے۔'' وہ پھولتے پچکتے نتھنوں کے ساتھ غرائے تو قیدی کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ لہرائی۔

''تو بھی کیسی باتیں کرتی ہے... جانور سے انسانیت کی توقع کررہی ہے۔'' قیدی کے منہ سے نکلنے والے الفاظ ناقابلِ برداشت تھے۔ انہوں نے بھنّا کر ٹیبل کی دراز کھولی اور کھٹ سے اپنا رول باہر نکالا... قیدی کو سبق سکھانے کا مصمم ارادہ کر کے اٹھ ہی رہے تھے کہ قیدی کی آواز دوبارہ کانوں سے ٹکرائی۔

''میرے لیے رحم کی درخواست کرنے آئی ہو نا؟''

''کبھی نہیں... تمہارے ساتھ میری جان بھی چلی جائے... تب بھی نہیں... ان فرعونوں کے سامنے زندگی کے لیے گڑگڑانا... لعنت ہے لعنت۔'' اس کی بیوی عزم و ہمت سے بولی۔

جابر خان جیل سپرنٹنڈنٹ کے کانوں میں یہ الفاظ کیا پڑے... ان کے وجود میں زلزلہ بپا ہوگیا... انہیں یاد آگیا... برسوں پہلے انہوں نے کسی اور کی زبان سے بھی یہی الفاظ سنے تھے... بالکل یہی... ترتیب شاید تھوڑی بہت اِدھر اُدھر ہو... لیکن الفاظ اور مفہوم یہی تھا... ان کا حلق خشک ہونے لگا اور چہرے پر پسینے کی بوندیں ابھر آئیں۔ دل اندر ہی اندر کہیں ڈوبنے لگا۔ انہوں نے کرسی کا سہارا لے کر کھڑا ہونے کی کوشش کی اور بہ مشکل کامیاب ہوئے۔ آگے بڑھے تو انہیں چکر سا آگیا۔ قیدی کی بیوی نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

''جابر صاحب! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

ذہن میں ہوئی سائیں سائیں اور اپنے منتشر حواسوں کے ساتھ وہ بہ مشکل آگے بڑھے اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ مین گیٹ کے حوالدار نے انہیں دیکھ کر گیٹ کھول دیا۔ وہ اس کے نزدیک سے گزرتے ہوئے بولے۔

''ان کی ملاقات چلنے دو۔'' پھر اسے حیرت زدہ چھوڑ کر اپنے بنگلے کی طرف چل دیے۔ آج پکی سڑک پر ان کے مضبوط قدم لڑکھڑا رہے تھے' اس لیے کھٹ کھٹ کی کوئی آواز نہیں تھی۔ درختوں میں ہوا یونہی گاتی رہی۔ پتے بجتے رہے اور پرندے بھی چہچہاتے رہے۔ وہ ایسے ہی لڑکھڑاتے... ڈگمگاتے قدموں سے اپنے کمرے میں جاکر بستر پر گر گئے۔

آج سے بائیس تیئس سال پہلے کا وہ لمحہ یادوں کے دریچے کھول کر ان کے ذہن میں داخل ہوا۔

چودھری کے مسٹنڈے ان کی نرم و نازک ثریا کو زبردستی کھینچتے ہوئے لے جارہے تھے... بوسکی کے شلوار قمیص پر گرم شال کاندھے پر ڈالے چودھری سامنے کھڑا اپنی پھڑکتی ہوئی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے اپنے آدمیوں کو ہدایات دے رہا تھا۔

''اوئے! چھوڑنا نہیں... سیدھا حویلی لے کر چلو...

اس کو تو میں اپنے ہاتھ سے گولی ماروں گا... میری بہن ہو کر میرے کمین سے شادی کرنے کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتی... لے چلو اسے..." وہ دہاڑا۔

"نہیں... نہیں چوہدری صاحب! اس کی جان بخش دو... آپ کو رب دا واسطہ۔" یہ کہہ کر وہ دوڑا اور چوہدری کے قدموں میں گر کر رو رو کر فریاد کرنے لگا۔ چوہدری نے اسے ایک ٹھوکر رسید کی تو وہ زمین پر لوٹیں لگانے لگا... ایسے میں ہی ثریا اپنے آپ کو چھڑا کر اس کے پاس آئی اور تلملا کر ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔

"ان ظالموں کے آگے ناک رگڑ رہے ہو؟ میری زندگی کے لیے ان کے سامنے گڑگڑا رہے ہو؟ نہیں... میری جان جاتی ہے تو جانے دو... پر ان کے سامنے میری زندگی کی بھیک مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں... مرد بنو مرد..."

وہ بُت بنا کھڑا خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ چوہدری کے آدمی اس کی ثریا کو گاڑی میں ڈال کر لے گئے۔ پھر چوہدری کی سیاہ شیشوں والی بڑی گاڑی بھی دھول اڑاتی کچے راستوں پر دوڑتی چلی گئی۔ نہ جانے کب تک ایسے ہی خالی الذہنی کے عالم میں کھڑا وہ اڑتی ہوئی دھول کو دیکھتا رہا۔

پھر اسے سائیکل کی گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ اپنی ننھی منی دو ماہ کی بچی کے رونے کی آواز سنائی دی... کوئی اس کا کاندھا ہلاتے ہوئے اسے نام لے کر پکار رہا تھا... اس نے مڑ کر دیکھا تو اس کا دوست نذیر اس کی روتی ہوئی بچی کو تھامے... پریشانی کے عالم میں اس سے پوچھ رہا تھا۔

"جابر! کیا ہوا ہے؟ تو یہاں کھڑا ہے... بچی زمین پر پڑی رو رہی ہے... بھابی کہاں ہے؟ جابر... جابر... کچھ بول تو سہی... جابر!" وہ پریشان ہو رہا تھا اپنے دوست کی حالت دیکھ کر... پر اس کے تو حواس ہی گم تھے... وہ جوں توں کر کے اسے اپنے گھر لے کر آیا۔

نذیر قریب کے مرکز صحت میں ڈاکٹر کے مددگار کے طور پر کام کرتا تھا جبکہ جابر نے محکمۂ پولیس میں اپنی خدمات دی ہوئی تھیں اور چوہدری کے توسط سے اپنے ہی تھانے کے گاؤں میں اس کی پوسٹنگ ہو گئی تھی۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا پھر چوہدری کی اکلوتی بہن جس کی شادی ایک بڑے زمیندار گھرانے میں ہوئی تھی، گھریلو اختلافات کے باعث مشکلوں کا شکار ہو گئی۔ اس میں زیادہ قصور اس کے بھائی کا تھا جس نے بہن کی شادی کرتے وقت ملکوں کو یہ زبان دی تھی کہ وہ بہن کے حصے کی زمینیں جلد اس کے نام کروا کے... کاغذات اس کے حوالے کر دے گا۔

ثریا کی شادی ہو گئی۔ شروع کے چند مہینے تو اس کے شوہر اور سسرال والوں نے انتظار کیا کہ چوہدری وعدے کے مطابق زمینیں ان کے حوالے کر دے گا پھر ان کی زبانیں کھلنے لگیں پھر ان میں تلخی اترنے لگی... پہلی بیٹی کی پیدائش کے بعد ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا... اور چوہدری نے .... یہ کہہ کر انکار کر دیا۔

"بہن کی شادی پر لاکھوں کا جہیز دیا اور لاکھوں لگا کر شادی کی تو اس کا حصہ تو ادا ہو گیا نا جی... اب کون سا حصہ مانگ رہے ہو زمینوں میں سے...؟"

دو چار دن کے اندر اندر ہی چوہدری کی حویلی پر تانگا آ گرکا اور ثریا روتی دھوتی واپس حویلی آ گئی۔ اس کے سسرال والوں نے بچی کو چھین کر اسے واپس بھیج دیا تھا کہ اگر بھائی زمینوں کا حصہ دے دے تو کاغذات لے کر آ جانا اور اگر اس کی نیت کا فتور برقرار رہے تو اگلے ہفتے تک طلاق نامہ گھر پہنچ جائے گا... آنے کی ضرورت نہیں ہے اور ثریا کی لاکھ منت سماجت کے باوجود چوہدری نے بہن کے حصے کی زمین اسے نہیں دی اور ایک ہفتے بعد ہی ملکوں کا کارندہ طلاق کے کاغذات اور مہر کے بتیس روپے حویلی پہنچا گیا۔ ثریا کے ہونٹوں پر قفل لگ گیا... آنکھوں میں آنسو تھم گئے... دل کے اندر صحرا پھیل گیا۔

پھر حویلی میں ایک واردات ہوئی... کوئی چور ثریا کی الماری سے اس کا زیور چرا کر لے گیا... کافی سارا زیور تھا... موٹے موٹے کنگن اور چوڑیاں، گلے کا ہار... کانٹے... اور نہ جانے کیا کیا... تھانے میں اطلاع کروائی گئی تو انسپکٹر کے ساتھ جابر بھی آیا تفتیش کرنے۔ چوہدری کی موجودگی میں ثریا سے پوچھ تاچھ انسپکٹر کر رہا تھا اور جابر اس کے جوابات نوٹ کرتا جا رہا تھا۔ لکھتے لکھتے وہ ثریا کو بھی دیکھ رہا تھا۔ اس کا خوب صورت چہرہ مرجھایا ہوا تھا آنکھوں میں دکھ اور اداسی کی پرچھائیاں... ایسا لگتا تھا کہ وہ زندگی کی جنگ ہار کر تقدیر کی مرضی پر راضی برضا ہو کر رہ گئی تھی... اس کی اداس آنکھیں پتا نہیں کیسے جابر کے دل میں اتر گئیں۔ بعد میں اس نے بڑی توبہ بھی کی۔

"یا اللہ! مجھے میری سوچ پر اختیار دے... میں چاند چھونے کا سوچ رہا ہوں... اگر کسی کو بھنک بھی پڑ گئی تو چوہدری کے کتے مجھے نوچ کر کھا جائیں گے۔" لیکن اس کی دعاؤں کو شرف قبولیت نہ مل سکا... پھر نہ جانے کیسے دل کا دل سے رابطہ ہو گیا... ثریا نے وقت گزارنے کے لیے گاؤں کے



اسکول میں پڑھانا شروع کر دیا... روزانہ وہ تانگے میں تھانے کے سامنے سے گزرتی ہوئی اسکول جاتی تھی اور جیسے ہی اس کا تانگا تھانے کے سامنے سے گزرتا جابر کو تھانے سے باہر کوئی کام پڑ جاتا... وہ برآمدے سے نیچے اتر کر باہر آتا کبھی یونہی بندوق کی صفائی شروع کر دیتا... کبھی باہر رکھی گھڑونچی سے پانی پینے لگتا... کبھی اور کچھ ایسا ہی کام...

روزانہ ایسا ہی ہونے لگا تو ثریا بھی سمجھ گئی... ایک دن ایسے ہی وہ اسے دیکھ کر درخت پر کسی چیز کا نشانہ لینے گا تو بھاری بندوق ہاتھ سے پھسلی اور اسے سنبھالنے کے چکر میں وہ خود سنبھلتے سنبھلتے بھی بُری طرح رپٹ کر گرا... اگرچہ اپنی خودی کو بلند کرتے ہوئے وہ فوراً ہی اٹھ کر کھڑا بھی ہو گیا لیکن پورا منہ، بال اور ہاتھ مٹی میں اٹ گئے... ثریا نے تانگے سے اسے اس ہیئت کذائی میں دیکھا تو ہنسی روکنے میں کامیاب نہ ہو سکی اور گزرتے تانگے کے بجتے سازوں میں اس کی مدھر ہنسی نغمہ بن کر جابر کے دل میں اترتی چلی گئی۔ لاکھ رکاوٹوں کے باوجود دونوں کے درمیان فاصلے کم ہوتے رہے اور آخر کار ایسا وقت آ گیا کہ ان دونوں نے شادی کا فیصلہ بھی کر لیا... یہ بہت مشکل مرحلہ تھا... جابر نے اپنے دوست نذیر کو اس راز میں شریک کیا۔

"ارے پاگل ہو گیا ہے کیا؟ چوہدری کو جانتا نہیں تُو... بھنک بھی ملی اسے تو تجھے مار کر لاش ایسے غائب کرے گا کہ پتا بھی نہیں چلے گا... کیوں اپنا دشمن آپ ہوا ہے تُو...؟" نذیر علی نے اسے باز رکھنے کی اپنی سی کوشش کی۔

"دیکھو نذیرے! اب یہ سب باتیں بہت پیچھے رہ گئی ہیں... ہم دونوں ان سے بہت آگے نکل آئے ہیں... اب ہمیں ہر صورت شادی کرنی ہے... تجھے دوست سمجھ کر تجھ سے مدد مانگنے آیا تھا... اگر کر سکتا ہے تو ٹھیک ہے... نہیں تو میں کوئی اور راستہ دیکھوں گا۔" جابر نے قطعی لہجے میں کہا تو نذیر علی چپ ہو کر اسے گھورتا رہا... پھر ٹھنڈی سانس بھر کر مخاطب ہوا۔

"ٹھیک ہے یار! اب جو بھی ہو... دیکھتے ہیں... کچھ کرتے ہیں..." وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔

"یہاں سے کچھ دور میری پھوپی کا گھر ہے... اگر وہ مان جاتے ہیں تو تم دونوں ادھر چلے جانا... شادی بھی وہیں ہو جائے گی۔" نذیر علی نے امید کی کرن دکھائی تو جابر خوشی میں اس سے لپٹ گیا۔

"نہ... نہ... ابھی اتنا خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے... ہو سکتا ہے پھوپا جی انکار کر دیں۔" نذیر علی نے اسے ڈرایا۔

"مجھے پتا ہے وہ مجھے انکار نہیں کریں گے۔" جابر نے خوشی سے بھرّائے ہوئے لہجے میں کہا۔

پھر ایسا ہی ہوا۔ ایک تاریک رات کو ثریا نے حویلی چھوڑی اور جابر نے تھانہ... اور وہ دونوں نذیر علی کی پھوپی اور پھوپا جی کی حویلی میں پہنچ گئے... صبح نذیر علی بھی پہنچ گیا... کچھ ہی دیر بعد دونوں کا نکاح ہو گیا... جابر کو آج بھی یاد تھا اُن دونوں زندگی کتنی خوب صورت ہو گئی تھی۔ ثریا جتنی خوب صورت تھی اتنی ہی خوب سیرت اور محبت کرنے والی بھی۔

نذیر علی کے پھوپا نے جابر کو حویلی کی حفاظت کرنے کی ذمے داری دے دی۔ دس بارہ گارڈ اور چوکیدار اس کی ماتحتی میں تھے... حویلی کے علاوہ کھیت کھلیان کی حفاظت بھی اسی کی ذمے داری تھی۔ اس کی اسے باقاعدہ تنخواہ ملتی۔ حویلی کے ہی بیرونی حصے میں انہیں رہائش بھی مل گئی... کوئی پریشانی... کوئی ڈر خوف نہیں تھا ان دنوں، جابر اور ثریا کے لیے ہر دن عید اور ہر شب شبِ برات تھی۔

پھر ان کی خوشیوں میں ایک اور اضافہ ہوا... ثریا ماں بننے والی تھی... جابر بے چینی سے وہ دن کاٹنے لگا جب ان کی محبتوں کا ثمر ان کی گود میں ہمکنے والا تھا۔

نذیر علی گاہے بگاہے اپنے دوست کی خیر گیری کے لیے جاتا رہتا تھا۔ ایک دفعہ گیا تو جابر نے بتایا کہ آخری آخری دن چل رہے ہیں... لیکن ثریا بہت تکلیف میں ہے... نذیر علی دوسرے دن اپنے مرکز صحت میں کام کرنے والی دائی خالہ فضلاں کو لے کر پہنچ گیا اور اس نے ثریا کا معائنہ کیا۔

"پتر! کڑی دا کیس ذرا مشکل ہے... اس کو شہر کے بڑے اسپتال لے جاؤ... ویسے بھی دن قریب ہیں اس کے۔" اس نے اپنی ماہرانہ رائے دی۔

اگلے ہی دن جابر ثریا کو لے کر شہر چلا گیا اور اسے ایک اچھے اسپتال میں داخل کر دیا۔ دوسرے دن ہی آپریشن کے ذریعے بچی کی پیدائش ہوئی۔ اچھی خاصی پیچیدگیوں کے سبب ثریا کو وہاں بہت عرصہ اسپتال میں رکنا پڑا... اسے مکمل طور پر صحت یاب ہونے میں تقریباً دو ماہ لگ گئے اور دو ماہ کی بچی کو لے کر وہ دونوں جب واپس جا رہے تھے تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ چوہدری اور اس کے آدمی انہیں اس طرح گھیر لیں گے... اس کی ثریا کو اس سے چھین کر لے جائیں گے اور وہ کچھ بھی نہیں کر پائے گا۔

انہوں نے بے خیالی میں اپنے گال پر ہاتھ پھیرا...

انہیں لگا کہ ثریا کے مارے ہوئے تھپڑ کی گرمی اب بھی ان کے گال پر موجود ہے۔

فون کی گھنٹی بجنے لگی... جیل سے فون تھا۔

''سر! ان کی ملاقات کو ایک گھنٹا ہو گیا۔'' جیلر نے یاد دہانی کروائی۔

''کوئی بات نہیں... جب تک وہ چاہیں... انہیں جی بھر کر باتیں کرنے دو۔'' ان کی بات سن کر جیلر کو شاید اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

''جی سر؟'' اس نے حیران ہو کر پوچھا لیکن صاحب فون رکھ چکے تھے۔

''او حوالدار! دیکھو تو... آج سورج مغرب سے تو نہیں نکلا تھا کہیں۔'' حوالدار نے بھی جیلر کی بات کا مزہ لیا اور سر ہلا کر ہنسنے لگا۔

☆☆☆

دوپہر گزر گئی۔ سورج ڈھلنے لگا اور درختوں کے سائے لمبے ہونے لگے۔ وہ راکنگ چیئر پر جھولتے جھولتے شاید تھک گئے تھے اور کمرے میں گھٹن کا احساس ہوا تو اٹھ کر ٹیرس پر آ گئے۔

دور جیل کا گیٹ نظر آ رہا تھا۔ تارکول کی پکی سڑک درختوں کی گھنی چھاؤں میں... ان کے قدموں کی آہٹ کی منتظر خاموش تھی۔ بائیں جانب دور تک پھیلی سبزی کی باڑیاں نظر آ رہی تھیں جن میں کچھ قیدی کام کر رہے تھے۔

ایسے میں انہوں نے دیکھا کہ جیل کا مین گیٹ کھلا اور وہ لڑکی باہر نکلی۔ بھاری بھاری قدم رکھتی ہوئی وہ پکی سڑک پر آئی تو اچانک ہی انہیں شناسائی کا موہوم سا احساس ہوا۔ اس کی چال اور اس کے انداز کچھ عجیب سے انداز کی شناسائی کا احساس اجاگر کر رہے تھے۔ پھر ان کی نظروں میں اس کا دھوپ سے سنولایا، پژمردہ سا چہرہ ذہن میں آیا... تو یہ احساس کچھ اور اجاگر ہو گیا پھر انہیں اس کے کہے ہوئے الفاظ یاد آئے۔

''رحم کی درخواست... کبھی نہیں... جان چلی جائے لیکن ان فرعونوں کے سامنے زندگی کی بھیک مانگنے کے لیے گڑگڑانا... لعنت ہے لعنت۔''

''وہی... بالکل وہی...'' وہ بڑبڑائے... تیزی سے اندر گئے اور فون پر مین گیٹ کے گارڈ سے رابطہ کیا۔

''حوالدار! اس لڑکی کو روکو... اور اسے میری طرف بھیجو۔'' انہوں نے فون رکھا اور کھٹ کھٹ سیڑھیاں اتر کر نیچے برآمدے میں آ گئے... وہ سڑک پر نظر آئی... انہی کی طرف آ رہی تھی... انہوں نے غور سے اسے دیکھا تو یہ اندازہ لگایا کہ اگر اس کا مرجھایا ہوا... سنولایا ہوا رنگ روپ... تر و تازہ ہو جائے... نکھر کر شاداب ہو جائے... تو یہ سو فیصد ان کی ثریا بن جائے... وہ ثریا جو اپنے سگے بھائی کے ہاتھوں قتل ہو گئی اور کسی ایسی گمنام جگہ دفن ہو گئی جو اس کی دسترس میں بھی نہیں تھی کہ وہ چند پھول اس کی قبر پر رکھ کر آنسوؤں کا نذرانہ چڑھا سکے۔

وہ سوچتے رہے... وہ لڑکی برآمدے کی سیڑھیوں کے سامنے رک گئی... وہ ان کے سامنے کھڑی انہیں استفہامیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''تمہارے اور تمہارے خاندان کے بارے میں کچھ معلومات درکار تھیں... اس لیے تمہیں بلوایا ہے... تمہارے ماں باپ کے نام کیا ہیں؟ قیدی کے ماں باپ کے نام... اور تمہارے خاندان میں کون ایسا ہے جو تمہارے شوہر کی موت کے بعد تمہاری سرپرستی کرے گا۔'' انہوں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے مناسب لب و لہجے میں سوالات پوچھے۔ حالانکہ ان کے اندر ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔

''کیوں؟ یہ سب پوچھنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟ قیدی کے ماں باپ کا نام تو اس کے ساتھ آنے والی فائل میں موجود ہوگا... بلکہ اس کے اگلے پچھلے سارے رشتے داروں، ملنے والوں اور دوستوں کا تفصیلی ذکر ہوگا اور میرے بارے میں تو خاصی تفصیل ہوگی... آخر ایک دہشت گرد کی بیوی ہوں... لیکن ہو سکتا ہے تمہیں اس فائل کے پڑھنے کا وقت ہی نہ ملا ہو... پڑھ لینا وقت نکال کر...'' یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے مڑ گئی... اور اسی وقت اس کی بوسیدہ چپل کہیں سے ٹوٹ گئی۔ وہ ایک لمحے کو لڑکھڑائی اور سنبھل گئی۔

''ٹھہرو! مجھے تمہارے ماں باپ کا نام معلوم کرنا ہے۔'' وہ ہاتھ اٹھا کر کچھ بے تابی سے بولے تو لڑکی نے پلٹ کر حیرانی سے انہیں دیکھا۔

''باپ کا نام شفیق حسین اور ماں کا نام ثریا۔'' لڑکی کے جواب نے انہیں حواس باختہ کر دیا۔ وہ اپنے اندر اٹھنے والے طوفان پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگے... لڑکی ٹوٹی ہوئی چپل کے سبب لڑکھڑاتی ہوئی پکی سڑک پر مین گیٹ کی مخالف سمت مڑ گئی۔

''حوالدار! یہ پیسے لو... اور اس لڑکی کو دے کر آؤ... میرا نام نہ لینا... یہ کہنا کہ یہ قیدی کی مشقت کے پیسے... اس کی اجرت ہے۔'' انہوں نے جیب سے کچھ بڑے نوٹ نکال کر سپاہی کو دے کر دوڑایا اور اپنے اتھل پتھل جذبات پر قابو

پانے کی کوشش کرنے لگے۔

باپ کا نام شفیق حسین اور ماں ثریا... یہ یقیناً کرن ہے... وہی دو ماہ کی بچی... جس کے لیے اکثر ثریا تڑپتی رہتی تھی۔ وہ اپنا درد اکثر آنسوؤں کے ساتھ اس کے سامنے ہی رویا کرتی تھی... ''نہ جانے میری کرن کس حال میں ہوگی... شفیق حسین نے میرا کلیجا نوچ کر اپنے پاس رکھ لیا ہے... جابر! تم مجھے اپنی کرن سے ملوادو گے نا؟''

''ہاں! تھوڑا صبر سے وقت کا انتظار کرو... تمہاری کرن تمہیں ضرور ملے گی... میں پوری کوشش کروں گا۔'' وہ اسے تسلی دیتا۔ پر ثریا نے وقت کا انتظار کہاں کیا... خود ہی چلی گئی۔ ایسے سفر پر جہاں سے واپسی کہاں ہوتی ہے... دکھ سے ان کی آنکھوں میں دھند چھانے لگی اور انہیں لگا جیسے وہ ثریا کی بیٹی نہیں... خود ثریا ہو... جو اس سے آخری ملاقات کر کے جارہی ہو... ٹوٹے ہوئے دل... اور ٹوٹی ہوئی چپل کے ساتھ... ان کے دل سے دھواں سا اٹھنے لگا۔

☆☆☆

آج صبح صبح بھٹی خانے کے جمعدار کو اپنی کوٹھری میں دیکھ کر اسے حیرت سی ہوئی۔ اس نے جلدی جلدی اس کی گندی بدبودار چادر اور بوسیدہ کمبل اٹھا کر نئی دھلی ہوئی چادر بچھائی اور ایک صاف ستھرا کمبل سلیقے سے چارپائی کی پائنتی پر رکھ دیا... اس کے گندے اور بے حد میلے کپڑے اتروا کر صاف ستھرا دھلا ہوا جوڑا اسے پہنایا اور سب میلے کپڑے سمیٹ کر چلتا بنا۔

ابھی وہ حیرت میں ہی تھا کہ جیل کا ڈاکٹر آن پہنچا... اچھی طرح اس کا چیک اپ کیا... پاؤں میں زنگ آلود بیڑیوں کی وجہ سے آجانے والے زخموں پر دوا لگائی... وٹامنز کی گولیاں کھلائیں اور ایک مسکراہٹ اس کی جانب اچھالتا ہوا واپس چلا گیا۔

چائے کا پہلا گھونٹ لیتے ہی اسے گھر کی بنی چائے کی خوشبو اور ذائقہ محسوس ہوا تو وہ ٹھٹک سا گیا۔

''یا حیرت! یہ اک دن میں کیا ماجرا ہو گیا؟'' وہ حیرت سے بڑبڑایا۔

تھوڑی دیر بعد لوہار خانے کا وارڈر ایک لوہار کے ساتھ آیا اور اس کی زنگ آلود بھاری بھرکم ڈنڈا بیڑی کٹوا کر... اس کی جگہ ہلکی پھلکی سبک سی ڈنڈا بیڑی ڈلوا دی۔

پھانسی گھاٹ کا جمعدار حیران ہو کر یہ سب دیکھ رہا تھا... ابھی وہ قیدی سے کچھ پوچھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ بھنگی کو جھاڑو بغل میں دبائے... بالٹی پونچا لیے آتا دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرانی سے ماتھے پر چڑھ آئیں۔

بھنگی نے کوٹھری کی اچھی طرح صفائی کی... فینائل ڈال کر پونچا لگایا اور سلام کرتا ہوا واپس چلا گیا پھانسی گھاٹ کا جمعدار... یہ سب دیکھ کر بے حد حیران... بلکہ اچھا خاصا پریشان تھا کہ یہ سب ہو کیا رہا ہے۔

''آج صبح سے وہ سب ہو رہا ہے... جو جابر صاب کی جیل میں آج تک نہیں ہوا تھا... یہ معاملہ کیا ہے؟'' وہ بڑبڑاتے ہوئے اپنے آپ سے سوال کر رہا تھا... کچھ دیر وہ سوچتا رہا... پھر اس طرح سر ہلایا جیسے سب کچھ سمجھ میں آگیا ہو۔

''کیوں بے! تیری بیوی جابر صاب کو کتنی رشوت دے کر گئی ہے... جو آج یہ کایا کلپ ہو رہی ہے؟'' اس نے قیدی سے پوچھا۔

''میری بیوی... اور رشوت؟'' قیدی ہنسا اور اٹھ کر صاف ستھرے بستر پر لیٹ گیا۔ جمعدار کچھ دیر اسے گھورتا رہا... اور کچھ کہنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ 'صاب' کے قدموں کی مخصوص کھٹ کھٹ کی گونج سنائی دی... ساتھ چند اور قدموں کی آہٹیں بھی تھیں۔

وہ لپک کر پھانسی گھاٹ کے دروازے کی طرف بڑھا اور گیٹ کھول دیا۔

صاحب کلف دار یونیفارم کے ساتھ ساتھ خود بھی اسی طرح گردن اکڑائے... ایک ہاتھ میں رول اور دوسرے ہاتھ میں چند کاغذات تھامے تیزی سے آگے بڑھتے آرہے تھے... ان کے پیچھے چار پانچ سپاہی اور بھی چلے آرہے تھے۔

آج صبح آفس میں قدم رکھتے ہی انہوں نے سینئر جیلر کو طلب کیا تھا۔

''اس پھانسی کے قیدی کی رحم کی درخواست کا کیا ہوا؟'' انہوں نے ٹیبل کی دراز سے رول نکالتے ہوئے پوچھا۔

''سر! وہ پتا نہیں کس قسم کا پاگل ہے... کہتا ہے جس حکومت کے خلاف لڑ رہا ہوں... اسی کے صدر سے زندگی کی بھیک مانگوں؟ لعنت ہے۔ اس نے دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے سر۔'' سینئر جیلر نے وضاحت سے بتایا تو 'صاب' غصے سے بھنا گیا۔

''تمہاری سروس کتنی ہے؟'' انہوں نے تپتے ہوئے لہجے میں جیلر سے پوچھا۔

''سر! پچیس سال۔'' جیلر نے ہکلا کر جواب دیا۔

''اور ان پچیس سالوں میں بھی تمہیں قیدیوں کو ہینڈل



کرنے کا طریقہ نہیں آیا... ان کاغذات پر دستخط نہیں کروا سکے تم... ایسا کرو... آلو چھولے کا ٹھیلا لگا لو... کاغذات مجھے دو... میں خود سائن کروالوں گا۔'' انہوں نے کاغذات جیلر کے ہاتھ سے چھینے اور خود ان پر دستخط کروانے کے لیے پھانسی گھاٹ کی طرف چل دیے۔ سینئر جیلر اور چند دوسرے وارڈر اور سپاہی بھی یہ دیکھنے ان کے پیچھے چل پڑے کہ دیکھیں وہ کون سا گر ہے جسے استعمال کر کے قیدیوں سے اپنی مرضی منوائی جاسکتی ہے... بقول 'صاب' کے۔

''قیدیوں سے میٹھی بات میٹھے لہجے میں کر کے پہلے ان کا اعتماد حاصل کرو... پھر ان سے اپنی مرضی کا کام کروالو۔''

حالانکہ جہاں تک ان سب کو یاد تھا آج تک صاب نے جو تم پیزار کر کے... موٹی موٹی خود تخلیق کردہ گالیاں دے کر اور جانوروں کی طرح پیٹ پیٹ کر قیدیوں کو بُری طرح دہشت زدہ کر کے اپنی مرضی پر چلایا تھا... آج وہ پتا نہیں کس طرح... کسی نئے طریقہ کار کی بات کر رہے تھے... سو اسی تجسس میں وہ پیچھے پیچھے آگئے۔

کھٹ کھٹ کرتے وہ اس قیدی کی کوٹھری کے سامنے آکر رک گئے۔ وہ خاموشی سے کھڑے قیدی کو گھور رہے تھے اور وہ سنجیدگی سے انہیں گھور رہا تھا... ماحول پر سناٹا طاری تھا۔ پھانسی گھاٹ کا جمعدار، سینئر جیلر، وارڈر اور سپاہی... سب سانس روکے خاموش کھڑے تھے کہ دیکھیں اب کیا ہنگامہ ہوتا ہے... 'صاب' نے مڑ کر ایک نظر سینئر جیلر کی طرف دیکھا... بھینچے ہوئے ہونٹوں اور سکڑی ہوئی موٹی موٹی بھوؤں کو کچھ پھیلایا... بناوٹی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر... وہ اپنی طرف سے بڑا میٹھا لہجہ بنا کر قیدی سے مخاطب ہوئے۔

''ہیلو ینگ مین! کیسے ہو تم؟ کیا حال چال ہیں؟''

''ینگ مین!'' قیدی نے بھویں سکیڑ کر استفہامیہ لہجے میں کہا۔

''میں قیدی نمبر 762، سور کا بچہ اور دہشت گرد ہوں... بقول آپ کے مار مار کر کھال اتار کر پھانسی پر لٹکایا جانے والا... اور آپ مجھے ینگ مین کہہ کر مخاطب کر رہے ہیں... کچھ غلطی تو نہیں کر رہے ہیں جابر صاحب! سوچ لیجیے۔''

قیدی کے ترش اور طنزیہ جواب کے بعد جیلر اور جمعدار سہم گئے۔

'بس اب آگئی اس کی شامت... مت ماری گئی ہے... چند دن میں ویسے ہی مرنے والا ہے لیکن اپنی ان حرکتوں سے مرنے سے پہلے جوتے بھی بلاوجہ کھائے گا۔' وہ ڈر کر سوچتے رہے۔

لیکن جیسا وہ سوچ رہے تھے ایسا کچھ نہیں ہوا... سپرنٹنڈنٹ صاحب نے اس کی بات سن کر ترحم آمیز انداز میں اسے دیکھا اور دوبارہ مخاطب کیا۔

''تمہارا کیا خیال ہے... تمہارے پھانسی چڑھ جانے کے بعد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا؟ ظلم، ناانصافی اور بھوک مٹ جائے گی؟ لوگ پیٹ بھر کر کھائیں گے اور چین کی بانسری بجتی رہے گی۔''

''میں نے ایسا دعویٰ کب کیا ہے؟ میرے پھانسی پر چڑھ جانے سے یہاں کچھ بھی نہیں بدلے گا... لیکن آپ یقین کیجیے... میں بارش کا پہلا قطرہ ضرور بن جاؤں گا... میرے بعد... میرے پیچھے بہت سے آئیں گے... جابر صاحب! آپ کس کس کو پھانسی چڑھائیں گے؟ بھوک کا... ظلم کا... ناانصافی کا ستایا ہوا... ہر بندہ گھر سے نکلے گا... تم کتنے بندے مارو گے۔'' اس کے لہجے کا ٹھہراؤ اور مضبوط اعتماد ان سب کو کچھ اس طرح شرمندہ کر رہا تھا جیسے لوگوں کی بھوک، ظلم اور ناانصافی کے ذمے دار وہی سب ہوں۔

جابر نے سنبھالا لیا اور کھنکھار کر گلا صاف کرنے کے بعد انہوں نے اسے مخاطب کیا۔

''یہ سب جذباتی لوگوں کی... جذباتی باتیں ہیں... یہاں سب کچھ صدیوں سے اسی طرح چل رہا ہے... اور اسی طرح چلتا رہے گا... ایک دو لوگوں کے پھانسی چڑھ جانے سے کوئی انقلاب نہیں آجائے گا۔''

''یہ آپ کا خیال ہے جابر صاحب! میں ایسا خیال کرتا ہوں کہ چند لوگوں کی پھانسی... بے شمار لوگوں میں بیداری پیدا کرے گی اور وہ اپنے حقوق کے لیے میدان میں آئیں گے... جدوجہد کریں گے... اور ظالمانہ نظام کو ختم کر کے... ایک نئے معاشرے کی بنیاد رکھیں گے۔''

''نئے نظام... اور نئے معاشرے کی بنیاد رکھنے کے لیے... پھانسی چڑھنا کیا ضروری ہے؟ تم زندہ رہ کر بھی تو اس مقصد کے لیے کام کر سکتے ہو۔'' آج 'صاب' اس دیوانے کو قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''آپ کا خیال ہے... کہ میں اور میرے ساتھی... جس ظالمانہ نظام کے ذمے دار ظالموں کے خلاف تحریک چلا رہے ہیں، میں انہی ظالموں کے سامنے گڑگڑا کر اپنی زندگی کی بھیک مانگوں؟'' اس نے تڑختے ہوئے لہجے میں سوال کیا تو صاحب کچھ دیر خاموش رہے پھر کچھ سوچ کر اسے مخاطب کیا۔

''جب کوئی بہادر جرنیل جنگ کرتے ہوئے دشمنوں کے گھیرے میں آجاتا ہے... تو وہ اپنی اور سب کی جانیں

بچانے کے لیے پیچھے ہٹنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا... وقتی طور پر پسپائی اختیار کرنے میں کوئی شرم نہیں... کیونکہ یہ پسپائی آئندہ بھرپور تیاری کے ساتھ حملہ کرنے اور جنگ جیتنے کا موقع دیتی ہے... تم کیوں رحم کی درخواست کو اپنے لیے شرمندگی سمجھتے ہو... بے عزتی سمجھتے ہو؟''

''جب میں گھر سے نکلا تو عزت اور بے عزتی... شرم اور غیرت... گھر کی دہلیز پر چھوڑ کر نکلا تھا... میرے پیش نظر صرف میرا مقصد تھا... ہے اور رہے گا۔'' اس نے دھیمے لیکن پُرعزم لہجے میں اپنی بات کہی۔

''اچھا... تمہارا مقصد کیا ہے؟'' سپرنٹنڈنٹ نے پوچھا تو انہیں خود محسوس ہوا کہ وہ انتہائی بے وقوفانہ سوال کر بیٹھے ہیں' اتنی دیر سے وہ اسی مقصد کو بیان کرنے کے لیے لن ترانیاں کر رہا تھا۔

''ہمارا مقصد ملک سے جابرانہ، ظالمانہ نظام ختم کر کے ایک ایسا نظام لانا ہے جس میں عوام کو انسان سمجھا جائے... جانور یا کیڑے مکوڑے نہ سمجھا جائے... ملک میں رہنے والے ہر شخص کو اس کے سارے حقوق بغیر مانگے ملیں... کسی کا حق نہ مارا جائے... سمجھے آپ؟'' اس نے آخر میں انگلی اٹھا کر ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا تو اس کی اس ویڈیو ریکارڈنگ پر جیل جمعدار غصے میں ڈنڈا اٹھا کر اس کی طرف لپکا تو صاب نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔

''تمہیں ساری دنیا کی فکر ہے... تم سب کی تکلیف دور کرنے کے لیے اپنی جان دینے پر تلے ہوئے ہو... لیکن تمہیں اس کا کوئی خیال نہیں ہے جو تم سے سب سے زیادہ قریب ہے... تمہاری بیوی... جو پہلے ہی مجھے کچھ اچھے حالات میں نہیں لگی... تمہارے مرجانے کے بعد اور بھی بے سہارا ہو جائے گی... وہ سیکڑوں میل دور سے تم سے ملنے آئی... اور ان میں سے نہ جانے کتنے میل اس نے پیدل طے کیے۔''

''جانتا ہوں جابر صاحب! مجھ سے شادی کرنے کے بعد وہ انگاروں پر زندگی کا سفر کاٹ رہی ہے... یہ چند میل تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔'' اس نے لہجہ تبدیل کیے بغیر اسی انداز میں کہا تو نہ جانے کیسے جابر صاحب بھی جذباتی ہو گئے۔

''لفظوں کے کھیل سے زندگی حقیقتاً بدل نہیں جاتی... تم اپنے زورِ بیان کے لیے کتنے بھی خوب صورت الفاظ کی طاقت کا استعمال کرو... یہ صرف سننے سنانے کی حد تک اچھے لگتے ہیں... زندگی کی حقیقتیں ان لفظوں کی خوب صورتی کے برخلاف... انتہائی سنگین اور بہت بدصورت ہوتی ہیں... اور انہی میں سے ایک حقیقت یہ ہے کہ تمہارے مرنے کے بعد تمہاری بیوی بے سہارا، تنہا اور بے ٹھکانا ہو جائے گی... اکیلے پن اور تنہائی کا عذاب جھیلتے جھیلتے وہ ذہنی مریضہ بن جائے گی... دنیا کے اس جنگل میں انسان نما بھیڑیے جب اسے گھیر لیں گے... تو اس کا کیا حشر ہوگا... کبھی اس کے بارے میں بھی سوچ لو۔''

جابر نے اپنے خیال میں کافی جذباتی انداز میں اسے حقیقت کا آئینہ دکھایا تھا لیکن وہ جھلا گئے جب انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی باتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا... وہ ایسے ہی دونوں پیر پھیلائے... سینے پر ہاتھ باندھے اِدھر اُدھر بے مقصد دیکھتا رہا۔

وہ تلملا کر آگے بڑھے اور قیدی کے دونوں کندھے پکڑ کر اسے زور سے جھنجوڑا۔

''تم آدمی ہو یا جانور... یا پھر انتہا درجے کے خود پرست... تم اپنے آپ کو ہیرو بنانے کے چکر میں... دوسروں کی تکلیفوں اور ناانصافیوں کا جھنڈا اٹھائے موت کی طرف قدم بڑھا رہے ہو... سب کی بھوک اور مظلومیت نظر آتی ہے... مفلوک الحال لوگوں کو دیکھ کر... تمہارا دل تڑپتا ہے لیکن اپنی بیوی کے لیے تمہارے دل میں ذرا بھی درد... ذرا بھی احساس نہیں ہے... اپنی اکڑ... اپنی جھوٹی انا کی خاطر اس کی زندگی برباد کر رہے ہو...'' وہ غصے میں شاید چلائے تھے اسی لیے قیدی چڑ کر سا گیا۔

''میری بیوی کے لیے آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟'' اس نے شاید چڑ کر ہی پوچھا تھا۔

''بحیثیت انسان... انسانیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔''

''انسانیت؟ انسانیت کا آپ سے کیا واسطہ ہے جابر صاحب! آپ کے اندر کتنی انسانیت ہے' اس کے تماشے میں ان دو چار دنوں میں اچھی طرح دیکھ چکا ہوں... قیدیوں کو جب آپ جانوروں کی طرح پیٹ رہے ہوتے ہیں... تو آپ کے اور انسانیت کے درمیان بہت فاصلہ ہوتا ہے جابر صاحب!'' اس کی اس بدتمیزی پر جمعدار پھر ڈنڈا گھما کر آگے بڑھا لیکن 'صاب' نے پھر اسے روک دیا اور وہ حیرت زدہ ہو کر پھر پیچھے ہٹ گیا۔

''میں جانتا ہوں... آپ میرے رحم کی درخواست پر دستخط نہ کرنے کی وجہ سے پریشان ہیں... کیونکہ حکومت آپ کو پریشان کر رہی ہوگی... دباؤ ڈال رہی ہوگی کہ اس پاگل سے دستخط کرواؤ... زور زبردستی سے کچھ ہونے والا نہیں... یہ اندازہ آپ کو ہو گیا ہوگا اس لیے اب آپ نے طریقۂ کار



بدل دیا ہے... سب بڑی نرمی سے پیش آ رہے ہیں مجھ سے... صرف اس لیے... کہ میں رحم کی درخواست پر دستخط کر دوں... اور اس پر آپ نے مجھے جذباتی طور پر بلیک میل کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے کہ اگر روٹیوں میں نہیں کوئی کمی رہ جائے... تو وہ آپ کی باتوں سے پوری ہو جائے۔'' قیدی کے یہ الزام سن کر وہ حیرت زدہ رہ گئے... کچھ دیر خاموش کھڑے اسے گھورتے رہے... پھر واپسی کے لیے مڑے... چند قدم بڑھانے کے بعد رک گئے' اچانک پلٹے اور اس کی کوٹھری کے سامنے آ کر رک گئے۔

''تم شاید اپنے آپ کو بہت عقلمند سمجھتے ہو گے... لیکن میں نے محسوس کیا کہ تم انتہائی ناسمجھ اور زندگی کی حقیقتوں سے بہت دور ہو... تم بڑی بڑی تقریریں کر سکتے ہو... لیکن نہ انسانیت کو سمجھتے ہو... اور نہ سیاست کو... تم کبھی نہیں سمجھ پاؤ گے کہ میں تمہارے پاس کیوں آتا ہوں... اس لیے کہ تمہاری زندگی تنہائی کے کرب سے کبھی دوچار نہیں ہوئی... کسی اپنے کا زندگی سے نکل جانا... کیسا عذاب ہوتا ہے... یہ وہی جانتا ہے جس میں انسانیت ہوتی ہے... انسانی جذبات ہوتے ہیں اور سیاست تو تم بالکل بھی نہیں سمجھتے... اگر سمجھتے... تو یہ کبھی نہ کہتے کہ حکومت تمہاری رحم کی درخواست کی منتظر ہے اور مجھ پر دباؤ ڈلوا کر وہ تم سے یہ درخواست مانگ رہی ہے۔'' انہوں نے زور دے کر اپنا ناقابلِ تضحیر واضح کیا۔

''تو پھر کیوں آپ یہ کوشش کر رہے ہیں... کہ میں رحم کی بھیک مانگوں؟'' وہ چلایا۔

''میں نے کوشش تو کی تمہیں یہ بات سمجھانے کی لیکن شاید سمجھا نہیں پایا... خیر، میں پھر آؤں گا...''

''میں پھر بھی سائن نہیں کروں گا۔'' قیدی نے انہی کے انداز میں جواب دیا۔

''اگر رحم کی درخواست پر میں نے تجھ سے دستخط نہ کرائے... تو میں اپنے باپ صابر احمد کا بیٹا نہیں۔'' انہوں نے دانت پیستے ہوئے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

''اور اگر میں نے دستخط کر دیے تو میں اپنے باپ نذیر علی ہاشمی کا بیٹا نہیں۔'' اس نے انہی کے الفاظ دہرا کر انہیں چڑایا۔

وہ کچھ دیر اسے گھورتے رہے... اور ان کی آنکھوں میں خون اترتا رہا... نتھنے پھولے اور پچکے... گردن کی نسیں تن کر موٹی موٹی ہو گئیں... وہ مٹھیاں زور سے بھینچ کر کھولتے ہوئے زور سے چلائے۔

''جمعدار! سور کے بچے! تالا کھول۔'' وہ اتنی زور سے دہاڑے کہ جمعدار ہڑبڑا کر بھاگا اور چابی دوبارہ اس کی جیب سے گری... پھر بھی وہ ممکنہ پھرتی سے تالا کھول کر پیچھے ہٹ آیا۔

'صاب' نے لوہے کے دروازے پر زوردار لات رسید کی تو وہ دیوار سے ٹکرا کر زور سے جھنجنایا... اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے لپک کر قیدی کی گردن دونوں ہاتھوں میں دبوچ کر ایک زوردار گھٹنا اس کے پیٹ میں مارا... وہ اچھل کر نیچے گرا... انہوں نے لپک کر پوری طاقت سے اسے لات رسید کی... وہ لڑھکتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا... انہوں نے پھر اس کے بال پکڑ کر سیدھا کیا اور اس کے سینے پر چڑھ کر گھٹنے سے سینے پر دباؤ ڈالا۔

''کمینے... بدبخت! ثریا کی بیٹی کو بیوہ کرنا چاہتا ہے... میری ثریا کی بیٹی کو... اس کو عذاب ناک زندگی دے کر... ثریا کی روح کو تڑپانا چاہتا ہے۔'' انہوں نے تابڑ توڑ تین چار گھونسے اس کے سینے پر رسید کیے... منہ پر لگنے والے گھونسے نے چہرہ خون سے رنگ دار کر دیا۔ اس کا سانس اکھڑتا سا محسوس ہو رہا تھا... وہ بے حال ہو گیا لیکن اتنا زیادہ پٹنے کے باوجود اس نے ایک لفظ منہ سے نہیں نکالا اور نہ ہی اپنے بچاؤ کی کوئی کوشش کی تھی۔

انہوں نے اپنے غصے کو ذرا کنٹرول کر کے مزاج کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی... سانس زور سے پھیپھڑوں میں بھر کر خارج کی... پھر جیب سے رحم کی درخواست کے کاغذات نکال کر اس کی طرف بڑھائے... اس نے نرمی سے ان کا ہاتھ پرے ہٹا دیا۔

''جابر صاحب! بہت دنوں سے آپ مجھے پیٹنا چاہ رہے تھے... اب آپ کی تسلی ہو گئی... جائیے اب جا کر چین اور سکون کی نیند سو جائیے۔'' یہ کہتے کہتے قیدی بے ہوش ہو گیا۔

انہوں نے جیل وارڈن کو اشارہ کیا... وہ بھاگ کر اسٹریچر لے آیا پھر وہ لوگ اسے اسٹریچر پر ڈال کر جیل کے اسپتال میں لے گئے۔ جمعدار نے خالی کوٹھری کو تالا لگا دیا... ان کی نظر خالی کوٹھری پر پڑی تو ایسا لگا کہ قیدی کو پھانسی دی جا چکی ہے۔ ان کی نظروں میں ثریا کی بیٹی کی صورت پھر گئی... مرجھایا ہوا چہرہ... میلے اور بوسیدہ سے کپڑے... پاؤں میں ٹوٹی چپل... ان کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر مڑے اور جیل کے مین گیٹ کو عبور کر کے پکی سڑک پر ڈھیلے ڈھالے قدم اٹھاتے اپنے بنگلے میں آ گئے۔

خانساماں اس دوران میں ان کے لیے ٹھنڈا پانی رکھ گیا

تھا... انہوں نے گلاس اٹھا کر منہ سے لگایا اور غٹا غٹ پی گئے۔ اب وہ کافی بہتر محسوس کر رہے تھے پھر وہ اٹھ کر الماری تک گئے اور اپنا پرانا بریف کیس نکالا۔ اس میں سے ڈھونڈ کر چمڑے کا وہ بٹوا نکالا جس میں ان کی ثریا کی تصویر تھی۔ وہ اس پر ہاتھ پھیر پھیر کر اسے دیکھتے رہے... اسے محسوس کرتے رہے... اس سے ہم کلام ہوتے رہے۔

"ثریا! کل تیری بیٹی میرے پاس آئی تھی۔ وہی بیٹی جس کے لیے تو تڑپتی رہی... تیری کرن... بالکل تیرا عکس ہے وہ... بس وقت اور حالات کی سختیوں نے... اس کے وجود پر ایک گرد سی پھیلا دی ہے۔ لگتا ہے کپڑا لے کر ابھی اس گرد کو صاف کر دوں... تو اندر سے ثریا نکل آئے گی... بالکل تیری کاربن کاپی ہے وہ اور بالکل تیری ہی طرح دلیر اور ہمت والی بھی۔ تجھے پتا ہے اس کا شوہر ڈاکٹر ہے... پر خرابی یہ ہے کہ وہ حکومت کا باغی ہے... قتل کے الزام میں پھانسی کی سزا ہو چکی ہے...

"اگر وہ رحم کی درخواست صدر کو بھجوائے تو اس کی پھانسی کی سزا شاید عمر قید میں بدل جائے... اور عمر قید ہوتی ہی کتنی ہے... کچھ ہی سالوں میں باہر آجائے گا... کم از کم ہماری کرن کی زندگی تو برباد ہونے سے بچ جائے گی... لیکن وہ مانتا ہی نہیں... کہتا ہے... جن لوگوں سے لڑ رہا ہوں... اپنے حقوق کی پامالی کی خاطر... انہی سے زندگی کی بھیک مانگوں... یہ نہیں کروں گا۔ اور تو اور... کرن کے سامنے یہ بات ہوئی تو اس نے بھی ترخ کر یہی جواب دیا۔ مر جانا... جھکنا نہیں... کبھی نہیں۔ اس کا جو انداز تھا وہ دیکھ کر مجھے تم یاد آگئیں... بالکل اسی طرح... تقریباً ایسے ہی الفاظ میں تم نے مجھے چودھری کے سامنے گزگڑانے سے روکا تھا۔

"لیکن اب میں سوچتا ہوں... کاش میں نے تمہاری بات نہ مانی ہوتی... تو بائیس برس اس تنہائی کی آگ میں نہ جلنا پڑتا... چودھری کے ہاتھ پاؤں جوڑ کر... اس کی منتیں کر کے... فریاد کر کے... جیسے بھی ہوتا... تمہیں چھڑا لیتا... تمہیں بچا لیتا... تو بائیس برس اکیلے پن کا یہ جہنم نہ بھگتنا پڑتا۔

"میری مجبوری دیکھو... پہلے ایک زندگی اور موت کے درمیان تم آکر کھڑی ہو گئیں... اور موت کو جیت دے دی... آج ایسی ہی موت و زندگی کے بیچ تمہاری بیٹی آکر کھڑی ہو گئی ہے... وہ بھی موت کو جتوانا چاہتی ہے... نہیں جانتی نا... کہ پیچھے رہ جانے والوں کے لیے کیسے کیسے عذابوں کا لامتناہی سلسلہ چھوڑ جاتے ہیں مر جانے والے...

"خیر... میں کوشش کرتا رہوں گا... ابھی کچھ دن ہیں۔"

وہ اپنی اور ثریا کی محبت سے بھرپور زندگی کے بارے میں سوچتے رہے اور سوچتے سوچتے کرسی پر ہی کب سو گئے... پتا نہیں چلا۔

☆☆☆

قیدی کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو اسپتال میں پایا... اس کے دائیں بازو میں گلوکوز کی ڈرپ لگی ہوئی تھی... رات کی مار کی وجہ سے اس کا جسم بری طرح دکھ رہا تھا... ہلنے جلنے کی سکت نہیں تھی... وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کر خاموش ہو گیا۔ وارڈ بوائے نے تیزی سے بڑھ کر اس کا بستر ٹھیک کیا۔ گلوکوز کی خالی ہو جانے والی ڈرپ تبدیل کر کے نئی ڈرپ لگائی اور تیزی سے ہر چیز ٹھیک کرنے لگا۔

جابر صاحب کی ہدایت کے مطابق اس قیدی کا خاص خیال رکھا تھا۔ اس لیے جیسے ہی رات کے چوکیدار نے آرایم او کو قیدی کے جاگنے کی اطلاع دی' وہ فوراً دوڑا چلا آیا۔ جیل میں دم توڑتے قیدیوں پر بھی کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی لیکن اس قیدی کی بات ہی الگ تھی... یہ 'صاب' کے خصوصی آرڈر کے مطابق خصوصی دیکھ بھال کا مستحق قرار پایا تھا اس لیے سب کی خصوصی توجہ اسے بہتر سے بہتر سہولیات فراہم کرنے پر مرکوز تھیں۔

دور برآمدے میں کھٹ کھٹ کرتی قدموں کی مخصوص آواز گونجی... تو تمام آوازیں تھم گئیں... اسپتال کے احاطے میں آگے درختوں پر پرندوں کی آوازیں... لڑتی بلیوں اور اڑتی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی آوازیں... یہاں تک کہ چیختے کراہتے مریضوں کی آوازیں بھی تھم گئیں۔

جابر صاحب آرایم او کے ساتھ وارڈ میں داخل ہوئے اور سیدھے اس باغی قیدی کے بیڈ کے پاس آکر رک گئے۔

"ہیلو ینگ مین! ہاؤ آر یو؟" انہوں نے قیدی سے پوچھا تو اس نے مندی مندی سی آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا... جواب دینے کی سکت ہی نہیں تھی اس لیے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

"ہاؤ از ہی؟" انہوں نے آرایم او سے پوچھا۔

"کوئی خاص پرابلم تو نہیں ہے... ہلکا سا بخار ضرور ہے۔" آرایم او نے جواب دیا۔ انہوں نے قیدی کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اس بخار کو محسوس کرنے کی کوشش کی تو قیدی کو احساس ہوا کہ ان کے سخت ہاتھ کے لمس میں کچھ اپنا پن اور شفقت ضرور ہے... اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اسے آنکھیں کھولتا دیکھ کر انہوں نے جھک کر اس کے کان کے



قریب منہ لے جا کر کہا۔

"شاید کچھ زیادہ چوٹ آگئی۔"

"میں آپ کے بارے میں کچھ تھوڑا سا غلط تھا... آپ ایک بالکل ہی کھڑوس پولیس افسر نہیں ہو... اندر کہیں دور آپ کے اندر بھی کبھی کچھ دھڑکتا بھی ہے۔" قیدی نے ہلکی آواز اور نسبتاً بہتر انداز میں اپنی بات کہی تو جابر صاحب ہنس پڑے۔

"تم نرے شاعر کے شاعر ہی ہو... گفتگو بھی اشعار کی صورت کرتے ہو... لیکن برخوردار! لفظ کتنے بھی خوب صورت ہوں... زندگی کی حقیقتوں کو نہیں بدل سکتے... اور حقیقت یہ ہے کہ تم اپنی ناپختہ جذباتی سوچ کو لفظوں کی شکل میں ترتیب دے کر اسے زندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہو... زندہ رہ کر زندگی کی الجھنوں کو سلجھانا... کیونکہ ایک مشکل کام ہے... اس لیے تم نے آسان راستے کا انتخاب کیا ہے... پھانسی کے پھندے پر جھول کر... تم اپنے لوگوں کی نظر میں ہیرو بننے کے چکر میں ہو جبکہ حکومت اور اس کے ہم خیال لوگوں کی نظر میں تم صرف قتل کے ایک مجرم ہو... جسے ایک مجرم کی حیثیت سے پھانسی پر چڑھا دیا جائے گا اور چند دنوں کے بعد... تمہاری داستان تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں۔"

انہوں نے اپنی طرف سے بڑے ٹھوس الفاظ میں اپنا نقطۂ نظر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں جابر صاحب! میرا مطمحِ نظر ہیرو بننا نہیں ہے... جو کچھ آپ نے کہا... وہ میں بھی جانتا ہوں میں تو اپنے مقصد کی خاطر جان دے رہا ہوں... تاکہ میرے پیچھے آنے والے لوگ بھی اپنے مقصد کا تعین کر سکیں... ڈو اور ڈائے... اس جذبے کی ہمیں بہت سخت ضرورت ہے... ورنہ ہم کبھی اپنے ملک اور قوم کے حالات نہیں بدل سکیں گے۔" اس کا اعتماد ذرا بھی نہیں ڈگمگایا تھا۔

"اس مفاد پرستی کے دور میں... انفرادی مقاصد کے سامنے اجتماعی مقاصد کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی برخوردار! تمہارے پیچھے آنے والے بھی اپنا مفاد حاصل کر کے... یا اس جدوجہد سے تھک کر بکھر جائیں گے... تنکوں کی طرح... لیکن تم اگر چلے گئے تو واپس نہیں آسکو گے... ان کو بُرا بھلا کہنے... اس لیے میں پھر کہتا ہوں... اس رحم کی درخواست پر سائن کر دو۔" انہوں نے پھر تی سے درخواست کے کاغذ نکال کر اس کے سامنے کر دیے... تو وہ مسکرایا۔

"آپ چاہتے ہیں کہ میں خود مرنے سے پہلے اپنے ضمیر کو مار ڈالوں... نو مائی لارڈ! میرے ہاتھ خالی نہیں ہیں کیونکہ میری ہتھیلیوں پر خود میرا اپنا سر رکھا ہوا ہے۔" اس نے اس قدر شگفتہ لہجے میں اس قدر بھیانک بات کہی کہ وہ حیران رہ گئے۔

"تم جانتے ہو... پھانسی کے پھندے پر لٹکنے والے کی جان فوراً نہیں نکلتی... وہ تقریباً پانچ منٹ... یا اس سے بھی کچھ زیادہ دیر تک... انتہائی دردناک اذیت جھیلتے ہوئے تڑپتا رہتا ہے... یہ بھیانک اذیت ہی دراصل سزا ہے... ورنہ ایک لمحے کی موت تو کوئی سزا نہیں ہوتی... مجرم کو اپنے جرم کے احساس سے پہلے ہی موت اچک کر لے جاتی ہے... اور وہ صرف ایک لمحے کی اذیت کے بعد نہایت آرام سے موت کی بانہوں میں منتقل ہو جاتا ہے... تم ایک بار پھر سوچنا... میں پھر آؤں گا۔"

یہ کہہ کر وہ مڑے اور اپنی مخصوص رفتار سے کھٹ کھٹ کرتے قدموں سے اپنے آفس کی طرف چلے گئے۔ دور ہوتی ہوئی کھٹ کھٹ کی آواز سن کر قیدی نے مسکرا کر آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

وہ اپنے آفس میں آکر بیٹھے... ٹیبل کی دراز کھول کر قیدی کی رحم کی درخواست کے کاغذات نکالے... انہیں دیکھتے رہے۔ "صرف تین دن رہ گئے ہیں... اور یہ ضدی انسان دستخط کر کے نہیں دے رہا ہے۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائے۔

پھر کاغذات واپس دراز میں ڈال کر دراز بند کی اور سوچنے لگے کچھ ایسے طریقے... جنہیں استعمال کر کے وہ اس ضدی انسان کو راضی کر سکیں... ایک کے بعد ایک طریقے ان کے ذہن میں آتے رہے... لیکن نامناسب ہونے کی وجہ سے وہ انہیں مسترد کرتے رہے... اسی ادھیڑبن میں مبتلا وہ گہری سوچوں میں غرق خاموش بیٹھے تھے کہ فون کی گھنٹی تیز آواز میں چیخ پڑی۔ انہوں نے ناگواری سے اسے دیکھا اور فون اٹھا لیا۔

"ہیلو! جابر اسپیکنگ... کون؟"

"پاپا! میں... زدنیرہ!" دوسری جانب سے ایک ڈری سہمی سی آواز میں کسی لڑکی نے اپنا نام بتا کر تعارف کروایا تو سپرنٹنڈنٹ صاحب کی توپ جیسی آواز گونجی۔

"زونی!" ایسا لگا جیل کی دیواریں لرز گئی ہیں۔ درختوں پر بیٹھے پرندے گھبرا کر اڑ گئے۔

"زونی! تو کہاں ہے؟ کیا لندن سے ہی بات کر رہی ہے؟" انہوں نے خوشی سے بے حال ہوتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں پاپا! میں لندن سے واپس آگئی ہوں... ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔''

''اس وقت کہاں ہے تُو میری بچی؟'' انہوں نے بے قراری سے پوچھا۔

''میں اس وقت لاہور میں ہوں... ابھی بس سے روانہ ہورہی ہوں... آپ کے پاس آرہی ہوں پاپا! آپ مجھے لینے آجائیں گے نا؟''

''آف کورس... میں ضرور لینے آؤں گا تجھے... کس وقت پہنچ رہی ہے تُو؟''

''بس نکلنے ہی والی ہے... تین گھنٹے بعد میں آپ کے پاس پہنچ جاؤں گی... آپ آجاؤ گے نا پاپا؟''

''میں وقت سے پہلے ہی تجھے لینے آجاؤں گا میری جان! تُو بس سے اترنے سے پہلے ہی مجھے وہاں کھڑا پائے گی... فکر نہ کر۔''

''او کے پاپا! بس ہارن دے رہی ہے... میں چلتی ہوں۔'' فون بند ہوگیا۔ انہوں نے فون رکھا اور جمعدار کو بلایا۔

''جمعدار...!'' ان کی توپ جیسی آواز گونجی تو جیل کے سارے جمعدار، جیلر، سپاہی اور حوالدار وغیرہ دم بخود ہو گئے... سینئر جیلر ہمت کرکے آفس میں داخل ہوا تو صاحب کے چہرے پر خوشیوں کا پرتو دیکھ کر... وہ حیرت سے گنگ ہو کر کھڑا ہوگیا۔

''حوالدار سے کہہ کر گاڑی نکلواؤ... تیل پانی اچھی طرح چیک کرواؤ... میری بیٹی آرہی ہے... مجھے اسے لینے کے لیے جانا ہے... جلدی۔'' انہوں نے چٹکی بجا کر جلدی کام کرنے کا اشارہ کیا تو جیلر فوراً واپسی کے لیے مڑ گیا... باہر حیرت زدہ چہروں کو دیکھتے ہوئے اس نے آہستہ سے انہیں بتایا۔

''صاب کی بیٹی آرہی ہے... اسے لینے جارہے ہیں۔'' ان کے جانے کی خبر سن کر ہر ایک کو ایک مختصر سے وقت کے لیے آزادی کا احساس ہوا چہروں پر طمانیت بھری مسکراہٹ لہرائی... اور وہ اِدھر اُدھر ہوگئے۔

جابر صاحب آفس سے نکل کر باہر آئے اور طویل بیرک پار کرتے ہوئے ان کے قدموں کی تال میں قیدیوں کو فوراً فرق محسوس ہوا... وہ بھاری قدموں کی کھٹ کھٹ آج ایک تال دیتی آہٹ محسوس ہورہی تھی۔

مین گیٹ سے نکل کر وہ بنگلے کی طرف بڑھنے لگے... تارکول کی پکی سڑک پر قدموں کی آہٹیں گونجیں... پرندے خاموش ہوگئے... پتوں کی پازیب بجنا بند ہوگئی۔ وہ سڑک پر چلتے ہوئے بنگلے کی طرف بڑھتے گئے۔ بنگلے کی چوکیداری پر تعینات حوالدار مستعد ہوگیا۔

ہوا کے جھونکوں کی نرم سرسراہٹ میں اسے گنگناہٹ سنائی دی... تو وہ چونکا اور آنکھیں پھاڑ کر صاحب کو دیکھنے لگا۔

آج ان کی چال میں کچھ لہرانے کا سا تاثر تھا۔ چھڑی کی حرکت جھومنے کی سی تھی اور ہونٹوں پر ایک سریلا سا گیت تھا۔

''آ میری جان! میرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے...
روشنی لے کے اندھیروں میں نکلنا ہے تجھے... آ میری جان!''

صاحب نزدیک آئے تو ان کی گنگناہٹ گیت کے بول بن کر سنائی دی۔ حوالدار نے حیرت سے انہیں دیکھتے ہوئے زوردار سیلوٹ مارا اور وہ خوشی خوشی اس کا سیلوٹ قبول کرتے ہوئے اندر چلے گئے۔

☆☆☆

ٹن ٹن ٹن... گھنٹے کے دس بجاتے ہی پکی سڑک پر قدموں کی آہٹیں گونجیں... لیکن نہ تو پرندے سہم کر خاموش ہوئے... اور نہ ہی پتوں کو چھن چھن بجاتی ہوا سہم کر ٹھہری۔

ان کے ہاتھ میں چھڑی ہوا میں لہرا رہی تھی اور قدموں کی آہٹیں ان کی گنگناہٹ کو تال دیتی محسوس ہورہی تھیں... وہ مین گیٹ سے اندر داخل ہوئے تو جیل وارڈن نے قیدیوں کی قطار لگوائی ہوئی تھی۔ یہ وہ بدمعاش قیدی تھے جو جیل قوانین کی خلاف ورزی کرتے یا چھوٹے موٹے لڑائی جھگڑے یا مار پیٹ میں ملوث ہوتے تھے... اور روزانہ صاحب جیل میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے انہی سے نمٹتے تھے۔

وہ یکساں رفتار سے چلتے ہوئے آفس کے سامنے سے گزر گئے... پھانسی گھاٹ کے جمعدار نے انہیں آتے دیکھا تو لپک کر گیٹ کھول دیا۔ وہ اس کے سیلوٹ کا جواب دیتے ہوئے سیدھے قیدی نمبر سات سو باسٹھ کی کوٹھری کے سامنے آکر رک گئے۔ جمعدار جلدی سے آیا اور اس کی کوٹھری کا تالا کھولنے کے لیے چابی تلاش کرنے لگا۔ صاحب اس دوران میں کھڑے جمعدار کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے بجائے گنگناتے رہے۔

''آ میری جان! میرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے...
روشنی لے کر اندھیروں میں نکلنا ہے تجھے۔ آ میری جان میرے...'' کوٹھری کے اندر کونے میں بیٹھا ہوا قیدی شاید کوئی کتاب پڑھ رہا تھا لیکن اب وہ پڑھنا لکھنا بھول کر



آنکھیں سکیڑے انہیں غور سے دیکھ رہا تھا... پھر کونے سے اٹھ کر دروازے پر آگیا۔

''کیا حال چال ہیں برخوردار؟'' انہوں نے گانا روک کر اس سے پوچھا۔

''گانا اچھا ہے۔'' اس نے ان کے سوال کو نظر انداز کر کے ان کے گانے پر تبصرہ کیا۔

''ارے یار! ہماری آواز تو خاصی اونچی ہے۔ پر گائیکی اتنی ہی نیچی ہے... سُر تال کی پہچان نہیں۔ بس دل پشوری کرنے کے لیے گا لیتے ہیں۔'' انہوں نے ہنستے ہوئے کہا تو قیدی بھی مسکرایا۔

''میں گانے کی نہیں... اس شاعری کی بات کر رہا تھا... جو آپ گا رہے تھے۔'' قیدی نے کہا۔

''تمہیں اچھی لگی؟''

''ہاں، بہت اچھی ہے... کس کی شاعری ہے یہ؟''

''آف کورس... میری جانم کی۔'' انہوں نے روانی میں خوش ہو کر بتایا۔

''جانم؟'' قیدی نے بھویں سکیڑ کر پوچھا تو اچانک انہیں احساس ہوا کہ وہ کچھ غلط بول گئے ہیں۔ انہوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ احاطے میں لگے درخت سے پرندے گھبرا کر اڑ گئے۔

''تم بھی سوچ رہے ہوگے... میرے جیسے آدمی کے منہ سے اس طرح کا لفظ کیسے نکل آیا... یہ اندازِ تخاطب تو محبت کرنے والوں کا ہوتا ہے... اور میں اور محبت... دو انتہائی الگ انتہائیں ہیں... میں بھلا کسی سے محبت کیسے کر سکتا ہوں؟''

انہوں نے اپنی بات ختم کر کے ایک بار پھر قہقہہ لگایا۔ قیدی بغور انہیں دیکھ رہا تھا۔

''آج کل کہاں ہے وہ؟'' اس نے آہستگی سے سوال کیا تو صاحب نے چونک کر اسے دیکھا اور سر جھکا لیا۔

''ہوگی کہاں؟ منوں مٹی کے نیچے... اب تو شاید صرف اس کی ہڈیاں رہ گئی ہوں گی۔ اپنے ظالم بھائی کے ہاتھوں... دو بار ماری گئی بے چاری... ایک بار اپنا حق مانگنے پر... اور دوسری بار جرمِ محبت پر... حق مانگنے پر اس کی ماتا کو دار پر کھینچ دیا گیا... دوسری بار وہ دو ماہ کی بچی کو میرے پاس چھوڑ کر... خود موت کے پاس چلی گئی... میں نے اپنے دل کی جلن کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اس کے قاتل کو بھی مار دیا... لیکن میرے اندر کی یہ جلن آج تک ختم نہیں ہوئی... اب بھی جلتا رہتا ہوں اور جیل والے بھگتتے رہتے ہیں۔'' وہ چپ



کیا آپ
لبوب مُقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟
کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مُقوّی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مُقوّی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مُقوّی اعصاب ٹیلیفون کرکے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں فون صبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک
المسلم دار الحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی یونانی دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
آپ صرف فون کریں۔ آپ تک لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

گئے۔ قیدی کو صاف محسوس ہوا کہ آنسوؤں کی نمی نے ان کے گلے میں پھندا ڈال دیا ہے۔

''ایسی تھی وہ؟'' قیدی نے پوچھا تو انہیں لگا کہ اس کے لہجے میں رشک کا ساشائبہ ہے۔

''ہاں، بہت اچھی تھی وہ... تم دیکھنا چاہتے ہو... مژیا کیسی تھی؟ تو میری بیٹی کو دیکھنا... زونی بالکل اپنی ماں کی کاپی ہے... نہ صرف شکل صورت میں... بلکہ انداز واطوار میں بھی بالکل اسی کی طرح ہے۔ کل رات کو ہی تو آئی ہے میری بیٹی... ہم نے رات بھر گپ شپ کی۔'' انہوں نے خوش ہو کر بتایا۔

''تب ہی تو آج آپ خاصے بدلے بدلے سے لگ رہے ہیں... بیٹی سے کہیں یہیں کچھ دن رہے آپ کے پاس۔'' اس نے مسکراتے ہوئے مشورہ دیا۔

''ہاں... ابھی تو وہ رہے گی یہاں... جانتے ہو پورے پانچ سال کے بعد آئی ہے... میں نے اسے لندن بھیج کر پڑھایا ہے۔ وہاں اس نے اپنا گریجویشن کرلیا ہے اور اب ماسٹرز کی تیاری کررہی تھی... پتا نہیں کیسے دو تین سال پہلے وہ کسی گورے لڑکے کے چکر میں پڑ گئی اور وہ کم بخت یہودی... مجھے تو برداشت ہی نہیں تھا میں اس سے ناراض ہو گیا... اس نے بڑی کوشش کی کہ میں اس بات کی اجازت دے دوں کہ وہ اس سے شادی کرلے... لیکن مجھے تو اس قدر غصہ آیا کہ میں نے اس سے ہر تعلق توڑ لیا... کہہ دیا میں نے اس سے کہ اگر اس یہودی سے شادی کرنی ہے تو بھول جائے کہ اس دنیا میں اس کا واحد رشتہ... اس کا کوئی باپ بھی ہے... منع کردیا میں نے اسے...'' وہ بڑے جوش میں بول رہے تھے۔

''اچھا... تو اس نے آپ کو منانے کی کوئی کوشش بھی نہیں کی؟'' قیدی نے سوال کیا۔

''بڑی کوششیں کیں... یہاں تک کہ اس نے نذیرے سے بھی سفارش کروائی... پر میں نے نذیرے سے بھی صاف کہہ دیا... دیکھ بھئی! بے شک تو اس کا مجھ سے زیادہ چاہنے والا چاچا ہے... میری بیٹی کی زندگی... تیرے احسانوں کی مرہون منت ہے... سالوں میں در در بھٹکتا رہا... اور تو نے میری بیٹی کو پالا پوسا... میں تیرے سارے احسانوں کو دل سے مانتا ہوں... پر اس معاملے میں تو مجھے نہیں... اسے سمجھا... کیونکہ میں ماننے والا نہیں ہوں یہ بات... صاف کہہ دیا میں نے اس کو...'' انہوں نے حتمی لہجے میں کہا۔

''اچھا... تو یہ نذیرا کون ہے؟'' قیدی نے انہیں ٹھوکتے ہوئے پوچھا۔

''نذیرا؟ میرا اکلوتا دوست... بھائی... غم خوار... میرا محسن... جو چاہو سمجھ لو۔'' انہوں نے جواب دیا تو لفظ محبت میں ڈوبے ہوئے تھے۔

''یہیں کہیں ہوتا ہے آپ کا یہ دوست؟'' قیدی نے پھر پوچھا۔

''نہیں... بڑکپن کا دوست تھا بیس بائیس سال پہلے ہی بس اس سے میل جول تقریباً ختم ہو گیا تھا کیونکہ میں تو اپنی دنیا لٹ جانے کے بعد اپنے حواسوں میں نہیں تھا... وہی میری دو ماہ کی بچی کو لے کر گاؤں سے ہی چلا گیا تھا... تاکہ اسے دشمنوں سے بچا سکے... اسی نے اسے پالا پوسا پھر جب وہ تقریباً سات سال کی ہو گئی تو میں اس سے ملا... اس نے میری امانت میرے حوالے کی اور کراچی چلا گیا... بس... پھر وہ اپنے بیوی بچوں کی ذمے داریوں میں کھو گیا... اور میں اپنے حالات میں... کبھی کبھار فون پر بات ہو جاتی تھی اب زونی کے معاملے کے بعد سے اب تک نہیں ہوئی... پتا نہیں کیسا ہوگا۔'' وہ خاموش ہو گئے۔

''اچھا ہی ہوگا... جا کر مل آئیں نہ اس سے کبھی۔'' قیدی نے اسے مشورہ دیا۔

''ہاں... کئی بار سوچا... بس جانا ہی نہیں ہو نے پایا۔ خیر چھوڑو... میں نے کل اپنی بیٹی کو تمہارے بارے میں بتایا... یہ بھی بتایا کہ تم شاعری میں بڑی دلچسپی رکھتے ہو اور تمہارے پاس جو کتابیں ہیں ان میں کئی شاعروں کے مجموعے بھی ہیں تو وہ بہت خوش ہوئی۔ کہنے لگی کہ ایک ڈاکٹر، سرجن اور شاعر... بڑی منفرد ترکیب رکھنے والی شخصیت ہے... اور ایسی انوکھی شخصیت سے میں ضرور ملنا چاہوں گی... تم ملنا پسند کرو گے میری بیٹی سے؟'' انہوں نے پوچھا تو قیدی مسکرایا۔

''ضرور کیوں نہیں... آپ کی بیٹی سے ضرور ملنا چاہوں گا... دیکھوں گا آپ سے کتنی ملتی ہے۔'' قیدی کی بات سن کر وہ بھی زور سے ہنسے۔

''بالکل بھی نہیں... میری بیٹی اتنی حسین ہے کہ قدرت نے کم ہی ایسے شاہکار تخلیق کیے ہوں گے۔'' وہ بولے۔

''پھر تو ملنا اور بھی ضروری ہو گیا۔''

''ٹھیک ہے... انتظار کرنا... شام کو اسے لے کر آؤں گا۔'' انہوں نے خوش دلی سے کہا اور تیزی سے مڑ گئے۔ قدموں کی تال پر چھڑی لہرائی اور ان کی آواز ابھری اور دور ہوتی گئی۔

آ میری جان! میرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے...



قیدی پُرخیال نظروں سے انہیں دیکھتا رہا... پھر جا کر اپنی کوٹھری کے کونے میں بیٹھ گیا۔

☆☆☆

شام کا سورج ڈھل کر درختوں کی طرف جھک گیا۔ سائے لمبے ہونے لگے... جابر صاحب اپنی نازک اندام بیٹی کے ساتھ جیل کے مین گیٹ کی طرف بڑھے... ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے زونی کے خوب صورت سنہری بالوں کو اڑانے کی کوشش کررہے تھے اور وہ انہیں ٹھیک کرتی ہوئی پاپا سے باتیں کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

مین گیٹ پر موجود دونوں حوالداروں نے صاب کو سلامی دی اور مین گیٹ کھول دیا۔ جابر صاحب نے ہاتھ بڑھا کر بیٹی کو سہارا دیا اور اس کے نازک قدم گیٹ کے اندر پڑے تو آس پاس کی فضا غیر ملکی پرفیوم کی خوشبو سے مہک اٹھی۔

اندر جیلر اور جمعدار ان سے نظریں بچا کر بار بار ان کی حسین بیٹی کو چور نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ صاحب اپنی بیٹی کے ساتھ پھانسی گھاٹ کی طرف جانے کے لیے بیرکوں سے گزرے تو قیدیوں کی گرسنہ نظریں ان کی بیٹی کو بھوکی نگاہوں سے کھانے لگیں لیکن اس سے نگاہ ملانے کی ہمت کسی نے بھی نہیں کی... جابر صاحب کا کوڑا اور جوتا درمیان میں حائل تھے۔

پھانسی گھاٹ کے جیلر نے گیٹ کھولا تو صاب کی بیٹی کو دیکھ کر کچھ گڑبڑا سا گیا۔ پہلی نظر اس کے چہرے پر پڑنے کے ساتھ ہی بوکھلا کر وہ پیچھے ہٹ گیا اور نظریں جھکا کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنی بیٹی کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے سیدھے قیدی نمبر 762 کی کوٹھری پر آ کر رک گئے۔ وہ لمبی لمبی سلاخوں والے دروازے کے سامنے ہی کھڑا ہوا تھا۔ اس نے گہری نظروں سے... بھرپور انداز میں زونی کو دیکھا اور بغور جائزہ لیا۔

''یہ ہے میری بیٹی زونی... کیسی ہے؟'' سپرنٹنڈنٹ صاحب نے قیدی سے پوچھا۔

''ماشاء اللہ... بہت خوب صورت... کم از کم آپ سے بالکل نہیں ملتی... یقیناً ماں سے ملتی ہوگی۔'' قیدی نے مسکرا کر کہا۔

''آف کورس مژیا سے ملتی ہے... ڈیٹو کاپی ہے اپنی ماں کی۔ بہت غزلیں، نظمیں پڑھتے رہتے ہو... اندازہ تو ہو گیا ہوگا کہ کیسے لوگوں کو دیکھ کر غزلیں کہی جاتی ہیں... کیا اس وقت تمہیں کوئی غزل یاد نہیں آئی؟'' جابر صاحب بیٹی سے محبت نہیں عشق کرتے تھے۔

''نہیں... بس ایک خیال آیا... کہ یہ اپنی ماں کی طرح ہے... خدا اسے اپنی ماں جیسے انجام سے بچائے۔'' قیدی بے ساختہ بولا تو جابر صاحب کو ایک جھٹکا سا لگا اور وہ شاید اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے دیوار سے ٹک گئے۔ ان کے چہرے پر ابھرنے والے دکھ نے قیدی کو بھی کچھ شرمندہ سا کردیا۔

زونی نے دونوں کو دیکھا پھر بولی۔

''میں اپنی کچھ غزلیں دکھانے کے لیے لائی ہوں۔''

''اوہ ہاں... دکھاؤ ذرا۔'' زونی نے ہاتھ میں پکڑی نوٹ بک اس کو دکھائی تو اس نے صفحے پلٹ پلٹ کر جگہ جگہ سے پڑھا۔ خوشبودار گلابی کاغذ پر خوش خط لکھی ہوئی غزلیں ایسی ہی تھیں جیسی ایک ناز ونعم میں پلنے والی لڑکی ہی لکھ سکتی ہے۔

چاند تاروں کی... پھولوں تتلیوں کی اور گھسی پٹی سطحی محبت کی... اس نے دو چار غزلیں پڑھ کر نوٹ بک واپس کردی۔

''کیوں پسند نہیں آئیں آپ کو؟'' زونی نے حیران ہو کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہم م م... عام سی ہیں... تم جیسی خاص لڑکی کی شاعری بھی خاص ہونا چاہیے... مقصدی اور منفرد...''

''مقصدی اور منفرد؟'' وہ سوالیہ انداز میں بڑبڑائی تو قیدی نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اسے کچھ دیر غور سے دیکھتی رہی پھر بولی۔

''کیا آپ مجھے سکھائیں گے کہ مقصدی اور منفرد شاعری کس طرح کی جاتی ہے؟'' اس کے سوال پر قیدی آہستہ سے ہنسا۔

''سکھا تو میں دیتا... لیکن تمہاری یہ مشق ادھوری رہ جائے گی کیونکہ میں تو یہاں بس چند دن اور ہوں۔'' اس کی بات کا مفہوم سمجھ کر نہ جانے کیوں زونی کا دل اندر سے زور سے دھڑکا۔ وہ سر جھکا کر نچلا ہونٹ چباتے ہوئے نہ جانے کس الجھن میں مبتلا رہی۔ پھر سر اٹھا کر قیدی کو دیکھا۔

''آپ اتنے اچھے اور اتنے شان دار انسان ہیں... اللہ تعالیٰ نے آپ کو شاہکار بنایا ہے... پھر آپ کیوں اس شاہکار کو وقت سے پہلے مٹی میں روند ڈالنے پر تلے ہوئے ہیں۔'' وہ بولی تو اس کے لہجے میں دردمندی جھلک رہی تھی۔

قیدی نے سر ذرا آگے کر کے دیوار کی طرف دیکھا تو سپرنٹنڈنٹ صاحب اپنے آفس کی طرف جاتے دکھائی دیے۔ وہ مسکرایا۔

"تو جابر صاحب اپنا مشن تم کو سونپ کر گئے ہیں۔"

"کیسا مشن؟"

"بچکانا سوال... تم بھی جانتی ہو اور میں بھی۔"

"میں نے جو کچھ کہا... وہ میرے دل کی آواز تھی کسی مشن کی لائن آف ایکشن نہیں تھی۔" زونی نے رکتے رکتے کہا۔

"اوکے... اوکے... ناؤ لیو دس ٹاپک... تمہارے بارے میں بات کرتے ہیں... کیا کر رہی تھیں؟ کیا کر رہی ہو؟ اور کیا ارادے ہیں؟" اس نے طویل گفتگو کے لیے موضوع کا درست انتخاب کرتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں... بچپن سے مری کانوینٹ کے ہوسٹل میں رہ کر پڑھتی رہی... پھر پاپا نے گریجویشن کے لیے لندن بھیج دیا... گریجویشن تو کرلیا ماسٹرز شروع کر دیا... اس دوران ایک لڑکا قریب آیا لیکن جب پاپا کو پتا چلا تو انہوں نے اس قدر شدید ردِعمل کا اظہار کیا کہ مجھے یہ چیپٹر کلوز کرنا پڑا... اب مجھے صرف اپنا تھیسس جمع کروانے کے لیے لندن جانا پڑے گا... ورنہ اب میرا مستقل یہیں رہنے کا ارادہ ہے... پاپا کے پاس۔ میں پاپا کو کسی قیمت پر ناراض نہیں کرسکتی۔ اس لیے کہ اس بھری پری دنیا میں ہم دونوں کا ایک دوسرے کے سوا کوئی نہیں ہے۔" زونی نے مختصر الفاظ میں اپنے بارے میں بتایا۔

"اور وہ لڑکا؟" قیدی نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"پاپا کی ناراضی تو بہانہ بن گئی... ورنہ مجھے بھی بعد میں معلوم ہوگیا کہ وہ فلرٹ ٹائپ چیز ہے، میرے کھنچتے ہی اس نے دوسری گرل فرینڈ ڈھونڈ لی لہٰذا اب وہ میری حماقت قصۂ پارینہ بن گئی ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو قیدی بھی مسکرایا۔

"تھیسس کس عنوان پر لکھ رہی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"مغرب و مشرق میں خاندانی رشتوں اور سماجی تعلقات کی اہمیت۔"

"بڑا عام سا عنوان ہے... کوئی منفرد سا موضوع کیوں نہیں لیا؟"

"میرے مضمون کے اعتبار سے اور آج کل کے بدلتے اقدار اور حالات کے لحاظ سے نہایت اہم ہے۔ مغرب میں خاندانی رشتے اور سماجی تعلقات اپنی آخری سانسیں لے رہے ہیں اور مشرق میں بھی اس قسم کی توڑ پھوڑ شروع ہو چکی ہے۔ اس کی وجہ سے سسٹم میں جو دراڑیں پڑنا شروع ہوگئیں وہ انسانیت کے لیے بھیانک مستقبل تیار کر رہی ہیں۔ یہ عام نہیں... بہت خاص بات ہے... ہے یا نہیں؟" اس نے سوال کیا۔

"بجا فرمایا... بالکل ٹھیک ہے۔" قیدی نے اس طرح کہا کہ وہ آہستہ سے ہنس پڑی۔

"آپ اس کی تیاری میں میری مدد کریں گے؟" اس نے سوال کرتے ہوئے ملتجیانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"جتنے دن ہوں... اتنے دن جتنی مدد لے سکتی ہو، لے لو۔" قیدی کی بات نے پھر اسے ایک جھٹکا دیا۔ اس نے ایک بار پھر گہری اور بھرپور نظروں سے قیدی کا جائزہ لیا پھر پوچھا۔

"کیا دنیا میں آپ کا کوئی ایسا رشتہ موجود نہیں ہے جس کے لیے آپ کا جینے کو دل چاہے... پیار کا رشتہ... محبت کا رشتہ؟"

"ہیں... کیوں نہیں ہیں... میرے قریبی رشتے تو بہت کم ہیں لیکن میں نے اپنا رشتہ محدود کر کے نہیں رکھا۔ میری محبت... میرا پیار کسی ایک یا دو چار کے لیے نہیں ہے... بلکہ میں نے اپنی محبت کے رشتے کو پھیلا کر... لاکھوں بلکہ شاید کروڑوں میں بانٹ رکھا ہے اور میں ان سب سے اپنا رشتہ نبھانے کے لیے ہی... ان کے اور اپنے مقصد کے حصول کی جدوجہد کر رہا ہوں۔ اپنے اور ان سب کے حقوق کے لیے لڑ رہا ہوں اور لڑائی میں کبھی کہیں ہار ہوتی ہے... تو کبھی کہیں جیت۔" وہ اپنی بات کہہ کر اپنے مخصوص من موہنے انداز سے مسکرایا۔

"محبت کے... پیار کے رشتے۔" وہ زیرِ لب بڑبڑائی۔

"ایک بات بتایئے... آپ کے اس قدر فیاضی سے بانٹے جانے والے محبت اور پیار کے رشتوں میں... کیا میرا کوئی حصہ ہے؟"

اس نے اچانک سوال کیا تو وہ مسکراتے مسکراتے ہنس پڑا۔

"ہاں... کیوں نہیں... تم ایک بہت خوب صورت، ذہین اور مہذب لڑکی ہو... جس کے سینے میں ایک خوب صورت دل بھی ہے... تم تو محبتوں کے رشتوں کی حق دار ہو... کون ہوگا... جو تم سے محبت نہیں کرے گا۔" اس نے مثبت جواب دیا۔

"کسی اور کی نہیں... صرف آپ کی بات کر رہی ہوں۔" اس کے لہجے میں بچکانا سی ضد تھی۔

"میری طرف آنے والے... یا میرے یہاں سے کہیں اور جانے والے تمام راستے... پھانسی گھاٹ کے اس گیٹ پر آکر ختم ہو چکے ہیں... نہ صرف حقیقی... بلکہ تعلقِ خاطر کے بھی تمام راستے مسدود ہو چکے ہیں... بس صرف چند دن اور ہیں... اس کے بعد میں صرف کہانیوں کا عنوان بن کر رہ جاؤں گا۔ ایسے میں تم ہوا کے جھونکے پر آشیانہ بنانے کی بات سوچ رہی ہو۔" اس نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"نہیں... میں یہ بتانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ اگر قدم زمین پر رہیں... تو راستے خود بخود بن جاتے ہیں لیکن یہی قدم اگر زمین... چھوڑ دیں تو پھر سارے راستوں کا وجود ہی مٹ جاتا ہے... امید کے... آرزو کے... خواہشوں کے... سب راستے... ہمیشہ کے انتظار کی اذیت سہتے سہتے ختم ہوجاتے ہیں اس سے پہلے کہ وہ وقت آئے... جب آپ کے قدم زمین چھوڑ دیں... ایک بار پھر سوچیں اور زمین سے اپنا رشتہ قائم رکھنے کی کوشش کریں... ان سب کے لیے... جو آپ سے محبت کرتے ہیں... میرے لیے... پاپا کے لیے۔" اس نے مضبوط لہجے میں اپنی بات کہی۔

وہ بڑی زور سے ہنسا۔

"تم تو ایک بہت اچھی وکیل ہو... اپنی بات مدلّل انداز میں کہنے کا ہنر جانتی ہو۔ یہاں جیل میں کیا کر رہی ہو؟ قانون کا ہتھیار ہاتھ میں اٹھاؤ... اور ناانصافیوں کے مارے لوگوں کی مدد کرو۔" اس نے ہنستے ہنستے مشورہ دیا۔

"وہی تو کرنے کی کوشش کر رہی ہوں لیکن کیا کروں... پہلا کلائنٹ ہی ایسا ملا ہے جو کسی دلیل... کسی استدلال کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہے... اسے اگر میں اپنا ٹیسٹ کیس سمجھ بھی لوں... تو سامنے آپ ہیں... جو میری ہر کوشش کو ناکام کرنے میں سردھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔" وہ بھی جواب دے کر مسکرائی۔

"ایسا نہیں ہے... تم گزر جانے والی ٹرین کے انتظار میں کھڑی ہونا چاہتی ہو... اس لیے بیکار ہے... اپنے لیے کوئی اور میدانِ عمل تلاش کرو... اور اپنی زندگی کی نئی ابتدا کرو۔" اس نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"شاید آپ درست فرما رہے ہوں... باباجی! لیکن میں کیا کروں... میرے یہاں کچھ فتور ہے شاید۔" زونی نے اپنی کنپٹی پر انگلی گھمائی اور ایک بار پھر سر سے پاؤں تک اس کا بغور جائزہ لیا۔ قیدیوں کے مخصوص لباس میں... آنکھوں پر ریم لیس چشمہ لگائے... بڑھے ہوئے شیو میں... وہ اب بھی نہایت جاذبِ نظر محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے اندر بعض نئے سے جذبات نے سر اٹھایا۔ وہ ان کی شدت سے پریشان ہو کر واپسی کے لیے مڑی اور پاپا کے آفس کی جانب چل پڑی۔

"پاپا! وہ ایک بہادر سپاہی ہے جو اپنے مقصد کے لیے لڑ رہا ہے کوئی چور، ڈاکو یا مجرم نہیں ہے جو اسے قاتلوں کی طرح پھانسی پر لٹکایا جا رہا ہے... پھانسی کے پھندے پر جھول کر... دردناک ترین اذیت کو جھیلنا... بہت تکلیف دہ ہے پاپا... اسے بچالیں۔"

زونی نے بھیگے بھیگے سے لہجے میں کہا تو ان کے اندر کا باپ بہت دکھی ہوگیا۔ وہ سر جھکائے خاموش بیٹھے رہ گئے۔

☆☆☆

آنے والے نے موٹر سائیکل جیل کے مین گیٹ پر روکی اور اندر داخل ہوگیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ سینئر جیلر کے آفس کے دروازے پر کھڑا اندر آنے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔ وہ ہوم ڈپارٹمنٹ سے آیا ہوا قاصد تھا۔ اس نے سینئر جیلر کو ایڑیاں ملا کر سیلیوٹ مارا اور ایک سرکاری مہر بند لفافہ جیلر کے حوالے کیا۔ لفافے سے منسلک رسید پر دستخط لیے اور واپس روانہ ہوگیا۔

سینئر جیلر نے لفافہ کھولا۔ اس کے اندر سے نکلنے والا کاغذ پڑھا۔

قیدی نمبر 762 عبیر علی ہاشمی کی پھانسی کے حکم نامے پر صدرِ مملکت کے دستخط ہو چکے تھے۔ وقت اور دن تاریخ مقرر ہو چکا تھا۔

سینئر جیلر کے اندر کا جیلر یکدم خوش ہوگیا۔ ایک اور مجرم کو پھانسی چڑھانے کا کام آگیا۔ وہ اس سلسلے میں بڑے جوش و خروش سے ضروری کام سرانجام دیتا۔ بالکل ایسے ہی جیسے کسی تقریب کی تیاری کر رہا ہو۔

وہ کاغذ کو دوبارہ لفافے میں ڈالتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ ٹوپی سر پر جمائی اور سپرنٹنڈنٹ کے آفس کی طرف چل پڑا۔

"سر! ہوم ڈپارٹمنٹ سے یہ لیٹر آیا ہے۔ قیدی نمبر 762 کی پھانسی کا حکم نامہ۔" اس نے لفافہ سپرنٹنڈنٹ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

انہوں نے خاموشی سے لفافہ لے کر کھولا اور اپنا چشمہ آنکھوں پر درست کرتے ہوئے اندر سے نکلنے والے حکم نامے پر نظریں دوڑائیں۔ اسی سنجیدگی سے کاغذ واپس لفافے میں ڈال کر اسے اپنی دراز میں رکھا۔

"تیاری کرو۔" وہ بولے تو ان کے لہجے میں بھاری پن تھا جسے محسوس کر کے سینئر جیلر کو کچھ تبدیلی کا سا احساس ہوا۔ ورنہ پہلے ایسا کوئی بھی آرڈر خود اس کے ساتھ ساتھ سپرنٹنڈنٹ

صاحب کے لیے بھی ایک انوکھی خوشی کا باعث ہوتا تھا اور ہمیشہ وہ ایسا کوئی بھی آرڈر وصول کر کے... اپنا ایک مخصوص جملہ ضرور بولا کرتے تھے۔

''چلو ایک اور گندگی کی پوٹ کو دنیا سے اٹھا کر پھینک دیں۔''

مگر حیرت ہے کہ آج ایسا کوئی جملہ بولنے کے بجائے وہ کچھ بھاری دل سے بولے۔ وہ کچھ کچھ حیران سا سلام کر کے واپس لوٹ گیا۔ پھر اپنے آفس میں جانے کے بجائے وہ سیدھا چلتا ہوا پھانسی گھاٹ تک پہنچ گیا۔ پھانسی گھاٹ کے جیلر نے قدموں کی آہٹ سن کر چھوٹی کھڑکی کھول کر دیکھا اور گیٹ کھول دیا۔

وہ اندر داخل ہوا تو جیلر بھی پیچھے پیچھے آیا۔

''قیدی نمبر 762 کا آرڈر آ گیا ہے۔ چار دن بعد پھانسی ہے۔ تیاری کرنی ہے۔'' اس نے ساتھ چلتے ہوئے جیلر کو بتایا۔

''یس سر!'' اس نے مستعدی سے جواب دیا۔

''گھاٹ کا لیور اور تختہ چیک کرنا ہے۔'' وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بولا تو دوسرے جیلر نے مستعدی سے جواب دیا۔

''یس سر!''

پھر وہ اوپر پہنچ کر لیور کے نزدیک پہنچا۔ لیور کا لاک ہٹا کر اسے زور لگا کر کھینچا۔ پھندے کے نیچے والا تختہ چُوں چُوں کی آواز سے کھلا اور نیچے گر گیا۔

''لیور اور تختے کے قبضوں کو تیل اور گریس کی ضرورت ہے۔ ان کی اچھی طرح گریسنگ کرواؤ... کل پھر آ کر چیک کروں گا اور ہاں نیا رسّا نکلواؤ... اس کو بھی تیل اور مکھن میں ڈلوانا ہے۔'' اس نے پھانسی گھاٹ کے جیلر کو ضروری ہدایات دیں اور سیڑھیاں اتر کر پُرجوش انداز میں کھٹ کھٹ مارچ کرتا ہوا پھانسی گھاٹ سے باہر نکل گیا۔

جاتے جاتے قیدی نمبر 762 کی کوٹھری پر نظر پڑی تو وہ اپنی کوٹھری کے دروازے پر... چوکھٹ سے ٹیک لگائے... بیرک سے آنے والی کمزور زرد روشنی میں کوئی کتاب پڑھ رہا تھا اور اس کی برابر والی کوٹھری میں دوسرا پھانسی کا قیدی... جو ہر وقت چلاتا رہتا تھا کہ ''میں نے قتل نہیں کیا... میں نے قتل نہیں کیا'' فرش پر دونوں گھٹنے سمیٹ کر سینے سے لگائے چپ چاپ پڑا تھا... شاید سو رہا تھا کیونکہ جاگتا ہوتا تو اب بھی موت کے خوف سے چلا چلا کر یہی کہہ رہا ہوتا کہ میں نے قتل نہیں کیا۔

☆☆☆

انہیں کروٹیں بدلتے بدلتے نہ جانے کتنی دیر ہو چکی تھی۔ لگتا تھا پوری رات ہی گزر گئی ہے جب دونوں پہلو جلنے لگے تو وہ بستر سے اٹھ کر کمرے سے باہر آ گئے۔ ملگجی چاندنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ برآمدے سے نیچے پودوں میں کھلے ہوئے پھول کم روشنی میں اپنے رنگ تو کھو چکے تھے لیکن خوشبو فراوانی سے لٹا رہے تھے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر ایک نظر باہر کے ماحول کا جائزہ لیا اور اپنی مخصوص راکنگ چیئر پر بیٹھ گئے۔ کرسی آہستہ آہستہ جھولتی رہی اور وہ نامعلوم خیالوں میں الجھے رہے۔

خیالوں کی گہرائی میں ڈوبے ان کے احساسات کو چڑیوں کی آواز نے توڑا۔ انہوں نے حیران ہو کر سر اٹھایا۔ دور افق سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔

''ساری رات گزر گئی پتا بھی نہیں چلا۔'' وہ بڑبڑائے۔ حالانکہ کچھ دیر پہلے ہی وہ جیل کی مسجد سے بلند ہونے والی اذان کی آواز بھی سن چکے تھے لیکن بالکل خالی الذہنی کے عالم میں وہ احساسات سے ٹکرائے بغیر کانوں سے گزر گئی تھی۔

مؤذن کی آواز پھر بلند ہوئی۔ اب وہ کچھ آیات تلاوت کر رہا تھا۔ وہ کرسی سے اٹھ کر اندر گئے۔ وضو کیا اور نہ جانے کتنے سالوں کے بعد ان کے قدم مسجد کی طرف اٹھ رہے تھے۔ نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو انہیں سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ کیا دعا مانگیں۔

''اے میرے رب! تُو دلوں کا حال جاننے والا ہے' میرے بھی دل کا حال جان لے... میری مدد فرما۔'' یہ کہہ کر انہوں نے ہاتھ چہرے پر پھیرے اور واپسی کے لیے چل پڑے۔ سورج طلوع ہونے کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ وہ کچھ دیر یونہی اِدھر اُدھر نم ناک سبزے پر گھومتے رہے۔ پھولوں اور پتوں پر شبنم کے قطرے روشنی ظاہر ہونے پر کچھ جگمگا سے اٹھے تھے۔ پر درخت خاموش تھے۔ ہوا بھی چپ تھی اور پرندے صبح دم آشیانوں سے اڑ چکے تھے۔ ماحول میں کچھ اداسی گھلی ہوئی تھی۔

بنگلے پر پہنچے تو ناشتا تیار تھا۔ خانساماں حسبِ معمول ٹیبل لگا رہا تھا۔ صاحب کو آتا دیکھ کر اس نے کرسی کھینچی اور کاندھے پر پڑی صافی سے نظر نہ آنے والی گرد کو جھاڑا... زونی بھی آ چکی تھی۔ اس نے سلائس پر مکھن لگا کر ان کی طرف بڑھایا۔

''نہیں... آج ناشتے کو دل نہیں چاہ رہا... صرف چائے لوں گا۔'' انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے سلائس لینے




## خوبصورتی خوبصورت جلد سے جبکہ خوبصورت جلد سکن ٹونر سے وہ بھی چند سیکنڈز میں

### جلد کی خوبصورتی کیلئے سب سے بہتر سکن ٹونر / آج آزمائیں فائدہ نہ ہو تو قیمت واپس

یوں تو اپنے آپ کو خوبصورت بنانے کیلئے انسان صدیوں سے مختلف جتن کرتا چلا آ رہا ہے۔ خاص طور پر چہرہ تو ہر کوئی خوبصورت چاہتا ہے اس سلسلے میں بعض چہرے کی کچھ مخصوص ورزشیں کر کے چہرے کے عضلات کو مضبوط بناتے ہیں تاکہ وہ چاک چوبند اور جوان نظر آئیں۔ خاص طور پر مرد۔ جبکہ بعض چہرے پر کچھ لگا کر جلد کو گورا، نرم، ملائم اور چمکدار بناتے ہیں کہ وہ خوبصورت نظر آئیں خاص طور پر خواتین۔ ہم نے بھی اپنی تحقیقات کو اس مقصد کے حصول پر مرکوز کیا۔ یعنی جلد کی خوبصورتی کیلئے کہ جلد گوری نرم ملائم اور چمکدار ہو۔ طویل تحقیق کے بعد ہم ان نتائج کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ جو کہ لگتے ہی دو چار سیکنڈ میں اپنا اثر دکھاتا ہے۔ یعنی جلد نرم ملائم گوری اور چمکدار ہو جاتی ہے۔ دانے اور خارش ختم ہو جاتی ہے۔ ایسا ہماری دن رات تھکا دینے والی طویل تحقیق اور محنت سے ہی ممکن ہو سکا۔ رنگ گورا کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ کسی بھی بلیچ کریم سے آسانی سے رنگ گورا ہو جاتا ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ رنگ بھی گورا ہو۔ اور مضر اثرات بھی نہ ہو۔ اگر استعمال چھوڑ دیا جائے تو چہرہ بھی خراب نہ ہو اثر بھی دیر پا ہو اس وقت مارکیٹ میں مختلف ناموں سے مہنگی سستی کریمیں دستیاب ہیں جن کے اثرات سے آپ بخوبی واقف ہیں کہ استعمال کرتے رہیں تو ٹھیک چھوڑ دیں تو چہرہ ایک دم خراب لہٰذا ہم نے اپنی تحقیق میں سب سے زیادہ توجہ اس پر دی کے روزانہ کا استعمال بھی نہ ہو استعمال چھوڑ دیں تو چہرہ خراب بھی نہ ہو اثر دیر تک رہے سو ہم اس میں کامیاب ہوئے سکن ٹونر استعمال کرنے سے جلد 5 سیکنڈ میں ہی نرم ملائم گوری اور چمکدار ایک دفعہ استعمال کا اثر مہینوں تک اپنی ہی جلد پر ہاتھ پھیر کر یا دیکھ کر خود ہی پر پیار آ جائے سکن ٹونر ہماری اب تک کی ایجادات میں ایک بڑی ہی اہم ایجاد ثابت ہوئی جس کا طریقہ استعمال بھی نہایت آسان اور فوری موثر ہے حتیٰ کہ لگائیں اور فوراً دھو دیں تو بھی اپنا اثر دکھاتا ہے کہ دیکھنے والے بھی کہیں اور خود کو بھی محسوس ہو

سکن ٹونر کے استعمال فوائد:

تھوڑا سا سکن ٹونر دونوں ہاتھوں پر مل کر چہرے پر لگائیں 5 سیکنڈ بعد بغیر صابن تازہ پانی سے اتنا مل کر دھوئیں کہ چکناہٹ باقی نہ رہے اور اب چہرہ خشک ہونے پر ہاتھ پھیر کر دیکھیں خود ہی پر پیار آ جائے گا اور آئینہ دیکھیں تو حیرانگی ہو گی کہ سیکنڈ میں ہی اتنا اثر اور اب یہ اثر کم از کم ایک مہینے تک رہے گا لہٰذا سکن ٹونر کا ایک بار کا استعمال ایک مہینے کیلئے کافی ہے پھر بھی زیادہ سے زیادہ ایک مہینے میں دوبارہ استعمال کر سکتے ہیں اسی طرح چہرہ، ہاتھ، پاؤں اور گردن پر بھی سکن ٹونر لگائیں اور 5 سیکنڈ بعد بغیر صابن تازہ پانی سے اتنا مل کر دھوئیں کہ چکناہٹ باقی نہ رہے تو ہاتھ، پاؤں بھی نرم ملائم گورے اور چمکدار ہو جائیں گے پھٹی ایڑیاں ٹھیک ہو جائے گی اور یہ اثر ایک ماہ تک رہے گا پھر سکن ٹونر ایک ماہ میں دوبارہ استعمال ہو سکتا ہے اور اگر پورے جسم کو نرم و ملائم اور چمکدار بنانا ہو تو پورے جسم پر سکن ٹونر لگا کر 5 سیکنڈ بعد بغیر صابن تازہ پانی سے اتنا مل کر دھوئیں کہ چکناہٹ باقی نہ رہے آپ حیران ہوں گے کہ اپنے ہی جسم پر ہاتھ پھیر کر یا دیکھ کر خود ہی پیار آ جائے گا کہ جسم نرم و ملائم گورا اور چمکدار ہو جائے گا دانے اور خارش ختم ہو گی سکن ٹونر پورے جسم پر ہر مہینے ضرور لگائیں حسب ضرورت مہینے میں دو بار بھی استعمال کر سکتے ہیں

تیار کردہ: اے۔ کے۔ کاسکو پانڈ، مینگورہ (سوات)

042-37666818
0300-9486848

نوٹ: سکن ٹونر حقوق (پیکنگ، ڈیزائن، بروشر، مونوگرام، کیلی گرافی، ٹریڈ مارک وغیرہ بحق رفیق شاکر محفوظ ہیں

سے منع کر دیا۔

زونی نے بھی اسے واپس رکھ دیا۔ خانساماں نے کیتلی سے دونوں کے کپ میں چائے انڈیلی اور وہ دونوں خاموشی سے چائے پینے لگے۔

''زونی! تمہیں کوئی مصروفیت نہ ہو... تو آج میرے ساتھ چلو... ہم شہر کی مارکیٹ چلتے ہیں۔'' انہوں نے بیٹی کو دیکھتے ہوئے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کیا لینا ہے پاپا؟'' زونی نے سوال کیا۔

''کچھ ضروری چیزیں ہیں... تم دس منٹ میں تیار ہو کر آجاؤ... میں باہر انتظار کر رہا ہوں۔'' وہ کرسی کھسکا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

زونی جب تک باہر آئی، وہ جیپ اسٹارٹ کر چکے تھے۔ زونی کے بیٹھتے ہی انہوں نے ایکسلریٹر دبایا اور جیپ تیز رفتاری سے آگے بڑھ گئی۔

آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے، کبھی کبھار ہلکی بوندا باندی ہو جاتی اور بجلیاں آسمان میں دور تک لہراتی نظر آرہی تھیں۔ تیز ہوا میں زونی کے بال اڑنے لگے تو اس نے دوپٹا سر پر لپیٹ لیا۔

''پاپا! یہ موسم بہت اچھا ہوتا تھا... پر آج اس میں اداسی کیوں ہے؟ لگتا ہے آسمان رونے والا ہے۔'' اس نے دور تک نظریں دوڑاتے ہوئے سوال کیا۔

''شاید اس کا تعلق ہمارے اندر کے موسم سے ہوتا ہے۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''آپ کیا لینے جا رہے ہیں؟'' اس نے پھر پوچھا۔

''کچھ مذہبی کتابیں... جن میں دعائیں ہوں... مرنے کے بعد کی زندگی کے بلند درجات کا ذکر ہو... دنیا کے فانی ہونے اور بالآخر ہر انسان کے فنا ہو جانے کا تذکرہ اچھے الفاظ میں بیان کیا گیا ہو۔'' انہوں نے اس طرح کہا کہ زونی حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔

''کیوں پاپا؟ یہ سب کس لیے؟'' اس کے سوال میں بھی حیرت نمایاں تھی۔

''اس قیدی نمبر 762 کو دیں گے پڑھنے کے لیے... بہادر سے بہادر آدمی بھی پھانسی کے تختے پر ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے اور میں سوچتا ہوں کہ وہ بہادر اور دلیر انسان اس مرحلے پر اپنا حوصلہ نہ کھو بیٹھے کہیں۔'' جابر صاحب نے عجیب سے لہجے میں کہا تو زونی نے باپ کو دیکھا، اسے پوری طرح یقین تھا کہ پھانسی کے تختے پر چڑھتے ہوئے اس دلیر قیدی کا حوصلہ ذرا بھی کم نہیں ہوگا لیکن اسے پھانسی دینے کے خیال سے اس کے باپ کا حوصلہ ضرور کمزور پڑ رہا ہے۔

''کیا بات ہے پاپا! اس سے پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی کو پھانسی دینے سے پہلے آپ اس قدر اداس اور رنجیدہ ہوں۔ پچھلے بیس اکیس سال سے آپ یہ کام بڑی خوشی خوشی کرتے آئے ہیں۔ بقول آپ کے دنیا سے گندگی کی ایک پوٹ باہر پھینک دیتے تھے آپ... پھر اب...؟'' زونی نے باپ کے تنے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اس لیے کہ وہ مجرم ہوتے تھے... برائی اور گندگی کی پوٹ... ایک ذہین، لائق اور خوش اطوار شخص... پھانسی پر چڑھائے جانے کے لیے نہیں ہوتا۔'' ان کے لہجے میں ایک عجب بے بسی آمیز جھنجلاہٹ تھی۔

زونی کچھ دیر گردن موڑے باپ کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات دیکھتی رہی... پھر آہستگی سے ان کے کاندھے کو چھوا اور بولی۔

''اصل بات کیا ہے پاپا؟ کون سی چیز ہے جو آپ کو اس طرح توڑ رہی ہے؟''

انہوں نے جیپ کی رفتار ہلکی کی اور اسے ویران سڑک کے کنارے روک دیا۔ مڑ کر بیٹی کی آنکھوں میں دیکھا۔

''وہ میرے محسن کا بیٹا ہے... اس کا بیٹا ہے جس نے تمہاری اور میری زندگی بچائی ہے... میرا بچپن کا دوست... نذیر علی ہاشمی... نذیرا۔'' انہوں نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں بتایا تو زونی بھی حیرت کی زیادتی سے گنگ ہو گئی۔

''نذیر چاچا کا بیٹا ہے یہ... پر ان کا بیٹا تو کہیں باہر پڑھنے گیا ہوا تھا۔'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، اس نے باہر سے ہی ڈاکٹر کی ڈگری لی ہے، بڑا ماہر سرجن ہے... باہر سے واپس آیا تو نہ جانے کیسے ان لوگوں کے ساتھ مل گیا جو حکومت کے خلاف لڑنے کے لیے اعلانِ جنگ کر چکے ہیں۔ شاید کافی زیادتیاں ہوئی ہیں اس کے ساتھ... یہ اس کا ردِعمل ہے۔'' انہوں نے بتایا۔

''چاچا نے سمجھایا نہیں... روکا نہیں اسے؟'' زونی نے پوچھا۔

''روکا تو ضرور ہوگا... لیکن وہ کس مزاج کا ہے یہ تو تم نے بھی اندازہ لگا لیا ہوگا... ہٹ کا پکا... جو ٹھان لی... سو ٹھان لی... پیچھے نہیں ہٹتا ہے... نذیر ابھی ایسا ہی تھا۔'' وہ اداس ہو کر اپنے دوست کو یاد کرنے لگے۔

''چاچا کو فون کرنا تھا... کہ بیٹے کو بچانے کی کوشش کریں۔'' زونی نے بے چینی سے کہا۔

''تین سال پہلے اس کا انتقال ہو چکا ہے، میں نے



معلوم کیا تھا۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''پاپا! میں پانچ سال تک چاچا کے پاس رہی ہوں... بہت ہلکی ہلکی یادیں ہیں ان کی میرے ذہن میں... بس یہ پتا ہے کہ بہت محبت کرنے والے آدمی تھے وہ۔''

''تیری تو زندگی ہی اس کی مرہونِ منت ہے... تو دو ماہ کی تھی جب چودھری نے تیری ماں کو مار دیا تھا اور میں اس کے غم میں حواس باختہ ہو کر جنگلوں میں نکل گیا تھا۔ انتقام کی آگ نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ مجھے کچھ ہوش نہیں تھا۔ ایسے میں دو ماہ کی بچی بغیر ماں باپ کے کس طرح زندہ رہ سکتی تھی۔ یہ وہی تھا جس نے اس دو ماہ کی بچی کو اٹھا کر سینے سے لگایا۔ پیار سے پالا پوسا اور جب میں اپنے حواسوں میں واپس آیا اور پولیس میں میری نوکری بحال ہوئی تو تجھے میری امانت کی طرح لوٹا گیا۔ بغیر کسی احسان کے... بغیر کسی صلے کے... تم ذرا سوچو... آج مجھ پر کتنا بُرا وقت آیا ہے کہ میں اپنے اس محسن کے اکلوتے فرزند کو... موت کے حوالے کرنے جا رہا ہوں۔ اس سے بڑی بدبختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ جس نے مجھے بیوی اور بیٹی کی شکل میں زندگی دی، آج اسی کے بیٹے کو میں...'' وہ خاموش ہو گئے۔ شاید حلق میں آنسوؤں نے پھندا ڈال دیا تھا۔

زونی کا دل بھی جیسے کسی نے مٹھی میں پکڑ کر بھینچ لیا۔ اس نے باپ کے کاندھے پر سر رکھ کر بے آواز آنسو بہانا شروع کر دیے۔ آسمان سے چھوٹی چھوٹی بوندوں کی ایک بوچھار سی آئی تو انہیں لگا کہ آسمان بھی ان کے غم میں آنسو بہا رہا ہے۔

دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتے رہے۔

''پاپا! آپ نے اس کے گھر والوں کو تو اطلاع کروا دی ہے نا... کوئی ملنے نہیں آیا اس سے؟'' زونی نے سنبھلتے ہوئے پوچھا۔

''گھر والوں میں سوائے اس کی بیوی کے... اور کوئی ہے ہی نہیں... وہ آئی تھی... یہ بھی نذیرے کا ایک اور احسان ہے۔ جانتی ہو، اس کی بیوی کون ہے؟'' انہوں نے پوچھا تو زونی نے نفی میں سر ہلایا۔

''وہ بھی ثریا کی بیٹی ہے... تمہاری بہن... چودھری کے لالچ کے باعث اس کے سسرال والوں نے بچی کو چھین کر ثریا کو گھر سے نکال دیا تھا۔ پھر میری شادی ہوئی ثریا سے... تو وہ اپنی بیٹی کرن کو یاد کر کر کے بہت رویا کرتی تھی۔ مجھ سے وعدے لیتی کہ میں اسے اس کی کرن سے ضرور ملواؤں گا۔ میری بھی یہی نیت تھی لیکن قدرت کو منظور نہیں تھا۔ ثریا کا ہی آخری وقت آگیا۔ میں اپنا وعدہ پورا نہیں کر پایا لیکن نذیرے نے نہ جانے کہاں سے اسے ڈھونڈ لیا اور اپنے بیٹے سے شادی کر کے اپنے گھر لے آیا۔'' جابر صاحب نے حیرت انگیز تفصیل بیان کی۔

''کیا...؟ میری بہن؟ میری کوئی بہن بھی ہے؟ اور وہ اس قیدی کی بیوی ہے؟'' زونی کی حیرت اپنے عروج پر تھی۔

جابر صاحب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے حلق میں پڑے آنسوؤں کے پھندے کو نگل کر نیچے اتارنے کی کوشش کی۔

تھوڑی دیر دونوں باپ بیٹی حالات کی ستم ظریفی پر جلتے کڑھتے رہے پھر زونی نے ہی سنبھالا لیا۔

''پاپا! کیا کوئی ایسا طریقہ نہیں ہو سکتا کہ ہم اسے جیل سے فرار کروا دیں۔ کم از کم زندگی تو بچ جائے گی اس کی۔''

''ہاں... میں نے سوچا تھا اور اسے یہ بتایا بھی تھا کہ میں اسے پہلے اسپتال پہنچا دیتا ہوں کسی بہانے سے... وہاں سے اس کے فرار ہونے کا بھی انتظام ہو جائے گا... اگر وہ تیار ہو تو میں بندوبست کروا دیتا ہوں۔''

''پھر... اس نے کیا کہا؟'' زونی نے بے چینی سے پوچھا۔

''وہ ہنس پڑا... کہنے لگا مجھے کوئی سکہ بند ڈاکو سمجھا ہے کیا آپ نے... یہاں سے نکلوں گا اور اپنے گروہ سے جا ملوں گا... پھر سے ڈاکے ڈالوں گا... اور آپ کا حصہ آپ کو پہنچاتا رہوں گا... میں نے اسے برا بھلا کہا، تو کہنے لگا۔ برا ماننے کی کیا بات ہے... آج کل کیا، ہمیشہ سے یہی ہوتا آرہا ہے... ڈاکو، پولیس اور جاگیردار... ایک مضبوط اتحاد ہے جو عام اور معصوم آدمی کے خون پر پل رہا ہے۔'' جابر نے کہا تو اس کے لہجے میں دکھ تھا۔

''تو پاپا! کیا یہ حقیقت ہے؟ کیا ایسا ہوتا ہے؟'' زونی نے پوچھا۔

''بدقسمتی سے... ہاں... ایسا ہی ہوتا آیا ہے اور ہو رہا ہے۔'' انہوں نے کہا اور جھنجلا کر گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کی۔ ایکسلریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھایا اور گاڑی زناٹے سے آگے بڑھتی ہوئی سڑک پر آگئی۔ بارش کے پانی سے بھرے گڑھوں سے پانی اور کیچڑ اچھالتی... وہ تیز رفتاری سے آگے بڑھتی چلی گئی۔

☆☆☆

وہ پھر آئی تھی۔ اسے آخری ملاقات کے لیے بلایا گیا تھا۔ کل اس کے شوہر کو پھانسی پر لٹکایا جانا تھا۔ تیز بارش نے

ارے راستوں کو پانی سے بھر دیا تھا۔ وہ نہ جانے کن مشکلوں سے گزر کر یہاں تک آئی تھی۔

جب وہ ملاقات کے لیے جیل سپرنٹنڈنٹ کے آفس میں داخل ہوئی تو اس کا لباس پوری طرح پانی سے بھیگا ہوا تھا۔ بھیگے بالوں کی لٹیں پیشانی اور گالوں سے چپکی ہوئی تھیں۔ چہرہ سفید و نزار محسوس ہو رہا تھا لیکن آنکھوں میں یقین و اعتماد کی چمک اور پختہ عزم اور استقامت کی جھلک محسوس ہو رہی تھی۔

آج اسے خلافِ معمول بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کی گئی۔ تھوڑی دیر بعد قیدی نمبر 762 بھی آ گیا۔ اس کے لیے بھی ایک کرسی رکھ دی گئی۔ یہ ان کی آخری ملاقات تھی۔ سپرنٹنڈنٹ اور سینئر جیلر... دونوں باہر آ گئے تاکہ وہ دونوں اطمینان سے بات کر سکیں۔

زونی کو اطلاع ملی تو اس سے رہا نہیں گیا۔ اس نے اپنی نازک سی چھتری اٹھائی اور بارش میں تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی جیل کے مین گیٹ تک پہنچ گئی۔ حوالدار نے گیٹ کھول دیا۔ اندر داخل ہو کر اس نے چھتری بند کر کے حوالدار کو تھمائی اور خود آگے بڑھ گئی۔

''تم کیسی بیوی ہو... کہ اپنے شوہر کی جان بچانے کی کوئی کوشش نہیں کی تم نے؟'' اس نے اندر داخل ہوتے ہی سوال کیا۔

تو قیدی نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ پھر اپنی بیوی کی طرف دیکھا تو وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''یہ اس جیل کے سپرنٹنڈنٹ کی بیٹی زونیرہ ہیں۔ ان کا اور ان کے والد کا خیال ہے کہ مجھے پھانسی کی سزا نہیں بھگتنی چاہیے کیونکہ میں اس کا مستحق نہیں۔''

اس لڑکی نے بھرپور نظروں سے زونی کو دیکھا۔ قیمتی لباس، مناسب میک اَپ سے سجا گل و گلزار چہرہ اور غیر ملکی پرفیوم کی خوشبو سے معطر، وہ زندگی کی تمام آسائشوں سے بہرہ ور نظر آتی تھی۔

''اب ان سب باتوں کا کیا فائدہ... کل ان کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا اور ان کا نام ہمیشہ کے لیے زندہ ہو جائے گا۔'' لڑکی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''نام زندہ رکھنے سے زیادہ ضروری یہ نہیں... کہ آدمی خود زندہ رہے... جتنی زندگی قدرت نے اسے دی ہے اسے بھرپور طریقے سے گزارے جن لوگوں کو اس کی ضرورت ہے ان کا سہارا بنے۔'' زونی نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''ہر ایک کے سوچنے... اور عمل کرنے کا انداز الگ الگ ہوتا ہے۔ ہم اور تم الگ الگ دنیاؤں کے لوگ ہیں۔ تم آرام و آسائش اور دھنک رنگ زندگی کی عادی ہو... صرف اپنے بارے میں سوچتی ہو... ہم کانٹوں بھرے راستوں کے مسافر... اور پستی کے گڑھوں میں گھرے لوگوں کی بھلائی کے لیے کچھ نہ کچھ کرنے والے لوگ ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ یہ ایک پولیس والے کے قتل کے الزام میں پھانسی پر چڑھائے جا رہے ہیں... نہیں... ان کا جرم یہ ہے کہ یہ ظلم و ستم کے مارے لوگوں میں یہ احساس بیدار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ جن لوگوں نے تمہاری عزتِ نفس چھینی ہے... تمہارے وسائل پر غاصبانہ قبضہ کیا ہوا ہے، تمہیں انسانوں کے بجائے کیڑے مکوڑوں کی طرح پستیوں اور اندھیروں میں رینگنے پر مجبور کر دیا ہے... اٹھو... اور ان کے خونی جبڑوں سے اپنے حقوق چھین لو۔'' اس نے جذب کے عالم میں بات ختم کی۔

''ارے بابا! تو اس کے لیے مرنے کی کیا ضرورت ہے، زندہ رہ کر بھی اس پیغام کو پھیلایا جا سکتا ہے۔'' زونی نے کچھ جھنجلا کر کہا۔

اس کا انداز دیکھ کر دونوں مسکرا دیے۔

''شاید تمہیں... میرے شوہر سے محبت ہو گئی ہے...ہے نا؟'' لڑکی کے منہ سے یہ بات سن کر زونی ٹھٹک گئی۔ کچھ لمحے اسے اپنے آپ کو سنبھالنے میں لگے اور کچھ جواب دینے کی ہمت کرنے میں لڑکی کی سوالیہ انگلی اس کی طرف اٹھی ہوئی تھی اور ''ہے نا'' کا سوال آنکھوں میں۔

''ہاں... مجھے تمہارے شوہر سے محبت ہو گئی ہے اور اسی لیے میں چاہتی تھی کہ یہ زندہ رہے۔'' آخر کار اس نے بے دھڑک اس کی محبت کا اقرار کر لیا۔

''اگر تمہاری محبت اس قدر طاقتور ہوتی... تو وہ ضرور ان کے ارادوں کو بدل دیتی لیکن شاید...؟'' وہ ہلکے سے مسکرائی۔

''محبت تو میری طاقتور ہے لیکن دو چار دنوں کی دو تین ملاقاتوں کا وقت بہت مختصر تھا... ان کے دل تک کا راستہ طے کرنے کے لیے... اگر کچھ اور مہلت ملتی... تو شاید ان کے ارادوں پر اثر انداز ہو پاتی۔'' زونی نے صاف الفاظ میں کہا۔

''شاید... پر اب تو بالکل مہلت نہیں ہے... تم کچھ نہیں کر سکتیں۔'' لڑکی نے سنجیدگی سے کہا اور اپنا رخ قیدی کی طرف موڑ لیا۔

''لیکن تمہاری محبت تو بہت طاقتور ہے نا... ان کی دھڑکنوں میں دھڑکنے والی... تم انہیں زندگی کی طرف کیوں نہیں لے آتیں؟'' زونی کے سوال نے دونوں کو چونکا دیا۔

''وہی بات ہے کہ اب مہلت باقی نہیں۔'' لڑکی نے



جواب دیا۔

''ہے... مہلت باقی ہے... ابھی پوری ایک رات اور پورا ایک دن باقی ہے... میں پاپا سے کہہ کر انتظام کروا دوں گی... پہلے انہیں یونہی بیمار ظاہر کر کے اسپتال پہنچائیں گے اور وہاں سے فرار کروا دیں گے... تم انہیں لے کر کہیں دور چلی جانا... چھپ جانا تم دونوں کم از کم زندہ تو رہو گے۔'' زونی نے پُرجوش لہجے میں کہا تو قیدی ہنس پڑا۔

''دیکھا کرن! ابھی بھی موقع ہے... اگر کہو تو میں اس کے پاپا کے ہاتھ پاؤں جوڑ کر جان بخشی کروا لوں؟''

''نہیں... کبھی نہیں... تمہیں اگر یہ ظالم سو دفعہ پھانسی چڑھائیں... پھر بھی ان کے سامنے جھکنا نہیں... مر جانا... لیکن ان سے زندگی کی بھیک مت مانگنا... ورنہ میں... اور تحریک کے بے شمار شہیدوں کی روحیں... کبھی تمہیں معاف نہیں کریں گے... تمہارا اس طرح چوروں کی طرح بھاگ جانا... ہماری تحریک کو... اس کے کاز کو شرمندہ کر دے گا... کبھی نہیں۔'' لڑکی نے کڑے لہجے میں حتمی جواب دیا تو ایک لمحے کو زونی نے اپنے آپ کو کچھ شرمندہ سا محسوس کیا۔

قیدی نے مسکرا کر زونی کو دیکھا۔

''کیا اب بھی تم کہو گی... کہ میں جیل سے فرار ہونے پر تیار ہو جاؤں... اس کی یہ طاقتور محبت ہی ہے جس نے اس جدوجہد میں... میرے قدم مضبوطی سے جمائے رکھے۔''

''اس کی محبت نے تمہیں موت کے راستے پر پہنچا دیا... خود اس کے لیے تو کوئی مشکل نہیں نا۔'' زونی ہار ماننے پر تیار نہیں تھی۔

''تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں... اس لیے ایسا کہہ رہی ہو... میری محبت نے اس کے دل میں ہماری تحریک سے محبت پیدا کی... بہت کام کیا اس نے... پھر جب بُرا وقت آیا... تو اس نے بھی بہت کچھ جھیلا ہے۔''

جواب ملا..... ''اور اپنی محبت میں... یہ تمہیں موت کے راستے پر دھکیل رہی ہے۔'' زونی نے طنز آمیز لہجے میں کہا تو ان دونوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''ہاں، یہ تمہیں موت کے اندھیروں میں اترنے کو کہہ رہی ہے... میں تمہیں زندگی کے اجالوں کی طرف بلا رہی ہوں۔''

''نہیں... یہ مجھے ہمیشہ کی زندگی کی طرف جانے کو کہہ رہی ہے۔'' قیدی نے ہاتھ اٹھا کر بات کی تو زونی کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اور وہ آنسو پیتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

شام ہو رہی تھی... کام سے واپسی کے بعد قیدیوں کی لائنیں لگی ہوئی تھیں... ان کی گنتی ہو رہی تھی۔ نمبر پکارے جا رہے تھے... سب قیدیوں کو معلوم تھا کہ آج قیدی نمبر 762 کی پھانسی ہے... ہر طرف سوگ کا ماحول تھا... سب قیدی خاموش اور افسردہ تھے۔

حتیٰ کہ آج بڑے صاب بھی آفس سے نکلے تو خاموشی سے جیل کے معائنے میں لگ گئے... نہ انہوں نے کسی قیدی کو رول سے پیٹا، نہ حلق پھاڑ کر گالیاں بکیں... نہ راستے پر پڑی کسی کرسی، اسٹول یا بینچ کو لات ماری... چپ چاپ وہ سارا جائزہ لیتے ہوئے پھانسی گھاٹ کی طرف مڑ گئے... پھانسی کے انتظامات کا جائزہ جو لینا تھا... کہیں کوئی سقم نہ رہ جائے... پھانسی گھاٹ کے جیلر نے صاب کو سیلوٹ مارا اور ان کے ساتھ ساتھ پھانسی کے تختے تک گیا۔

''جمعدار! سب انتظام ہو گئے... سب کچھ ٹھیک ہے؟'' انہوں نے سیاہ فام بھاری بھرکم جمعدار کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''یس سر! چیک کر لیجیے۔'' اس نے اٹینشن ہو کر جواب دیا۔

آٹھ فٹ اونچے اسٹینڈ پر موٹے رسّے کا پھندا لٹکا ہوا تھا... مکھن اور تیل پی کر وہ رسّا بھی چمکتا ہو رہا تھا۔ انہوں نے اسے مٹھی میں لے کر دبانے کی کوشش کی تو وہ پھسل رہا تھا۔ تختے کے پاس ریت سے بھری دو بوریاں رکھی تھیں۔ انہوں نے ایک کو اٹھا کر اس کے وزن کا اندازہ کیا اور مطمئن ہو کر واپس رکھ دیا... پھر جا کر لیور کو دیکھا۔ اس کی بھی اچھی طرح گریسنگ ہوئی تھی۔ تیل اور گریس نے اس کے اوپر کو بھی چمکا دیا تھا۔ انہوں نے لیور کو چھو کر دیکھا... پھر ایک جھٹکے سے اپنی طرف کھینچ لیا... کھڑاک کی آواز آئی۔ لیور پیچھے ہٹا... تختے کا لاک کھلا اور وہ اندر کی طرف گر کر جھولنے لگا... اس کے دونوں پٹ اندر گر کر جھول رہے تھے۔

چرخ چوں... چرخ چوں... چرخ چوں...

''اس کے قبضوں میں تیل اور ڈالو... اور تیاری کرو۔'' انہوں نے بھاری آواز میں کہا اور کھٹ کھٹ کرتے باہر نکل گئے۔

آسمان پر دبیز بادلوں کی تہ نے وقت سے پہلے ہی رات کر دی تھی۔ انہوں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے آفس کی دیواروں کو دیکھا تو سادہ دیواریں انہیں زندگی کے بے رنگ ورق کی طرح محسوس ہوئیں... بارش کے سبب ان پر چھا

جانے والی نمی آنسوؤں کی طرح بہہ رہی تھی اور ان پر پھیلی ہوئی زرد بیمار سی روشنی... ان کے دل میں اداسیوں کا بوجھ بڑھاتی جارہی تھی۔

کھڑکی سے باہر جھڑجھڑ برستی بارش کا تیز شور ہر آواز کو پی گیا تھا۔ آسمان پر رہ رہ کر کوندنے والی بجلیاں تیز کڑاکوں کے ساتھ نیزے اور تلواروں کی طرح لہرا رہی تھیں...

یہ شور آمیز سکوت ٹیلی فون کی گھنٹی کی پُرشور آواز سے کانچ کی طرح ترخ کر ٹوٹا اور بکھر گیا۔

'کاش! یہ فون ہوم ڈپارٹمنٹ سے ہو... اور کہا جائے کہ آج صبح ہونے والی پھانسی ملتوی ہوگئی ہے۔ اس پر عمل درآمد روک دیا جائے۔' وہ دل ہی دل میں سوچ رہے تھے اور ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی... آخرکار انہوں نے ہاتھ بڑھا کر فون اٹھالیا۔

''سر! وہ پھانسی والا قیدی مر چکا ہے۔'' پھانسی گھاٹ کے جیلر نے فون پر اطلاع دی۔

''کون؟ قیدی نمبر 762؟'' انہوں نے بوکھلا کر پوچھا۔

''نو سر! اس کے برابر والی کوٹھری کا وہ پاگل قیدی ... وہ دوپہر میں کھانا کھا کر لیٹ گیا تھا... ہم سمجھے سو رہا ہے... پر رات ہوگئی وہ اٹھا نہیں... تو کچھ شک سا ہوا... اندر جا کر اسے ہلا جلا کر دیکھا... تو وہ مر چکا تھا۔'' جیلر نے تفصیل بتائی۔

''اوہ... آر ایم او کو بلا کر دکھاؤ... وہ موت کی تصدیق کردے تو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجواؤ۔'' انہوں نے حکم دیا۔

''سر! آر ایم او تو شام کو ہی چھٹی لے کر چلا گیا تھا۔ اس کے گھر سے اطلاع آئی تھی... اس کی بیوی کافی بیمار ہے۔''

''مجھے معلوم تھا... یہ کمینہ ہر پھانسی پر اسی طرح بہانہ کر کے غائب ہوجاتا ہے۔'' وہ غصے میں بڑبڑائے۔

''سر! شاید وہ پھانسی سے ڈرتا ہے۔''

''پھانسی سے ڈرتا ہے... تو جیل کا ڈاکٹر بنا ہی کیوں؟'' وہ چلائے۔

''خیر... لاش اسپتال میں رکھوا دو۔ صبح پھانسی سے پہلے سول سرجن آئے گا... موت کی تصدیق کرنے... اسی کو دکھا دینا۔''

''سر! بارش بہت زیادہ ہے... سیلاب کا خطرہ ہے... آس پاس کا کافی علاقہ سیلابی ریلے کی زد میں آچکا ہے... پتا نہیں وہ آبھی پائے گا کہ نہیں۔'' جیلر نے اندیشہ ظاہر کیا۔

''کیوں نہیں آئے گا... صرف سول سرجن ہی نہیں... علاقہ مجسٹریٹ اور کسی مولوی کو بھی لانا ہوگا... ان لوگوں کا پھانسی کے وقت موجود ہونا بہت ضروری ہے۔'' انہوں نے الجھتے ہوئے کہا۔

''جی سر! ضروری تو ہے... پر آئیں گے کیسے... تمام راستے پانی میں ڈوب چکے ہیں۔'' جیلر نے حقیقی صورتِ حال بتائی تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔

''ایسا کرتے ہیں... جیپ بھجوا دیتے ہیں... کسی حوالدار کو ساتھ بھیج دینا... وہ سب کو لے آئے گا۔''

''کوشش کروں گا سر! ویسے نہ جانے کیوں... مشکل ہی لگ رہا ہے۔'' سلسلہ منقطع ہوا تو انہوں نے بھی فون رکھ دیا۔

بارش طوفانی رفتار سے جاری تھی۔ بجلی کب کی جا چکی تھی۔ اندھیری بیرکوں میں کہیں کہیں لالٹینیں جلا کر رکھ دی گئی تھیں... وارڈوں میں حوالدار مدھم پیلی روشنی والی لالٹین ہاتھ میں تھامے... قیدیوں کی دوبارہ گنتی کررہے تھے... اور ہر طرف سے آوازیں آرہی تھیں۔ ''سب ٹھیک ہے... سب ٹھیک ہے...''

آج کی رات ہر وارڈ پر پہرا بڑھا دیا گیا تھا۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ بے شک صبح پھانسی پانے والا اپنے سیاسی نظریات کے سبب سزا پانے والا تھا۔ تاہم ایسا کوئی اندیشہ نہ تھا کہ اس کے لیے جیل میں بغاوت ہوجاتی... لیکن پھر بھی مروجہ طریقہ کار کے مطابق یہ سب کیا جارہا تھا۔

سینئر جیلر نے پھانسی پانے والے قیدی کے تمام پیپرز اور رجسٹر لاکر ان کے سامنے رکھ دیے۔ انہوں نے ایک نظر ان پر ڈالی۔

''سب ٹھیک ہے۔'' انہوں نے واپس دے دیے۔

''مجسٹریٹ کو فون کرو۔ اس سے سول سرجن اور کسی مولوی کا بندوبست کرنے کا کہو... اسے بتا دو کہ جیپ ہم بھیج دیں گے۔ وہ تیار رہیں۔''

''او کے سر!'' سینئر جیلر نے فون اٹھا کر کان سے لگایا۔ ایک دوبار اس کے کریڈل پر ہاتھ مارا اور فون واپس رکھ دیا۔

''ٹیلی فون ڈیڈ ہوگیا ہے سر!'' اس نے اطلاع دی۔

''وہاٹ...؟ اب کیا ہوگا؟'' وہ پریشان ہوگئے۔

پھانسی قانون کے مطابق اپنے وقت پر دینا ضروری تھا۔ نہ ایک منٹ ادھر... نہ ادھر... پر ضروری کارروائیوں کے بغیر... یہ کیسے ممکن ہوگا؟



''اچھی طرح چیک کرو فون۔'' انہوں نے حکم دیا تو جیلر نے دوبارہ ریسیور اٹھا کر کانوں سے لگایا۔ کریڈل کو دو تین مرتبہ دبایا... لیکن مایوسی سے سر ہلا کر رکھ دیا۔

''او مائی گاڈ! اب تک ایک سو آٹھ بدمعاشوں کو پھانسی پر چڑھا چکا ہوں... کبھی ایسی پریشانی نہیں ہوئی... جتنی اب ہورہی ہے۔'' انہوں نے جھنجلا کر کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ عجیب سی گھبراہٹ ہورہی تھی۔ وہ باہر نکل آئے۔

باہر نکلے تو سامنے سے اپنا اردلی آتا نظر آیا۔ اس نے برساتی اوڑھ رکھی تھی اور وہ عجلت میں قدم بڑھاتا ان کے نزدیک آرہا تھا۔ قریب آکر اس نے سلام کیا۔

''صاب! بی بی صاب کی طبیعت بہت خراب ہے... ہم نے اسپتال فون کر کے ڈاکٹر کو بلانے کی کوشش کی... پر فون بند پڑا ہے... پھر میں خود ادھر گیا... تو پتا چلا ڈاکٹر چھٹی پر گیا ہوا ہے۔ میں نرس کو لے کر ادھر بی بی صاب کے پاس چھوڑ کر آپ کے پاس آیا ہوں... جلدی چلیں صاب!'' اردلی نے ہانپتے کانپتے اپنی بات مکمل کی۔ وہ طوفانی بارش میں بنگلے سے یہاں تک آتے آتے ہانپ گیا تھا۔

''کیا ہوا ہے اسے؟'' انہوں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''پتا نہیں صاب! کہیں بہت زیادہ درد ہے... وہ چلا رہی ہیں۔''

''او مائی گاڈ!... چلو۔''

صاب نے تیزی سے قدم بڑھائے تو اردلی نے رین کوٹ انہیں پہنا دیا۔ مین گیٹ سے باہر قدم رکھتے ہی طوفانی بارش کے پہلے تھپیڑے نے ہی انہیں وقت کی نزاکت کا احساس دلا دیا۔ حالات بہت سنگین ہوتے جارہے تھے۔ تارکول کی سڑک پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اردلی کی ٹارچ کی روشنی میں وہ گھٹنے گھٹنے پانی میں ممکنہ حد تک تیز چلنے کی کوشش کر رہے تھے۔

برآمدے میں لالٹین کی پیلی روشنی میں نرس مضطربانہ انداز میں ان کے وہاں پہنچنے کا انتظار کررہی تھی۔

''کیا ہوا زونی کو؟'' انہوں نے برآمدے میں قدم رکھتے ہی نرس سے سوال کیا۔

''سر! اپینڈکس... بہت خطرناک صورتِ حال ہے... فوری آپریشن کرنا ضروری ہے۔ ورنہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔''

نرس نے ایک ہی سانس میں سب کچھ بتا دیا۔ اس کی بدحواسی سے انہیں نازک صورتِ حال کا بہ خوبی اندازہ ہو گیا۔

''اے... جلدی جاؤ... اسپتال کی ایمبولینس لے کر آؤ... ابھی اسے شہر کے بڑے اسپتال لے چلتے ہیں۔ جاؤ... جلدی کرو۔'' انہوں نے اردلی کو آرڈر دیا... لیکن نرس جلدی سے بولی۔

''کوئی فائدہ نہیں سر! ایمبولینس آدھی سے زیادہ پانی میں ڈوبی ہوئی ہے... میں نے یہاں آنے سے پہلے ڈرائیور سے کہا تھا کہ ایمبولینس نکالے۔ پر لاکھ کوششوں کے باوجود وہ اسٹارٹ ہوئی... اور نہ ہی اس کے جانے کا کوئی راستہ ہے۔'' نرس نے بتایا۔

''ٹھیک ہے... ہم اسے جیپ میں لے چلتے ہیں۔'' انہوں نے فوری متبادل بتایا۔

''سر! آپ کو شاید اندازہ نہیں ہے... سیلاب آچکا ہے۔ ہر جگہ پانی ہی پانی ہے... کیسے؟'' نرس کے الفاظ ابھی منہ میں ہی تھے کہ زونی کی ول دوز چیخ ان کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ تیزی سے اس کے کمرے کی طرف بھاگے... وہ بستر پر بُری طرح بل کھا رہی تھی۔ لالٹین کی پیلی روشنی میں بھی اس کا چہرہ سپید پڑا ہوا نظر آرہا تھا... پیشانی سے پسینے کی دھاریں بہہ رہی تھیں... اور اس کے منہ سے کراہیں نکل رہی تھیں... جو درد کی شدت بڑھنے پر چیخوں میں تبدیل ہوجاتی تھیں۔ اس کا چہرہ پھولا ہوا لگ رہا تھا۔

''زونی... زونی... میری بچی!'' وہ اس کا ہاتھ پکڑے اضطرابی کیفیت میں اسے آوازیں دیے جارہے تھے۔

''پاپا! آئی ایم ڈائنگ... میں... میں مر رہی ہوں پاپا۔'' زونی کے منہ سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔ اس کی ادھ کھلی آنکھوں سے اس کی کیفیت کا اندازہ ہورہا تھا۔

''نہیں... میری بچی... میں کچھ کرتا ہوں... حوصلہ رکھو... میں کچھ کرتا ہوں۔'' وہ بُری طرح گھبرائے ہوئے تھے۔ مضطربانہ انداز میں پلٹے... چیخ کر حوالدار کو آواز دی۔

''حوالدار! کیسے بھی گاڑی کا بندوبست کرو... نہیں تو کسی بھی طرح شہر سے ڈاکٹر کو لے کر آؤ... جاؤ۔'' وہ دہاڑے تو حوالدار اور اردلی ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ باہر قیامت کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ گہرے اندھیرے میں پانی کا شور دل دہلا رہا تھا۔ رہ رہ کر آسمان پر کوندنے والی بجلیوں کی وجہ سے دکھائی بھی دے

جاتا تھا کہ ہر طرف صرف پانی ہی پانی ہے۔ جیل کی عمارت تھوڑی بلندی پر واقع ہونے کے سبب نسبتاً بہتر حالت میں تھی... لیکن یہاں بھی بنگلے سے مین گیٹ تک جانے والی پکی سڑک اور اس کے آس پاس کا علاقہ دریا کا منظر پیش کر رہا تھا... ایسے میں کوئی کیسے شہر تک جا کر ڈاکٹر کو لے کر آسکتا تھا؟

''سر! ہر طرف پانی ہی پانی ہے۔ آدمی تو کیا بڑی گاڑی کا جانا بھی ممکن نہیں ہے۔ وہ بھی پانی میں ڈوب جائے گی۔''

حوالدار نے ڈرتے ڈرتے 'صاب' کو بتانے کی کوشش کی تو انہوں نے اپنی ہی ہتھیلی پر غصے میں زور سے ہاتھ مارا اور چلّائے۔

''ڈیم اٹ... اب میں کیا کروں؟''

پھر زونی کی چیخ سنائی دی تو وہ بوکھلا کر اندر بھاگے... نرس بھی پریشان تھی اور بے حال زونی کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''کیا تم کچھ نہیں کرسکتی ہو اس کے لیے؟'' انہوں نے نرس سے پوچھا۔

''سر! میں نے اسے پین کلر انجکشن دیا ہے... لیکن آپ جانتے ہیں کہ آپریشن کے سوا چارہ نہیں... اور وہ بھی بہت جلد... ورنہ اگر اپینڈکس پھٹ گیا تو بے بی کی زندگی خطرے میں پڑسکتی ہے۔'' نرس نے اصل صورتِ حال بتائی تو وہ بے انتہا پریشان ہوگئے۔

''میں کیا کروں... میں کیا کروں؟'' وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بڑبڑائے۔

''پاپا!... پاپا! وہ قیدی... وہ... سرجن ہے... وہ آپریشن کرسکتا ہے...'' زونی نے کراہتے ہوئے انہیں یاد دلایا تو وہ چونک گئے۔

''یس... یس... ہی کین ڈو۔'' وہ باہر کی طرف لپکے۔

سینئر جیلر ان کی بات سن کر حیران رہ گیا۔

''سر! پھانسی کے قیدی کو تو... جیل کے اندر بھی گیٹ تک نہیں لایا جا سکتا... باہر نکالنے کا تو قانون ہی نہیں ہے... اور پھر اسے تو چار گھنٹے بعد پھانسی ہونے والی ہے۔ اسے بھلا جیل سے باہر کیونکر لایا جاسکتا ہے... ناممکن ہے سر! اگر کچھ ہوا تو ہم اوپر کیا جواب دیں گے؟'' سینئر جیلر نے بوکھلا کر اپنی بات کہی اور سپرنٹنڈنٹ صاحب سوچ میں پڑ گئے۔

زونی کی کراہ نے پھر اس جمود کو توڑا... وہ فیصلہ کرنے نہ کرنے کی شش و پنج میں تھے کہ نرس نے کچھ غصے سے کہا۔

''سر! جو بھی کرنا ہے... جلد کریں... زیادہ وقت نہیں ہے... اگر کچھ ہوگیا... تو مجھے الزام مت دیجیے گا... کہ میں نے آپ کو حقیقتِ حال سے آگاہ نہیں کیا تھا۔''

''اوکے... تم اسپتال سے آلات منگواؤ... دوائیاں بھی ہوں گی؟'' انہوں نے نرس سے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے... میں سرجن کو بلواتا ہوں۔'' انہوں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور سینئر جیلر کی طرف دیکھا۔ 'صاب' کا حکم تھا۔ ٹالا نہیں جاسکتا تھا۔ سینئر جیلر نے حالات کا اندازہ کر کے سنتری کو اشارہ کیا۔ اس نے سر ہلایا اور پلاسٹک کی بڑی سی شیٹ اپنے اوپر ڈال کر برآمدے کی سیڑھیوں سے پانی میں اتر گیا۔ موسلا دھار بارش کی تیز دھاروں سے بچنے کی ناکام کوشش کرتا ہوا وہ گھٹنوں گھٹنوں پانی سے گزر کر حتی الامکان تیزی سے جیل تک پہنچ گیا۔

گارڈز نے دوڑ کر پھانسی گھاٹ کے جیلر کو خبر کی اور سینئر جیلر کا پیغام دیا۔

''سر آرہے ہیں... قیدی کو لینے... بی بی صاحبہ کی طبیعت بہت خراب ہے... آر ایم او چھٹی پر گیا ہوا ہے اور سول سرجن صبح پھانسی کے وقت آئے گا۔ اس لیے مجبوراً قیدی کو نکالنا پڑے گا کیونکہ اس وقت اس پورے علاقے میں وہی ایک ڈاکٹر ہے جو بی بی کی جان بچا سکتا ہے... اسے اطلاع کردو۔'' اس نے ایک سانس میں پورا پیغام دے دیا۔

اسی اثنا میں سینئر جیلر 'صاب' کے بنگلے سے وہاں پہنچ گیا تھا۔ پھانسی گھاٹ کا دروازہ کھڑکھڑایا... سینئر جیلر اندر داخل ہوا۔ سامنے اوپر چبوترے پر پھانسی کا پھندا تیار تھا اور پیچھے لگی ہوئی بڑی سی گھڑی کی چمک دار سوئیاں ٹک ٹک کرتی تیزی سے آگے کی جانب رواں تھیں... وہ چلتا ہوا قیدی نمبر 762 کی کوٹھری میں آکر رک گیا اور اسے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ صبح چھ بجے جسے پھانسی ہونے والی ہے، وہ بڑے اطمینان سے کتابوں پر سر رکھ کر سو رہا ہے۔

جیلر شش و پنج میں تھا کہ چند گھنٹوں بعد جس کی زندگی کا اختتام ہونے والا ہے... اس سے کیسے کہے کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب کی بیٹی کی زندگی بچالے۔ اس نے اپنا رول سلاخوں پر پھیرا۔

کڑ... کڑ... کڑ کی آواز سے اس کی نیند اچٹ گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کوٹھری کے دروازے پر سینئر جیلر کو دیکھ کر

اس سے پوچھا۔

''کیا چلنے کا وقت ہو گیا؟''

''نہیں۔'' سینئر جیلر نے کچھ بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''تو پھر تم نے مجھے گہری نیند سے کیوں اٹھایا... یہ سونے کا وقت ہوتا ہے۔'' اس نے کچھ جھنجلا کر کہا تو جیلر اور بھی حیران ہوا۔ پھر کچھ پس وپیش کے عالم میں بولا۔

''جابر صاحب نے آپ کو بلایا ہے... ان کی بیٹی بہت سخت تکلیف میں ہے... فوری آپریشن نہ ہوا تو وہ مر جائے گی۔''

''ہیں... کیا یہاں کوئی ڈاکٹر موجود نہیں ہے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''کوئی نہیں ہے... سوائے تمہارے۔'' جیلر نے بھاری لہجے میں کہا۔

''سرجری کے آلات اور دوائیں وغیرہ؟'' اس نے استفسار کیا۔

''وہ نرس بنگلے پر لے آئی ہے۔'' جواب ملا۔

قیدی ایک لمحہ کچھ سوچتا رہا پھر دروازے کے نزدیک آکر بولا۔

''چلیے... دنیا سے جاتے جاتے کوئی نیکی کماتا جاؤں۔''

جمعدار نے آگے بڑھ کر کوٹھری کے دروازے کا تالا کھولا۔ پھانسی گھاٹ کے جیلر نے آگے بڑھ کر قیدی کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالیں اور بیڑی کی زنجیر اپنے ہاتھوں میں لے کر چلنے کا اشارہ کیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی گارڈ ڈیوٹی پر تعینات سپاہی رائفلیں ہاتھوں میں تھامے اس کے ساتھ ساتھ ہو لیے... پھانسی گھاٹ کا قیدی باہر نکل رہا تھا... کوئی مذاق نہیں تھا۔

جیپ گیٹ کے ساتھ کھڑی تھی... جس کے پہیے پانی میں پوری طرح ڈوبے ہوئے تھے۔ قیدی اور سینئر جیلر کے جیپ میں بیٹھنے کے بعد ڈرائیور نے جیپ اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی جو حسب توقع اسٹارٹ نہ ہو سکی... لہٰذا تمام موجود سپاہیوں نے جیپ کو دھکا لگانا شروع کیا اور وہ آہستہ آہستہ پانی میں تیرتی صاب کے بنگلے پر پہنچ گئی۔

قیدی نے جیپ سے باہر قدم رکھا۔ کھلی فضا میں بارش کی پھوار اور پھولوں اور سبزے کی مہک کو لمبی سانس لے کر محسوس کیا۔

جابر صاحب برآمدے میں بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ وہ بے صبری سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کی لاڈلی بیٹی شدید اذیت میں تھی اور اس کی کراہیں اور چیخیں ان کا دل چیر کے ڈال رہی تھیں۔

رائفل بردار گارڈز کے پہرے میں پھانسی کا وہ قیدی برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر ان کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا... ہاتھوں میں ہتھکڑی اور پیروں میں بیڑیاں پہنے وہ ان کے سامنے کھڑا تھا۔

''ہیلو جابر صاحب! کیسے ہیں آپ؟'' اس نے مسکرا کر اپنے مخصوص انداز میں انہیں مخاطب کیا تو وہ جز بز ہو گئے۔ چند گھنٹے بعد پھانسی پر چڑھنے والے اس دلیر اور جری انسان سے وہ کیسے کہیں کہ وہ ان کی بیٹی کی جان بچالے۔ فوری آپریشن کر کے اسے اس اذیت سے نجات دلا دے۔

پھر انہیں یہ بھی خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں وہ اسے جان بوجھ کر نہ مار دے کیونکہ انہوں نے اس کو ایک مرتبہ بہت بُری طرح مارا پیٹا تھا۔ وہ ان کے سامنے کھڑا تھا... مسکرا رہا تھا اور ان میں اتنی ہمت نہیں آپا رہی تھی کہ وہ اس سے اپنی مجبوری میں مدد کرنے کا کہتے۔

ایسے میں ہی انہیں بیٹی کی دل دوز کراہ سنائی دی تو وہ بے چین ہو گئے... وہ قیدی کے سامنے گھٹنوں کے بل جھک گئے۔

''میری بیٹی کی زندگی بچالو... وہ ایپنڈکس کی تکلیف کی وجہ سے شدید اذیت میں ہے۔ اگر کچھ دیر اور اس کا آپریشن نہ ہوا تو وہ مر جائے گی۔ پلیز! اس کی زندگی بچالو۔''

وہ اس کے سامنے بُری طرح گڑگڑا رہے تھے۔ اس کے ہتھکڑیوں والے ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے وہ اس سے نہ جانے کیا کہے جا رہے تھے کہ اس نے نرمی سے اپنے ہاتھ ان کے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد کروائے اور بولا۔

''جابر صاحب! دنیا میں کسی بھی سرجن نے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہن کر آپریشن نہیں کیا ہوگا۔'' انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تو وہ اپنے ہتھکڑی والے ہاتھ انہیں دکھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ جابر صاحب نے اس کی ہتھکڑی اور بیڑی کھولنے کا اشارہ کیا... پھانسی گھاٹ کا جیلر تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے دونوں چیزیں کھول کر قیدی کو ان کی گرفت سے آزاد کیا۔

اسی وقت سینئر جیلر آگے بڑھا۔

''جب تک تم یہاں ہو... گارڈز کی کئی رائفلیں تمہارا نشانہ لیے تیار ہوں گی... اندر کمرے کی بھی ہر کھڑکی اور ہر روشن دان میں ایک ایک اسنائپر موجود ہوگا۔ اس بات کا



خیال رکھنا۔'' جیلر نے انگلی اٹھا کر اسے انتباہ کیا تو وہ جابر صاحب کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''میں یہاں سے فرار ہونے کی کوئی کوشش نہیں کروں گا۔ اس بات کی گارنٹی آپ جابر صاحب سے لے سکتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے قدم بڑھا کر زونی کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

درد سے بے حال... پسینے پسینے ہوتی زونی کو اپنی پیشانی پر ایک شفقت بھرے ہاتھ کا احساس ہوا تو اس نے آنسوؤں سے لبریز آنکھیں کھول دیں۔ اس کا مسکراتا ہوا چہرہ اس کے سامنے تھا... اس نے بھی مسکرانے کی کوشش کی۔

''تم بہت باہمت لڑکی ہو... فکر نہ کرو میں ابھی کچھ دیر میں تمہاری تکلیف ختم کر دوں گا... سب لوگوں سے درخواست ہے کہ باہر تشریف لے جائیں۔'' اس نے آپریشن کے آلات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا تو سینئر جیلر نے ایک بار پھر آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔

''میں ایک بار پھر بتانا چاہوں گا... آپ بہت سی رائفلوں کی زد میں ہوں گے... اس لیے...''

''میں جانتا ہوں... آپ لوگ صرف مارنا جانتے ہیں... بچانا نہیں... یہ آپ کے دستور میں نہیں ہے۔'' اس نے تیزی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔

''تم سچ مچ ایک بہادر انسان ہو... یہ جانتے ہوئے بھی کہ چند گھنٹوں بعد تمہیں پھانسی ہونے والی ہے... تم اس آپریشن کے لیے تیار ہو گئے۔'' جابر صاحب نے اس کی ہمت کو سراہا۔

''پھانسی؟ اوہ... میں تو یہ بھول ہی گیا تھا کہ کچھ دیر بعد مجھے پھانسی پر چڑھنا ہے... دیکھا مسٹر جابر! کتنا فرق ہوتا ہے جان بچانے اور جان لینے میں... آپ لوگ میری جان لینے کے لیے بھی اضطراب کا شکار ہیں... اور میں جان بچانے کے نشے میں خود اپنی پھانسی کو ہی بھول گیا تھا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے سب کو باہر جانے کا اشارہ کیا تو نرس کے علاوہ سب باہر آگئے اور دروازہ بند ہو گیا۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا، ان سب کا اضطراب اور بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ آسمان پر دبیز بادلوں کی تہ مستقل اندھیرا پھیلائے ہوئے تھی... بارش کبھی ہلکی ہو جاتی... کبھی پھر جھڑی لگ جاتی... کمرے کے بند دروازے کے پیچھے کوئی آہٹ... کوئی آواز نہیں تھی۔ سینئر جیلر نے اضطراب میں گھڑی پر نظر ڈالی۔ سوئیاں تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ وہ رول ہلاتا بار بار اِدھر اُدھر بے چینی سے گھوم رہا تھا اور ہر بار بند دروازے کو دیکھ کر تیزی سے واپس گھوم جاتا۔

ایسے میں ہی اچانک دروازہ کھلا... قیدی باہر آیا۔

''مجھے پھانسی پر کب لٹکنا ہے؟ کتنی دیر اور ہے؟'' اس نے سپرنٹنڈنٹ سے پوچھا تو جیلر نے گھڑی دکھاتے ہوئے کہا۔

''سر! وقت بہت کم ہے... ہمیں دیر نہیں کرنا چاہیے۔''

سپرنٹنڈنٹ جابر نے آگے بڑھ کر اس سے پوچھا۔

''وہ کیسی ہے؟''

''آپریشن ہو گیا ہے۔ اب اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے انہیں تسلی دی تو انہوں نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

''تم نے میری بیٹی کی جان بچا کر مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے... کیا تم جانتے ہو... تمہارے باپ نے بھی اسی طرح میری اس بیٹی کی جان بچائی تھی... موت کے منہ سے... دشمنوں سے بچایا تھا اسے۔'' انہوں نے مدھم آواز میں کہا تو قیدی نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔

''میں جانتا ہوں۔''

''جانتے ہو؟'' انہوں نے اچنبھے سے کہا۔

''کیا تم مجھے جانتے ہو؟'' اس نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تو وہ سچ مچ حیرت زدہ رہ گئے۔

''آپ ابوجی کے بچپن کے دوست ہیں... آپ کے بارے میں وہ بہت باتیں کیا کرتے تھے... میں آپ سے کبھی ملا نہیں لیکن ابوجی نے آپ کے بارے میں اتنا زیادہ بتایا ہوا تھا کہ میں نے پہلی نظر میں ہی آپ کو پہچان لیا تھا۔'' اس نے وضاحت سے کہا۔

''تم نے مجھے بتایا نہیں؟''

''میں نہیں چاہتا تھا کہ... مجھے پھانسی چڑھاتے ہوئے آپ کسی شرمندگی سے دوچار ہوں... آپ کو یہ احساس ساری زندگی ستاتا رہے کہ آپ نے اپنے جگری دوست اور محسن کے بیٹے کو اپنے ہاتھوں پھانسی پر چڑھا دیا... کسی طرح بھی احساسِ جرم کا شکار ہوں۔''

اس کی باتیں سن کر جابر کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''تم دونوں باپ بیٹے... کس دنیا کے لوگ ہو... خیر تم نے میری بیٹی کی زندگی بچا کر مجھ پر جو احسان کیا ہے... بتاؤ اس کے بدلے میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟'' انہوں نے اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"آپ صرف مجھے پھانسی دے سکتے ہیں... اس کے سوا کچھ نہیں۔" اس نے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔

"نہیں... میں اس کے علاوہ بھی تمہیں کچھ دے سکتا ہوں... بہت کچھ... اتنا کہ مرنے کے بعد بھی تم میرا احسان نہ بھول پاؤ گے۔"

"اچھا! چلیں ٹھیک ہے... جو کچھ دینا ہو پھانسی کے تختے پر ہی دے دیجیے گا۔" اس نے ہنس کر کہا تو وہ سب حیران تھے کہ یہ وہ شخص ہے جسے کچھ ہی دیر میں پھانسی پر لٹکنا ہے۔

"سر! ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے... صرف دس منٹ ہیں۔" سینئر جیلر نے کہا اور پھانسی گھاٹ کے جیلر نے بغیر آرڈر کا انتظار کیے تیزی سے قیدی کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔ بیڑی کے لیے طے پایا کہ جیل میں پہنچ کر ڈال دی جائے گی... آخر جیل کے قاعدے اور قوانین پر عمل بھی تو لازم تھا۔

جیلر اور سپاہی قیدی کو لے کر آگے بڑھے۔ برآمدے کی سیڑھیاں اترنے لگے تو پیچھے سے سپرنٹنڈنٹ کی آواز آئی۔

"ڈاکٹر عبیر علی ہاشمی۔"

اس نے پلٹ کر دیکھا۔

"میں تمہیں کچھ دینا چاہتا ہوں۔" ان کی بات سن کر قیدی ہنسا۔

"میں نے کہا نا... پھانسی کے تختے پر دے..." ابھی الفاظ اس کے منہ میں تھے اور ہونٹوں پر ہنسی کہ ایک دھماکا ہوا اور اس کی آواز ایک ہچکی میں بدل گئی۔ گولی ٹھیک اس کے دل پر لگی تھی اور وہ شاید زمین پر گرنے سے پہلے ہی راہیِ ملکِ عدم ہو گیا تھا۔ روح پرواز کر گئی اور چہرے پر ہنسی جامد ہو گئی۔

بارش کچھ تھم سی گئی تھی۔ بادل ہلکے ہو گئے تھے اس لیے افق سے ایک بے نام سا اجالا جھانکنے لگا۔ وہ پستول ہاتھ میں لیے آگے بڑھے۔ ڈاکٹر کے مردہ چہرے پر بھیگے بالوں کی لٹیں چپکی ہوئی تھی... اس کے ہونٹ مسکراہٹ کے انداز میں پھیلے ہوئے تھے اور کھلی آنکھیں جیسے پوچھ رہی تھیں۔

"یہ آپ نے کیا کیا؟"

"ضدی انسان! میں نے تجھ سے کتنا کہا کہ رحم کی درخواست پر دستخط کر دے... مگر تو نہیں مانا۔

"بیوقوف! تجھے اندازہ نہیں کہ پھانسی پر لٹک کر مرنے تک... جان نکلنے تک... کتنی تکلیف... کتنی جان لیوا اذیت جھیلنی پڑتی ہے... میں نے تجھے اس اذیت سے نجات دلا دی... دیکھو! کیسے ایک سیکنڈ میں جان نکل گئی... ہنستے ہنستے۔"

انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔ زونی اپنے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آگئی تھی اور نرس کا سہارا لیے کھڑی بُری طرح رو رہی تھی۔ لرز رہی تھی۔

"میں نے صحیح کیا نا؟" انہوں نے بیٹی سے پوچھا۔

"آپ نے... بالکل ٹھیک کیا... بہت اچھا کیا... وہ کوئی مجرم نہیں تھا جو اذیت کی سزا جھیلتا... اسے ہنستے مسکراتے ہی دنیا سے جانا چاہیے تھا۔" وہ ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان بولتے بولتے نڈھال ہونے لگی تو نرس اسے واپس کمرے میں لے گئی۔

☆☆☆

بارش تھم چکی تھی۔ ہلکے بادلوں کے سبب ایک بے نور سا اجالا ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ فضا میں اب بھی حبس موجود تھا۔ جیل کے اندر سپرنٹنڈنٹ کا بنگلا پولیس کی نفری سے آباد تھا۔

پنچ نامہ ختم ہوا تو ڈی ایس پی نے جابر صاحب کی بیلٹ اور ٹوپی اتروالی اور انہیں ڈاکٹر عبیر علی ہاشمی کے قتل کے الزام میں ہتھکڑیاں پہنا دیں... اور وہ سب ان کو ساتھ لے کر چل پڑے۔

تارکول کی سڑک پر قدموں کی کھٹ کھٹ فضا میں گونجی لیکن نہ تو مین گیٹ کے گارڈ سنتریوں نے انہیں سیلوٹ مارا... نہ ہی قیدیوں کے باہر کام کے دوران میں نگرانی کرنے والے سپاہیوں نے انہیں جھک کر سلام کیا... انہیں بہت بُرا لگا۔ اپنی توہین محسوس ہوئی... اور وہ اندر ہی اندر اس پر غضب ناک بھی ہوئے۔

پر ایک دم ہوا کے ایک شوخ جھونکے نے شاخوں کو کچھ یاد دلایا۔ وہ سلام کے لیے جھکیں اور پتوں نے تالیاں بجا بجا کر جابر صاحب کو الوداع کہا... کوئل نے کوک کر انہیں خدا حافظ کیا۔ جیل کی چار دیواری کا بڑا سا گیٹ کھلا۔ سامنے ہی کیچڑ سے بھری پولیس جیپ کھڑی تھی جو انہیں لے جانے والی تھی۔ رات سیلابی پانی میں ڈوبے راستے دور تک کیچڑ میں لتھڑے پڑے تھے۔

ڈی ایس پی نے انہیں اشارہ کیا اور وہ ہتھکڑیوں والے ہاتھ اوپر اٹھا کر جیپ میں بیٹھ گئے اور جیپ لمبے سفر پر روانہ ہوگئی۔

www.digestpk.com